سلسلہ مطبوعاتِ انجمنِ ترقّیِ اُردو (نمبر ۱۲۶/۱)

تاریخِ
ادبیاتِ ایران بعہدِ مغولان

مُصنّفہ

آنجہانی پروفیسر ایڈورڈ جی۔ براؤن

مترجمہ

محمّد داؤد رہبرؔ ایم۔ اے؛

میکلوڈ پنجاب عربک ریسرچ سکالر

پنجاب یونیورسٹی

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمنِ ترقّیٔ اُردو (نمبر ۱۲۶/۱)

تاریخِ ادبیاتِ ایران بعہدِ مغولان

مصنّفہ

آنجہانی پروفیسر ایڈورڈ۔ جی۔ براؤن

مترجمہ

محمّد داؤد رہبر، ایم۔ اے،
میکلوڈ پنجاب عربک ریسرچ سکالر
پنجاب یونیورسٹی

پہلی دفعہ ۱۹۴۹ء تعداد ۵۰۰

فہرستِ مضامین

دفترِ اوّل

ایران کے مغول ایلخان۔ ہلاکو کی وفات
سے خاندان کے انقراض تک

(سنہ ۶۶۳ھ تا سنہ ۷۳۶ھ = سنہ ۱۲۶۵ء تا سنہ ۱۳۳۷ء)

دفترِ دوم

تیمور لنگ کی ولادت سے وفات تک

(سنہ ۷۳۶ھ تا سنہ ۸۰۷ھ = سنہ ۱۳۳۵ء تا سنہ ۱۴۰۵ء)

دفترِ سوم

تیمور کی وفات سے سلاطینِ صفویہ کے طلوع تک۔

(۸۰۷ھ تا ۹۰۷ھ = ۱۴۰۵ء تا ۱۵۰۲ء)

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام ضمیر احمد خاں غوری پرنٹر چھپی اور حامد علی خاں صاحب
مینیجر انجمن ترقی اردو پبلشر نے کراچی سے شائع کی ۔

مُصنّف کا اِنتساب

مَیں یہ جلد اپنی بیوی کے نام معنون
کرتا ہوں جس کی تشویق اور ہمّت
افزائی اسکی تکمیل کا بڑا سبب ہوئی ؎

یک روز بود عید بیک سال بیک بار
ہموارہ مرا عید ز دیدارِ تو ہموار

(امامی۔ دیکھو صفحہ ۱۸۷)

مترجم کا دیباچہ

یہ ترجمہ میں نے اُس زمانے میں کیا تھا جب میں بی، اے میں پڑھتا تھا۔ بی اے کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مسوّدہ صاف کرنا شروع کیا اور قسطوں سے اپنے شفیق بزرگ قبلہ مولوی عبدالحق صاحب کو دِلّی بھیجتا رہا۔ ۱۹۴۵ء کے دسمبر میں مسودہ ان کے پاس مکمّل ہوگیا۔ اُنھوں نے اسے ۱۹۴۶ء کی مجوزہ مطبوعات کی فہرست میں رکھا۔ اور اسی سال کی سالانہ رپورٹ میں اس کا اعلان کردیا۔ ادھر سر میرزا اسمٰعیل نے حیدر آباد سے انجمن کی گرانٹ بند کردی۔ انجمن اس مصیبت سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ دلّی کے فساد شروع ہوئے۔ دریا گنج میں انجمن کا مکان لُوٹا گیا۔ یہاں افواہیں یہ اُڑیں کہ کتاب خانہ جل گیا۔ مسوّدے اسی میں تلف ہوگئے۔ پھر آندھی رُکی تو مولوی صاحب قبلہ دِلّی گئے۔ مکان میں جو کچھ بچا تھا اس کو ٹھیک کیا۔ اور مسوّدے بھی ڈھونڈ نکالے۔ میرا مسوّدہ لاہور میں مجھے عنایت کر گئے کہ اپنی نگرانی میں چھپوالو۔ اس طرح اشاعت میں ساڑھے تین سال کی دیر ہوگئی۔ ملک کی تقسیم کے بعد انجمن ترقیٔ اُردو کی یہ پہلی اشاعت ہے۔

مولوی صاحب کی ہمّت افزائی تھی کہ میں نے اُس وقت یہ کام سنبھال لیا

ؕ اس کتاب کی پہلی جلد کا نامکمل ترجمہ سید سجاد حسین صاحب نے کیا ہے اور چوتھی کا مکمّل ترجمہ جناب وتاج الدین صاحب نے۔ دونوں ترجمے انجمن ترقیِ اُردو ہی نے چھاپے ہیں؛

تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک سہارا تھا۔ والدِ مرحوم پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال زندہ تھے اور ہر لمحہ اُن کی ہدایت حاصل تھی۔ وہ براؤن کے خاص شاگردوں میں تھے۔ اور ایران کی ادبی تاریخ برسوں اپنے طالبعلموں کو پڑھاتے رہے۔ جن دنوں براؤن یہ جلد لکھ رہے تھے والدِ مرحوم برابر اُن کے ساتھ تھے۔ براؤن اُن سے مدد بھی لیتے رہے۔ ان ہی نے مصنف کو شعر العجم سے متعارف کرایا۔ اور اس کی اُردو عبارات میں ترجمانی کا کام کرتے رہے۔ علمی نسب کے لحاظ سے اگر مَیں اپنے آپکو براؤن کا پوتا کہوں تو غلط نہیں۔ مجھے یہ بھی افتخار ہے کہ مَیں نے یہ ترجمہ اُس خاص جلد سے کیا ہے جو براؤن مرحوم نے میرے والد کو مرحمت کی تھی اور اس پر اُن کے دستخط ہیں ؀

یہ ترجمہ مَیں نے جس زمانے میں کیا تھا اس وقت ذرا بڑے لفظوں کے استعمال کا شوق ہؤا کرتا ہے۔ اور "ایک حد تک" کی جگہ "تا حدے" میں زیادہ رُعب نظر آتا ہے۔ اب جو اس ترجمے کو دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ زبان زیادہ آسان ہوتی تو اچھا تھا۔ میں ناظرین کو یہ تنبیہ بھی کرتا ہوں کہ میرے اعتراف کی شہ پاکر عبارت کو جائز سے زیادہ مشکل قرار نہ دیں ؀

میں نے ذیلی حاشیوں میں اپنی طرف سے جگہ جگہ نوٹ اضافہ کئے ہیں۔ ورنہ اصل میں والدِ مرحوم کی تجویز تھی کہ مَیں اُن کی نگرانی میں کتاب کا ایک ضمیمہ تیار کردوں جس میں براؤن کی تالیف کے بعد کی تحقیقات کا خلاصہ شامل ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ اُنکی وفات سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔ مَیں ڈرتے ڈرتے خود ہی یہ کام شروع کر دیتا۔ مگر میرا خاص مضمون ہمیشہ عربی رہا ہے۔ اور مجھے منصبی طور پر بھی توجہ عربی تک محدود رکھنی پڑی ہے۔ جو نوٹ مَیں نے بڑھائے ہیں اُن میں بعض تو غیر مانوس یورپی ناموں

اور تلمیحوں پر ہیں کہ عام اُردو خوان اُن سے واقف نہیں۔ پروفیسر براؤن کئی کتابوں کو غیر مطبوعہ کہہ رہے ہیں وہ ان کی تالیف کے بعد چھپ گئی ہیں۔ مَیں نے اُنکی اشاعتوں کا ذکر کر دیا ہے۔ بعض شعراء اور مصنفوں پر نئے مستشرقوں اور ایرانی فاضلوں نے نئی کتابیں شائع کی ہیں۔ اُن کا ذکر بھی نوٹوں میں بڑھا دیا ہے۔ ایسے تمام نوٹوں کے آگے 'مترجم' کا لفظ درج ہے ؀

پروفیسر براؤن نے بعض جگہ تو اصل فارسی اقتباس بھی دے دِئے ہیں لیکن بعض جگہ صرف انگریزی ترجمے پیش کئے ہیں۔ ایسے انگریزی ترجموں کی جگہ مَیں نے جہاں تک ممکن ہؤا اصل فارسی عبارتیں مطبوعہ اور قلمی نسخوں سے لیکر اضافہ کر دی ہیں۔ اس کی مثالیں آپ کو عبید زاکانی اور لمعاتِ عراقی کے اقتباسات میں ملیں گی؀

ترجمہ کرتے ہوئے ہر حصّے میں مَیں نے براؤن کے دستیاب مآخذ کو سامنے رکھا۔ اس طرح مطالب کو بہتر سمجھنے میں مجھے کافی مدد ملی۔ اور معلومات کی صحت قائم رہی۔ بعض عجیب مشکلات آجاتی ہیں۔ مثلاً انگریزی میں پوتے اور نواسے کے لئے ایک ہی لفظ ہے۔ ایسی جگہ نسب نامے میں تلاش کر کے دیکھنا پڑتا ہے کہ اصل میں رشتہ کیا ہے۔ مُحتاط اور باضمیر مترجم کی ایسی بہت سی مشکلات ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں ؀

یہاں پروفیسر براؤن کا اسلوب تحریر بھی کُچھ شگفتہ نہیں۔ پھر ترجمے کے نقطۂ نظر سے تو خاص طور پر دقّت سے پُر ہے۔ وُہ دس دس سطروں کا ایک فقرہ لکھ ڈالتے ہیں جسے ترجمے میں توڑ کر کئی فقروں میں پیش کرنا پڑتا ہے ؀

یورپی زبانوں کے نام اُردو میں لکھتے ہوئے میں نے اُن کے صحیح لہجوں کے

قریب پہنچنے کی پوری کوشش کی ہے ؞

اس جلد میں باقی تین جلدوں کی نسبت ذیلی حاشیوں، کتابی حوالوں، ناموں، تاریخوں اور فہرستوں کی بہت زیادہ بھرمار ہے۔ اور ادبی تنقید بہت کم ہے۔ اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے مگر انڈکس کی ضخامت سے تو خاص طور پر ہو جاتا ہے۔ براؤن متقدم طور پر ایک کامل مورّخ ہیں۔ وہ اچھے سے اچھے ادب پارے میں شہروں کے نام اور ممدوحوں کی فہرست ڈھونڈتے ہیں۔ اور اس کی تاریخ تصنیف پر لمبی بحثیں لکھ ڈالتے ہیں۔ وہ طبعًا کچھ ایسے نڈر قسم کے نقاد نہیں ہیں۔ مگر غیر ملکی ادب پر رائے زنی کرتے ہوئے تو اُن کو بے اندازہ تامّل ہے جس کا اعتراف اُنھوں نے دو ایک جگہ کیا ہے۔ وہ اس طرح کے فقرے لکھ دیتے ہیں "اگر ایک غیر اہلِ زبان ناقد کو کچھ کہنے کی اجازت ہے۔ تو مَیں یہ کہوں گا" وغیرہ۔ اسی طرح جامیؔ پر خود تنقید کرنے کی بجائے اُنھوں نے اپنے ہمکار ذبیح اللہ بہروز سے تبصرہ لکھوا کر شامل کر دیا ہے۔ دُوسرے مصنّفوں پر بھی جہاں کہیں اُنھوں نے کچھ رائے پیش کرنا چاہی ہے۔ تو دوسرے مُستشرقوں کی رائے نقل کر دی ہے۔ اسی طرح شعر العجم سے متعارف ہوتے ہی اُنھوں نے شبلی کی بنی بنائی تنقیدات اپنے ہاں شامل کر لیں ؞

لیکن اس سے یہ ہرگز مُراد نہیں کہ وُہ شعر کی سمجھ اور ذوق سے عاری ہیں۔ وہ فارسی شاعری میں بالکل ڈُوبے ہوئے ہیں۔ اور اُنھوں نے فارسی اشعار کے منظوم ترجموں میں اصل کے مطلب اور ساخت کو جس چابکدستی سے برقرار رکھا ہے وہ یقینًا رشک کے قابل ہے ؞

اس جلد میں ایک اَور کمی یہ نظر آتی ہے کہ ہر دور کے تاریخی واقعات کو

ادبی پیداوار کے پس منظر کے طور پر نہیں لیا گیا۔ اور ادب واقعات سے نکلتا ہؤا نہیں دکھایا گیا۔ تاریخ اور ادب کے تعلق کے بارے میں بے باکانہ نتائج نہیں نکالے گئے۔ صرف ایک مشاہدہ جابجا آیا ہے کہ ایران میں بے امنی کے زمانے ادبی پیداوار کے لحاظ سے زیادہ پُر ہیں۔ گو اس پر بھی صرف تعجب کیا گیا ہے۔ اور اسکی کوئی نفسیاتی وجہ نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس جلد میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک باب میں اُس دور کی تاریخ ہے۔ پھر اس کے بعد اس کا ادب ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی اس کتاب کی پہلی دو جلدیں موجودہ جلد سے بہت بہتر ہیں۔

تاتاری عہد کی ادبیات کے اس جائزے میں معلومات کا ایک دریا ہے جسے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ایک زیادہ صاحبِ تخیل ناقد کے لئے یہ جلد بہت جامع مأخذ کا کام دے سکتی ہے۔ اس میں یہ پورے طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ اس دَور میں کیا ادب پیدا ہؤا۔ گو یہ وضاحت سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی صحیح وقعت اور نوعیت کیسی تھی۔

یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کتاب میں براؤن کا رُوئے سُخن صرف انگریزوں کی طرف ہے وہ بعض جگہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں چیز کے بارے میں انگریزی کتابیں خاصی معلومات بہم پہنچاتی ہیں اس لئے تفصیل چھوڑ دی جاتی ہے۔

ہمارے مُلک کے طالبعلموں کو اس بات پر تعجب ہوگا کہ براؤن نے ہندوستان کے فارسی ادب کو یہاں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس کی جو وجہ براؤن نے خود بیان کی ہے خاصی معقول ہے۔ کہ یہ موضوع ایک جداگانہ تصنیف کا حق رکھتا ہے۔ لیکن اسکے علاوہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ براؤن کو ہندوستانی فارسی کے خلاف کچھ تعصّب

سا ہو گیا تھا۔ والدِ مرحوم بیان کرتے تھے کہ وہ ہندوستانیوں کو بے ذوق نقّال سمجھتے تھے۔ مثلاً "علی گڑھ کالج میگزین" پر میگزین کا لفظ پڑھ کر اُنہوں نے سخت حقارت کا اظہار کیا اور کہا کیسی غلامانہ حرکت ہے۔ اس کی جگہ 'مخزن' اس لفظ کی اصلی شکل اختیار کر لیتے یونیورسٹی میں اُنہوں نے اُردو بھی پڑھی تھی۔ اور اُردو شاعری کو بھی وہ فارسی کی بھونڈی نقل سمجھتے تھے۔ ایک اور دلچسپ اور بہت ہی ذاتی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ابتدا میں فارسی ایک ہندوستانی سے سیکھنی شروع کی تھی۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب "ایرانیوں میں ایک سال" کے شروع میں کیا ہے۔ اس ہندوستانی نے انہیں یائے مجہول قسم کے جو لہجے سکھائے وہ ایرانیوں کی سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ ان سب باتوں پر مزید یہ کہ ہمارے ہاں کی چھپی ہوئی کتابوں سے اُنہیں گھن آتی تھی۔ نولکشوری مطبعے کی کتابیں جس بے احتیاطی سے تیار ہوتی تھیں۔ اسکو وہ علم دشمنی سمجھتے تھے ؛

میں ترجمے سے قطع نظر بھی اپنے والدِ مرحوم کی عنایتوں کا جتنا چرچا کروں کم ہے۔ یہ حق ادا نہیں ہو سکتا۔ قبلہ مولوی عبدالحق صاحب کی خاص شفقت پر بھی مجھے ناز ہے کہ اُنہوں نے انجمن کی مطبوعات میں ترجمے کو شامل کر کے ایک طالب علم کی ہمت اور عزت بڑھائی ؛

کتاب کی طباعت کی نگرانی، پروف خوانی وغیرہ نے میرا بہت وقت لیا۔ کاش یورپ کی طرح یہاں بھی تقسیم کار سے ایسی آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ ایک تہائی صفحوں کے پروف پڑھنے میں میرے چھوٹے بھائی ضیار محی الدین نے اس طرح مدد کی کہ وہ مسودہ پڑھتے جاتے تھے اور میں کتابت کو درست کرتا تھا۔ اس کا جتنا

شکریہ واجب ہے ادا کرتا ہوں ؛

ماڈل ٹاؤن لاہور — داؤد رہبر

۸ر مارچ ۱۹۴۹ء

مصنّف کا دیباچہ

"تاریخ ادبیاتِ ایران[۱]" کی دوسری جلد کو شائع ہوئے اب چودہ برس ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف نام اور ہیئت کے اعتبار سے نہ سہی ویسے دراصل اسی کا تسلسل ہے۔ موجودہ جلد ہلاکو کی وفات سے صفوی خاندان (۱۲۶۵ تا ۱۵۰۲ء) کے طلوع تک آتی ہے۔ اس جلد کے تیار ہونے میں دیر ہوئی اس کے مختلف اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک سبب جو پانچ چھ سال تک (۱۹۰۷ تا ۱۹۱۲ء) کارفرما رہا میں نے اپنی کتاب "ایرانی انقلاب" کے دیباچے (صفحہ یٓ) میں اشارہ کیا ہے۔ اُس وقت ایران اُس کیفیت سے گزر رہا تھا جو بار بار نزع کی شکل اختیار کرتی معلوم ہوتی تھی۔ ایسے عالم میں اس سے محبت کرنے والوں کے لئے مشکل تھا کہ اسکی موجودہ مصیبتوں سے نظر ہٹا کر اس کی گذشتہ عظمتوں کو دیکھنے لگیں۔ واقعی کئی مرتبہ تو میں نے اس تصنیف کو جاری رکھنے کا خیال قریب قریب چھوڑ ہی دیا۔ کچھ حصہ میں

---

[۱] ان دو جلدوں میں سے جو مسٹر ٹی فشر۔ اَن وِن نے "سلسلۂ تواریخ ادبی" میں شائع کیں پہلی کا عنوان یہ ہے:۔ تاریخ ادبیات ایران از اوائل تا فردوسی (تعداد صفحات یو + ۵۲۱؛ سنہ ۱۹۰۲ء)۔ دوسری کا عنوان یہ ہے تاریخ ادبیاتِ ایران از فردوسی تا سعدی (تعداد صفحات یو + ۵۶۸؛ سنہ ۱۹۰۶ء) موجودہ جلد کے حواشی میں ان کے حوالے تاریخ ادبیاتِ ایران جلد اول یا دوم کے نام سے دئے گئے ہیں ؂

پہلے لکھنا شروع کرچکا تھا۔ اس پر پھر سے نظر ڈالنے اور اُسے پورا کرنے کا تہیّہ آخر میں نے کیا۔ اس ارادے کا سہرا ایک تو میری بیوی کے سر ہے اور دُوسرے دو ایک دوستوں اور ہمکاروں کے سر جن میں خاص طور سے ڈاکٹر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ اور مسٹر گائی لوسٹرینج کا ذکر کروں گا۔ ان ہی کے شوق دلانے اور ہمت بڑہانے پر مَیں نے پھر قلم اُٹھایا ٭

لیکن یہ جو دیر ہوئی سراسر افسوس ہی کا باعث نہیں۔ اس نے مجھے ایسے چھپے ہوئے اور قلمی مواد سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا جو اس سے پہلے نہ مل سکتا تھا۔ خاص طور پر میری خوش قسمتی ہے کہ عربی اور فارسی قلمی نسخوں کے دو عمدہ مجموعے مجھے ملے جنہوں نے مجھے قابلِ قدر مواد بہم پہنچایا۔ میری مُراد ایک تو اُن ساٹھ ایک قلمی نسخوں سے ہے (علاوہ ایران کی چھپی ہوئی چاپ سنگی اور ٹائپ کی کتابوں کے) جو ۱۹۱۷ء میں آنجہانی سرالبرٹ ہاؤٹم شنڈلر کے کتابخانے سے وصول ہوئے[1]۔ اور دُوسرے چالیس پچاس مزید قلمی نسخوں سے جو غیر معمولی طور پر نادر اور قدیم ہیں اور ۱۹۲۰ء میں حاجی عبد المجید بیلشاہ نے ایران اور عراق سے جمع کرکے دئے۔ ابھی تک فارسی کی کتنی ہی ایسی تصانیف غیر مطبوعہ ہیں جو چوٹی کی اہمیت رکھتی ہیں۔ عام طور سے یہ تصانیف ناقابلِ رسائی ہیں۔ سوائے اسکے کہ یورپ کے بڑے بڑے کتابخانوں میں اُن کے نسخے موجود ہیں۔ اس لحاظ سے ایرانی ادب کے اُس طالبعلم

---

[1] اس مجموعے کا تذکرہ میں نے مجلّۂ انجمن ہمایونی ایشیائی بابت اکتوبر ۱۹۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ ص ۶۵۷ تا ص ۶۹۴۔ عنوان یہ تھا:۔ "آنجہانی سرالبرٹ ہاؤٹم شنڈلر۔ کے۔سی۔آئی۔ ای کے فارسی مخطوطات"۔

کے لئے جو اپنی تحقیقات قدرے غیر مانوس پگڈنڈیوں کی طرف لے جانا چاہتا ہے ایک اچھا ذاتی کتاب خانہ ضروری ہے ؂

بعض لحاظ سے مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ جلد سابق دو جلدوں سے جدا حیثیت میں پیش کرنی پڑ رہی ہے۔ اور یہ اسی سلسلۂ مطبوعات میں شائع نہیں ہو رہی لیکن اس راستے کو اختیار کرنے میں کئی خیال تھے۔ ان میں سب سے مقدم بیان کرتا ہوں اوّل تو میں چاہتا تھا۔ کہ اگر کوئی شخص اس کتاب سے اقتباس کرنا چاہے تو اس کی اجازت دینے کے پورے حقوق میرے پاس ہوں۔ پھر میں چاہتا تھا کہ اُن تمام اصل فارسی عبارتوں کو خاطر خواہ اور صحیح شکل میں پیش کرسکوں جن پر مَیں نے اپنے ترجمے مبنی کئے ہیں درحالیکہ ان میں بہت سی عبارتیں چھپی ہوئی کتابوں میں نہیں ملتیں اور صرف قلمی نسخوں میں موجود ہیں۔ غرض یہ ضروری تھا کہ چھپائی کا کام کسی ایسے پریس کے سپرد کیا جائے جس کے پاس مناسب مشرقی ٹائپ موجود ہوں۔ کوئی مصنّف جس کی کتاب کیمبرج یونیورسٹی پریس میں تیار ہوئی ہے یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس پریس کے منتظمین کی کاریگری، احتیاط، حسنِ ذوق اور پیہم خوش اخلاقی کا وہ کس درجہ ممنون ہے ؂

مجھے امید ہے کہ میرے ایرانی دوستوں میں کسی کو اس عنوان سے اختلاف نہ ہوگا جو مَیں نے اس کتاب کو دیا ہے یعنی "تاریخ ادبیاتِ ایران بعدِ مغولان"۔ میں ایسے ایرانیوں کو جانتا ہوں جنھوں نے حُبّ وطن کے جوش میں تاریخی حقیقت کی پرکھ کو اس حد تک پیچھے چھوڑ دیا کہ نہ صرف تیمور بلکہ ہلاکو اور چنگیز کے ایرانی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ نوعِ انسانی کی وہ آفتیں جن میں آخری دو تو اسلامی تمدن

پر اور وہ بھی خاص طور سے ایران میں تباہی کا ایسا سیلاب لائے کہ انسانوں میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ مغلوں نے وسطی اور مغربی ایشیا کے طول و عرض میں جو لرزہ خیز تباہی پھیلائی اس کا حال پڑھ کر ہمیں اُن چیزوں پر اتنی حیرت نہیں ہوتی جو اُنکے ہاتھوں مٹ گئیں بلکہ ان چیزوں پر حیرت ہوتی ہے جو اُن کے ہاتھوں سے بچ نکلیں۔ اور ایرانی طبع کی سختی کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ بیشتر قوموں کی طبائع کے مقابلے پر اس پر ان وحشیوں کی تباہ کاریوں کا بہت کم اثر ہوا ؞

اس جلد میں جس دور سے بحث کی گئی ہے وہ مغولی تسلّط کی اُٹھتی لہر سے شروع ہوتا اور اس تورانی حملے کی لہر کے اُتار پر ختم ہوجاتا ہے جو تیمور نے شروع کیا۔ سیاسی طور پر اس تمام دوران میں تاتاریوں، ترکوں اور ترکمانوں کے ذریعے ایران پر توران کا غلبہ رہا۔ تاہم ایران نے اپنی علمی ادبی اور فنّی زندگی بدستور قائم رکھی بلکہ کسی حد تک اس نے حملہ آوروں کو متمدّن بنایا۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر حالات نے ساتھ دیا تو میں ایران کی اس رُوحانی اور علمی زندگی کے جائزے کی تکمیل ایک اور جلد میں کروں گا جس کا عنوان یہ ہوگا "تاریخِ ادبیاتِ ایران بعہدِ جدید"۔ اُس جلد میں آخری چار سَو سال کا جائزہ ہوگا۔ یعنی صفویوں کے عظیم خاندان کے طلوع سے آج تک۔ اس خاندان نے ایران کی پُرانی جغرافی حدُود کو بحال کیا۔ اور اس کی قومی رُوح کو بیدار کیا۔ مجھے اُمّید ہے کہ میں اپنا ارادہ پُورا کرسکوں گا ؞

ایک خوشگوار فرض ابھی باقی ہے۔ مجھے اپنے ان دوستوں اور ساتھی طالبعلموں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس تصنیف کی تیاری میں میری نہایت ٹھوس مدد

کی ہے۔ تقریباً تمام پروف حکومتِ ہند کے بھیجے ہوئے دو طالبعلموں نے پڑھے جو ریسرچ کے لئے یہاں آئے ہیں اور غیر معمولی طور پر فاضل، قابل اور محنت پسند ہیں۔ ایک تو محمد شفیع صاحب ہیں جو میرے ہی کالج کے ممبر ہیں اور اب پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ اور ان کے جانے کے بعد نوجوان طالب علم محمد اقبال صاحب جن سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں ان دونوں کا میں بہت سی اصلاحوں، درستیوں اور مشوروں کے لئے ممنون ہوں ٭

ل ....

....

آخر میں مجھے اعتراف کرنا ہے کہ میں مس گرٹرڈ لوتھین بیل کا احسانمند ہوں انہوں نے حافظ کی غزلوں کے اپنے کئے ہوئے بعض حسین ترجمے نقل کرنے کی مجھے اجازت دی۔ اور اپنی وہ عبارت نقل کرنے دی جس میں نہایت عمدہ پیرائے میں انہوں نے حافظ کو نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ کل دنیا اور کل وقتوں کے عظیم شاعروں میں جگہ دی ہے ٭

۵ راپریل ۱۹۲۰ء ایڈورڈ۔ جی۔ براؤن

ل یہاں پروفیسر براؤن نے اُن اداروں اور شخصوں کا شکریہ ادا کیا ہے جن سے اُنہیں کتاب میں بعض تصاویر شامل کرنے کی اجازت ملی ہے۔ چونکہ ترجمے کی اِس ایڈیشن میں وہ تصاویر حذف کر دی گئی ہیں اسلئے مَیں نے اس عبارت کو بھی نکال دیا ہے ٭ (مترجم)

دفترِ اوّل

ایران کے مغول ایلخان۔ ہلاکو کی وفات سے
خاندان کے انقراض تک

(۶۶۳ھ تا ۷۳۶ھ = ۱۲۶۵ء تا ۱۳۳۶ء)

باب اوّل

ایران کے مغول ایلخان

تاریخ ایران کے عظیم دَور اور تاریخِ عالم سے ان کا تعلق

یوں تو جس قوم کی تاریخ کو دیکھو طالبعلم کے لئے اُس کا ہر زمانہ کم وبیش دِلچسپ ہوتا ہے۔ یا کافی معلومات، ہمدردی اور تخیّل کے ساتھ دِلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ تاہم اکثر اقوام کی تارِیخ میں انقلاب اور تجدید کے ایسے مہتم بالشان دور آتے ہیں جن کے متعلق ہر پڑھے لکھے آدمی کو کچھ نہ کچھ واقفیت ہونی چاہئے۔ ایران کو اپنی جغرافی اور نسلی وجوہات کی بناء پر ان ادوار کا پورا حصہ ملا ہے نقشے کو ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوجائیگا۔ کہ یہ قدیم، متمدن اور یک نسل خطّہ جو بحرِ خزر اور خلیج فارس کے مابین تمام علاقے پر مشتمل ہے ایک طرف تو یورپ اور ایشیائے کوچک کے درمیان اور

دُوسری طرف وسطی اور مشرقی ایشیا کے درمیان گویا ایک پُل کی طرح سے ہے۔ قدیم زمانوں سے مغرب اور مشرق کے حملہ آور لشکر اپنی اپنی فتوحات کی گزرگاہوں میں اس پُل پر سے گذرتے رہے ہیں ایسے خاص لمحے جن میں تاریخِ ایران اس طرح تاریخِ عالم کیساتھ ہم آغوش ہو جاتی ہے حسبِ ذیل ہیں:-

ایسے ادوار میں سے سات کا شمار

۱- پانچویں صدی قبل مسیح میں شاہان ہنجامنشی کا یونان پر حملہ ؛

۲- چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کی راہ پر سکندر کا ایران پر حملہ، نتیجے کے طور پر خاندان ہنجامنشی کا انقراض اور ساڑھے پانچ صدیوں کیلئے بہ حیثیت ایک عظیم طاقت ایران کا مٹ جانا ؛

۳- تیسری صدی میں ساسانیوں کے ہاتھوں سلطنتِ ایران کا بحال ہونا اور چوتھی اور مابعد کی صدیوں میں رُومیوں کے ساتھ اُنکی لڑائیاں جو اکثر کامیاب رہیں ؛

۴- ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کا حملہ، یہ حملہ ایک ایسی قوم کے غیر معمولی مذہبی احیاء کا جُزو تھا جو تا حال ہیچ سمجھی جاتی تھی اور اس تحریک نے چند ہی سال کے عرصے میں صحرائے عرب کے مرکز سے لے کر مغرب میں ہسپانیہ تک اور مشرق میں دریائے جیحوں اور دریائے سندھ تک اسلامی جھنڈے گاڑ دِئے ؛

۵ - تیرہویں صدی عیسوی میں قوم مغول یعنی تاتاریوں کا حملہ جس نے ایشیا کے بیشتر حصّے اور جنوب مشرقی یورپ پر گہرا اثر چھوڑا۔ اور جسے بجا طور پر بنی نوع کی مہیب ترین آفتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ✦

۶ - چودھویں صدی کے آخری حصّے میں تیمور کا دُوسرا تاتاری حملہ۔

۷ - سولھویں اور سترھویں صدی کے ترکی ایرانی محاربے جنھوں نے ایران کی اہمیت کو اہلِ یورپ کی نظر میں بہت بُلند کر دیا کیونکہ اُن کے نزدیک ایران ٹرکی کے عزائم کیلئے ایک سدِ راہ تھا۔ اس سبب سے مغرب کی بڑی بڑی قومیں نہایت سرگرمی کیساتھ ایران سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی آرزو مند تھیں ✦

عربوں اور تاتاریوں کے ایرانی حملوں کا موازنہ اور مقابلہ

ایرانی تاریخ کے ان سات ادوار میں چوتھے اور پانچویں کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے اور ان کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا ہوُا۔ سوائے ایک بات کے عربوں اور تاتاریوں کے حملوں میں کوئی مشابہت نہ تھی۔ عرب جنوب مغرب کی طرف سے وارد ہوئے اور تاتاری شمال مشرق کی طرف سے۔ عربوں میں مذہبی جوش کی آتشیں رُوح کارفرما تھی۔ تاتاریوں میں محض فتح و نُصرت، خونریزی اور غارتگری کی وحشیانہ ہوس موجزن تھی۔ عرب اِس تمدّن کے عوض جسے اُنھوں نے تباہ کیا ایک نئے

تہذیب اپنے ساتھ لائے تاتاریوں کے ہاں دہشت اور تاراجی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ تاتاری عیار تھے۔ خون کے پیاسے اور سفاک لٹیرے تھے۔ اور عرب جیسا کہ اُن کے ہسپانوی دشمنوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا:" بامروّت ...... اور شریف تھے اگرچہ عرب تھے ......"۔

دونوں حملہ آور قوموں میں مشابہت کا صرف ایک نکتہ ہے۔ اور وُہ یہ کہ اُن کے قلیل ساز و سامان اور ادنیٰ وضع قطع دیکھ کے اُنکے مسلّح اور سنگین آلات سے لیس دشمن نے دونوں دفعہ اُنہیں نہایت حقیر سمجھا۔ اور یہ حقارت قائم رہی۔ جب تک ایرانیوں نے اُن کے دوسرے اوصاف کا مزا نہ چکھا۔ یہ نکتہ عربی کی دلکش تصنیف "کتاب الفخری" میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جو مصنف نے ۱۳۰۰ء میں لکھی۔ اس وقت تاتاریوں کے بغداد کو تاراج اور خلافت کو تباہ کئے پچاس برس ہو چکے تھے۔ مصنف نے ایران پر عربوں کے حملے کا بیان کیا ہے۔ اور پھر اس تضحیک کا ذکر کیا ہے جو ایرانی فوجی سرداروں اور امیروں نے ان کی خستہ نیاموں شکستہ نیزوں اور پست قد گھوڑوں کو دیکھ کر کی ہے۔ اسی سلسلے میں وُہ ایک راوی کے بیان[1] کا حوالہ دیتا ہے۔ یہ شخص بذاتِ خود ان مجاہدین میں شریک تھا۔ جو ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں یعنی بغداد کے حادثہ فاجعہ کے موقع پر

---

[1] اس عبارت کے مکمل ترجمے کیلئے دیکھو میری "تاریخ ادبیاتِ ایران" جلد اوّل ص ۱۹۷-۸

تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کو شہر کے مغرب کی جانب کوچ کر گئے تھے" راوی مذکور بتاتا ہے کہ "کس طرح اُن کے ایک مکمل ساز و سامان سے آراستہ پہلوان کے مقابلے پر تاتاری صف میں سے ایک شخص برآمد ہوًا جو ایک خرنما گھوڑے پر سوار تھا۔ اور ہاتھ میں تکلے کے برابر ایک نیزہ لئے تھا۔ نہ اسکے جسم پر وردی تھی نہ زرہ بکتر۔ چنانچہ سب اس کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دیئے"۔ پھر آخر میں وہ کہتا ہے" بااین ہمہ جب دِن پُورا ہُوًا میدان انہی کے ہاتھ رہا اور ہمیں شکست فاش ہوئی۔ اُن کی فتح مفتاحِ آفات تھی۔ اور پھر جو کچھ ہم پر گزری سو گزری"

تاتاری حملے کی ہولناک نوعیت اور اس کے پائدار اثرات

تیرھویں صدی کے نصف اوّل میں منگولیا، ترکستان اور ماوراء النّہر کے وحشیوں نے جو زبردست یورش کی اس کی تاریخی اہمیت اور اس کی دہشت کے بارے میں مبالغہ کرنا تقریبًا ناممکن ہے۔ اسکے نتائج میں عربی خلافت کی بربادی، اسلامی سلطنت کا انتشار، مغربی ایشیا کی جدید مُلکی تقسیم، آگے چل کر عثمانی تُرکوں کا اوّل ایشیائے کوچک اور اس کے بعد یورپ میں دھکیلے جانا اور ضمنًا یورپ میں تحریک احیائے علومؒ[1]، شامل ہیں،

---

[1] اس تحریک کا انگریزی نام Renaissance ہے۔ اس سے مُراد علوم و فنون کا وُہ احیاء ہے جو پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ میں وقوع پذیر ہوًا۔ ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ اُنکے حملے کے باعث

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

تا تاریوں کے سنگدلانہ اعمال نے جو عالمگیر دہشت پھیلا رکھی تھی اُسکے متعلق دوسون[1] اپنی قابلِ ستائش کتاب "تاریخ مغول" میں یہ خیال ظاہر کرتا[2] ہے کہ ہم مشرقی مؤرخوں کو مبالغے کا قصوروار ٹھہرانے پر مائل ہوتے اگر اُن کے بیانات کی پوری تصدیق مغربی مؤرخوں کی جداگانہ شہادت سے نہ ہوتی جو انہوں نے جنوب مشرقی یورپ میں تاتاریوں کے وحشیانہ اقدامات کے بارے میں دی ہے کہ وہاں اُنہوں نے نہ صرف رُوس پولینڈ اور ہنگری کو تاراج کیا بلکہ سائلیشیا[3]، موراویا[4] اور ڈیلمیشیا[5]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷) یونانی علماء کثرت سے اٹلی کو ہجرت کرنے لگے۔ وُہ اپنے ساتھ یُونانی زبان کا علم لیتے گئے اور اُنہوں نے علوم جدیدہ کی اشاعت کو زبردست ترقی دی۔ قدیم یونان اور روم کا ادب بڑے زور شور سے پڑھا جانے لگا۔ علماء اور حکام نے پُرانے نسخوں کی سرگرمی سے تلاش کی، ۱۴۳۸ء میں جون گٹن برگ John Gutenberg نے مینز (Mainz دریائے رائن کے کنارے جرمنی کا ایک شہر اور بندرگاہ) میں چھپائی ایجاد کی جس سے اس تحریک کو مدد ملی۔ انگلستان میں یہ تحریک بالخصوص سر ٹامس مور Sir Thomas Moore)، جون کولٹ (John Colet) اور ایریسمس (Erasmus کے ناموں کے ساتھ وابستہ ہے؛ (مترجم)

[1] d'Ohsson [2] Histoire des Mongols ؛ جلد اول صـ "اگر تمام ملک کی تاریخی اسناد اس بات پر متفق نہ ہوتیں تو ہمیں خیال ہوتا کہ (مشرقی) تاریخ نے اُنکے ظالمانہ افعال کو بڑھا چڑھا کر بتایا ہے"؛ [3] Silesia جرمنی کے مشرقی حصے میں ایک صُوبے کا نام؛ [4] Moravia چیکوسلواکیا کا ایک حصہ [5] Dalmatia یوگوسلاویا کا ایک صُوبہ؛ (مترجم)

میں بھی جا گھسے اور لیگنٹس[1] کی مہلک جنگ (۹ اپریل سنہ ۱۲۴۱ء) میں
انہوں نے تیس ہزار کی فوج کو شکست دی جس میں جرمنی، آسٹریا، ہنگری
اور پولینڈ کی فوجیں شامل تھیں، اس فوج کی کمان ہنری[2] پارسا (ڈیوک
آف سائلیشیا) کے سپرد تھی۔ اس سے دو برس قبل مغربی یورپ میں بھی
انہوں نے جس زلزلے کی دہشت پھیلائی تھی۔ اس کا اندازہ ایک ہمعصر
واقعہ نگار میتھیو پیرس[3] کے بیان سے ہوتا ہے۔ وہ سینٹ البانز[4] میں
بیٹھا سنہ ۱۲۳۸ء کے حالات میں گوتھ لینڈ[5] اور فریس لینڈ[6] کے مچھیروں کی
خوفزدگی کا عالم لکھتا ہے کہ تاتاریوں کے ڈر سے انہیں ہمت نہ پڑتی
تھی کہ بحرِ شمالی کو عبور کریں اور یارمتھ[7] کے مقام پر مچھلی کے شکار میں
حصہ لیں۔ چنانچہ اس سال انگلستان میں اس مچھلی کی افراط کی یہ کیفیت
ہوئی کہ ساحل سے دور دور مقامات پر بھی ایک چاندی کے سکے میں

---

[1] Liegnitz سائلیشیا کا ایک شہر؛ (مترجم)

[2] Henry the Pious, Duke of Silesia؛ [3] Matthew Paris

[4] لندن سے اکیس میل کے فاصلے پر دریائے وِر Ver کے کنارے ہرٹفورڈ شائر Hertfordshire کا ایک تجارتی شہر؛ [5] Gothland بحیرۂ بالٹک میں سویڈن کے جنوب مشرقی ساحل سے ساٹھ میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ (مترجم)؛

[6] Friesland شمالی ہالینڈ کا ایک صوبہ (مترجم)؛ [7] Yarmouth انگلستان کے مشرقی ساحل پر نورفوک Norfolk کی ایک بندرگاہ اور تجارتی شہر (مترجم)؛

چالیس پچاس مل جاتی تھیں۔ اسی سال اسمٰعیلیوں یا حشیشیّینِ اَلموُت[1] کا ایک سفیر بحرِ خضر کے راستے فرانس اور انگلستان اس غرض سے آیا کہ ان خوفناک دُشمنوں کے خلاف مدد کی التجا کرے جن کے ہاتھوں بیس برس بعد اسمٰعیلیوں کی کامل تباہی عمل میں آئی۔ لیکن اس ایلچی کی چنداں ہمت افزائی نہ ہوئی کیونکہ ونچسٹر کے لاٹ پادری نے اُس کی التجا سُن کر کہا۔ "اچھا ہے یہ کُتے ایک دُوسرے کو پھاڑ کھائیں اور صفحۂ ہستی سے یکسر مٹ جائیں۔ پھر ہم دکھا دینگے کہ کیونکر ہم ان کے کھنڈروں پر ایک عالمگیر کیتھولک کلیسا کی بُنیاد رکھتے ہیں۔ پھر صحیح معنوں میں ایک ہی چوپان ہوگا اور ایک ہی گلہ"۔

میتھیو پیرس کا قول مغولی حملے کی جو روئداد یں ابن الاثیر، یاقوت اور دوسرے ہمعصر مسلمان مؤرخوں نے پیش کی ہیں انکو ہم جزواً اس کتاب کی ایک سابق جلد میں پیش کر آئے ہیں[2] یہاں انکے دُہرانے

---

[1] عربی میں "حشیش" بھنگ کو کہتے ہیں، لہذا "حشیشین" کا لفظی ترجمہ "بھنگی" ہونا چاہئے اس سے مراد فرقۂ اسمٰعیلیہ کے وہ لوگ ہیں جو بھنگ کا استعمال کرتے تھے (جیسے سکھوں کا نہنگ اکالی فرقہ)، یہ لوگ سیاسی یا مذہبی مخالفتوں کی بنا پر لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ایران و شام میں ان لوگوں نے بہت دہشت پھیلا رکھی تھی۔ یورپین زبانوں میں لفظ اسیسن (بہ معنئ قاتل) دراصل حشیشین ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (مترجم)

[2] ایران کی ادبی تاریخ جلد دوم صہ ۴۲۶ بعد؛

کی ضرورت نہیں، البتہ میتھیو پیرس[1] نے ہولناک تاتاریوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے ان کا مقابلہ مفیدِ مطلب ہوگا۔ یہ لوگ ان اسباب کی بنا پر جو اُس نے بتائے ہیں ایک مقبولِ عام اشتقاق کی رو سے یورپ میں 'ٹارٹار' کہلائے جو اُنہیں جہنمی طبقوں سے نسبت دلاتا ہے۔ ۱۲۴۰ء کے تحت میں وہ اُن کے بارے میں بارے میں یوں رقمطراز ہے[2]:

فغان و فریاد کے بغیر بنی نوع فانی کی مسرتیں قائم اور دُنیوی خوشیاں دائم نہیں رہتیں، اسی برس شیطان کی ایک نفرت انگیز قوم یعنی تاتاریوں کا ایک لاتعداد لشکر اپنے کوہستانی نشیمن سے چھوٹ کر کوہ قفقاز کی ٹھوس چٹانوں کو چیرتا ہؤا ایسے نمودار ہؤا جیسے ٹارٹارس (جہنم) سے بھتنوں کی فوج، اسی لئے بجاطور پر ان کو 'ٹارٹار' یا 'ٹارٹاری' کہا جاتا ہے جھُنڈ کے جھُنڈ اس قوم کے ٹڈی دل کی طرح رُوئے زمین پر چھاگئے۔ اور یورپ کے مشرقی حصّوں میں خوفناک تباہی مچادی۔ آتش زنی اور خونریزی سے انہیں ویرانہ کردیا۔ ممالکِ اسلامیہ سے گزرنے کے بعد شہروں کے شہر مسمار

---

[2] جلد چہارم ص ۷۸-۷۶ بحوالہ جلد چہارم (لندن ۱۹۰۰ء) سلسلۂ دوم مطبوعات ہیکلوئیٹ سوسائٹی Hakluyt Society Publications

[1] Matthew Paris

کر دئے۔ جنگلوں کے جنگل چھانٹ ڈالے۔ قلعوں کو منہدم کردیا۔ انگور کی بیلوں کو اُکھاڑ پھینکا۔ باغوں کو برباد کردیا۔ شہریوں اور کسانوں کا قتلِ عام کیا۔ اگر اتّفاق سے کہیں ملتجیان رحم کی جان بخشی کی گئی تو اُنہیں غلامی کی پست ترین حالت میں لا گرایا اور انہی کے ہمسایوں کے خلاف صفِ اوّل میں لڑنے پر مجبور کیا۔ جنہوں نے لڑنے میں ریاکاری سے کام لیا یا جان بچانے کے لئے چُھپ رہے اُن کا پیچھا کرکے اُنہیں ذبح کر ڈالا۔ اگر کسی نے اُن کی ہمراہی میں دادِ شجاعت دی تو بھی احسانمندی اور انعام سے محروم رہا۔ انہوں نے قیدیوں کا ویسا ہی بُرا استعمال کیا جیسا اپنے گھوڑوں کا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ سنگدل اور وحشی ہیں۔ انسان کیا ہیں عفریت ہیں، خُون کے پیاسے ہیں اور خُون پیتے ہیں۔ کُتّوں اور آدمیوں کا گوشت چیر پھاڑ کر نگل جاتے ہیں۔ بیل کی کھال سے تن ڈھانکتے ہیں۔ آہنی ڈھالوں سے مسلّح ہوتے ہیں۔ پست قد مضبوط اور خوب گٹھے ہوئے ہیں۔ جفاکش۔ اجیت اور ان تھک ہیں۔ ان کی پُشت غیر مسلّح ہوتی ہے۔ سینے پر زرہ ہوتی ہے۔ خوب مزے لے لیکر اپنے مویشیوں کا خالص خُون پیتے ہیں۔ ان میں ان کے دیو ہیکل گھوڑے ہیں جو ٹہنیاں بلکہ درخت تک کھا جاتے ہیں۔ ان پر سوار ہونے

کے لئے ان لوگوں کو تین سیڑھیوں کا زینہ لگانا پڑتا ہے کیونکہ اُن کی رانیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ انسانی قوانین سے یہ لوگ آزاد ہیں۔ آرام و آسائش سے نا آشنا ہیں شیروں یا ریچھوں سے بڑھ کر خونخوار ہیں۔ اپنی کشتیاں بیل کی کھال سے بناتے ہیں۔ ہر کشتی دس بارہ آدمیوں کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔ وہ پیراکی اور کشتی کھینے کے ایسے ماہر ہیں کہ بڑے سے بڑے اور تیز سے تیز دریا کو بلا روک ٹوک پار کر جاتے ہیں۔ اگر پینے کو خون نہ ملے تو گدلا اور کیچڑ ملا پانی پی جاتے ہیں۔ اُن کے پاس تلواریں اور خنجر ہوتے ہیں جن کی ایک ہی دھار ہوتی ہے۔ غضب کے تیرانداز ہیں قتل کے وقت وہ چھوٹے بڑے اور مرد عورت کی تمیز اور کسی حالت کا پاس نہیں کرتے۔ اپنی زبان کے سوا کوئی اَور زبان نہیں جانتے۔ نہ کوئی دوسرا اُن کی زبان جانتا ہے۔ کیونکہ اب تک کسی کو اُن تک رسائی نصیب نہیں ہوئی اور نہ وُہ خود ملک سے باہر نکلے ہیں۔ اسی سبب سے اُن کی رسُوم اور اشخاص کے بارے میں وہ اطلاعات حاصل نہیں ہو سکیں جو لوگوں کے باہمی میل جول سے ہُوا کرتی ہیں۔ وہ مویشیوں کے گلّوں کو لئے اپنی عورتوں کو مردانہ وار لڑنا سکھاتے ہیں۔ ان صفات کے ساتھ یہ لوگ لُوٹ مار اور قتل و غارت کرتے

ایک زمانے کو دہشت زدہ اور مبہوت کرتے سرعتِ برق کیساتھ عیسائی دُنیا پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اہلِ اسلام یورپ سے اتحاد کے متمنی ہوئے۔ کہ متحدہ طاقت سے ان دیو خلقت انسانوں کی روک تھام کرسکیں"۔

مغولی پایۂ تخت میں ابتدائی یورپی سفارتوں کا وُرود

ایسا اتحاد تو کیا ہوتا ہاں البتہ مسیحی دُنیا کے مذہبی اور مُلکی حکمرانوں کو یہ سُوجھی کہ تاتاریوں کو اسلام کے کچلنے کا آلۂ کار بنائیں اور اس طرح اس دیرینہ کشمکش کا فیصلہ ہمیشہ کیلئے اپنے حق میں کرالیں جس نے صلیبی جنگوں کی صورت میں ظہور کیا تھا۔ اِدھر مغربی یورپ اور اُدھر تاتاریوں کے دُور دراز اور ناخوشگوار پایۂ تخت قراقرم کے درمیان آمدورفت کا دروازہ کھُلا، مکاتبات اور مراسلات جاری ہوئے۔ جون آف پیان دو کارپین[1] اور ولیم آف روبرک[2] جیسے جان نثار فرائر[3] طویل اُکتا دینے والے راستے کے مصائب اور خطرات، تاتاریوں کے تکبر اور جبری مطالبات کے مقابلے پر ڈٹے رہے کہ سفارت کے اس فرض کو جو انہیں سونپا گیا تھا ادا کریں۔ اوّل الذکر پاپائے رُوم کا ایک خط مورخہ ۹ مارچ

لہ John of Pian de Carpine

لہ William of Rubruck

لہ Friar ایک خاص فرقے کے عیسائی درویش؛ (مترجم)

۱۲۴۵ء لیکر چلا تھا۔ ۱۲۴۷ء کے موسم خزاں میں لیونز[1] واپس پہنچا اور دو برس غیر حاضر رہ کر مغول شہنشاہ کیوک خان کا تحریری جواب اس نے پاپائے رُوم کو لاکر دیا۔ دُوسرے نے اپنا سفر ۱۲۵۳ء اور ۱۲۵۵ء کے دوران میں پُورا کیا۔ اور تقریباً آٹھ مہینے (جنوری تا اگست ۱۲۵۴ء) منگو خاں کی چھاؤنی اور پایۂ تخت میں بسر کیے۔ منگو خان نے متعدد بار اسے دربار میں باریاب کیا۔ دونوں سفیر اپنی مہموں اور کٹھن مسافتوں کی داستانیں چھوڑ مرے ہیں۔ ہیکلوئیٹ سوسائٹی نے دونوں چھپوا کر انگریزی خوانوں کے لئے سہل الحصول بنا دی ہیں[2]۔ ان دونوں میں فرائر ولیم کا تذکرہ بالخصوص جاذبِ توجہ ہے اور خاص وقعت رکھتا ہے۔ اسے پڑھ کر تاتاری دربار، اس کے رسوم و آداب، ان تحائف کی شان و شوکت جو غیر ملکی لوگوں اور محکوم قوموں کے بہت سے سفیر لا لاکر پیش کرتے تھے۔ اُن کی بسیار خواری اور بلا نوشی (جو ڈیڑھ سَو برس آگے چل کر ہم تیموری دربار میں بھی خصوصیت سے پاتے ہیں)، غیر قوموں کا غیر معمولی تانتا جن میں تقریباً جملہ ایشیائی اقوام کے علاوہ روس، گرجستان، ہنگری، روتھینیا[3] اور فرانس کے لوگ بھی شامل تھے۔ غرض ان تمام چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے

---

[1] Lyons فرانس کے وسط میں ایک شہر؛ (مترجم)

[2] سلسلہ دوم جلد چہارم (لندن ۱۹۰۰ء) مترجمہ و مرتبہ ڈبلیو ڈبلیو روک ہل (W. W. Rockhill)؛

[3] Ruthenia موجودہ چیکوسلوویکیا کا ایک ضلع ہے؛ (مترجم)

سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ ان غیر ملکی زائرین میں بعض نے دس دس بیس بیس بلکہ تیس تیس برس تاتاریوں میں رہ کر گزارے انکی بول چال میں مہارت پیدا کی۔ یہ لوگ بلا حیل و حجت مبلغوں کو مفصل حالات بتانے اور اُن کی ترجمانی کرنے کو تیار تھے۔ اور اس کی صلاحیت رکھتے تھے جب پاپائے رُوم کے خط کا جواب لکھا جانے لگا تو زبان کے مسئلے پر کچھ مشکلات پیش آئیں۔ تاتاریوں نے پُوچھا "کیا لاٹ پادری کے پاس کوئی ایسے آدمی ہیں جو روتھینیا والوں کی مسلمانوں کی یا تاتاریوں کی زبان جانتے ہوں"۔ فرائر جون نے صلاح دی کہ خط تاتاری زبان ہی میں لکھا جائے اور نہایت احتیاط سے اس کا ترجمہ اور تشریح کر دی جائے۔ تاکہ وہ لاطینی میں ترجمہ کر کے اصل خط کیساتھ واپس لے جائیں۔ مغول شہنشاہ نے چاہا کہ فرائر جون کے ہمراہ اپنے ایلچی کو یورپ بھیجے۔ جون نے اس تجویز کو پانچ وجوہات کی بنا پر نا پسند کیا ان میں پہلی تین حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اسے اندیشہ ہُوا مبادا عیسائیوں کے باہمی تنازعات اور فساد کو دیکھ کر تاتاریوں کو ان پر حملہ کرنے کی مزید جرأت ہو۔

۲۔ ممکن ہے وُہ جاسوسی کریں۔

لہ ایم لیو کاہاں M. Leon Cahun نے اپنی مقدمہ تاریخ ایشیا Inroduction a i'Histoire de l'Asie میں یہ نفیس قیاس ظاہر کیا ہے۔ کہ جرمن لفظ Dolmetsch ترکی مغولی لفظ تلماژ سے مستخرج ہے اور دونوں لفظوں کے معنی ترجمان کے ہیں ص ۲۵۳ حاشیہ ذیلی نمبر ۲۔

۳- ایسا نہ ہو کہ یورپ میں انکو کوئی گزند پہنچے- کیونکہ ہم لوگ بہت حد تک (متکبّر) اور جلد باز ہیں- اور تاتاریوں کا معمول ہے کہ اگر کوئی ان کے ایلچیوں کو مار ڈالے تو جب تک انتقام نہ لے لیں صُلح نہیں کرتے ؀

چنانچہ یہ فرائر واپسی سفر پر جب اپنے ہمراہیوں سمیت کیف[۱] پہنچے تو وہاں ان کو "یوں مُبارکباد دی گئی گویا مر کر جی اُٹھے ہیں- اسی جوش کیساتھ رُوس، پولینڈ اور بوہیمیا میں اُن کا خیر مقدم ہُوا"

یورپ کیساتھ تاتاریوں کے سفارتی تعلقات

تیرھویں اور چودھویں صدی میں یورپ اور تاتار کے درمیان جو سیاسی سفارتیں عمل میں آئیں اُنکی تاریخ آبیل ریموسا[۲] کے دو مُستند رسالوں میں بطریقِ احسن واضح کی گئی ہے یعنی فرمانروایانِ مسیحی (بالخصوص شاہانِ فرانس) اور شہنشاہانِ مغول کے سیاسی رشتوں کے "تذکرات[۳]" ان میں نو تاتاری مکتوبات

---

۱ Kieff ؛ ۲ Abel-Remusat .

۳ Memoires sur les Relations politiques des Princes Chretiens, et particuliarement les Rois de France, avec les Empereurs Mongols. کتبات و ادب کے دارالعلم شاہی کے تذکرات Memoires de l'Academie Royale des Inscriptions et Belles Lettres- میں ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۲ء میں شائع ہوئے ہیں، جلد ششم صفحہ ۳۹۶ اور جلد ہفتم صفحہ ۳۳۵؛

کی عکسی تصویریں دی ہیں اور اُن کا متن چھپی ہوئی صُورت میں بھی ساتھ دیا ہے۔ بعض کے ساتھ ان کا فرانسیسی ترجمہ بھی درج کیا ہے۔ یہ مکتوبات تاتاریوں کے ایلچی مُختلف زمانوں میں فرانسیسی دربار میں لیکر آئے۔ اصل خطوط آج بھی پیرس کے مجموعہ ہائے سندات میں محفوظ ہیں۔ ان میں بعض کے کاغذ چھ چھ فٹ لمبے ہیں۔ ان میں لہجے کا غرور و تحکّم واضح نظر آتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ چونکانے والا ایک وہم انگیز جملہ باچو نویان کے ایک خط کے لاطینی ترجمے میں آیا ہے جو اُس نے پوپ کو لکھا تھا۔ ہمعصر ایرانی مؤرّخ جوینی بھی اس جملے کی طرف متوجّہ ہوا ہے "اگر تم اپنی بحری اور برّی عملداری اور اپنے ورثے کی سلامتی چاہتے ہو تو اے پوپ! یہ ضروری ہے کہ تُم بذاتِ خود ہمارے پاس آؤ۔ یعنی اُس کے پاس جو کُل رُوئے زمین کا حاکم ہے۔ اور اگر تُم خدا کے اور پھر اُسکے جو کل روئے زمین کا حاکم ہے اٹل حکم پر کان نہیں دھرتے تو جو کچھ اسکا نتیجہ ہوگا ہم نہیں جانتے خدا جانتا ہے"[1]

چنانچہ جوینی لکھتا[2] ہے کہ یہ لوگ جب تسلیم و اطاعت کا مطالبہ کرتے تو دُوسرے جابر سلاطین و فاتحین کی طرح کبھی شدید اور طویل الفاظ میں دھمکی نہ دیتے بس ان کی آخری تنبیہہ اسی قدر ہوتی تھی۔

---

[1] مذکورہ بالا تذکرات میں سے دُوسرا دیکھئے۔ ص ۲-۲۱-۴ ؛

[2] تاریخ جہانگشا (سلسلہ یادگار گِب E. J. W. Gibb Memorial Series جلد سولہ مطبوعہ ۱۹۱۲ء) جلد اوّل ص۱۷ س ۱۱ ؛

"اگر ایل و منقاد نشوند ما آنرا چه دانیم خدای قدیم داند"

(اگر وہ مطیع نہیں ہوتے تو ہم کیا جانیں (کہ کیا ہو) خدائے قدیم جانتا ہے)[1]

اب یہ پُوچھئے کہ تاتاریوں کا مقابلہ کرتے ہیں (یا اکثر جیسا ہوتا تھا مقابلہ نہ بھی کیا جائے تو) کیا کچھ گزرتی تھی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ بہت جلد بد نصیبوں کی حالت بیم و اُمید کا فیصلہ کر دیا جاتا تھا "جہاں کسی مقامی حُکمران یا والیِ شہر نے مزاحمت کی جرأت کی اُنہوں نے اس کے خاندان، خویش و بیگانہ سب کو اس درجہ فنا کیا۔ کہ بلا مبالغہ جہاں ایک لاکھ نفوس تھے وہاں ایک سَو بھی نہ رہے اس بیان کا ثبوت مختلف شہروں کی روئداد ہے جن میں ہر ایک کا ذکر ہم نے اُسکے مناسب وقت اور مقام پر کیا ہے"۔

تاتاری سفیر ۱۳۰۷ء میں نارتھیمپٹن میں ایڈورڈ دوم سے ملتے ہیں

میں کہہ نہیں سکتا کہ انگلستان کی تاریخی دستاویزوں میں ایسے خطوط موجود ہیں یا نہیں۔ لیکن اس قدر معلوم ہے کہ ایڈورڈ اوّل (جسے یہ خط بھیجے گئے) کی وفات کے کچھ عرصہ بعد دو تاتاری سفیر نارتھیمپٹن آئے۔ اُنکے نام ملخ اور تومان[2] دئے گئے ہیں۔ ایڈورڈ دوم سے

---

[1] جوینی، تصنیف مذکور ص۱۷۱؛

[2] دوسری جگہوں پر اس کا نام ٹامس الداچی، یا یُولدوچی، دیا گیا ہے۔

ایک جواب (بزبانِ لاطینی) مؤرخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۳۰۷ء لیکر یہ واپس روانہ ہوئے۔ اس سفارت اور سابقہ سفارتوں کا بڑا مدعا یہ تھا کہ تاتاری اور یورپین اقوام کے درمیان مسلمانوں اور خصوصاً مصریوں کے خلاف اتحاد قائم کیا جائے۔ اس غرض و غایت کیلئے عیّار تاتاری ہمیشہ یہ ظاہر کرتے رہے کہ وہ عیسائیت قبول کیا ہی چاہتے ہیں۔ یہ محض فریب تھا جو خاص حالات میں اَور بھی آسانی سے کارگر ہوگیا۔ وہ یوں کہ یورپ میں یہ عقیدہ عام تھا کہ وسطی یا

پریسٹر جون مشرقی ایشیا میں ایک عیسائی شہنشاہِ عظیم "پریسٹر جون[1]" موجود ہے۔ عموماً اسے انگ خان فرمانروائے قوم کریت یا (کرائت) قرار دیا جاتا[2] ہے۔ قوم کریت تاتاریوں کی ایک ہم نسل قوم تھی۔ اپنے دورِ عروج کے ابتدائی ایام میں چنگیز خان کے ان سے گہرے تعلّقات تھے اور انہیں نسطوری[3] مبلّغوں نے عیسائی بنا لیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایڈورڈ دوم کے دربار میں مذکورہ بالا سفیروں کے باریاب ہونے سے کم از کم دس سال پہلے تاتاری

---

[1] Prester John [2] ابو الفرج بار ہیبریس نے وضاحت کیساتھ یہ تعیین کی ہے (طبع بیروت ۱۸۹۰ء، ص ۳۹۴) نیز دیکھو دوسّوں کی تاریخ مغول، ص ۹-۴۸ و ص ۳-۵۲ مع حواشی ذیلی، عوام کی لغات ہیں اُونگ خاں یا اَونگ خاں بدکر یوخنان = جوہان ہوگیا؛

[3] Nestorian، نسطور Nestorius) کے پیرو، نسطور ۴۲۸ء میں قسطنطنیہ کا بطریق تھا۔ (مترجم)؛

حکمرانوں کا سرکاری مذہب اسلام ہو چکا تھا۔

تاریخِ مغول کے مآخذ کی عمدگی اور بہتات

تا تاریوں کی معاصر مشرقی تاریخیں مکمل اور عمدہ ہیں[1]۔ ان میں ابن الاثیر کی زبردست تاریخ ہے۔ اس میں ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) تک کے حالات ہیں۔ شہاب الدین نسائی کی تالیف یعنی اپنے آقا جلال الدین منکوبرنی کی سوانحعمری؛ جلال الدین خوارزم کا ایک منچلا بادشاہ ہے۔ اس نے اپنے خاندان اور سلطنت کو تباہ کرنے والوں کے خلاف طویل اور اولوالعزمانہ جدّوجہد جاری رکھی؛ عیسائی مؤرّخ ابوالفرج بارہیبریس کی تاریخ (بزبان عربی)، اس میں ۶۸۳ھ (۱۲۸۴ء) تک کے واقعات ہیں یعنی مصنّف کی وفات سے دو برس پہلے تک۔ اس نے زیادہ مکمل وقائع سریانی میں لکھے ہیں؛ پھر مشہور جُغرافیہ دان یاقوت کی تصنیف۔ ان تمام کتابوں کی بحث اور حوالے کتاب ہٰذا کی ایک سابق جلد میں آچکے ہیں۔ فارسی کے تین چیدہ مآخذ جوینی کی تاریخ جہانگشا، تاریخ وصاف اور جامع التواریخ کے متعلق اگلے باب میں گفتگو ہو گی۔ لیکن یہ افسوس کا مقام ہے کہ ان میں آخری یعنی جامع التواریخ جو فارسی زبان کی نہایت اچھوتی جامع اور گراں قدر تاریخوں میں سے ہے تا حال غیر مطبوع ہے

---

[1] دوستوں نے بطریق احسن انہیں شمار کیا ہے۔ اور ان کی کیفیت لکھی ہے، تصنیفِ مذکور جلد اول صح تا صس و

اور علماء کیلئے تقریبًا ناقابلِ رسائی ہے۔

تاتاریوں کی تین مشہور ترین یورپین تاریخوں اور ان میں ہر ایک کے پیش کردہ نقطۂ نظر کا کچھ نہ کچھ ذکر یہاں لازمی ہے :-

مغولوں کے یورپی مؤرخین (۱) دوسّون

اوّلاً بیرن دوسّوں کی قابلِ قدر کتاب "تاریخِ مغول از ابتدائے عہد چنگیز خان تا عہدِ تیمور بے یا تیمور لنگ" ہے۔ اِس کتاب کی سُلجھی ہوئی تحریریں متبحّرانہ تحقیق پر مبنی ہیں۔ جیسا کہ اس مضمون کے ہر مطالعہ کرنے والے کے لئے لازم ہے۔ دوسّوں نے تاتاری فتوحات کے بے پایاں اور دور رس اثرات کا اعتراف کیا ہے۔ اور وہ اُن لوگوں کو بیحد قابلِ نفرت پاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "اُن کی حکومت سیہ کاری کے غلبے کا نام تھا۔ ہر وہ چیز جو شریفانہ اور قابلِ احترام تھی اُن کے ہاں ذلیل سمجھی گئی۔ پرلے درجے کے

۱؎ اس اہم تصنیف کا ایک مکمّل متن مرتّب کرنے کے لئے جو مواد دستیاب ہیں اُن پر میں نے ایک مقالے میں بحث کی ہے (مجلّۂ انجمنِ ہمایونی ایشیائی بابت ۱۹۰۸ء جلد چالیس صفحہ ۱۷-۳۷) اسکا عنوان یہ ہے: "رشید الدین فضل اللہ کی جامع التّواریخ کی ایک مکمّل اشاعت کی تجویزیں"۔

۲؎ Histoire des Mongols, depuis Tchinguiz Khan jusqu'a Timour Bey ou Temerlan جلدوں میں ہیگ Hague اور Amsterdam سے شائع ہوئی ہے ۱۸۳۴-۵ء۔

بد وضع اور مُفسد لوگ جو ان خُونخوار آقاؤں کے خدمتگزار تھے اپنی ذلیل جاں نثاری کے عوض دولت، اعزاز و اکرام اور اپنے ہموطنوں پر مظالم ڈھانے کی قوت حاصل کرتے تھے۔ غرض تاتاریوں کی تاریخ جس پر وحشی پن کی مُہر لگی ہوئی ہے ہمارے سامنے صرف خوفناک مناظر پیش کرتی ہے۔ لیکن چونکہ متعدد سلطنتوں کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے تیرھویں اور چودھویں صدی کے واقعات کو ٹھیک طور پر سمجھنے کیلئے اس کا مطالعہ لابدی ہے[1]"۔

(۲) سر ہنری ہووَرتھ زمانوی اعتبار سے دُوسری کتاب سر ہنری ہوورتھ کی زبردست "تاریخِ مغول" ہے۔ یہ چار ضخیم جلدوں میں ہے[2]۔ تاتاریوں کے بارے میں اس کا نظریہ دوستوں سے کسی قدر مُختلف ہے۔ اسکو تاتاری ان سخت جان اور جفاکش قوموں میں سے نظر آتے ہیں جنھوں نے سخت افلاس اور کڑے حالات کے گہوارے میں پرورش پائی ہے۔ اُن کے خون میں فولاد کی آمیزش ہے۔ ایسی قومیں دُنیا میں وقتاً فوقتاً اس لئے بھیجی جاتی ہیں کہ مالدار اور تعیش پسند لوگوں کو تباہ کریں۔ ان فنون اور آداب

---

[1] تصنیف مذکور جلد اوّل صفحہ ۲ تا ۳؛ [2] Sir Henry Howoth؛

[3] History of the Mongols ، ۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۸ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔ تین حصّوں میں تقسیم ہے۔ حصّہ دوم دوسری اور تیسری جلدوں پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصّہ (جلد چہارم) ایران کے مغولوں سے متعلق ہے۔

کو جو دولت اور آسودگی کے سائے میں پروان چڑھتے ہیں خاک میں ملائیں اور اس فردوس کو جسے انسان نے انتہائی جانفشانی سے سینچا ہے ویرانے میں تبدیل کر دیں۔ دستِ قدرت نے وبا اور قحط کیطرح تاتاریوں کو بھی لازماً تباہی اور بربادی کا آلہ بنایا تھا۔ ان کی سرگذشت کا مطالعہ اگرچہ ایک عذاب خیز اور تکلیف دہ کام ہے۔ تاہم انسانی ترقی کی رفتار کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے"[1]۔ چند ایسی دوسری عیاش اور مہذّب قوموں کا شمار کرتے ہوئے جن کی اصلاح اسی قسم کے شدید ذرائع سے ہوئی وُہ لکھتا ہے کہ تاتاریوں کے مفتوحین کے معاملے میں بڑی حد تک یہی کچھ ہُوا۔ اُن کی اقبالمندی کھوکھلی اور نمائشی تھی۔ اُن کی شان وشوکت بُہت حد تک محض ظاہری چمک دمک تھی۔ اور اُن کے بیمار جسم کے لئے ایسی ہی تیز دوا کی ضرورت تھی۔ اور مرگی کا وُہ روگ جو لگتا نظر آ رہا تھا ڈھیر سا خون بہانے ہی سے ٹالا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ضرورت تھی کہ ان بستیوں کی اخلاقی زمین میں جو شورزار بن چکی تھی نئے سرے سے کھاد ڈالی جائے۔ اور ان کے باشندوں میں صحرا کے تازہ مصفا اور قوی خون کی لہر دوڑائی جائے[2]"۔ اس سے زیادہ انصاف سے کام لیتے ہوئے وُہ مشرق اور مغرب کی انتہائی متباین اقوام کے حیرت انگیز ملاپ پر زور دیتا ہے۔ یہی اُس کے نزدیک تاتاری حملے کا سب سے بڑا تعمیری اثر

---

[1] تصنیف مذکور، حصہ اول صہ ؛ [2] ایضاً صہ ۱۱ ؛

ہے۔ آخر میں وہ لکھتا ہے۔ خود مجھ کو یہ ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ فنِ طباعت، جہازران کی کمپاس، بارودی اسلحہ اور معاشرت کی کئی تفصیلی خصوصیات یورپ کے انکشافات نہیں ہیں بلکہ یہ سب مشرقِ اقصیٰ سے تاتاری اثر کے ذریعے داخل ہوئیں"۔

(۳) **لیوں کاہاں** | تیسری کتاب جو تذکرے کی مقتضی ہے لیوں کاہاں کی "مقدمۂ تاریخ ایشیا: ترک و مغول، از آغاز تا ۱۴۰۵ء"[1] ہے۔ بالخصوص اسلئے کہ اس کا اثر ٹرکی میں یعنی تورانی یا ہمہ تورانی تحریک کی پیدائش کا باعث ہُوا جس کی سیاسی اہمیت کا پورا پورا اندازہ ابھی نہیں لگایا جاسکتا۔ خود تاتاریوں کی تعریف میں اور ان ہم نسل ترکی اقوام کی تعریف میں جو ان کی فوج کا بڑا جزو تھیں، یہ مصنف ہوورتھ سے بھی بڑھ گیا ہے[2]، ان کے فوجی محاسن[3]، اپنے "جھنڈے کی پرستش، نام "ترک" اور اسکے بعد "منگول" کی تعظیم و تقدیس غرض ان کی جنگجویانہ وطن پرستی"[4] ساسانی ایرانیوں کے خلاف ان کے سیاسی اتحادات[5] اور بعد میں اسلامی اثرات کے خلاف جن کا مرکز ایران تھا، ان کی جانبازی، جفاکشی، ضبط و اصول، مہمان نوازی

[1] Introduction a l'Histoire de l'Asie : Turcs et Mongols, des Origines 1905. پیرس ۱۸۹۶ء؛

[2] تصنیف مذکور صفحہ ط؛ [3] ایضاً ص ۷۹؛

[4] ایضاً ص ۱۱۸-۱۱۱؛

مذہبی تعصبات سے معرّیٰ ہونا، ان کا قوی نظامِ حکومت، ان سب چیزوں کے بیان میں اس مصنّف کے ہاں تحسین کی ایک نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ بے ربط اور طُولانی ہے تاہم معنی خیز ضرور ہے۔ اور بہر حال پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے کہ ٹرکی کے بعض شدید وطن پرست حلقوں میں اس نے اپنا اثر ڈالا ہے۔ تاتاریوں سے متعلق اسی مصنّف کا ایک تاریخی رومان بھی انہی صفات کا حامل ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ "دی بلو بینر" (عَلَمِ ازرق)[1] کے عنوان سے ہوا ہے۔ جدید تورانی تحریک کا مختصراً میں ایک جگہ تذکرہ

"دینی توران" یا جدید تورانی تحریک

کر چکا ہوں[2]۔ یہاں موقع نہیں کہ اس پر زیادہ مفصّل بحث کی جائے۔ اگرچہ جتنا میں اس وقت سمجھا تھا۔ اس سے غالبًا اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ ادبی پہلو پر اس تحریک کا نصب العین یہ ہے کہ ترکی الفاظ، محاورات اور اظہارِ خیال کے ذرائع کو عربی اور فارسی کی ان چیزوں پر ترجیح دیجائے اور عربی اور ایرانی اثرات اور روایات کے خلاف جہاد کیا جائے۔ سیاسی پہلو پر یہ تحریک یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ تمام ترکی اور اُن کی ہم نسل اقوام کو جو بحیرۂ خَزَر کے

---

[1] The Blue Banner ؛ [2] "ایران نو کا پریس اور اُس کی شاعری" The Press and Poetry of Modern Persia. صفحہ لطؔ، اس موضوع پر ایک دلچسپ مقالہ ۳، ۵، اور ۷، جنوری ۱۹۱۸ء کے ٹائمز (لندن کا اخبار) میں بھی چھپا تھا جو میرے خیال میں مسٹر آرنلڈ ٹوئن بی Mr. Arnold Toynbee نے لکھا تھا۔

شرق و غرب میں پھیلی ہوئی ہیں -) اور جن میں ایک طرف تاتاری اور دُوسری طرف بلغاری شامل ہیں) ایک ہی قلمرو کے ماتحت متحد کر دیا جائے - اور ایک عظیم تورانی یا تُرکی سلطنت کی بنا ڈالی جائے - جو وسعت میں کم و بیش چنگیز خان کی سلطنت کی مثیل ہو - اس دبستان کے خیالات کا بیشتر اظہار ایک پندرہ روزہ رسالے میں ہوتا تھا جس کا عنوان "تُرک یُرد" تھا - اس کا اجرا دسمبر ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا ॰

تاتاریوں کے عہد میں ایران کی حالت

تاتاری سلطنت سے ہمیں یہاں بحیثیت مجموعی کوئی واسطہ نہیں - ہمارا اصل سروکار تاتاریوں کے عہدِ حکومت کے ایران سے ہے - نہ ہمیں مغول ایلخانوں کی تاریخ تفصیل سے قلمبند کرنے کی ضرورت ہے جو ہلاکو کے جانشین ہوئے - اُن کی مکمل تاریخ دوسوں[1] اور ہوورتھ[2] کے اوراق میں پڑھی جا سکتی ہے - اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ ایران نے تاتاریوں کے ہاتھوں کیا کچھ سہا - یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد میں اچھا ادب کتنی مقدار میں پیدا ہوا - عام طور پر جنوبی ایران پر شمال مغربی اور وسطی

جنوبی ایران کا نسبتہً محفوظ رہنا

علاقوں کی نسبت اس آفت کا بہت کم اثر ہوا - کیونکہ یہ حصہ تاتاری فتوحات کی صدر گذرگاہ سے بہت ہٹ کر تھا - اصفہان

---

۱ d'Ohsson . ۲ Henry Howrth

پر ایک قتلِ عام نازل ہؤا۔ جس میں کم سے کم ایک مشہور شاعر تو مارا گیا۔ لیکن شیراز اپنے حاکم کی بروقت اور دانشمندانہ اطاعت کے سبب قریب قریب صحیح و سالم رہا۔ اس واقعے کی طرف شیخ سعدی اپنے مربّی کے ایک قصیدے میں نہایت لطیف پیرائے میں اشارہ کرتے ہیں۔ یہ قصیدہ اُنھوں نے بطور دیباچہ ملحق[لہ] کیا ہے ؎

سکندر بدیوار روئین و سنگ بکرد از جہان راہِ یاجوج تنگ

ترا سدِّ یاجوجِ کُفر از زر است نہ روئین چو دیوارِ اسکندر است

شارح کہتا ہے "یاجُوج کُفر سے مراد چنگیز خان ہے۔ اتابکِ فارس نے زر دیکر اس سے صُلح کرلی۔ اور یوں شیراز کے مسلمان اس جور و استبداد سے بچ گئے۔ شاعر یہ کہتے ہوئے اپنے ممدوح کو فضلیت دیتا ہے کہ سکندر نے تو یاجُوج کے اقدام کو کانسی کی دیوار سے روکا تھا۔ لیکن تُو نے 'یاجُوجِ کفر' کے حملے کو بزورِ زر روکا"۔

شیخ سعدی کے ان اشعار لکھنے سے پچیس برس پہلے شمس الدین محمد بن قیس رازی جب تاتاری یورش کے پہلے طُوفان سے جان بچاکر بھاگا ہے تو اسے شیراز ہی میں ایک گوشۂ پناہ نصیب ہُؤا۔ جہاں بیٹھ کر اس نے ایران کے فنِ شعر اور عروض پر اپنی وہ تصنیف

لہ دیکھو طبع گراف ص ۲۲ پر آخری سطر اور ص ۲۳ پر پہلی سطر، بوستان ۶۵۶ھ (۱۲۵۷ء) میں لکھی گئی یعنی گلستان سے ایک سال پہلے؛ ٢ دیکھو معجم فی معاییر اشعار العجم طبع میرزا محمد قزوینی (مطبوعہ "سلسلہ یادگار گب جلد دہم ۱۹۰۹ء) دیباچۂ انگریزی (صفحہ یۃ تا یحٓ)؛

جس میں خلل واقع ہو گیا تھا مکمل کی، اور معلوم ہوتا ہے کہ ان پُر آشوب ایام میں شیراز کی زندگی خاصی پُرسکون رہی۔ اور اسے نسبتاً بہت کم خلل سے دوچار ہونا پڑا ؀

بعض فروعِ علم کو دُوسرے علوم کی نسبت کم نقصان کیوں پہنچا

ایک اَور غور طلب امر یہ ہے۔ کہ ہر چند علماء کے بلا امتیاز قتلِ عام مسجدوں کُتب خانوں اور دُوسرے متقدس اداروں کی عام مسماری سے علم و فضل کو بہت ضرر پہنچا۔ تاہم علم کی بعض شاخوں کا دُوسری فروع کی نسبت بہت کم نقصان ہوا۔ مثلاً ان غیر مہذب تاتاریوں کو طبعاً دینیات اور فلسفے سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ لیکن طب علمِ نباتات علمِ ہیئت اور دُوسرے طبعی علوم کو اُنہوں نے بہت کچھ اہمیت دی۔ وہ خاص طور پر شائق تھے کہ اُنکے کارناموں کو اچھے مؤرخین صحیح اور مکمل طور پر ضبطِ تحریر میں لائیں۔ وہ شاعروں کی مدح سرائی سے بھی بالکل بے نیاز نہ تھے۔ جیسا کہ اگلے باب میں زیادہ تفصیل سے بتایا جائے گا۔ فارسی کی اوّل درجے کی تاریخیں اتنی تعداد میں اَور کسی عہد میں نہیں لکھی گئیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان کے مصنف لازماً وہ لوگ تھے۔ جن کی تعلیم کی بُنیاد تاتاری زمانے سے پہلے کی زیادہ عالمانہ روایات پر پڑی تھی۔ اور یہ کہ جوینی کی تاریخ جہانگشا، رشیدالدین فضل اللہ کی جامع التواریخ کی سی تاریخی تصانیف

بے مثل چیزیں تھیں - اور اُن کے پائے کو مابعد کی کوئی تصنیف نہیں پہنچتی - تاریخِ گزیدہ مؤخر الذکر کے مقابلے میں ایسی ہی کم پایہ ہے جیسی کہ وُہ میرِ خواند اور خواند میر کی تاریخوں سے برتر ہے - جن کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے - ان آخری دو تاریخوں پر اس کتاب کے آخری باب میں بحث ہوگی - مجموعی طور پر بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان نازک اور خوفناک حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جن میں سے ایران گزر رہا تھا اور جبکہ ملحد فرماں روا مُلک پر قابض ہو گئے تھے - اور پھر عیسائی اور یہودی اس میں مسلمانوں پر حکومت کرتے تھے ہمیں تاتاری اقتدار کا زمانہ ادبی مآثر سے حیرت انگیز طور پر مالا مال نظر آتا ہے - یعنی ہلاکو کی وفات (۸ / فروری ۱۲۶۵ء) سے لیکر آخری مغول ایلخان موسیٰ کی وفات تک کا عہد ؛

پیشتر اسکے کہ ہم ان کارناموں کا تفصیلی مطالعہ شروع کریں - اس عہد کی خارجی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ دینا ضروری ہے - اس دور کو غازان خان کے عہدِ حکومت نے تقریبًا دو برابر کے حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے - غازان اگرچہ پہلا مغول ایلخان نہیں تھا جس نے اسلام قبول کیا تاہم پہلا شخص تھا جس نے اسلام کی سیادت کو بحال کیا اور تاتاری الحاد سے خاکِ ایران کو پاک کیا ؛

(۱) اباقا (۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۲ء)

اباقا ۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۲ء ہلاکو کا پہلا جانشین اُس کا بیٹا اباقا (یا ابقا) تھا جس کی تاجپوشی ۱۹ جون ۱۲۶۵ء کو عمل میں آئی۔ یہ تاریخ مشہور منجم اور فلسفی نصیرالدّین طوسی نے ایک روزِ سعید کے طور پر انتخاب کی تھی۔ نصیرالدین کے شاندار علمی اور مُشتبہ سیاسی کارناموں پر اس کتاب کی ایک سابقہ جلد میں بحث کی جاچکی ہے[۱]۔ اب اس کی زندگی انجام کے قریب آرہی تھی۔ لیکن

نصیرالدّین طوسی کے آخری ایّام اور اس کی موت پانچ برس آگے چل کر یعنی ۶۶۹ھ (۱۲۷۰-۱ء) میں ہمیں پھر اس کا ذکر ملتا ہے جب وہ اباقا کے علاج کے لئے بلایا گیا ہے۔ اباقا کو شکارگاہ میں ایک جنگلی گائے نے سینگ مار کر زخمی کر دیا تھا۔ زخم پک کر پھوڑا بن گیا۔ ایلخان کے دُوسرے شاہی طبیبوں میں سے کسی کو اس پر جراحت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ نصیرالدّین نے کامیابی کے ساتھ یہ عمل کر دیا۔ اس سے اگلے ہی برس ۷۵ سال کی عُمر میں اُس نے رحلت کی۔ بارہیبریس نے اپنی مختصر الدول میں اس کا ایک مختصر مگر ستائش آمیز تذکرہ[۲] لکھا ہے۔ وُہ لکھتا ہے:" وُہ مراغہ

---

[۱] ایران کی ادبی تاریخ جلد دوم ص ۴۸۴-۴۸۶ وغیرہ۔ [۲] طبع بیروت ۱۸۹۰ء ص ۵۰۰

کی رصدگاہ کا نگراں تھا۔ اور فلسفے کے جملہ علوم پر وسیع عبور رکھتا تھا۔" آگے لکھا ہے "مغولی حکومت کے تمام ممالک میں جتنے اوقاف تھے۔ اُن سب کا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے منطقیات طبعیات۔ الہیات، اقلیدس اور مجسطی پر بہت سی تصانیف کیں۔ فارسی میں اخلاقیات پر اس کی ایک گراں قدر تصنیف[1] ہے جس میں اُس نے حکمتِ عملی (فلسفۂ عملی) پر افلاطون اور ارسطو کے تمام اقوال جمع کیے۔ متقدمین کی آرا پر مُہرِ تصدیق لگائی۔ متأخرین کے شکوک کو رفع کیا۔ اور ان کی ان نکتہ چینیوں کو رد کیا جو انہوں نے اپنی مصنفات میں پیش کی ہیں۔"

اباقا عیسائیوں پر مہربانی کرتا ہے

اباقا جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر اکتیس برس تھی۔ اس افواہ میں کچھ صداقت تھی یا نہیں کہ اپنی بیوی دسپینہ[2]

---

[1] یعنی مشہور کتاب اخلاق ناصری جو اس مضمون پر فارسی کی اُن تین کتابوں میں سے ہے جو آج بھی سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ دیکھو تاریخ ادبیات ایران جلد دوم ص ۲۲، ص ۴۵۶، ص ۴۸۵؛

[2] Despina عیسائی قبیلہ کرائت (یا کریت) سے تعلق رکھتی تھی اور اُنکے فرمانروا اُونگ یا ونگ خاں (زمانۂ وسطے کے افسانوی "پریسٹر جون" کے تاریخی اصل کی بڑ پوتی تھی)، بار ہیبریس اس کی وفات اندراج کرتے ہوئے لکھتا ہے: "کانت .... عظیمۃ فی رأیہا وخابر تہا (قوتِ رائے اور دانش میں بڑے پائے کی عورت تھی)۔ (تصنیف مذکور ص ۲۹۷)؛

(دختر میکائیل پیلیو لوگس[1]) کی خواہش پر واقعی اُس نے اصطباغ پاکر عیسائی مذہب اختیار کیا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ وُہ ہمیشہ عیسائیوں کی حمایت کرتا رہا اور بظاہر یقیناً اپنی تخت نشینی کے لئے انہی کے رسُوخ کا رہینِ منّت تھا۔ عیسائیوں کی یہ با اثر حمایت دوقوز خاتون کے وسیلے سے حاصل کی گئی تھی۔ یہ اُس کے باپ اور پیشرو ہلاکو کی بیوہ تھی۔ جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد تقریباً ایک سال زندہ رہی۔ اور اس نے اپنے ہم مذہبوں یعنی عیسائیوں کو دوست بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا۔ لیکن یہ اغلب ہے کہ پاپاؤں اور یورپ کے عیسائی بادشاہوں سے اباقا کے سفارتی تعلقات مذہبی اغراض سے نہیں بلکہ سیاسی اغراض کی بنا پر تھے۔ کلیمنٹ[2] چہارم اور اسکے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نے اباقا کو ۱۲۶۷ء میں وٹربو[3] سے ایک خط لکھا۔ گریگوری[4] دہم نے ۱۲۷۴ء میں ایک خط لکھا۔ اور نکولس[5] سوم نے ۱۲۷۸ء میں اس کے پاس اور اس کے فرمانروائے اعلیٰ قوبلائی (کبلا) خان کے پاس پانچ فرانسسکن[6] راہبوں

---

[1] Michæl Palæologus ؛ [2] Clement

[3] Viterbo رُوم کے شمال میں اٹلی کا ایک شہر؛ (مترجم)

[4] Gregory ؛ [5] Nicolas

[6] Franciscan Monks وہ راہب جن کا تعلق اس برادری سے ہوتا ہے فراردں کی چار شاخوں میں سے ایک شاخ ہے ۱۲۱۰ء میں سینٹ فرانسس باشندۂ اسیسی نے قائم کی تھی؛ (مترجم)

کا ایک وفد بھیجا۔ اباقا کی سفارتوں میں سے ایک انگلستان تک بھی جا پہنچی۔ اور بظاہر ایڈورڈ اوّل کے ہاں باریاب ہوئی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ اس سفارت کی تاریخی دستاویزیں نایاب یا معدوم ہیں[1]۔ اس تمام گفت وشنید کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ مصر اور شام کے مسلمانوں پر ایک متحدہ حملے کی تیاری کی جائے۔ وہ اب تک مغلوب نہ ہوئے تھے۔ اور تاتاریوں کے فطری اور جانی دُشمن تھے۔ عیسائیوں کو یہ تحریص دلائی گئی کہ وہ ارضِ مقدس (فلسطین) پر قابض ہو جائینگے۔ جس کیلئے وہ مدت سے جدّوجہد کرتے رہے تھے۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ اسلام کے پاس ایک سُورما فاتح موجود تھا۔ یعنی سلطان مملوک بیبرس الملقب بالملک الظاہر۔ یہ غازی اس دُہرے خطرے سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے جو اُس وقت اُس کے دین و مُلک کو دھمکا رہا تھا۔ تمام ضروری صفات سے متّصف تھا۔ اس سے پہلے بھی ۱۲۶۰ء میں جبکہ وہ بادشاہ منتخب نہ ہوا تھا۔ اُس نے ہلاکو کے مغلوں کو غزہ سے نکال باہر کیا تھا۔ اور عین جالوت کے

---

[1] دیکھو ہوورتھ۔ کتاب مذکور۔ جلد چہارم ص۲۷۸ تا ص۲۸۱، پورے مبحث کیلئے دیکھو آبیل ریموسا (Abel Remusat) کے تذکرات انجمنِ ہمایونی کتبات و ادب Mem. de l'Acad. Royale des Inscription et Belles Lettres۔ میں بلند پایہ مذکورات جلد ششم ص ۳۹۶ اور جلد ہفتم ص ۳۳۵

مقام پر اُن کو شکست فاش دی تھی۔ ادھر شام میں مسیحی مجاہدوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اور حشیشین کی شامی شاخ کی طاقت کو توڑ کر رکھدیا تھا۔ اپریل ۱۲۷۷ء[1] میں اُس نے اُبلستین کے مقام پر مغلوں کو ایک اَور زبردست شکست دی۔ تاتاریوں کے سات ہزار آدمی میدانِ جنگ میں کام آئے۔ اباقا جب بعد میں میدان جنگ کو دیکھنے آیا تو تاتاری مقتولوں کی تعداد سے یہاں تک متأثر ہوا کہ آبدیدہ ہو گیا۔ اس دَور میں مغول ایلخانوں اور ممالیکِ مصری کے درمیان برابر شدید نفرت کارفرما رہی۔ ایلخانوں کی رعیت میں کسی فرد کے خلاف اس سے زیادہ خطرناک اور مضرت رساں الزام نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ممالیک سے راہ و رابطہ رکھتا ہے۔ تاتاریوں کے ہر مُسلمان محکوم کو اِس قسم کے مہلک شبہات سے دُور رہنے کیلئے قدم بہت پھُونک پھُونک کر رکھنے پڑتے تھے۔ اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ان دنوں کسی حریفِ محسود کو تباہ کرنے کا مقبول ذریعہ یہ تھا کہ تاتاری حکومت کے سامنے اُسکو مصریوں کے ساتھ سازباز رکھنے کا مُجرم ٹھہرایا جائے ؂

جوینی خاندان | موجودہ نقطۂ نظر سے ہمیں تاتاری حکمرانوں

---

[1] دیکھو "ایران کی ادبی تاریخ، جلد دوم، ص ۴۴۶؛ لین پول (S. Lane-Poole) کی قابلِ تعریف مختصر "تاریخِ مصر" History of Egypt ص ۲۶۲ و ص ۲۷۰ اور ہوورتھ کی تصنیف مذکور ص ۲۵۷-۹؛

اور جرنیلوں سے اس قدر سروکار نہیں جتنا اُن ایرانی اہلکاروں سے ہے جنہیں تاتاریوں نے سرکاری ملازمت کے لئے ناگزیر پایا بعینہٖ جیسے سابق تر زمانے میں عربوں کو یہی صُورت پیش آئی تھی۔ ان میں غیر معمولی استعداد کے لوگ شامل تھے۔ ان سب میں نمایاں حیثیت جوینی خاندان کی تھی۔ خصوصاً شمس الدین محمد صاحبِ دیوان، اس کا بھائی علاء الدین عطا ملک اور بیٹا بہاء الدّین بہت ممتاز تھے صاحب دیوان کا دادا جس کا لقب شمس الدین ہی تھا۔ لیکن "بزرگ" اور "مُودراز" کے القاب سے مشہور ہوا قطب الدّین خوارزمشاہ کا وزیرِ اعظم رہا تھا اور اس کا والد بہاء الدّین "مستوفی الممالک" کے عُہدے پر فائز تھا۔ (جو تقریبًا چانسلر آف دی ایکس چیکر[1] کا جواب ہے۔ صاحبِ دیوان خود دس سال تک ہلاکو کا وزیرِ اعظم رہا اور اسکے بعد اباقا نے اُسکے اس عُہدے کو برقرار رکھا۔ اس کا بھائی علاؤ الدّین ایرانی مؤرّخوں کی صفِ اوّل کا رُکن ہونے کے سبب ہمارے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے اس حیثیّت سے ہم اس پر اگلے باب میں نظر ڈالیں گے۔ لیکن وُہ ایک اعلیٰ منتظم بھی تھا۔ اور چوبیس سال تک بغداد کا عامل رہا[2]۔ صاحبِ دیوان

---

[1] Chancellor of the Exhequer = وزیر خزانہ؛

[2] ہلاکو نے اسے ۶۵۷ھ (مطابق ۱۲۵۹ء) میں تاتاریوں کی فتح بغداد سے ایک سال بعد وہاں مقرر کیا تھا۔ دیکھو سلسلہ یادگار گب جلد ۱۶ (۱۹۱۲ء) یعنی تاریخ جہانگشا کی طبع میرزا محمد قزوینی کا مقدمہ صفحہ کح؛

کا بیٹا بہاء الدین عراقِ عجم اور فارس کا والی تھا۔ اور ایک دوسرا بیٹا شرف الدین ہارون شاعر تھا۔ اور شاعروں کا سرپرست تھا۔ اِس ہُنرمند خاندان کا ایک مفصّل اور محققانہ تذکرہ جو جامع بھی ہے اور دقیق بھی میرزا محمد قزوینی نے لکھا ہے۔ میرزا محمد اُن بہترین اور نہایت دقیقہ رس ایرانی فاضلوں میں سے ہیں جن سے مجھے ملنے کا موقع ملا۔ یہ تذکرہ اُنہوں نے تاریخ جہانگشا کے مقدمے میں پیش کیا ہے (جلد اوّل ص ۱۹ تا ص ۳۲) ناظرین مفصّل اطلاعات کیلئے اسے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ یہاں گنجائش کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسکا اعادہ ممکن نہیں۔ جوینی خاندان کے معاملے میں جب ہم کو علم و ادب کی دلدادگی، شاہانہ بخشش انتظامی قابلیت اور المناک انجام غرض سب چیزیں وہی نظر آتی ہیں تو ہمیں بے اختیار مدبّروں کا ایک اَور ایرانی خاندان یاد آ جاتا ہے یعنی "ہارون الرشید کے زرّیں عروج"[۲] کا مشہور برمکی خاندان۔ ان کا اثر و رسوخ وقیع اور وسیع تھا۔ ادب کیساتھ ان کا تعلّق کیا بلحاظ مصنّف ہونیکے اور کیا شعراء و علماء کے مربّی ہونیکے بہت گہرا تھا۔ اُنکے حریفوں کے حسد نے جن کو اُن جیسا عروج نصیب نہ تھا اُن کی زندگی تلخ کر دی۔ اور یہی اُن کی تباہی کا باعث ہُوا۔ اور جس نسبت سے

---

[۱] اسکا دیوان بہت نادر ہے لیکن برٹش میوزیم میں اسکا ایک نسخہ (مشرقی ۳۶۴۷) ہے۔ دیکھو ریو کا ضمیمہ فہرست کتب فارسی (Pers. Suppl. Cat، ۲۵۴، ص ۱۶۶-۷)؛ [۲] ملاحظہ ہو جہانگشا پر میرزا محمد کا مقدمہ ص ۴۲؛

اتنا عرصہ اُنکو اقتدار اور عالی مراتب حاصل رہے اُسی نسبت سے یہ تباہی دردناک تھی - مذکورہ بالا اشخاص میں پہلا وفات پانے والا جوان گنتی کے چند خوش نصیبوں میں سے ہے جو اپنی طبعی موت مرے بہاءالدین ہے

بہاءالدّین کی وفات اور اُس کے سیرت واخلاق

یہ صاحب دیوان کا فرزند اور عراقِ عجم کا والی تھا - اس کی وفات ۶۷۸ھ (۱۲۷۹ء) میں واقع ہوئی - وہ بے حد سخت گیر حاکم تھا - اُس نے اپنی رعیّت کے دِلوں میں انتہا درجے کی دہشت بٹھائی تھی - اُس کی سنگدلی کا یہ عالم تھا - کہ اُس نے اپنے خورد سال اور وُہ بھی منظورِ نظر بچّے کو صرف اتنی بات پر جلّاد سے مروا ڈالا - کہ اس نے کھیل کھیل میں اس کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی - مؤرّخ وصّاف اس کی سنگدلانہ سخت گیری کی کئی اَور مثالیں پیش کرتا ہے جن کا انتخاب آپکو ہوورتھ کی "تاریخ مغول" میں ملیگا لیکن ساتھ ہی اگر یہ بھی کہیں تو بجا ہوگا - کہ اس کی جابرانہ حکومت کے سائے تلے اس کی عملداری کے تمام علاقوں میں انتہائی امن و امان رہا - مزید برآں اُس نے شعراء فضلاء اور باکمالوں کے طبقے کی بڑی سرگرمی سے پرورش کی - اس کا باپ صاحبِ دیوان اشعارِ ذیل میں اس کی وفات کا ماتم کرتا ہے ؎

فرزندِ محمد ای فلک ہندوییت بازارِ زمانہ را بہایک مُوییت

لہ جزو ۳، صفحہ ۲۲۱۰۲ نیز تاریخِ وصّاف (بمبئی طبع سنگی) صفحہ ۶ بعد؛

تو پشتِ پدر بودی از آن پُشتِ پدرؔ خم گشت چو ابروی بُتان بی رویت

ہندو شاہ نے ذیل کے اشعار اس کی تاریخ وفات کی یادگار میں کہے ؎

چون شبِ شنبہ کہ بود از ماہِ شعبان ہفدہم
شش صد و ہفتاد و ہشت از ہجرہ اندر اصفہان
صاحب اعظم بہاء الدین کہ مثلش یادگار
در جہانبانی نبیند رفت بیرون از جہان

خاندانِ جوینی کی بدنصیبیاں یہ اُن بدبختیوں میں سے جو جوینیوں پر نازل ہوئیں پہلی بدبختی تھی۔

ان سب کا باعث ان کا احسان ناشناس متوسل مجد الملک یزدی تھا جس کی ہوس نے اسے صاحب دیوان اور اس کے بھائی علاء الدین عطا ملک کو بدنام کرنے پر کمربستہ کر دیا۔ ابھی وہ صاحب دیوان کا ماتحت تھا کہ اُس نے ذیل کی رُباعی میں اُس سے خطاب کیا ؎

گفتم کہ بخدمتِ تو جاوید شوم نی آنکہ چو سرو آیم و چون بید شوم[1]
نومید دلیر باشد و چیرہ زبان ای دوست چنان مکن کہ نومید شوم

مجد الملک کی سازشیں اباقا کے پاس صاحب دیوان کی بدگوئی کرکے اس نے بادشاہ کو

---

[1] میرے خیال میں بادشاہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ وزیر کا مستقل اور باعزت شریکِ کار رہنا چاہتا ہے۔ وہ سرزنش، اہانت یا معطلی کا سزاوار نہیں ہے کہ سرو کی طرح تنا ہؤا آئے اور دھتکار سُن کر بیدِ مجنوں کی طرح رُسوائی سے سر جھکائے وہاں سے نکلے ۔

اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ اسے اپنے حریف کیساتھ شریکِ حکومت کر دے۔ چنانچہ یہ دو عملی لا انتہا کشمکش اور باہمی الزامات کا سامان ہوئی۔ ایک موقع پر مجد الملک نے صاحب دیوان کو ایک اَدْر رُباعی لکھ کر بھیجی وہ یہ ہے ؎

در بحرِ غمِ تو غوطہ خواہم خوردن یا غرقہ شدن یا گُہری آوردن
خصمی تو بس قویست خواہم کردن یا روی بدان سُرخ کنم یا گردن[1]

صاحبِ دیوان نے اس کا مندرجہ ذیل جواب بھیجا ؎

بر غو برِ شاہ چون نشاید بردن بس غصۂ روزگار باید خوردن
این کار کہ پای درمیانش داری ہم روی بدان سُرخ کنی ہم گردن

عطا ملک جوینی کی رُسوائی اور سزا

بالآخر مجد الملک علاء الدین عطا ملک کے خلاف اباقا کے دِل میں شبہات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وُہ گرفتار ہُوا۔ بغداد کے کُوچوں اور بازاروں میں پھرایا گیا۔ اسے اذیت دی گئی اور کثیر رقمیں ادا کرنے پر مجبور کیا گیا جن کے متعلق الزام لگایا گیا تھا۔ کہ اس نے غبن کی ہیں۔ ابھی ممکن تھا کہ اسے بدتر حالات پیش آتے۔ اگر یکم اپریل ۱۲۸۲ء کو اباقا کی موت واقع نہ ہوئی ہوتی جس سے اس کے سر پر سے عذاب ٹل گیا۔ اور اُسے زندان سے

---

[1] سُرخ کردنِ گردن سے قتل کی طرف اشارہ ہے۔ رُو سُرخ کردن = سُرخرو کرنا رُوسیاہ کی ضد ہے ؎

عطا ملک کی رہائی اور مجد الملک کی موت

رہائی ملی۔ کچھ عرصہ بعد اس کا دشمن مجد الملک عوام کی آتشِ غضب کا شکار ہوُا۔ اور انبوہ نے اُسے تکا بوٹی کر ڈالا۔ اور اس کے کٹے ہوئے اعضاء کی ایران کے بڑے بڑے شہروں میں نمائش کی گئی۔ اس دیرینہ جانی دُشمن کی سزائے برحق پر عطا ملک جوینی نے ذیل کی رباعی تصنیف کی ؎

روزی دو سہ سرمایۂ تزویر شُدی جویندۂ مال وجاہ و توفیر شدی
اعضاء تو ہر یکے گرفت اقلیمی فی الجملہ بیک ہفتہ جہانگیر شدی

عطا ملک جوینی کی وفات ۱۲۸۳ء

عطا ملک بھی اپنے دُشمن کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا کیونکہ وہ بھی ۱۲۸۲ء کے موسمِ بہار میں چل بسا ؂

اباقا کی وفات

اباقا کے متعلق ایک عجیب بات پر سب مؤرخین متفق ہیں۔ تاتاریوں کے معمول کے مطابق وہ اپنے مقربوں اور ندیموں کے ساتھ کثرت سے شراب پی رہا تھا۔ اس دوران میں اُس نے کچھ بے چینی محسوس کی۔ دم بھر کے لئے ان میں سے اُٹھ کر محل کے باغ میں چلا آیا۔ اس وقت یکایک چلّا اُٹھا کہ ایک بڑا سیاہ پرندہ مجھے دھمکا رہا ہے۔ اپنے بعض نوکروں کو حکم دیا۔ کہ تیروں سے اسے مار ڈالیں۔ خدام تعمیلِ ارشاد میں بھاگے آتے۔ لیکن کوئی پرندہ دکھائی نہ دیا۔ اور ابھی اس کی تلاش کر ہی رہے تھے کہ

اباقا غش کھا کر گر پڑا اور پھر کبھی نہ جاگا[1]۔

حشیشیّین کی تازہ سرگرمیاں

اباقا کے عہدِ حکومت کے چند اور واقعات مختصر طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حشیشیّین باوجود ان تمام صدموں کے جو اُنھوں نے تاتاریوں کے ہاتھوں سہے تھے اب یہاں تک سنبھل گئے تھے۔ کہ ۶۷۰ھ (۲-۱۲۷۱ء) میں اُنھوں نے عطا ملک جوینی کی جان لینے کی کوشش کی۔ اور اس کے چار سال بعد وہ اپنے رئیس اعلیٰ رکن الدین خورشاہ کی سرکردگی میں اَلمُوت واپس لینے میں کامیاب ہوگئے۔ گو جلد ہی اباقا کے ہاتھوں مغلوب ہو کر نیست و نابود کر دئے گئے۔ مختلف مغول

سلاطینِ مغول کی باہمی مُہلک لڑائیاں

فرمانرواؤں کے درمیان مہلک خانہ جنگیاں عام ہونے لگیں۔ جیسے مثلاً یُوش مُوت اور نوگائیؔ کے درمیان آق سو کے مقام پر ۶۶۳ھ (۵-۱۲۶۴ء) میں جو اباقا کا سنِ جلوس ہے، اور اباقا اور نکودار پسر جغتائیؔ کے مابین ۶۶۷ھ (۹-۱۲۶۸ء) میں نکوداریوں کے پے درپے حملوں اور خراسان میں بُراق کی بغاوت سے مزید

---

[1] ابوالفرج بار ہیبریس (طبع بیروت ۱۸۹۰ء، ص ۵۰۵) کہتا ہے کہ یہ واقعہ ہمدان میں بہنام نامی ایک ایرانی کے گھر پیش آیا۔ اس نے اباقا کے اعزاز میں ایک دعوت کی تھی۔ ابوالفرج صاف طور پر سیاہ پرندے کا ذکر نہیں کرتا لیکن لکھتا ہے صار یری خیالات فی الھوا، (اسے ہوا میں خیالی شکلیں نظر آنے لگیں)

براق کی بغاوت افراتفری پھیلی، اباقا کی فوجوں کے براق کو شکست دینے کا سہرا تقریباً تمامتر سُبتائی کی مردانگی کے سر تھا- اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ہمعصر شاعر کہتا ہے ؎

لشکرِ عشقِ ترا پای من آوردم و بس
ہمچو در جنگِ بُراق از ہمہ میران سُبتای

احمد تکودر[1] (۱۲۸۲ء تا ۱۲۸۴ء)

اباقا کی وفات پر تخت کے دو حریف اُمیدوار منظر پر آئے- اس کا بھائی تکودر (جس نے اسلام لانے پر اپنے نام کے ساتھ احمد کا اضافہ کر لیا- اور اُسکا بیٹا ارغون- مغول امرا کی ایک

احمد تکودر ۶۸۱ھ تا ۶۸۳ھ / ۱۲۸۲ء تا ۱۲۸۴ء

اکثریت اوّل الذکر کے حق میں تھی- چنانچہ ۶ مئی ۱۲۸۲ء کو سلطان احمد تکودر کے لقب سے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا- اس کے سب سے پہلے علانیہ کاموں میں سے ایک یہ تھا- کہ اُس نے اپنے نئے اختیار کردہ دین کے لئے جوشِ عقیدت کا اظہار کیا- وہ یُوں کہ

---

[1] بعض جگہ یہ نام نکودر یا نِگودر دیا گیا ہے- لیکن Haithon نے اس کی جو آرمینی شکل یعنی تونگُدَر دی ہے قطعی طور پر صحیح ہے- دیکھو ہوورتھ، تصنیف مذکور (حصہ سوم ص ۳۱۰-۱۱)؛

بغداد کے علمائے[1] دین اور قلاؤُن سلطانِ مصر کے نام اس مضمون کے خط لکھے ان میں اُس نے دینِ اسلام کے تحفظ کرنے اور اس کو ترقی دینے اور تمام مسلمانوں کے ساتھ صُلح و آشتی کے روابط قائم رکھنے کے لئے اپنی تمنا ظاہر کی۔ قلاؤُن کے نام اس کا مکتوب مؤرخہ جمادی الاوّل ۶۸۱ھ (اگست ۱۲۸۲ء) دو خاص سفیروں کے سپرد ہؤا۔ یعنی قطب الدین شیرازی اور اتابک پہلوان۔ قلاؤن کے جواب[2] پہ اسی سال کے شروع رمضان (۳ر دسمبر ۱۲۸۲ء) کی تاریخ تھی۔ احمد تکودر کے تبدیلِ مذہب اور اپنے طرزِ عمل سے خلوص کا

احمد تکودر کا ارغون کے ہاتھوں شکست کھانا، گرفتار اور قتل ہونا

ثبوت دینے پر مسلمان خواہ کتنے ہی مطمئن کیوں نہ ہوئے ہوں لیکن تاتاری بھلا اس خاطر جمعی میں کیوں شریک ہونے لگے۔ چنانچہ اگلے سال (۶۸۲ھ = ۱۲۸۳-۴ء) میں مغول امرار کی ایک خوفناک سازش منکشف ہوئی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ احمد تکودر کو معزول کر کے اُس کے بھتیجے ارغون کو تخت پر بٹھایا جائے۔ قُنقُراتائی جو سرغنوں میں

---

[1] دیکھو دوسوں کی تاریخ مغول جلد سوم صفحہ ۵۵۳ ببعد؛ [2] دیکھو تاریخ وصاف (بمبئی طبع سنگی ۱۲۶۹ء ص ۱۱۳ تا ۱۱۵) اور قلاؤن کے جواب کیلئے صفحہ ۱۱۵ تا صفحہ ۱۱۸، نیز ابو الفرج بار ہیبریس (طبع بیروت ۱۸۹۰ء) صفحہ ۵۰۶ تا صفحہ ۵۱۰ اور صفحہ ۵۱۰ تا صفحہ ۵۱۸، دونوں خطوں کے انگریزی ترجمے ہوورتھ نے دئے ہیں تصنیف مذکور صفحہ ۲۶۰ تا صفحہ ۲۹۶؛

تھا ۱۸ جنوری ۱۲۸۴ء کو مارا گیا۔ لیکن ارغون نے چچا کے خلاف کامیابی کے ساتھ بغاوت کی اور بالآخر اُسی سال ۱۰ اگست کو اُسے گرفتار کر کے تہ تیغ کیا۔ اس سے اگلے روز اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔

ارغون (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء)

ارغون کا عہدِ حکومت ۶۸۳ھ تا ۶۹۰ھ = ۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء | ارغون نے سب سے پہلے جو کام کئے۔

اُن میں ایک یہ تھا کہ اپنے بیٹے غازان کو خراسان، ماژندران، رے اور قومس کا حاکم بنا دیا۔ اس سے اگلے سال اُرْدُ گیا چین سے فرمانروائے اعلےٰ قوبلائے خان کی طرف سے اس کے ایلخانِ ایران ہونے کا رسمی تسلیم نامہ لیکر آیا۔

صاحب دیوان مارا جاتا ہے | احمد تکودر کے زمانے میں صاحب دیوان اور اس کے خاندان کی اقبالمندی کو۔

مجدالملک کی سازشوں سے کچھ عرصے کے لئے اندیشہ پیدا ہُوا تھا لیکن اب وُہ ایک بار پھر عود کر آئی۔ مگر آخر کار ارغون کی تخت نشینی سے وہ بالکل ماند پڑ گئے۔ اپنے آقا کی وفات پر شمس الدّین محمد صاحب دیوان ارغون کے غضب سے خائف ہو کر قم کو بھاگ گیا۔ وہاں ارغون کے ہرکاروں نے اُسے جا لیا۔ اُسے واپس لائے اور انجام کار رہ ریا

۵ رشعبان ۶۸۳ھ (۱۶ ریا ۱۷ر اکتوبر ۱۲۸۴ء) کو اہر کے پاس مُعینہ نام ایک جگہ پر وہ مارا گیا۔[1] جلاد کے سامنے سر جھکانے سے پہلے اس نے قلیل مہلت کی التجا کی جو منظور کی گئی۔ وضو کرنے کے بعد اس نے قرآن کی ایک جلد سے جو اس کی اپنی ملکیت تھی فال نکالی اور پھر علمائے تبریز کو درجِ ذیل خط لکھا:۔

"چون بقرآن تفاؤل کردم برآمد انّ الّذین قالوا ربّنا اللہ ثُمّ استقاموا تتنزّلُ علیھم الملٰئکۃ ان لا تخافُوا ولا تحزنُوا وابشرُوا بالجنّۃ الّتی کُنتُم تُوعدُون[2] ۝ باری تعالی چون بندۂ خویش را درین جہانِ فانی نیکو داشت وہیچ مرادی ازو دریغ نہ خواست کہ ہم درین جہان بشارت جہان باقی بدو رساند چون چنین بود مولانا محی الدین و مولانا افضل الدین و مولانا ہمام الدین و مشایخِ کبار را کہ ذکرِ ہر یک بتطویل می انجامید و موضع احتمال نمیکرد بشارت رسانیدن واجب نمود تا دانند کہ قطع علایق کردہ روانہ گشتیم ایشان نیز بدعاءِ خیر مدد دہند"[3]

اُس نے اپنے بیٹوں کے نام بھی ایک الوداعی خط اور وصیت نامہ لکھا وُہ یہ ہے[4]:۔

---

[1] یہ آخری واقعہ ہے جو بار ہیبریس نے اپنی تاریخ میں قلمبند کیا ہے۔ (ص ۲-۵۲۱ طبع بیروت ۱۹۰۰ء)؛ [2] قرآن کریم سورہ ۴۱ آیہ ۳۰؛ [3] تاریخ وصاف ص ۱۴۱؛

[4] اسکا متن فصیحی کی مجمل، ورق ۴۶۵ ب ۴۶۹ و نسخہ مملوکہ مؤتمنین سرمایۂ گِب؛

بیٹوں کے نام اُس کا خط

"میرے بیٹوں اور عزیزوں کو سلامتی اور نجات نصیب ہو۔ خدائے قدیر اُنہیں محفوظ رکھے۔ وُہ سمجھ لیں کہ مَیں اُنہیں خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ وہی قادر اور جلیل ہے۔ بیشک اللہ کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ جو اسکے سپرد کیا جائے وہ نقصان اُٹھائے۔ میرے دل میں تھا کہ شاید ملاقات ہو سکے جس پر میری آخری آرزوئیں زبانی پہنچائی جا سکیں لیکن اب میرے دن پُورے ہو چکے ہیں۔ اب آخرت کا معاملہ درپیش ہے۔ میرے بچوں کی نگرانی میں کوتاہی نہ کرنا۔ انہیں مطالعے کی ترغیب دلاؤ کسی حال میں اُنہیں حکومت کی ملازمت سے کوئی سروکار نہ رکھنے دو اس سے اچھا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالےٰ نے انہیں دے رکھا ہے۔ اس پر قناعت کریں۔ اگر میرا بیٹا اتابک اور اُس کی والدہ گھر واپس جانا چاہیں تو میری طرف سے اُنہیں ایسا کرنے کی اجازت ہے، نوروز مسعود اور اُن کی والدہ کو بُلقان خاتون کے پاس رہنے دیا جائے اور اگر وہ اُنہیں کچھ جاگیریں دے دے تو اسے قبول کریں اور اس پر قناعت کریں۔ میری بڑی بیوی تبریز سے اَور کہاں جا سکتی ہے؟ پس وُہ میری قبر اور میرے بھائیوں کی قبروں کے پاس ہی رہے۔ اگر ہو سکے تو یہ سب لوگ شیخ فخرالدین کی خانقاہ میں جا رہیں مومنہ کے ساتھ ہماری جانب سے تسلّی بخش سلوک نہیں ہوُا۔ اگر وُہ چاہے تو دُوسری شادی کر لے۔ فرخ اور اُس کی والدہ اتابک کے پاس

رہیں۔ زکریا کو جاگیر خالصہ اور دُوسری جاگیریں دے دی جائیں۔ جو میں نے امیر بوقا کو دے رکھی ہیں۔ میرے عزیز اُس کی طرف سے عرضداشت پیش کریں۔ اگر اسے کوئی زمین عطا ہو جائے تو اچھا ہے۔ نہ ہو تو قناعت کرے۔ خالق قدیر ہم پر رحم کرے اور سب کو برکت دے۔ اس وقت میرا خیال حضورِ ربانی کی طرف لگا ہؤا ہے اور اس سے آگے میں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ سب سے مہربانی کا سلوک کرو غلام ہو کہ آزاد۔ اور جس شب بچھڑے ہوؤں کو یاد کرو تو ہمیں بھول نہ جانا"۔

صاحب دیوان تنہا ہلاک نہ ہُؤا۔ اس کے چار بیٹے یحییٰ، فرج اللہ، مسعود اور اتابک بھی اس کے بعد جلد ہی موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ بقول وصافؒ تاتاری خونخواری نے (جو ہر وقت اجداد کے گناہوں کی سزا اولاد کو دینے پر کمر بستہ رہتی تھی۔ اور جس کی فطرت سے ان لوگوں کو چھوڑ دینا بہت دور تھا جن کے متعلق احتمال ہو کہ یہ انتقام لیں گے) جو بھینٹ طلب کی تھی، وہ "دو بھائیوں اور سات بیٹوں پر مشتمل تھی"۔ جانوں کے اس اتلاف میں علاء الدین عطا ملک اور بہاء الدین کی ہلاکتیں بھی شامل تھیں جو کچھ سال پہلے واقع ہوئیں اور جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ گویا پانچ یا چھ برس کے عرصے میں مدبرین کا یہ زبردست خاندان صفحۂ تاریخ سے تقریباً محو ہو گیا۔

لہ ص ۱۴۲؛

فصیحی اپنی مجمل (ورق ۴۶۹) میں ذیل کی دو رباعیاں نقل کرتا ہے جو صاحب دیوان نے اپنے آخری لمحوں میں کہیں ؎

ای دستِ اجل گرفته پای دلِ من حکم تو بکشتنم رضای دلِ من
جان پیشکشت میکنم از دیدهٔ دل این بود همه عمر هوای دلِ من

اور ؎

در نگر ای چراغ جانِ کشته تا ببینی دو صد جهانِ کُشته
کشتگان زندگانِ جاویدند خاصه در دستِ کافرانِ کُشته

اس کی وفات کا ماتم عالمگیر ہؤا۔ حتیٰ کہ شیراز جیسے شہروں میں بھی جہاں وہ صرف خیرات اور رفاہی کاموں کے ذریعے معروف تھا۔ اور وہاں خود کبھی نہ گیا تھا اس کی وفات پر جو اشعار لکھے گئے اُن میں سے ذیل کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

از رفتنِ شمس از شفق خون بچکید
مه روی بکند و زهره گیسو ببرید
شب جامه سیه کرد دران ماتم و صُبح
بر زد نفسی سرد و گریبان بدرید

تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے صاحب دیوان کے انجام کو حق بجانب سمجھا۔ اسلئے کہ اُس نے اپنے بدنصیب پیشرو مجد الملک کو فنا کرنے میں حصّہ لیا تھا۔ یہ نقطۂ نظر ذیل کے اشعار میں پیش کیا گیا ہے جو تاریخ گزیدہ سے منقول ہیں ؎

چو مجد الملک از تقدیر ایزد — شہادت یافت در صحرای نوشہر
بقصدِ صاحب دیوان محمد — کہ دستور ممالک بود در دہر
پس از دو سال و دو ماہ و دو ہفتہ — چشید او ہم ز دوران شربتِ قہر
تو در دُنیا مشو بد را خریدار — کہ دارد در تغارو نوش با زہر

وہ لوگ جو اتنے نا عاقبت اندیش تھے کہ تاتاریوں کی وزارت قبول کر لیتے تھے ان سب کا انجام تشدد کی موت تھا۔ چنانچہ جلال الدین سمنانی جو صاحبِ دیوان کا قائم مقام ہُوا اگست ۱۲۸۹ء میں قتل کیا گیا سعد اللہ جو اس کے بعد آیا اخیر فروری ۱۲۹۱ء میں مارا گیا۔ صدر الدین خالدی جو گیخاتو کا وزیر تھا۔ مئی ۱۲۹۸ء میں اسی قسمت کا نشانہ بنا اور رشید الدین فضل اللہ جو ان سب میں بڑھکر صاحب فضل و کمال تھا جولائی ۱۳۱۸ء میں تہ تیغ کیا گیا ؛

یہودی وزیر سعد اللہ ارغون نے ایران پر تقریباً سات سال (اگست ۱۲۸۴ء تا مئی ۱۲۹۱ء) حکومت کی۔ یوروپ کو اُس نے جو سفارتیں روانہ کیں بالخصوص ۱۲۸۷ء۔ ۱۲۸۸ء کی سفارت (جس کا حال سفیروں میں ایک شخص ربان بن صوما نے سریانی میں لکھا ہے[۱]) اباقا کی پالیسی کے احیا کا پتہ دیتی ہیں جسے

---

[۱] دیکھو دلچسپ تاریخ مار جبلاہا ثالث .... و راہب ربان صوما۔ مترجمہ از سریانی بزبان فرانسیسی از موسیو جے بی شابو (پیرس ۱۸۹۵ء) Histoire de Mar Jabalaha III—et du moine Rabban Canma—traduit due Syriaque et annotee par J.-B. Chabot

احمد تکودر نے اُلٹ دیا تھا۔ ارغون کے زمانے کے متاخر حصے میں سعد اللہ یہودی اُس کا وزیر تھا جس کو اقتدارِ کُلّی حاصل تھا۔ یہ شخص جو اولاً ایک طبیب تھا، مسلمانوں کی شدید نفرت کا مورد ہوا جنھوں نے اس کی طرف اسلام کی مخالفت کی انتہائی شر انگیز سازشیں منسوب کیں۔ اصلاً وہ آبہر کا باشندہ تھا۔ بعد کو بغداد میں مطب کرتا رہا۔ اس کے بعض ہم مذہبوں نے ارغون کے ہاں اس کی سفارش کی۔ اور از روے تاریخِ وصاف[1] اس نے بادشاہ کا حُسنِ ظن اور اعتماد حاصل کر لیا۔ نہ صرف منگولی اور ترکی زبانوں کی علمیت کے زور پر بلکہ اس دانشمندانہ طرزِ عمل سے جس پر چلتے ہوئے اُس نے ارغون کی حرص سے فائدہ اُٹھا کر خزانے کو پُر کرنے کی تجاویز پیش کیں۔ بغداد میں ان تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے میں اُس نے ایسی قابلیت کا ثبوت دِیا کہ ارغون نے اپنی کل سلطنت کا مالیاتی ضبط و اختیار اس کے سپرد کر دیا۔ اسکے ہم مذہب جو اب تک حقیر سمجھے جاتے تھے اور دبے ہوئے تھے اس کی روز افزوں طاقت سے فائدہ اُٹھانے لگے۔ اور حکومت کے بہت سے عُہدوں پر مامور ہونے لگے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بغداد کے ایک شاعر نے لکھا[2]

یَهُودُ هٰذَا الزَّمَانِ قَدْ بَلَغُوْا   مَرْتَبَةً لَا يَنَالُهَا فَلَكُ
اَلْمُلْكُ فِيهِمْ وَالْمَالُ عِنْدَهُمْ   وَمِنْهُمُ الْمُسْتَشَارُ وَالْمَلِكُ

---

[1] ص ۲۳۶؛ [2] ایضاً ص ۲۳۸

یا معشرُ النّاسِ قد نصحتُ لکم تہوّدوا قد تہوّد الفلکُ
فانتظروا صیحۃَ العذابِ لہم فعن قلیلٍ تراہمُ ھلکوا

(ترجمہ:- یہودی ان دنوں ایسے رُتبے پر پہنچ گئے ہیں کہ فلک بھی اس رُتبے کو نہیں پاتا۔ انہی کے ہاتھوں میں حکومت ہے۔ انکے پاس دولت ہے مشیر اور بادشاہ انہی میں سے ہیں، اے لوگو! میں تم سے نصیحت کرتا ہوں یہودی ہو جاؤ کہ آسمان بھی یہودی ہو گیا ہے۔ انتظار کرو کہ عذاب کی گھڑی انکے سر پر آ کھڑی ہو۔ عنقریب تم اُنکو دیکھ لوگے کہ وہ ہلاک ہو گئے)

سعد الدولہ کی جسارت اور اسلام کی کھلم کھلا معاندت اس کے اقتدار کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے نہ صرف ارغون کو اس کی ترغیب دلائی کہ تمام اعلیٰ دیوانی اور فوجی عہدوں سے مُسلمانوں کو برطرف کر دے[1]۔ بلکہ اُن کے دین کو بھی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی۔ اس غایت سے وُہ ارغون کو اس عقیدے پر بھی لانا چاہتا تھا کہ منصبِ نبوت عربوں سے ہٹ کر تاتاریوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ جنہیں خدا نے محمدؐ کے نافرمان پیروؤں کی سرزنش کے واسطے بھیجا ہے۔ یہ تجویز بھی کی کہ کعبہ کو بُت خانے میں بدل دیا جائے۔ اُس نے مکہ پر حملہ کرنے کے لئے بغداد میں ایک جنگی بیڑہ تیار کرنا شروع کیا۔ اور اپنے ہم مذہب خواجہ نجیب الدین کحاّل کو کم و بیش ۲۰۰

---

[1] تاریخ وصاف صفحہ ۲۴۱؛

سربرآوردہ اور بارسوخ مسلمانوں کا قتل نامہ دیگر خراسان روانہ کیا۔ ان مسلمانوں کی جان لینے کا وہ خواہاں تھا۔ ایسی ہی ایک اور لیکن نسبۃً مختصر فہرست شیراز کے سترہ مشائخ اور علمائے دین کے ناموں کی اس کیلئے تیار کی گئی تھی۔ تاریخ وصاف کا مصنف لکھتا ہے[1]:۔

"حکایت کردند کہ ارغون خان در مبادیِ جلوس بر سریرِ دولت کارِ قتل را کارہ بود چنانکہ روزی در اثناء طوی نظر بر کثرتِ ذبایح اغنام انداخت از کمالِ رقّتِ قلب فرمود۔ چندین حیوانرا بی گناہ برای لذّتِ قبقبِ عرضۂ مُرہفات کردن از لوازم قساوتِ قُلُوبُ هُنّ غلفٌ و رذائل اخلاقِ ذمیمہ تواند بود علیٰ ہٰذا وزیر و مشیر پیوستہ بہ تحسینِ مستقبح و تزئینِ مستکرہ او اشتغال داشت و میگفت گلزار دولت را باغبان وار از خارِ انکار پیراستن و مشارب مآرب را از اقاذورات محذورات مصفی داشتن از مقتضی کیاست و فراست باشد ...... از وسوسہ و اغواءِ او دلِ ایلخان بر قتلِ بے خطا چون غمزۂ کافر دل خوبان ختن حریص شد تا غایتی کہ باندک توہمی یا بسببِ مختصر جریمتی صد جان را برباد میداد۔ ہر آئنہ مخالطت جلیس السوء و معاشرت اشرار ہمیں نتیجہ دہد"۔

---

[1] تاریخ وصاف ص ۲۴۲-۳؛

ارغون کا مرض الموت لیکن عین اس وقت جبکہ سعد اللہ کا اثر و رسوخ اپنے اوجِ کمال پر تھا۔ اور اس کی ریشہ دوانیاں اپنے مطلب کو پہنچنے والی تھیں ارغون تبریز میں سخت علیل ہو گیا۔ وزیر نے جب سمجھ لیا کہ یقیناً اس کو اپنے آقا کے مرے پیچھے زیادہ دن جینا نہ ملیگا تو سخت مایوسی کا شکار رہا۔ دربار کی حاضری میں اس نے کبھی ناغہ نہ کیا۔ اور ساتھ ہی فلک کی رضاجوئی کیلئے اس نے کثیر رقمیں خیرات کیں۔ تیس ہزار دینار بغداد میں اور دس ہزار شیراز کے غربا میں تقسیم کیے۔ اس نے بہت سے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا۔ اور بہت سے خیراتی کاموں کی توسیع و تجدید کی۔ بعض تاتاری پروہتوں نے یہ حکم لگایا کہ قرانقائی، ہولاجو، جوشکب اور دوسرے مغول امرا کا قتل ارغون پر یہ بیماری لایا ہے۔ اوروں نے کہا کہ اسپر اس کی ایک بیوی نے جادو کر دیا ہے۔ سلطان ایداجی جس پر یہ الزام لگایا گیا کہ اسی نے اس کام پر اس بیوی کو اکسایا کفارے کے طور پر بھینٹ چڑھایا گیا۔ اور یہی کچھ جوشکب کی بھتیجی توقجاق کے ساتھ ہوا جس پر بادشاہ پہ جادو کرنے کا الزام تھا۔ لیکن ان تدبیروں سے اس کے مرض کی رفتار نہ رکی اور فروری ۱۲۹۱ء کے آخر میں حالت ایسی نازک ہو گئی کہ سوائے سعد اللہ اور جوشی کے اَور کسی کو اس کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی۔ سعد اللہ نے خفیہ طور پر غازان کے پاس قاصد بھیجے۔ اسے تاکید کی کہ ارغون کے دمِ آخرین کے

ساتھ ہی تخت کا دعویٰ کر دے لیکن دُشمنوں سے بچنے میں اُس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اور اپنے آقا کے مرنے سے چند روز پہلے ہی ۹ر مارچ ۱۲۹۱ء کو مارا گیا[1]۔

یہودیوں پر جور و تعدّی سعد اللہ کی موت یہودیوں کی عام اذیت رسانی کا پیش خیمہ تھی۔ انہیں لوٹا گیا اور اکثر حالتوں میں قتل کیا گیا۔ ایک بغداد ہی میں ان کے سَو سے زیادہ سرکردہ اشخاص مارے گئے۔ یہودی غلبے کی اس فوری شکستگی کی خوشی میں زین العابدین علی بن سعید واعظ نے ذیل کا عربی قصیدہ[2] لکھا۔ یہ اسی زمین میں ہے جس میں اُوپر کے منقولہ اشعار ہیں ؎

نَحْمَدُ مَنْ دَارَ بِاسْمِهِ الْفَلَكُ — هٰذِي الْيَهُودُ الْقُرُودُ قَدْ هَلَكُوا
وَقَارَنَ النَّحْسُ سَعْدَ دَوْلَتِهِمْ[3] — وَافْتَضَحُوا فِي الْبِلَادِ وَانْهَتَكُوا
وَشَتَّتَ اللّٰهُ شَمْلَ مُلْكِهِمِ — وَبِالْحُسَامِ الصَّقِيلِ قَدْ سُبِكُوا
كَمْ حَكَمُوا فِي الْبِلَادِ لَا حَكَمُوا — وَارْتَكَبُوا الْمُوبِقَاتِ وَانْتَهَكُوا
أَبْكَاهُمُ اللّٰهُ عَاجِلاً أَسَفًا — مِنْ بَعْدِ مَا فِي زَمَانِهِمْ ضَحِكُوا
سَقَاهُمُ الْحَتْفَ سَادَةٌ خُشُنٌ — فَامْتَلَأَتْ بِالْجَمَاجِمِ السِّكَكُ

---

[1] دیکھو ہوورتھ تصنیف مذکور ص ۳۴۵؛

[2] منقولہ از تاریخ وصاف ص ۲۴۷؛

[3] سعد الدولہ = ملک کی نیک بختی، سعد اور نحس میں تضاد ہے۔ سعد مبارک ستاروں کے اچھے اثر کے لئے آتا ہے اور نحس بدشگون ستاروں کے بُرے اثر کیلئے۔

وَٱسْتَخْلَصُوا ٱلْمَالَ مِنْ دِيَارِهِمِ   وَٱلْحَرِيمَ ٱلْحَرَامَ قَدْ هَتَكُوا
يَا أُمَّةَ ٱلْكُفْرِ وَٱلضَّلَالِ لَقَدْ   دَارَ بِكُمْ فِي حِبَالِهِ ٱلشَّرَكُ
يَا أَخْبَثَ ٱلطَّيْرِ يَا بُغَاثُ لَقَدْ   صَارَ لَكُمْ فِي ٱلْخَمِيلَةِ ٱلشَّبَكُ
فَأَنْتُمْ شَرُّ أُمَّةٍ سَلَفَتْ   وَأَنْتُمْ شَرُّ أُمَّةٍ تُرِكُوا
عَبَدْتُمُ ٱلْعِجْلَ دُونَ خَالِقِكُمْ   فَضَلَّ ذَاكَ ٱلْإِيَابُ وَٱلنُّسُكُ
مُهَذَّبٌ[1] هَذَّبُوا بِقَتْلَتِهِ   جَمَاعَةً فِي ٱلْبِلَادِ قَدْ فَتَكُوا
لَمَّا رَأَوْا رَأْسَهُ يُطَافُ بِهِ   وَقَدْ عَلَاهُ ٱلْقَتَامُ وَٱلصَّهَكُ
فَعَجَّلَ ٱللهُ رُوحَ خَيْرِهِمِ   إِلَىٰ جَحِيمٍ ظَلَامُهَا حَلَكُ
فَفِي ٱلْعَذَابِ ٱلْمُذَابِ قَدْ سُجِنُوا   وَفِي ٱلْحَدِيدِ ٱلْمَدِيدِ قَدْ سُلِكُوا
فَٱعْتَبِرُوا سَادَتِي بِمَصْرَعِهِمْ   ثُمَّ ٱتْلُ يَا ذَا ٱلْبَيَانِ كَمْ تَرَكُوا[2]
طُغَاجِرُ هَدَّ رُكْنَ عِزِّهِمِ   ذَاكَ ٱلْهُمَامُ ٱلْحُلَاحِلُ ٱلْمَلِكُ
أَبَادَهُمْ عَنْوَةً بِصَارِمِهِ   وَمَا عَلَيْهِ بِذَا لَكُمْ دَرَكُ
إِشَارَةُ ٱلشَّيْخِ فِيهِمْ ظَهَرَتْ   لَمَّا رَمَاهُمْ بِسَهْمِهِ فَتَكُوا
جَمَالُ دِينِ[3] ٱلْإِلَٰهِ سَيِّدُنَا   ذَاكَ ٱلْوَلِيُّ ٱلْمُؤَيَّدُ ٱلْمَلِكُ
ٱلزَّاهِدُ ٱلْعَابِدُ ٱلْخُضُوعُ لِمَنْ   دَانَتْ لَهُ فِي بِحَارِهَا ٱلسَّمَكُ

---

[1] لفظ "مہذّب" غالباً مہذّب الدولہ یا ایسے ہی کسی لقب کا حصّہ ہے جو مقتولین میں کسی کا خطاب ہے۔ [2] قرآن کریم، سورہ الدخان (۴۴)، آیت ۲۴۔ کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۔ [3] غالباً جمال الدّین محمد ابن سلیمان النقیب المقدسی (متوفی ۶۹۸ھ مطابق ۹-۱۲۹۸ء) سے مراد ہے ۔

هَجَوْتُهُمْ أَبْتَغِي بِهَجْوِهِمِ جِنَانَ خُلْدٍ يَزِينُهَا الْبِرَكُ
رَغْمًا لِمَنْ قَالَ فِي قَصِيدَتِهِ تَهَوَّدُوا قَدْ تَهَوَّدَ الْفَلَكُ

ترجمہ :- ہم اُس خدا کی تعریف کرتے ہیں جسکے نام سے فلک گھومتا ہے۔ یہ بندر یہودی تہس نہس ہو گئے ؛

نحوست اُن کی اقبال مندی کے قریب آگئی اور وہ ملکوں میں ذلیل و رسوا ہو گئے ؛

اللہ نے ان کی حکومت کا شیرازہ بکھیر دیا اور وہ چمکدار تلوار سے پگھلا دئے گئے ؛

کتنا عرصہ اُنھوں نے حکومت کی لیکن ایسی کہ گویا نہیں کی اور وہ گھناؤنی حرکتوں کے مرتکب ہوئے اور ذلیل ہوئے ؛

خدا نے جلد اُنہیں رنج دیکر رلایا بعد اس کے کہ وہ اپنے زمانۂ عروج میں ہنستے رہے ؛

سخت گیر سرداروں نے اُنکو جامِ موت پلایا۔ راستے اُن کی کھوپڑیوں سے اٹ گئے ؛

(ان سرداروں) نے اُنکے گھروں سے مال لے لیا۔ اور ان کے حرم کو بے حرمت کیا ؛

اے کافروں اور گمراہوں کی قوم، اب جال کی رسیوں نے تم کو جکڑ لیا ہے ؛

اے خبیث ترین مُردار کھانے والے پرندو! ہلاکت نے تمھیں

اپنے جال میں پکڑ لیا؛

تم اسلاف اور اخلاف کی حیثیت سے بدترین نسل ہو ٭

تم نے اپنے خالق کو چھوڑ کر بچھڑے کی پرستش کی۔ تمہارا یہ رجوع اور عبادت سب گمراہی تھی؛

مہذّب کے قتل کرنے سے لوگوں نے گنہگاروں کی ایک جماعت (یہودی) کو مہذّب بنا دیا؛

جب انہوں نے دیکھا کہ اس کا سر شہر میں پھرایا جا رہا ہے تو (وہ اس حال میں تھا کہ) اس پر گرد اور بدبُو چھائی ہوئی تھی؛

خدا نے ان کے بدترین شخص کی رُوح کو جلدی سے جہنّم میں پہنچا دیا۔ جہاں کی تاریکی یاس انگیز ہے:

وہ پگھلانے والے عذاب میں قید کیئے گئے اور لوہے کی طویل زنجیروں میں (باندھ کر) لے جائے گئے؛

صاحبو! اُن کی ہلاکت سے عبرت پکڑو، اے قاری! کَمۡ تَرَکُوۡا کی آیت پڑھ کر سُنا؛

طُغا چار نے انکے عزم کے ستون کو گرا دیا۔ وہ شہزادہ جو مضبوط ارادے اور جوش والا ہے؛

اُس نے ان کو بزورِ شمشیر ہلاک کر دیا اس کو اس ہلاکت پر کوئی الزام نہیں دے سکتا ٭

(ہمارے) شیخ کی پیشین گوئی اُنکے بارے میں پوری ہو گئی

(جو اس نے اس وقت کی تھی) جب وہ اُس کا مال لُوٹ رہے تھے ؛

ہمارا سردار جمال الدین جو کہ ولی ہے اور فرشتہ ہے اور اللہ کی تائید سے بہرہ مند ہے ؛

زاہد ہے عابد ہے اور اس خدا کی درگاہ میں عاجزی کرنیوالا ہے جس کے حکم کی سمندر میں مچھلیاں مطیع ہیں ؛

میں نے اُن کی ہجو کی اور میں اُنکی ہجو کے معاوضے میں خلد کا باغ چاہتا ہُوں جس کی زینت بڑے بڑے حوض ہیں ؛

برخلاف اس شاعر کے جس نے اپنے قصیدے میں یہ کہا تھا "یہودی ہو جاؤ کہ فلک (بھی) یہودی ہوگیا ہے" ؛

گیخاتُو (سنہ ۱۲۹۱ء تا سنہ ۱۲۹۵ء)

گیخاتو کی تخت نشینی سنہ ۱۲۹۱ء تا سنہ ۱۲۹۵ء

ارغون کے بعد اس کا بھائی گیخاتو تخت نشین ہؤا۔ اس کی رسمِ تاجپوشی ۲۲ جولائی سنہ ۱۲۹۱ء کو اپنے پیشرو کی موت سے ½۴ ماہ بعد ادا ہوئی۔ اس وقفے میں باوجود اس کے کہ تغاچار اور تاتاریوں کے دُوسرے امراء نے بعجلت تمام مُختلف صُوبوں میں حکّام معیّن کر دئے

تھے۔ طوائف الملوکی شدّت سے پھیلی رہی۔ اور آلِ ہزار اسپ کے امیر افراسیاب نے کہ یہ خاندان بارھویں صدی کے وسط سے لُرستان پر حکمران تھا ایک بغاوت کھڑی کی جو ناکام رہی۔ تاہم کچھ عرصے کے لئے وہ اصفہان پر قابض رہا۔

گیخاتو کی عیاش طبعی اور مسرف مزاجی

گیخاتو نے جسے صاحب حبیب السیر "آلِ ہلاکو میں فیاض ترین" کہتا ہے صدرالدین خالدی زنجانی المعروف بہ صدرِ جہاں کو اپنا وزیرِ اعظم منتخب کیا۔ بادشاہ اور وزیر دونوں کی طبیعت مسرفانہ اور فضول خرچ واقع ہوئی تھی۔ بادشاہ کا اسراف محض دسترخوان کی لذّتوں اور دُوسری نسبتہً غیر مستحسن تفریحوں پر مبنی تھا۔ چنانچہ جلد ہی خزانہ خالی ہوگیا۔ ادھر روپے کی اشد ضرورت پڑی تو صدرِ جہاں نے چاؤ یعنی زرِ کاغذی کے رائج کرنے کا تہیہ کرلیا۔ جو ان دنوں سلطنتِ

چاؤ یعنی نوٹ کے روپے کا اجرا

چین میں چلتا تھا۔ اس چاؤ کے تیار کرنے کے لئے بڑے بڑے تمام شہروں میں ٹکسالیں قائم کی گئیں اور قیمتی دھاتوں کا حتی الامکان کم سے کم استعمال کرنے کی پابندی کے لئے سخت قوانین نافذ کئے گئے۔ اس مجوّزہ زرِ کاغذی کے مکمل حالات تاریخِ وصاف اور اس عہد کی دُوسری تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ یہ نوٹ مستطیل شکل کے

لہ ص ۳ : ۲۷۲ ؛

کاغذ تھے۔ جن پر چینی کے کچھ الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ اُوپر عربی میں اسلامی کلمۂ شہادت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہوتا۔ نیچے کاتب یا نقشہ کش کا نام ہوتا۔ اور ایک دائرے کے بیچ میں نوٹ کی قیمت درج ہوتی جو نصف درہم سے دس دینار تک ہوتی تھی۔ ایک اَور عبارت یہ ہوتی :۔ "پادشاہ جہان در تاریخ سنہ ثلث و تسعین وستمائہ این چاو مبارک را در ممالک روانہ گردانید۔ تغییر و تبدیل کنندہ را با زن و فرزند بیاسا رسانیدہ اورا جہتہ دیوان بردارند" شیراز اور دیگر شہروں میں اس جدید زرِ کاغذی کے فوائد منادی کے ذریعے سمجھائے گئے۔ اور اس کے خلاف فرضی اعتراضات کا خود ہی جواب دیا گیا۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ ؎

چاو اگر در جہان روان گردد

رونقِ ملک جاودان گردد

اور یہ کہ افلاس اور تنگدستی بالکل دُور ہو جائیگی۔ چاؤ کے متعلق جتنے قوانین مرتب کئے گئے اُن میں خوش تدبیری سے ایک گنجائش یہ رکھی گئی کہ کثرتِ استعمال سے جو نوٹ بوسیدہ ہو جاتے یا پھٹ جاتے اُنہیں چاؤ خانہ یا ٹکسال میں واپس کرنا ہوتا تھا۔ وہاں اُن کے بدلے دس فیصدی کم مالیت کے نوٹ مل جاتے ؛

چاؤ کی غیر مقبولیت | تبریز میں چاؤ کے اجرا کے لئے ذوالقعد ۶۹۳ھ دستمبر ۱۲۹۴ء مقرر ہوا۔ تین دن میں تبریز کے سب بازار

بند ہو گئے۔ اور کاروبار تقریباً رُک گیا کیونکہ کوئی شخص چاؤ کو قبول نہ کرتا تھا۔ اور سونے چاندی کا استعمال پہلے ہی موقوف ہو چکا تھا۔ عوام کی ناراضی کا رُخ عزالدین مظفر کی طرف تھا۔ جس کے وسیلۂ تعاون سے ناپسندیدہ زر کاغذی جاری کیا گیا تھا۔ عزالدین کے بارے میں اس قسم کے اشعار کہے گئے ؎

توعزِ دینی و ظلِّ جہانی | جہان را ہستیٔ تو نیست درخور
از آن گبر و مسلمان و یہودی | پس از توحیدِ حق واللہ اکبر
ہمی خوانند از روی تضرّع | بنزدِ حضرتِ دارای داور
خدایا برمرادِ خویش ہرگز | مبادا در جہان یکدم مظفّر

چاؤ کی تنسیخ اسی قسم کی شکایتیں شیراز اور دُوسرے شہروں میں اُٹھنے لگیں۔ مغول اور دیگر امراء کی وکالت سے بالآخر چاوِ مکروہ کو منسوخ اور زرِ کاغذی کو موقوف کرنے پر رضامند ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے مالیات کی نازک حالت کو سدھارنے کی بجائے بدتر کر دیا تھا۔

گیخاتو اپنے عمزاد بیدُو کی توہین کرتا ہے اس ناگوار تجربے کے جلد ہی بعد بدمستی کی حالت میں جو اس کے معمول میں داخل تھی اس نے اپنے عمزاد بھائی بیدُو کی جو کہ ہلاکو کا پوتا تھا سخت ناشائستہ طرح سے توہین کی۔ یعنی اسے

---

۱ عزالدین ؛ ۲ عزالدین مظفر"؛

اپنے ایک مصاحب سے پٹوایا۔ اگلے روز صبح جب اُسے ہوش آیا۔ تو اپنے کئے پر پشیمان ہوا۔ اور بیدو کو انعام واکرام کے ذریعے راضی کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے فی الوقت مصلحت کے خیال سے اپنی رنجیدہ خاطری کو چھپائے رکھا۔ لیکن جلد ہی بعض غیر مطمئن مغول سرداروں کی شہ پر اُس نے گیخاتو کے خلاف علانیہ بغاوت کردی سپہ سالار تُغاچار کی غدّاری سے گیخاتو گرفتار ہو گیا۔ اور مُوقان میں ۶ جمادی الثانی (۲۳ اپریل ۱۲۹۵ء) کو بروزِ جمعرات قتل کیا گیا۔

بیدُو (اپریل تا اکتوبر ۱۲۹۵ء)

اس کے بعد جلد ہی بیدو کو ہمدان میں تاج پہنایا گیا۔ تاتاری دستور[1] کے مطابق بدمستی کے عالم میں جشنِ جلوس منا چکنے کے بعد اُس نے تغاچار کو سپہ سالار بنا دیا۔ سابق وزیرِ اعظم صدرِ جہاں کو موقوف کیا اور اس کی جگہ جمال الدین دستجردانی کو مامور کیا۔ مگر وہ اس رُتبۂ عالی سے زیادہ متمتع نہ ہُوا۔ کیونکہ جلوس کے چھ ماہ بعد غازان اسپر غالب آیا۔ اور بقول خواندمیر[2] اسی شراب موت کا بھرپور جام اُسے پینا پڑا جو اُس نے گیخاتو کو چکھایا تھا۔

---

[1] حبیب السیر (طبع سنگی بمبئی ۱۸۵۷ء)، جلد سوم حصہ اوّل؛ [2] ایضاً ص ۸۱؛

غازان (۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۴ء)

غازان ۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۴ء ہلاکو کے پڑپوتے غازان کی تخت نشینی تاتاری کُفرو الحاد پر اسلام کے حتمی غلبے کا فتحِ باب تھی۔ اور اسی سے ایرانی حریت کی تعمیرِ نو کا آغاز ہُوا۔ غازان ۴ر دسمبر ۱۲۷۱ء کو پیدا ہوُا تھا۔ پس جب اُس نے عنانِ سلطنت ہاتھ میں لی تو ابھی وُہ چوبیس برس کا نہ ہُوا تھا۔ سات سال کی چھوٹی سی عمر میں وُہ اپنے دادا اباقا کی معیت میں شکار کو جایا کرتا تھا۔ دس سال کا ہُوا تو اُس کے باپ ارغون نے اُسے خراسان کا حاکم بنا دیا اور امیر نوروز کو اس کا نگران کردیا۔ یہ ارغون آغا کا بیٹا تھا جس نے اُنتالیس برس تک چنگیز خان اور اُس کے جانشینوں کے عہد میں ایران کے مختلف صُوبوں میں گورنری کی تھی۔ امیر نوروز نے

غازان کا اسلام لانا اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اسی کے ذریعے غازان نے بھی یہ دین اختیار کیا۔ وہ یوں کہ غازان اور بیدو کی کشمکش کا آغاز تھا۔ نوروز نے اس کو یہ وعدہ دینے پر آمادہ کر لیا۔ کہ اگر خدا اُس کو فتح و نُصرت عطا کرے تو وہ رسولِ عربی کے دین کو قبول کرے گا۔ غازان نے وعدہ وفائی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا قول پُورا کیا۔ ۴ر شعبان ۶۹۴ھ (۱۹ر جون ۱۲۹۵ء) کو دس ہزار تاتاریوں سمیت فلِ

معروف سعدالدین الحموی کے بیٹے شیخ صدرالدین ابراہیم کی موجودگی میں ایمان کا اقرار کیا۔ غازان کے دل میں نئے عقائد کا جوش و خروش بھی کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ اس تبدیلِ مذہب کے چار ماہ بعد اُس نے نوروز کو اجازت دیدی کہ تبریز کے گرجوں، یہودی عبادتگاہوں اور بُت خانوں کو مسمار کر دیا جائے۔ اُس نے اسلامی عبارتوں کے نئے سکّے بھی ضرب کرائے۔ اور مئی ۱۲۹۹ء میں ایک فرمان جاری کر کے سُود لینے کی ممانعت کر دی۔ اس لئے کہ دینِ اسلام کے منافی ہے۔ نومبر ۱۲۹۷ء میں مغول امراء نے اپنی قومی ٹوپی کی بجائے دستار اختیار کی۔

قدیم الوضع مغول امراء کا انحراف

تاہم اب بھی تاتاریوں، فرمانرواؤں اور امیروں کا ایک معتدبہ گروہ ایسا تھا جو غازان کے تبدیلِ مذہب کو شدید نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ متعدد بغاوتیں اور سازشیں ہونے لگیں۔ لیکن سختی سے دبا دی گئیں۔ حبیب السیر کی رو سے (مقامِ مذکور ص ۸۵) غازان اور نوروز نے ایک ہی مہینے کے عرصے میں مغولوں کے کم سے کم پانچ فرمانرواؤں اور ۳۷ امیروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ غازان حالانکہ خود نوروز کا ممنون تھا۔ لیکن اُس نے اس پر سُلطان

---

[1] حبیب السیر اور دولت شاہ میں یہی نام ہے۔ لیکن مجمل فصیحی کی رُو سے شیخ ابراہیم الجوینی ہے۔

مصر کے ساتھ سازشیں کرنے کا شُبہ کیا۔ وہ اگرچہ ہرات بھاگ گیا۔ اور ملک فخرالدین کرت کے ہاں پناہ گزین ہؤا۔ لیکن پکڑا اور مارا گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد جمال الدین دستجردانی، صدرِ جہاں[1] اور اس کا بھائی قطب جہاں بھی مار ڈالے گئے۔ اور زبردست مؤرّخ اور طبیب رشید الدین فضل اللہ وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ غازان ایک جابر حکمران تھا جیسا کہ سر ہنری ہوورتھ کا کہنا[2] ہے "قتل و خونریزی کی ایک وحشتناک فہرست اُس کے عہدِ حکومت کا طغرائے امتیاز ہے۔ اور دوستوں نے درست کہا ہے کہ رشید الدّین کے صفحات میں اندنوں کی روداد کا بمشکل کوئی صفحہ ہوگا جو کسی سرکاری عہدیدار کے قتل کے مذکور سے خالی ہو"۔

مصر کیساتھ لڑائیاں

اپنے عہد کے ایک قابلِ لحاظ حصے میں غازان مصر کیساتھ برسرِ پیکار رہا۔ ۱۲۹۹ء، ۱۳۰۰ء کے موسمِ سرما میں اس کی پہلی مہم حمص کے قریب مجمع المروج پر تاتاری فتح پر منتہی ہوئی۔ مصریوں نے جن کی تعداد دُشمن سے تہائی یا چوتھائی تھی شکستِ فاش کھائی۔ مغلوں کا دمشق اور شام کے دُوسرے حصوں پر سوروز کے لئے قبضہ رہا۔ اور اس دوران میں غازان کا نام خُطبے میں داخل کیا گیا۔ باوجود اس کے کہ غازان نے ۳۰ دسمبر ۱۲۹۹ء

۱؎ ۱۰، ۱۳ اپریل ۱۲۹۸ء، ملاحظہ ہو ہوورتھ کی تاریخ مغول جزو ۳ ص ۴۲۶-۷؛

۲؎ ہوورتھ بمقام مذکور ص ۴۲۱؛

کو لوگوں کی تسکین کے لئے منادی کرائی لیکن شام نے تاتاریوں کی غارتگری اور مظالم کے بھاری صدمے اُٹھائے[1]۔ اگلے سال (سنہ ۱۳۰۰ء۔ ۱۳۰۱ء) غازان نے پھر شام پر حملہ کرنے کی تیاری کی۔ لیکن موسم کی خرابی اور طغیانیوں نے اسے لوٹ جانے پر مجبور کیا۔ آٹھن مئی میں اُس نے سلطانِ مصر کو ایک خط روانہ کیا۔ جس کا جواب مکتوبہ اکتوبر ۱۳۰۱ء اسکے سفیروں نے دسمبر میں اُسے لاکر دیا[2]۔ ایک سال سے زیادہ مدت گزرنے پر جنوری سنہ ۱۳۰۳ء کے آخر میں غازان پھر مصریوں کے خلاف لشکر لیکر نکلا۔ تاریخِ مذکورہ بالا کو فرات عبور کرکے اُس نے کربلائے معلّٰی کی زیارت کی۔ اپنے شدید شیعی میلانات کے سبب یہ مقام اُس کے نزدیک مقدس تھا۔ مزار پر شاہانہ چڑھاوے دیئے۔ اور وہاں کے مجاوروں متولّیوں پر ایسی ہی عطا و بخشش کی۔ اس کے بعد عانہ کی طرف بڑھا۔ جہاں درباری مؤرخ وصاف نے اپنی تاریخ

مؤرّخ وصّاف غازان کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے سنہ ۱۳۰۳ء

کی جس میں وہ مشغول تھا پانچ میں سے پہلی تین جلدیں پیش کیں۔ یہ کتاب اوراقِ حاضرہ میں جا بجا منقول یا مذکور ہے۔ غازان اپنی فوج سمیت کچھ فاصلہ آگے مغرب کی سمت کو بڑھا۔ اور دوبارہ فرات کو عبور

---

[1] ہوورتھ مقام مذکور ص ۵-۴۴۴؛ [2] ان خطوط کے مندرجات کیلئے رجوع کرو ہوورتھ مقام مذکور ص ۴۶۱-۴۵۸؛

کیا کہ مہم کشف کے نتائج کا انتظار کرے، کشف اردبیل سے مغرب کی طرف دو دِن کا سفر تھا[1]۔ یہ مہم تاتاریوں کے لئے اتنی ہی منحوس ثابت ہوئی جتنی پہلی مبارک، کہ مارچ ۱۳۰۳ء میں اُنکو دمشق کے پاس

مرج الصّفر کے مقام پر تاتاریوں کی شکست ۱۳۰۳ء

مرج الصُّفّر میں بُری طرح شکست ہوئی مصری فتح پر شام اور مصر میں عام جشن ہوئے۔ اور قاہرہ میں تو ظاہر ہے کہ خاص خوشیاں منائی گئیں۔ وہاں ہر گھر سجایا گیا۔ اور ہر وہ موقع جہاں سے شاہی جلوس کا نظارہ اچھّی طرح کیا جا سکتا تھا ہجوم سے پُر ہو گیا۔ کہ سلطان کو فتحیاب لشکر کیساتھ داخل ہوتا دیکھیں۔ اُس کے آگے آگے سولہ سو تاتاری قیدی تھے۔ ہر ایک کی گردن میں کسی مُردہ رفیق جنگ کا سر حمائل تھا۔ علاوہ برآں ایکہزار اَور تاتاریوں کے سر نیزوں پر چڑھا رکھے تھے۔ اور ساتھ مغلوں کے بھاری جنگی طبل تھے جن کے چمڑے پھٹے ہوئے تھے[2]۔ مصری سلطان جس قدر نازاں تھا اور پھُولا پڑتا تھا۔ اسی نسبت سے غازان دِل گرفتہ ہو رہا تھا۔ اور فاتح کے ایک تحقیر و تضحیک سے بھرے ہوئے خط نے زخم پر نمک کا کام کیا[3]، جو تاتاری جرنیل اور کپتان اس بدبختی کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے اُنہیں اس نے واجبی سزا دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ لشکر

---

[1] ہوورتھ مقام مذکور ص ۴۷۷؛ [2] ایضاً ص ۴۷۸؛

[3] ایضاً ص ۴۷۸-۴۷۹؛

کی اس ہزیمت نے جو دِل شکستگی پیدا کی اُس نے غازان کو اندر ہی اندر گھُلا دِیا۔ اور ان ہی دنوں اسے معزول کرنے اور اس کی

غازان کی وفات ۱۳۰۴ء

جگہ اُس کے عمزاد بھائی آلفرینک کو تخت پر بٹھانے کی ایک ناکام سازش ہوئی جس نے اس دِل شکستگی کو اَور بڑھا دِیا۔ اور وُہ ۱۷ رمئی ۱۳۰۴ء کو ۳۲ سال کی قلیل عُمر میں چل بسا ؁

غازان کی سیرت

ایران بھر میں اس کی موت کا عالمگیر ماتم ہؤا اور معلوم ہوتا ہے کہ سچّے دِلوں سے کیا گیا۔ کیونکہ اُس نے اسلام کو پھر سے اس مرتبے پر پہنچایا جو اسے چنگیز خان کے حملے سے پہلے حاصل تھا۔ اس نے کفر کو دبایا اور ابتری دُور کر کے ضبط و نظام قائم کیا، اپنی سخت گیری کے باوصف وُہ اپنے اگلوں کے مقابلے میں رحمدل تھا۔ اور اس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وُہ خونریزی سے متنفر ہے تا آنکہ وہ مقتضای مصلحت یا ضروری نہ ہو۔ اس کے علاوہ وہ علم و ادب کا فیاض سرپرست تھا۔ اور نادار اور خدا ترس لوگوں کا فراخدل محسن تھا۔ گو کریہہ المنظر اور ادنیٰ اور حقیر صُورت کا آدمی تھا۔ لیکن شجاع اور مستقل مزاج تھا۔ اور مبداء فیض سے

علوم سے دِلچسپی

اُسے غیر معمولی طور پر وسیع دلچسپیاں اور اس کے علاوہ فوق العادت ذکاوت عطا ہوئی تھی۔ اسے صنعت و حرفت اور علوم طبیعی سے برابر کا شغف تھا۔ خصُوصًا ایک طرف

تو فنِ تعمیر سے اور دُوسری طرف نجوم، کیمیا، معدنیات، فلزکاری، اور نباتیات سے، مغولوں کی تاریخ اور انساب سے اُسے حیرت انگیز

اُس کا زبانوں کا علم

واقفیت تھی۔ اور اپنی مادری زبان مغولی کے علاوہ وُہ فارسی، عربی، چینی، تبّتی اور کشمیری کا ماہر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ لاطینی میں بھی اس کو مہارت تھی۔ مغربی اقوام اور ممالک کے بارے میں بھی اس کی معلومات اپنے اسلاف سے زیادہ تھیں۔ اور یہ سب معلومات اسے مختلف اقوام کے متعدد ایلچیوں سے حاصل ہوئیں جو اُس کے پایۂ تخت واقع آذربائجان کی طرف رجُوع کرتے تھے۔ ان معلومات کا عکس جیسا کہ ہوورتھ نے کہا ہے بزرگ مؤرّخ رشید الدّین کی تصنیف میں نظر آتا ہے جو اسکی حکومت کے متاخّر حصّے میں اُس کا وزیرِ اعظم رہا۔ اب مثلاً اس کو اس بات کی خبر تھی کہ سکاٹ لینڈ والے انگریزوں کو باج ادا کرتے تھے۔ یا مثلاً یہ کہ آئر لینڈ میں سانپ نہیں پائے جاتے۔ غازان کے دربار میں حاضر ہونے والے سفیروں میں چینیوں، ہندوستانیوں مصریوں، ہسپانویوں، انگریزوں اور کئی دُوسری قوموں کے نمائندے شامل تھے۔ ان میں اہلِ اسپین کا نمائندہ سولورو آف بارسیلونا[2] تھا اور

---

[1] دیکھو ورق ٣١٢ الف، جامع التواریخ کا نسخۂ دیوانِ ہند (India Office. ٣٥٢٤/٢٨٢٨ فارسی = فہرست ایتھے (Ethe)

[2] Solivero of Barcelona

انگریزوں کا جیوفرے دو لینگلے[1] :

غازان کا شیعی عقائد کی جانبداری کرنا

غازان کا اعتقاد اپنے اختیار کردہ دین یعنی اسلام میں بہت راسخ تھا۔ اور اُس نے اس مذہب کے شیعہ خیالات کیطرف صاف میلانِ طبع ظاہر کیا[2]۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کربلا کو کیسا نہال کیا۔ اور مشہد میں آٹھویں امام علیؑ رضا کی درگاہ بھی اُس کی سخاوت سے بہرہ یاب ہوئی۔ اپنے تبدیلِ مذہب میں وُہ خلوصِ عقیدت سے کہاں تک متأثر ہؤا۔ اور اس میں سیاسی مصلحت بینی کو کہاں تک دخل تھا۔ یہ امر بحث طلب ہے لیکن اس کا اسلام لانا بہرصورت ایران کے لئے برکت ثابت ہؤا۔ مستبدانہ حکومت رعایا کے حق میں ایک بُری چیز ہے۔ اور اس سے بڑھ کر بُری ہے۔ اگر عنانِ حکومت کسی بیرونی غالب قوم کے ہاتھ میں ہو۔ اور بدترین چیز ہے اگر حکام ایک ایسے بیگانہ مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہوں جو رعیّت کے دین کے ساتھ معاندت یا غیر ہمدردانہ سلوک روا رکھے۔ تاتاری تسلّط

---

[1] (Geoffry de Langley) ؛ [2] سید نور اللہ شوستری اس کو اُن شیعہ حکمرانوں کی فہرست میں داخل کرتا ہے جو اس نے اپنی مجالس المومنین کی چھٹی مجلس میں درج کئے ہیں۔ چونکہ اس تصنیف کی طبع طہران (۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱-۲ء) میں بدقسمتی سے صفحات پر نمبر نہیں لگائے گئے۔ اس لئے اس سے زیادہ پورا حوالہ نہیں دیا جا سکتا :

اب تک اس آخری اور سب سے ظالمانہ نوعیت کا رہا تھا۔ غازان کے قبولِ اسلام سے اکدم بہ سُدھر کر قسم دوم میں آگیا۔ اور اس صُورت نے اسکے قسمِ اوّل میں عود کرنے کے لئے راستہ پیدا کیا۔ ہوورتھ کہتا ہے (ص ۴۸۶) "جب غازان مسلمان ہوگیا تو اُس نے صاف طور پر مشرقِ بعید کے خانِ اعلیٰ کی اطاعت سے انحراف کیا۔ اب تک ایلخان محض خاقانِ منگولیا و چین کے زیر دست تھے۔ اب انہیں خود مختار ہونا تھا تو ظاہر ہے کہ ان کے سکّوں کی عبارتیں بھی بدلی جائیں گی"۔ اب شمنی[1] اور بُدھ راہبوں کا مسلمانوں پر زور نہیں چلتا تھا۔ اُنکی خانقاہوں اور مندروں کی جگہ مدرسوں اور مسجدوں نے لے لی۔ اسلامی علوم جو بعض فروعات میں مالامال تھے گو بعض میں کم مایہ بھی رہ گئے تھے۔ دوبارہ اُن کا احترام کیا جانے لگا۔ اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ مادّی اصلاحات بھی جن کا میلان ایلخانوں کے تاحال ستم زدہ محکوموں کی فلاح کی طرف تھا کچھ کم نہ ہوئیں۔ غازان اگرچہ ہمیشہ سخت گیر رہا اور اکثر ظالم۔ لیکن رعیّت کی طرف اپنے فرائض کے بارے میں اس کے معیار اپنے پیشرووں سے کہیں بلند تھے۔ اور اُس نے اُنکے

---

[1] Shamans ، شمنی مذہب کے پیرو، یہ مذہب سائبیریا میں رائج ہے۔ اسکے معتقدوں کا عقیدہ ہے کہ بدرُوحیں انسان کے نفع وضرر پر قادر ہیں۔ اور اُن کے پروہت یا مذہبی پیشوا ان بدرُوحوں کے اثر کو باطل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ (مترجم)؛

حصول کے لئے عملی وسائل اختیار کئے۔ اس کا قول[1] تھا "یقین رکھو خدا نے مجھے ترقی دیکر حاکم بنایا ہے۔ اور مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے بندوں کو میرے سپرد کیا ہے۔ کہ میں عدل و تسویہ کیساتھ ان پر حکومت کروں۔ اس نے مجھ پر انصاف کرنے اور مجرموں کو جرائم کے بموجب سزا دینے کا فرض عائد کیا ہے۔ اس کی یہ منشا ہے کہ میں ان کے ساتھ سب سے زیادہ سختی سے کام لوں جو بلند ترین رتبے پر فائز ہیں۔ ایک فرمانروا پر واجب ہے کہ بالخصوص اعلیٰ حیثیت رکھنے والوں کی خطاؤں کی پاداش کرے۔ تاکہ عوام عبرت پکڑیں"۔ اس کی اصلاحات کا تذکرہ یہاں بے محل ہو گا۔ خصوصاً جبکہ ہوورتھ اپنی بلند پایہ تصنیف میں انپر سیر حاصل بحث کر چکا ہے۔ (مقام مذکور ص ۴۸۷ تا ص ۵۲۰) یہ اصلاحات ان چیزوں کے متعلق تھیں:۔ ٹیکسوں کی وصولی، استحصال بالجبر کا انسداد، مقتدر تاتاریوں کے تباہ کن اور بیہودہ اسراف کی روک تھام، ان خوشحال شہروں میں اعتماد اور امن کی بحالی جنہیں ان چیزوں کی عدم موجودگی نے ویران و سنسان قصبے بنا کر رکھ دیا تھا۔ اور انکے علاوہ ملک کی مالی حالت کو ایک مستحکم اور مضبوط حالت پر لانا، ایک نئے سن کا اجرا جو ایلخانی یا غازانی کہلایا اور جس کا آغاز ۱۳ رجب سنہ ۷۰۱ھ (۱۴ مارچ سنہ ۱۳۰۲ء) کو ہوا۔ اسکے نافذ کرنے کا کم سے کم جزوی سبب یہ تھا کہ مالیات میں چند ایک بیقاعدگیاں سرایت کر گئی تھیں۔ بادشاہ ان کا خاتمہ کرنا چاہتا

[1] ہوورتھ مقام مذکور ص ۴۹۱ :

تھا۔ عصمت فروشی کو روکنے یا کم سے کم اسے گھٹانے کا سہرا بھی غازان کے سر ہے۔ اور اس بات پر بھی وہ تحسین کا سزاوار ہے کہ اس نے بذاتہٖ اخلاق کی ایک ایسی مثال قائم کی جو اس کے ہموطنوں کے متداول اخلاق سے کہیں بالاتر تھی ؂

غازان کا مقبرہ اور خیراتی اوقاف سابقہ مغول فرمانرواؤں نے اپنی قوم کے رواج کے مطابق ہمیشہ اپنے مدفن کو پوشیدہ رکھنے کی تدبیریں کی تھیں۔ اسکے برعکس غازان نے وُہ جگہ پہلے ہی سے مخصوص کر دی تھیں جہاں اسے دفن ہونا منظور تھا۔ اور اپنے مقبرے کے گرد درویشوں کیلئے ایک خانقاہ، شافعی اور حنفی فرقوں کے مدارس، ایک ہسپتال، ایک کتبخانہ، رصدگاہ، دارالعلم فلسفہ، سادات کے لئے ایک قیامگاہ اور فوارہ اور دیگر سرکاری عمارات بنوانے اور اُن کے لئے اوقاف معین کرنے میں کثیر رقمیں صرف کیں۔ ان اداروں کے بندوبست کے لئے ایک لاکھ تومان سالانہ کی مالیت کے اوقاف فراہم کئے گئے۔ اور ان آمدنیوں کے اصلی اور صحیح استعمال کی حفاظت کے لئے ہر ممکن پیش بندی کی گئی۔ مقبرے اور اس کی ملحقہ عمارات کے اردگرد غازانیہ نام بستی آباد ہوئی۔ جو جلد ہی اپنی وسعت میں تبریز کی ہم پلّہ ہوگئی اور خُوبصورتی میں اس پر سبقت لے گئی ؂

اُولجائتو خدا بندہ (۱۳۰۵ء تا ۱۳۱۶ء)

اولجائتو کا دورِ حکومت ۱۳۰۵ء تا ۱۳۱۶ء

غازان کے بعد اس کے بھائی ارغون کا بیٹا اُولجائتو تخت نشین ہُوا۔ اور ۲۱ر جولائی ۱۳۰۵ء کو اولجائتو محمد خدا بندہ کے لقب سے اس کی تاجپوشی ہوئی۔ اس وقت اس کی عُمر چوبیس سال تھی۔ جب بچہ تھا تو اُس کی ماں اروک خاتون کی آرزو پر اصطباغ پاکر نکولس[1] نام کیساتھ عیسائی مذہب میں داخل کیا گیا تھا لیکن آگے چل کر بیوی کے ذریعے جس کے ساتھ چھوٹی ہی عُمر میں بیاہا گیا تھا اسلام لے آیا۔

اس کا سابق نام خربندہ

لڑکپن کے ایام میں وہ خربندہ کے طُرفہ نام سے معروف ہوگیا تھا۔ جو بعد میں 'خدا بندہ' میں تبدیل کر دیا گیا۔ اپنی شاندار تاریخ کی جلد اوّل کے دیباچہ میں رشید الدین کے ہاں اولجائتو کے سابق نام پر حسبِ ذیل اشعار ملتے ہیں ؎

دوش در نامِ شاہ خربندہ　　فکر می کرد ساعتی بندہ
کہ مگر معنیٔ دراین ہمست　　کہ از آن غافل است خوانندہ
اندرون حرم بگوشش آمد　　کہ ہوا خواہ شاہِ فرخندہ

---

[1] Nicolas

معنیٔ در حروف این لفظ است | کہ بشاہ است سخت زیبندہ
عقد کن از رہِ حسابِ جُمّل | یک بیک حرفِ شاہ خربندہ
تا بدانی کہ ہست معنیٔ آن | سایۂ خاصِ آفرینندہ
نُہ حروف است آن و پانزدہ این | کہ بعقد ند ہر دو مانندہ
گوئی آن نُہ حروف چون صدفست | بدہ و پنج گوہر آگندہ
یا طلسمیست این ہمایون اسم | بر درِ گنجِ ایزد افگندہ
سرِ این اسم چون بدانستم | جمع شد خاطرِ پراگندہ
کردم ادراک معنی و گفتم | شاہِ خربندہ باد پایندہ
آفتابِ جلال و سلطنتش | از سپہرِ دوام تابندہ

ان اشعار میں جو اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا پورا ترجمہ کیا جائے۔ "نکتے کی بات یہ ہے کہ 'شاہ خربندہ' کے اعداد 'سایۂ خاص آفرینندہ' کے برابر ہیں۔ چونکہ یہودی عقیدے کی طرح مسلمانوں کے ہاں بھی یہ خیال ہے کہ الفاظ جن کے اعداد برابر ہوں کسی نہ کسی اعتبار سے مماثل ہوتے ہیں۔ پس بادشاہ کا نام خربندہ 'سایۂ خاص آفرینندہ' کا مرادف دکھایا گیا ہے۔ بقول دولت شاہ[1] (ایک مصنف جس کے غیر محققانہ بیانات کا کوئی بھروسا نہیں) "جب ارغون خان کے بعد غازان خاں بادشاہ ہوا تو اولجایتو اُسکے ڈر سے بھاگ نکلا۔ اور نواحی کرمان و ہرمز میں گدھے چرانے والوں (خربندگان) کے ساتھ

[1] میری ایڈیشن کا صفحہ ۱۰۔

پھرتا رہا۔ اس سبب سے اسے خربندہ کہتے ہیں اور بعضوں کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جب کوئی بہت خُوبرو فرزند ہوتا ہے۔ تو ماں باپ اس کا کوئی زشت نام رکھ دیتے ہیں تاکہ نظرِ بد اس پر کام نہ کر سکے۔ اور اسی جہت سے اس کو خربندہ کہتے ہیں[1]۔

الفرنیک مارا جاتا ہے ابھی اولجائتو کی تاجپوشی بھی نہیں ہوئی تھی جب یہ قرینِ مصلحت سمجھا گیا کہ تخت کے ایک ممکن دعویدار کی حیثیت سے اس کے عم زاد بھائی الفرنیک سے خلاصی حاصل کی جائے۔ چنانچہ خُفیہ خُفیہ تین مغول افسروں نے اسکا اور سپہ سالار ہرقداق کا کام تمام کر دیا۔ اولجائتو کا پہلا کام یہ تھا۔ کہ اس نے اپنے پیشرو غازان کے قوانین کو تقویت دی اور شریعت کی شدید پابندی کے لئے فرمان جاری کئے اور مشہور مؤرخ اور طبیب رشید الدین اور سعد الدین ساوجی کی متحدہ وزارتِ مالیہ قائم کی۔ اور انہیں (مغولی رعیت کو چھوڑ کر) ایرانی رعایا پر اختیارِ مطلق دے دیا۔ اس نے مراغہ کی رصدگاہ کا معاینہ کیا۔ اور مشہور فاضل نصیر الدین طوسی (جو حسبِ مذکور ۱۲۷۴ء میں فوت ہوا) کے بیٹے اصیل الدین کو منجمِ شاہی[2] کا منصب تفویض کیا اولجائتو کا بیٹا اور جانشین

---

[1] ایک اور توجیہہ کے لئے ملاحظہ ہو سفرنامۂ ابن بطوطہ (طبع دو فرمری، Defremery and Sanguinetri جلد دوم ص ۱۱۵)؛

[2] نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں؛

ابوسعید باپ کے سنِ جلوس میں پیدا ہوا۔ اور اسی سال کرمان کے قراختائی خاندان کا آخری فرمانروا معزول ہوا۔ اسی سال زنجان کے قریب

سُلطانیہ کی تاسیس

سلطانیہ کے عالیشان شہر کی بُنیاد پڑی[1] جس نے جلد ہی نہایت شاندار وسعت اختیار کر لی۔ اب یہ شہر تقریباً ایک ویران کھنڈر ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہی رہ گئی ہے کہ اس میں ایک پرشکوہ لیکن خستہ و شکستہ مسجد ہے۔ لیکن اُسکے بانی شاہی کا نام اب تک ذیل کی تُک بندی میں یاد کیا جاتا ہے۔ میں جب نومبر ۱۸۸۷ء میں مسجد کو دیکھنے گیا۔ تو میں نے یہ ایک بڈھے کی زبانی سُنی جو مسجد دیکھتے ہوئے میرے ساتھ رہا ؎

ای شاہ خدا بند: ظُلم کننده ایکی طاوق برکنده[2]

آخری حصہ تُرکی میں ہے۔ لیکن میں کبھی تحقیق معلوم نہیں کر سکا کہ اس

(حاشیہ ۲ صفحہ گزشتہ) اصیل الدین کی وفات مجمل فصیحی میں زیر سال ۸۰۲ ہجری (مطابق ۱۴۰۵-۱۴۰۶ء) مندرج ہے۔ ابو الفرج بار ہیبریس نے نصیر الدین کا سال وفات ۶۷۵ ہجری (مطابق ۷۷-۱۲۷۶ء) دیا ہے۔ طبع بیروت ۱۸۹۰ء صفحہ ۵۰۰ تا ۵۰۱ ؛

[1] تاریخ وصاف ص ۸-۴۷۷ مصنف اس واقعے پر خود اپنی ایک طویل نظم دیتا ہے۔ اسکے آخر میں وہ اس نظم کی تاریخِ تصنیف نظم کرتا ہے ؎

سال بر ہفصد و ده از گہِ ہجرت این شعر
گفتہ شد روز انیران زمہِ فروردین

= مارچ۔ اپریل ۱۳۱۱ء ؛

[2] اس ترکی حصے کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ "ایک گاؤں، دو مُرغ" مفہوم جیسا کہ فاضل مصنف نے کہا ہے واضح نہیں ہے ؛ (مترجم)

میں کس چیز کی طرف اشارہ ہے ؂

اولجائتو کے ہاں سفارتوں کا ورود اور ارسال

مسندِ شاہی پر بیٹھنے کے دو مہینے بعد تین مغول فرمانرواؤں کی سفارتیں (جن میں تیمور قاآن شہنشاہِ چین کی سفارت اہم ترین تھی) اولجائتو کے ہاں اس عارضی صلح کا پیغام پہنچانے وارد ہوئیں جو اُن کے درمیان قرار پائی تھی۔ تین ماہ بعد توقتائی کی ایک سفارت پہنچی اور کچھ عرصہ بعد اولجائتو نے سُلطان ناصر کے دوستانہ میلان کی طرف سے اطمینان کرنے کے لئے مصر کو ایلچی روانہ کئے۔ فلپ لوبل، ایڈورڈ دوم اور پوپ کلیمنٹ پنجم سے بھی اس کی مراسلت تھی۔ ان اربابِ اختیار کے نام خطوط اور پھر انکے جوابات کا لانے لے جانے والا طامس[۱] اِلدُوچی تھا۔ جیسا کہ دوسّوں نے تحریر کیا ہے (جلد چہارم ص ۸-۵۹۰) ظاہر ہے کہ مکتوب الیھم سے اُس نے یہ بات چھپائے رکھی کہ اس کا آقا مُسلمان ہوچکا ہے۔ کیونکہ جابہین کے مکتوبات اب تک محفوظ ہیں اور (ایڈورڈ دوم (اپنے ایک خط مؤرخہ ۳۰ نومبر ۱۳۰۷ء میں) اور پوپ کلیمنٹ پنجم (اپنے ایک خط مؤرخہ یکم مارچ ۱۳۰۸ء میں) دونوں صریحاً یہ فرض کئے بیٹھے ہیں کہ اولجائتو اُن فرقے کی بیخ کنی میں ان سے تعاون کریگا جسے وہ "محمد کا نفرت انگیز فرقہ" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اولجائتو اسی دوران میں کسی ایسی

[۱] دیکھو اوپر ص ۱۹ اور ذیلی حاشیہ ۲

آزمائش کی تدبیروں میں مصروف تھا۔ جس سے وہ ان متعدد یہودیوں کے خلوصِ نیت کا امتحان کرے جنھوں نے اُندنوں اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ کام بالآخر رشید الدین کی فضیلت نے سرانجام دیا۔ جس کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ یہودی عقائد وسنن کا پُورا ماہر تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے دُشمنوں نے اس پہ یہودی ہونے یا کم سے کم یہودیوں پہ ناجائز مہربانی روا رکھنے کا الزام بھی لگایا تھا۔ ہر عازمِ اسلام کو حکم دیا گیا کہ دُودھ میں اُبلا ہوا اُونٹ کا گوشت کھائے اور تغییرِ مذہب میں اسکے اخلاص کی کسوٹی یہ تھی کہ وہ کتنی آمادگی سے یہ دوہری حرام غذا کھاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جس کے لگ بھگ (۱۴ اپریل ۱۳۰۶ء کو) صاحب موصوف رشید الدین نے اپنی معرکۃ الآرا تاریخی تصنیف جامع التواریخ کا تمام شدہ جزو اولجائتو کی خدمت میں پیش کیا ؛

محاربات اولجائتو کے عہد کی بڑی لڑائیاں دو ہیں۔ ایک تو گیلان کی فتح جو ۱۳۰۷ء کی گرمیوں کے آغاز میں واقع ہوئی۔ اور دُوسری تسخیرِ ہرات جو اسی سال کے متأخر حصّے میں عمل میں آئی۔ دونوں مہموں میں ایک جانبازانہ مقاومت کا سامنا ہُوا۔ اور تاتاریوں نے خطیر نقصانات کے بعد فتح حاصل کی۔ ہرات کے دفاع میں بالخصوص شجاعت و تدبیر کے نمایاں جوہر غوری سردار محمد سام نے دکھائے۔ فخر الدین کرت نے شہر کی حفاظت اُسکے ذمّے لگائی گئی وہ انجام کار دھوکے سے پکڑا گیا اور مارا گیا۔ دوسرے قابلِ ذکر اشخاص جنھوں

قتل کی سزائیں

نے اولجائتو کے عہد میں ہلاکت کا مُنہ دیکھا۔ اُن میں موسٰی کرد ہے جس نے اسلام کے منجیِ موعود یعنی مہدی ہونیکا دعویٰ کیا تھا۔ سیف الدّین ہے جو اوّل رشید الدّین کا شریکِ کار رہا اور بعد میں اس کا حریف ہُوا۔ اسے خزانے سے غبن کرنے کے الزام میں قتل کیا گیا۔ اور تاج الدّین اوجی ہے جو ایک کٹر شیعہ تھا۔ اس نے اولجائتو کو اپنے عقائد پہ لانے کی کوشش کی تھی با ایں ہمہ جس بات کے انجام دینے میں بدنصیب تاج الدّین ناکام

اولجائتو کے مذہبی خیالات

رہا۔ وہ دُوسرے اسباب سے پُوری ہوگئی۔ اولجائتو فرقۂ حنفیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ اس فرقے کے علماء شاہی عنایات کے برتے پر سخت متکبر ہوگئے۔ حتّٰی کہ بادشاہ کے وزیر رشید الدین نے اُسے شافعی عقائد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ اس پر اولجائتو کے حضور میں دونوں سُنّی دبستانوں کے نمائندوں کے درمیان شدید مناظرے ہوئے انہوں نے بحث کی گرمی میں ایکدوسرے پر ایسی ایسی مکروہ تُہمتیں دھریں کہ اولجائتو دونوں پر سخت برہم ہُوا۔ اور تاتاری امراء نے بھی باوجود اپنی اکھڑ مزاجی کے سخت نفرت کا اظہار کیا۔ اور پُوچھنے لگے کہ کیا یہی وہ باتیں ہیں جن کے لئے تم نے اپنے اجداد کے دین سے مُنہ موڑا۔ اور چنانچہ اب اُنہوں نے اولجائتو کو اس دین کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی۔ انہی دنوں بادوباراں کے ایک

شدید طوفان نے اولجائتو کو اَور بھی مضطرب کر دیا۔ تاتاریوں اور اُن کے بخشیوں (یا پروہتوں) کے قول کے مطابق یہ قہر سماوی کی ایک علامت تھی۔[1] (ان بخشیوں کو غازان نے ایران سے باہر نکالدیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسکے جانشین کے زمانے میں واپس آئے۔ اسلئے دوسوں کی یہ دلالت درست نہیں کہ وہ اس خاص واقعہ کے سبب واپس لائے گئے)

کچھ عرصہ وُہ تذبذب کی اُلجھن میں رہا۔ حتیٰ کہ امیر ترمتاز نے اسے غازان کے نقش قدم پر چلنے اور شیعہ مسلک اختیار کرنے کی ترغیب دلائی۔ جب اُس نے حضرت علیؑ کے مزار کی زیارت کی تو وہاں ایک کشف ہُوا۔ جس نے اس کا عقیدہ راسخ کر دیا۔ کہ پیغمبرؐ کے بعد سب سے مقدم احترام حضرت علیؑ ابن ابی طالب اور اُن کی آل کا ہے۔ تو بالآخر اس کے بعد وُہ شیعہ ہو گیا[2]۔

شام کے خلاف مہم

اولجائتو نے شام کے خلاف لشکر کشی کی جس کا سب سے اہم واقعہ رحبہ کا محاصرہ تھا۔ لیکن تاتاریوں کو مجبور ہو کر یہ محاصرہ اس وقت اُٹھا لینا پڑا جب شہر قلتِ خوراک اور گرمی کی شدت سے انتہائی تنگی کی حالت کو پہنچ

---

[1] دوسوں جلد چہارم ص ۵۳۶ تا ص ۵۴۱؛

[2] اس کے ایک سکّے کی عبارت اس کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ دیکھو دوسوں جلد چہارم ص ۵۴۱؛

چکا تھا - بنو قتادہ کے بھائیوں کے ہاں جو جنگ کے پانسے اُلٹنے سے یکے بعد دیگرے مکّہ پر حکمران رہے - آپس کی ناچاقیوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ کچھ عرصہ کیلئے مصری سلطان ناصر کی بجائے اولجائتو کا نام خطبے میں داخل کیا گیا ٭

اولجائتو کی وفات ۱۳۱۶ء

اولجائتو ۱۶ر دسمبر ۱۳۱۶ء کو پینتیس برس کے نسبتہً قلیل سن میں نقرس کے مرض کے باعث فوت ہُوا - اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نیک شمائل اور فیاض تھا - غیبت سے جلد متأثر نہیں ہوتا تھا - لیکن تمام مغول سلاطین کی طرح مسکرات کا عادی تھا - اور بیشتر عیش و عشرت میں مشغول رہتا تھا - اس کی تجہیز و تکفین کی رسمیں بڑی دھوم دھام سے منائی گئیں - اور آٹھ روز تک اس کی رعیت نے اسکا سوگ منایا - اس کی بارہ بیویاں تھیں جن سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں لیکن ان میں سے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی بچپن ہی میں مر گئے - اس کا بیٹا ابو سعید بچا تھا وہی اس کا جانشین ہُوا - اسکی دو باقیماندہ بیٹیاں امیر چوبان سے بیاہی گئیں اور ان میں سے ایک ساتی بیگ آگے چل کر ۱۳۳۹ء میں قلیل مدّت کیلئے ملکہ بھی ہو گئی تھی ٭

ابو سعید (۱۳۱۷ء تا ۱۳۳۴ء)

ابو سعید کا زمانہ ۱۳۱۷ء تا ۱۳۳۴ء

ابو سعید کو جو اپنے باپ کی وفات کے وقت ماژندران میں تھا۔ اپریل ۱۳۱۷ء میں تاج پہنایا گیا۔ جبکہ ابھی تیرہ سال سے کم عمر کا تھا۔ امیر چوبان امیر الامرا بنایا گیا۔ اور علی شاہ کو وزارت میں رشید الدین فضل اللہ کا شریک کیا گیا۔ ان دو وزیروں میں بیحد رقابت رہتی تھی اور جلد ہی یہ بات آشکار ہو گئی کہ دونوں میں سے ایک کو ہتھیار ڈالنے پڑینگے۔ چنانچہ قرعہ رشید الدین کے نام رہا جس کی حق پسندی اور شرافت نفس نے اُسے گھاٹے میں رکھا۔ حریف کی سازشوں سے وہ اکتوبر ۱۳۱۷ء میں معطل کر دیا گیا۔ اور جنوری ۱۳۱۸ء میں مقتدر امیر سیونج کی موت نے اُسے اپنے خاص محافظ و سرپرست سے محروم کر دیا۔ امیر چوبان اس کو منصب پر بحال کرنیکا سخت آرزومند تھا اور ہرچند وُہ اسکے بُڑھاپے کا واسطہ دیتا ہُوا صرف یہ چاہتا تھا کہ اُسے اپنی باقیماندہ زندگی امن و سکون اور عزلت میں گذارنے دی جائے لیکن علی شاہ خبردار ہو گیا اور اشارہ پاتے ہی اُس نے اپنی سازشیں تازہ کر دیں اور ابو سعید کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ کہ رشید الدین اور اس کا جواں سال اور قبول صورت بیٹا خواجہ ابراہیم سابق بادشاہ اولجائتو کو زہر دینے کے مرتکب ہیں۔ دونوں کی سزائے

موت کا حکم ہوُا - اور ۱۸ / جولائی ۱۳۱۸ء کو اِس حکم کی تعمیل ہوئی۔

۱۳۱۸ء میں رشید الدین اور اُس کے بیٹے کا قتل

رشید الدین اس وقت ۷۰ برس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ اس کی لاش کی بے حُرمتی کی گئی۔ جائداد اور گھر بار لُوٹے گئے۔ عزیز و اقارب کو ہر طرح کی ایذا دی گئی۔ اس کی سیرت، فضیلت، خیرات اور ادبی کارناموں پر ابھی ہم مزید گفتگو کریں گے *

بغاوتیں اس الناک واقعے کے کوئی ایک ماہ بعد (اگست ۱۳۱۸ء) میں یساؤر کی بغاوت شروع ہوئی۔ جس کی ہوس نے اسے صوبہ خراسان کی طمع دلائی اور وہ یساؤل کے قتل کو سرانجام دینے میں کامیاب ہو گیا۔ خراسان کا مُختارِ کل ہو کر اُس نے ماژندران پر چڑھائی کی اور اسے تاراج کیا - لیکن ابوسعید کے جرنیل امیر حسین کے مقابلے پر پیٹھ دکھا کر گرم سیر یعنی خلیج فارس کے متصلہ گرم خطّے کو بھاگ گیا - اسی زمانے میں تاتاری سرداروں نے جن میں اِرنجِن[۱] توقماق اور اسن بُوقا وغیرہ شامل تھے - امیر چوبان کے خلاف ایک خوفناک سازش کی لیکن اُس نے ابوسعید کی مدد سے جون ۱۳۱۹ء میں اوجان کے قریب اُنہیں فاش شکست دی اور جو باغی سردار میدان میں کام نہ

---

[۱] یا اِرنجن، دوقوز خاتون کا بھتیجا - ملاحظہ ہو شابو کی تاریخ مارجبلاہا ثالث ص ۱۴۱ ؛

آئے تھے۔ فضیحت اور بے رحمی کیساتھ مارے گئے۔ ان مقتولین میں اباقا کی پوتی اور ارنچن کی بیوی کُنچک (یا کنجشک یا کچک) بھی تھی جو جنگ میں اپنے فرزند شیخ علی کا انتقام لینے کو نمایاں بہادری کے ساتھ لڑی اور نویری کے بیان کے مطابق[1] ابو سعید کے حکم سے اب اسے گھوڑوں کے پیروں تلے روندوایا گیا۔ دو مہینے بعد امیر چوپان کی خدمات کے صلے میں اس کی شادی ابو سعید کی بہن ساتی بیگ سے کردی گئی۔ اور خود بادشاہ نے اس جنگ میں اپنی جواں مردی کی یاد کیلئے بہادر خان کا لقب اختیار کیا ؛

قحط اور زلزلہ باریاں سنہ ۱۳۱۸ء اور سنہ ۱۳۱۹ء اس لئے قابلِ ذکر ہیں کہ ایشیائے کوچک اور دیگر مقامات پر مہلک قحط پڑے اور اُن کے پیچھے پیچھے سنہ ۱۳۲۰ء میں خوفناک زلزلہ باریاں ہوئیں۔ ابو سعید بہت بے چین ہوا۔ اور اس نے علمائے دین سے ان آفتوں کا سبب پوچھا۔ انہوں نے اسے غفلت شعاری پر محمول کیا جو میخواری اور زناکاری کے معاملوں میں عام برتی جاتی تھی۔ وہ یوں کہ کئی جگہ میکدے اور قحبہ خانے مسجدوں اور درس گاہوں کے بالکل پاس واقع تھے۔ اس پر ابو سعید نے

شرابخانوں کا بند کرنا بدمعاشی کے تمام اڈے بند کرا دئے اور

[1] دوسوں جلد چہارم صفحہ ۶۳۶ اور صفحہ ۶۴۱، ایک اور روایت کے مطابق وہ لڑائی میں ماری گئی اور وصاف کا بیان ہے کہ وہ سنگسار کی گئی اور اسکی لاش برہنہ کرکے بازار میں پھینک دی گئی ؛

اور شراب کی ایک بے حساب مقدار تلف کرائی۔ لیکن ہر ضلع میں مسافروں کے استعمال کے لئے ایک شراب خانہ رہنے دیا۔ ان اقدامات نے مصر میں بہت اچھا اثر پیدا کیا۔ اور ابوسعید اور مصری سلطان ناصر کے درمیان معاہدہ انجام پانے میں آسانیاں پیدا کردیں۔ سلطان ناصر

مغلوں کے خلاف حشیشین کا استعمال

نے ان ہی دنوں مغلوں کے خلاف اپنی معاندت کو اس درجہ بڑھا دیا تھا۔ کہ اس نے تیس اسمٰعیلی حشیشین کو شام سے قراسنقر کی جان لینے روانہ کیا۔ گو یہ کوشش ناکام رہی لیکن اُس نے مغلوں کو بیحد متنبہ کردیا۔ چنانچہ جانبین اپنی دیرینہ عداوتوں کو چھوڑنے اور مصالحت قائم کرنے پر تیار ہوگئے۔ اور ۱۳۲۳ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا جبکہ اس سے قبل ۱۳۲۰ء میں ایک تاتاری شہزادی[1] (باتو کی ایک پوتی) سلطان ناصر کے عقد میں دی جاچکی تھی ؞

تیمور تاش کی بغاوت

۱۳۲۲ء میں چوبان کے بیٹے تیمور تاش نے ایشیائے کوچک میں سرکشی کی اور مہدی یا مسیح موعود ہونے کا دعوی کیا۔ لیکن اس کا باپ اس پر غالب آیا۔ اور ابوسعید نے اُسے معاف کردیا اور اُسے اپنی

---

[1] دوسوں جلد چہارم ص ۶۵۵-۷ سرائے سے اسکندریہ تک شہزادی کے سفر میں تقریباً چھ مہینے لگے۔ اپریل ۱۳۲۰ء میں وہ اسکندریہ پہنچی ؞

ولایت پر بحال کر دیا۔ ان ہی دِنوں مصریوں نے آرمینیہ کو غارت کیا

آرمینیہ کی غارت

اور پوپ جون (بیست و دوم) نے یورپی طاقتوں کو اُن کی حمایت کیلئے بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس غرض کیلئے اس نے ابو سعید کو ایک خط (مؤرخہ ۱۲ جولائی ۱۳۲۲ء) لکھا[1]۔ اور اس میں اس کی مدد طلب کی اور ساتھ ہی اس کو عیسائیت قبول کرنے کی تلقین کی۔ اس نے ایک ڈومینکی راہب[2] فرانسوا دو پریُوز[3] کو سلطانیہ کا اُسقفِ اعظم بھی مقرر کیا[4]۔

ابو سعید چوبان کی طاقت سے مشوش ہو جاتا ہے

۱۳۲۴ء کے آغاز میں امیر الامراء علی شاہ نے وفات پائی۔ اُس کی قابلِ توجہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ پہلا مغول وزیر تھا جو اپنی طبعی موت مرا۔ رکن الدین صائن اسکا قائم مقام ہؤا جسے امیر مقتدر چوبان کی حمایت حاصل تھی۔ مگر اس امیر کے اقتدار نے ابو سعید کے دل میں حسد پیدا کرنا شروع کیا۔ ابو سعید اس

---

[1] اس خط کا ایک ترجمہ دوسّون نے دیا ہے، جلد چہارم ص ۳-۶۶۲؛

[2] Dominician مبلغ فرائروں کی ایک شاخ۔ اسکے درویش سیاہ فرائر Black Friars کہلاتے ہیں ۱۲۱۵ء میں سینٹ ڈومی نک St. Dominic نے اسکی بنا ڈالی؛ مترجم؛ [3] Francois de Peruse [4] دوسّون جلد چہارم ۶۶۴، یہ تقرر یکم مئی ۱۳۱۸ء کو ہؤا، پہلا اسقف ۱۳۲۳ء میں مستعفی ہو گیا۔ ولیم آف ایڈا Guillaume d'Ada اس کا جانشین ہؤا؛

وقت چوبیس سال کا تھا۔ اسے چوبان کی بیٹی شیخ حسن جلائر کی بیوی بغداد خاتون سے عشق ہو گیا۔ ادھر احسان فراموش رکن الدین نے اپنے محسن کے خلاف سازشیں کیں۔ ان باتوں سے ابوسعید اور چوبان میں کھلم کھلا بگاڑ کی صورت پیدا ہو گئی۔ ماوراء النہر کے مغلوں نے خراسان پر حملہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس پر چوبان اور اسکے بیٹے حسن کو سلطنت کے مشرقی حصے میں جانا پڑا۔ ایک دُوسرا بیٹا دمشق خواجہ نام جس کے خلاف ابوسعید پہلے ہی سے برانگیختہ ہو رہا تھا دربار ہی میں رہا۔ اور ۱۳۲۷ء کی بہار میں موسم سرما کے پایۂ تخت بغداد سے واپس سلطانیہ آگیا۔ ابوسعید روز بروز دمشق خواجہ کی نخوت اور بداخلاقی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور صرف اس انتظار میں تھا کہ اسے ہلاک کرنے کا معقول بہانہ ملے۔ اسے زیادہ دیر نہ ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ انہی دنوں یہ انکشاف ہوا کہ دمشق خواجہ اولجائتو کی کسی پُرانی داشتہ کیساتھ عاشقانہ سازباز کر رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ جُرم کی گرفت ہو چکی

دمشق خواجہ مارا جاتا ہے
اگست ۱۳۲۷ء

ہے تو اُس نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن پکڑا اور مارا گیا۔ اور سلطانیہ کے ایک دروازے پر اُس کے سر کی نمائش کی گئی۔ یہ سب کچھ ۲۵ اگست ۱۳۲۷ء کو پیش[1] آیا۔

[1] ابن بطوطہ دمشق خواجہ کی موت کا پورا حال لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد دوم ص ۱۱۷-۵ ؛

دمشق خواجہ چار بیٹیاں چھوڑ مرا۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور دلشاد خاتون تھی۔ پہلے اس کی شادی ابو سعید سے ہوئی۔ اس سے ابو سعید کے مرنے کے بعد ایک بچی ہوئی جو خورد سالی ہی میں مرگئی۔ بعد میں وہ شیخ حسن ایلخانی کیساتھ بیاہی گئی۔ اس کے ہاں سے اس کا ایک بیٹا سلطان اویس اور ایک اَور بیٹا پیدا ہوُا۔ یہ سلطان اویس ۱۳۵۶ء سے ۱۳۷۴ء تک بغداد میں حکومت کرتا رہا۔ اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے ارباب ادب اور علوم کا قابلِ ذکر سرپرست تھا۔

چوبان کی موت اس فیصلہ کن اقدام کے بعد ابو سعید نے چوبان اور اُسکے پورے خاندان کے استیصال کی ٹھانی چوبان نے بادشاہ کی نیت سے خبردار ہوکر پہلے تو رکن الدین صائن وزیر کو مروا ڈالا۔ پھر اُس نے اپنی فوجیں جمع کرنی شروع کیں۔ حتّٰی کہ ستر ہزار کا لشکر ہوگیا تو اُسے لیکر مغرب کے رُخ چلا۔ پہلے مشہد آیا وہاں سے سمنان پہنچا۔ یہاں سے اس نے معزز بزرگ شیخ علاء الدین کو بھیجا کہ ابو سعید کے پاس اس کی شفاعت کرے۔ ایلخان ٹس سے مس نہ ہوُا اور چوبان مغرب کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ حتّٰی کہ ابو سعید سے صرف ایک دِن کی مسافت باقی رہ گئی۔ تمام حالات چوبان کی مساعدت میں نظر آتے تھے۔ تا آنکہ اس کے بعض اہم ترین امیر اس کا ساتھ چھوڑ کر بادشاہ سے جا ملے۔ اور کوئی تیس ہزار لشکری اپنے ساتھ لے گئے۔ اس پر چوبان ساوہ کو واپس مُڑا۔ وہاں اُس نے کُردوچین

اور ساتی بیگ اپنی بیویوں کو چھوڑا اور پھر طبس کا رُخ کیا۔ اس کیساتھ رفتہ رفتہ اسے چھوڑتے گئے حتیٰ کہ بالآخر صرف سترہ اشخاص رہ گئے اب اس نے ہرات میں غیاث الدّین کرت کے ہاں پناہ لینے کا قصد کیا۔ لیکن اُس نے اُس کیساتھ غداری کی اور اسے اُسکے خاص مصاحبوں کے ساتھ پھانسی دلوا دی۔ اس کی میت ایلخان کے حُکم سے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ مدینے پہنچائی گئی۔ اور وہاں اُس مقبرے میں دفن کی گئی جو اُس نے اپنے لئے تیار کرایا تھا[1]۔

چوبان کے بیٹے تیمور تاش کا انجام۔ اگست ۱۳۲۸ء

ابو سعید کے لئے بغداد خاتون سے شادی کرنیکا راستہ اب صاف تھا۔ لیکن ہر چند اس عورت نے جلد ہی اس پر بڑا اثر ورسُوخ پیدا کر لیا۔ ابو سعید اسکے خاندان پر تعدّی کرنے سے باز نہ آیا۔ چوبان کے بیٹوں میں ایک اَور تیمور تاش جو ایشیائے کوچک کا گورنر تھا۔ بھاگ کر مصری دربار میں پناہ گزین ہؤا۔ وہاں ۱۱ر جنوری ۱۳۲۸ء کو پہنچا۔ پہلے تو اس کا اچھا استقبال ہؤا اور پُرتکلف مہمانداری ہوئی۔ اس کیلئے ۱۵۰۰ دینار روزکا راتب بندھا۔ لیکن ادھر ابو سعید کے پُر اصرار تقاضے تھے کہ مجرم تحویل کیا جائے۔ ساتھ ہی سلطانِ مصر کے درباریوں نے سازشیں شروع کر دیں ان باتوں نے مل کر سلطان کو اس فیصلے پر پہنچایا۔ کہ اس سے پیچھا

---

[1] دیکھو ابنِ بطوطہ جلد دوم صہ ۱۱۹ تا صہ ۱۲۱؛

چُھڑانا چاہیئے۔ کچھ دیر تو وُہ شش وپنج میں رہا۔ کہ اپنے اس مہمان کو جو کبھی ایسا ذی اقتدار تھا ابوسعید کے حوالے کرے یا قتل کردے لیکن آخر اسے مارنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس خوف سے کہ اگر اسے ابوسعید کے پاس بھیج دے تو ممکن ہے اس کی بہن بغداد خاتون اور اُس کا دیرینہ دوست غیاث الدین (رشید الدین بزرگ کا بیٹا) جواب خود وزیرِ اعظم تھا بیچ بچاؤ کردیں۔ اور مبادا ایلخان درگُزر پر آمادہ ہوجائے تو اس صورت میں ضرور ہے کہ وہ مصریوں سے انتقام لینے کی کوشش کریگا۔ چنانچہ ۲۲ر اگست ۱۳۲۸ء (جمعرات) کی رات کو تیمور تاش زندان میں مارا گیا۔ اور اس کا سر مسالہ لگاکر ایک صندوقچے میں ابوسعید کے پاس بھیج دیا گیا ؞

وزیر غیاث الدین بن رشید الدین کے متعلق ہمعصر مؤرخ حمد اللہ مستوفی اپنی تاریخ گزیدہ میں جو اُس نے اسی کے نام معنون کی ہے پُرجوش مدح کے الفاظ میں رقمطراز ہے :-

وزیر نیکو نام در ضبطِ کارِ جہان ہمچون پدر بزرگوار خود مساعی جمیلہ بتقدیم رسانید و بانگِ عفو ہنگام قدرت غایت کمالِ انسانیت است و از بزرگان ماتقدم ہر کس این طریق سپردہ اند بحسنِ سیرت علوِ مرتبت و نام باقی یافتہ اند این وزیر فرشتہ سرشت از غایت یقین بر آن مزید فرمود و ہر کہ در حقِ خاندانِ مبارک ایشان بدی ہای کہ تقریرِ آن موجبِ تنفرِ خاطرِ مستمعان باشد کردہ بُود بخلاف

آنکه بمکافات مشغول شود رقم عفو بر جرائد جرائم ہمگنان کشید آن
بدی ہا بہ نیکی مقابلہ فرمود و در حق از ایشان از یُمنِ دولت نسخۂ
کرد بانواع اکرام ایشانرا بمراتب عظیم رسانید و متقلد اشغالِ خطیر گردانید
واکنون آنچہ ہر یک تمنا میکردند برای العین مشاہدہ می کنند"[1]۔

غیاث الدین کی مسامحت قریب قریب اس کی تباہی کا سامان ہو چلی تھی۔ وہ یُوں کہ باغی امیر نارین بُوقا عین اس وقت ابوسعید کے پاس اُس کی شفاعت کا مُلتجی ہؤا جب ادھر وہ وزیر کے خُفیہ قتل کی سازش کر رہا تھا۔ لیکن اس موقعہ پر بغداد خاتون نے بادشاہ کو برانگیختہ کیا۔ اُسے نارین بُوقا سے اسلئے نفرت تھی۔ کہ وہ اس کے باپ اور بھائیوں کی ہلاکت کا محرّک تھا۔ چنانچہ اس کے اکسانے پر بادشاہ نے مداخلت کی۔ اور باغی اور اس کے شریکِ سازش تیمور تاش کو ۵ اکتوبر ۱۳۲۷ء کے دن قتل کرا دیا ؎

ہرات کے کُرت حکمران ابوسعید کے عہد کے آخری سنین میں ہرات کے کُرت بادشاہوں میں کئی تبدیلیاں دیکھی گئیں۔ غیاث الدین اکتوبر ۱۳۲۹ء میں مر گیا۔ اور اس کا سب سے بڑا بیٹا شمس الدین جانشین ہؤا۔ وُہ شراب نوشی میں اسدرجہ مُبتلا تھا۔ کہ کہتے تھے دس ماہ کے زمانۂ حکومت میں صرف دس دن ہشیار رہا۔

---

[1] رجوع کرو ص ۶۱۱، طبع عکسی تاریخ گزیدہ، مطبوعہ سلسلہ یادگار گب سلسلہ نمبر ۱۴ جلد اوّل ؛

اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی حافظ تخت پر بیٹھا جو سلیم الطبع فاضل تھا ۱۳۳۲ء میں سازش سے قتل کیا گیا۔ اس کی جگہ اس کا خوردسال بھائی معزالدین تخت پر بٹھایا گیا۔ ابوسعید نے اسکے انتخاب کی تصویب کی۔ معزالدین نے چالیس برس کا طویل زمانہ پایا۔ اسکے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین پیر علی برسرِ حکومت آیا۔ اسی کے زمانے میں یہ سلسلہ جو ۱۲۴۵ء سے جاری تھا تیمور کے ہاتھوں منقطع ہوا ؛

اگست ۱۳۳۵ء میں ابوسعید کو معلوم ہوا کہ اُردوئے زرّیں[1] کا

---

[1] چنگیز خان کا سب سے بڑا بیٹا جوجی دریائے سیحوں کے شمالی علاقے کا حاکم تھا۔ جوجی کی وفات کے بعد اُسکے چار بیٹے اُوردا، باتو، توقای تیمور اور شیبان مختلف علاقوں کے حکمران رہے۔ وہ تمام قبائل جو ان چاروں بھائیوں اور ان کی اولاد کے زیرِ حکومت تھے مجموعی طور پر اُردوئے زرّیں (= زرّیں لشکرگاہ) کے نام سے موسوم تھے۔ ۱۲۲۶ء میں اُوردا باپ کی وفات کے بعد اسکا جانشین ہوا۔ یہ اور اُسکے اخلاف خاندان کے برائے نام رئیس تھے۔ اور ان کا سلسلہ ۱۵۵۴ء تک قائم رہا۔ باتو نے ۱۲۲۴ء میں مغربی قبچاق کے قبائل کو زیر کر لیا تھا۔ جو اُردوئے ازرق کہلاتے تھے۔ اُس کے اخلاف ۱۳۵۹ء تک برسرِ حکومت رہے۔ سب سے طاقتور سلسلہ باتو ہی کا تھا۔ توقای تیمور کا سلسلہ مٹتا گھٹتا ۱۷۸۳ء تک جاری رہا۔ شیبان کا سلسلہ ۱۸۷۲ء تک قائم رہا۔ ملاحظہ ہو گبن (Gibbon) جلد ہفتم ص۵، حاشیۂ زیرین اور سٹینلے لین پُول (S. Lane-Poole) کی تصنیف "سلسلہ ہائی سلاطینِ اسلامی" (Mohammadan Dynasties) ص ۲۲۲ بعد ؛ (مترجم)

خان ازبک اُس کے مقبوضات پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو وُہ اُس کے ساتھ جنگ آزمائی کی تیاری کر رہا تھا کہ اس دوران میں بیمار

ابُوسعید کی وفات ۱۳۳۵ء

ہو گیا۔ اور اسی سال ۳۰ر نومبر کو اران کے قریب قراباغ میں فوت ہو گیا۔ ابن تغری بردی اس کی توصیف بدین الفاظ کرتا ہے کہ " شجاع اور ذہین فرمانروا تھا۔ شاہانہ شکل وشباہت رکھتا تھا۔ فیاض اور ظریف تھا " اچھا خطّاط نغمہ گر اور موسیقار تھا۔ اور اُس کے مؤرّخ نے نہ صرف اسکے عُمدہ اخلاق اور شراب کی تجارت کا انسداد کرنے پر تحسین کی ہے بلکہ عیسائی گرجوں کی مسماری پر بھی۔ میر خواند نے قیاس ظاہر کیا ہے اور ابن بطوطہ[1] نے وثوق سے کہا ہے کہ ابوسعید کو بغداد خاتون نے زہر دیکر مار ڈالا۔ کیونکہ اس کی چھوٹی بہن اور رقیبہ دلشاد خاتون ایلخان پر حاوی ہوتی جا رہی تھی[2]۔ بغداد خاتون قصور وار تھی یا نہیں بہر کیف مار ڈالی گئی[3]۔

ابوسعید کی موت سے ایران کے ایلخانوں کا خاندان جس کی بنا

---

[1] ابن بطوطہ، جلد دوم ص ۱۲۳؛

[2] دیکھو ہوورتھ کی تاریخ مغول، حصہ سوم، ص ۶۲۴ - اس صفحے کی پہلی سطر میں ابوسعید کی وفات کی تاریخ ۳۰ر نومبر ۱۳۳۴ء دی ہے۔ اس غلطی کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ دوسّون کی "تاریخ مغول از چنگیز تا تیمور" کا آخری پیرا لاپروائی سے پڑھا گیا ہے۔ جلد چہارم ص ۷۱۶؛

[3] اسکے مارے جانے کا طریقہ ابنِ بطوطہ نے بیان کیا ہے جلد دوم ص ۱۲۳؛

ہلاکو نے ڈالی تھی عملاً ختم ہو گیا۔ اور ابتری کا ایک دور آیا اور جاری رہا۔ حتیٰ کہ خاکِ توران سے ۳۵ برس بعد فتوحات کی ایک تازہ زبردست لہر اُٹھی جس نے ایران اور ایشیائے کوچک کو لپیٹ میں لے لیا۔ اس سے ہماری مُراد بے رحم اور ناقابلِ مزاحمت فاتح تیمور لنگ کی لشکر کشی ہے۔ عجیب اتفاق ہے جو مطلع السعدینؔ[1] میں مذکور ہؤا ہے۔ کہ تیمور کی ولادت کا سال وہی ہے جو ابو سعید کی وفات کا سال ہے۔ اور اس کیلئے "لوذ" کی تاریخ نکالی گئی ہے۔ (لوذ = ۷۳۶ھ[2]) اور یہ تاریخ بالکل مناسبِ حال ہے۔ کہ لوگ اس دوہری آفت سے جو یہ سال اپنے ساتھ لیکر آیا خدا کی پناہ مانگیں۔ ادھر ابو سعید کی موت سے اور ادھر تیمور کی پیدائش سے۔

ارپا کی تخت نشینی ابو سعید مرا تو اس کا کوئی بیٹا اس کے بعد نہ تھا۔ چنانچہ وزیر غیاث الدین ابن رشید الدین کے ایما پر ہلاکو کے بھائی اریک بُوقا کی اولاد میں سے اَرپا ایک شہزادہ بطور جانشین منتخب ہُوا۔ اپنی حالت کو مستحکم کرنے کیلئے اس نے چوبان کی بیوہ اور ابو سعید کی بہن ساتی بیگ سے شادی کر لی۔ پھر اس نے ازبک کے خلاف لشکر کشی کی۔ اور اسے شکست دی۔ لیکن اس دوران میں امیر علی پادشاہ اور دُوسرے امراء نے ارپا کے انتخاب کو نامنظور کرتے

---

[1] دیکھو ریو کی فہرست مخطوطاتِ فارسی ص ۱۸۲؛

[2] دیکھو ہوورتھ کی تاریخ مغول جزو ۳ ص ۶۳۴؛

مُوسیٰ کو حریف دعویدار بناکر کھڑا کردیا گیا

ہوئے ہلاکو کے اخلاف میں سے موسےٰ ایک شخص کو حریف ایلخان بناکر کھڑا کر دیا گیا۔ دونوں حریفوں کے درمیان ۲۹ راپریل ۱۳۳۶ء کو ایک جنگ ہوئی۔ آرپا کو شکست ہوئی اور جلد ہی غیاث الدین وزیر تہ تیغ کیا گیا۔ موسیٰ کو اپنی فتحمندی کے ثمر زیادہ دِنوں نصیب نہ ہوئے۔ کیونکہ شیخ حسن جلائر معروف بہ بزرگ نے ہلاکو کی اولاد میں سے ایک اَور حریف محمد شاہ کو کھڑا کر دیا۔ نوشہر کے شہر کے پاس اَلتاغ کے مقام پر ایک اور معرکہ ہوا۔ جس میں شیخ حسن بزرگ کی دغابازی سے موسیٰ کو شکست ہوئی اور علی پاشا ہلاک ہوا۔ لیکن اب طغای تیمور کو ایک اَور دعویدار کی صورت میں کھڑا کر دیا گیا۔ جس نے اپنے لشکر کو موسیٰ کی فوج کیساتھ ملا لیا۔ اور جون ۱۳۳۷ء میں مراغہ کے قریب شیخ حسن بزرگ سے ایک اَور محاربہ کیا۔ اس میں موسیٰ گرفتار ہُوا اور مارا گیا (جولائی ۱۳۳۷ء) اور طغای تیمور لبسطام کو بھاگ گیا۔ شیخ حسن ابن تیمور تاش ابن چوبان نے اس افراتفری کو اَور بڑھا دیا۔ وہ ایسے کہ ایک جھُوٹا دعویدار پیش کیا۔ جس کے متعلق وُہ کہتا تھا۔ کہ یہ اسکا باپ تیمور تاش ہے جس کے بارے میں ذکر آچکا ہے کہ سلطانِ مصر نے اسے قتل کرایا تھا۔ بالآخر ۱۰ر جولائی ۱۳۳۸ء کو نخجوان کے مقام پر شیخ حسن بزرگ اور شیخ حسن کوچک کے درمیان ایک جنگ واقع ہوئی۔ اس میں شیخ حسن بزرگ کو شکست ہوئی اور اس کا پروردہ حمایت

محمد شاہ گرفتار ہو کر مارا گیا۔ شیخ حسن کوچک نے اب نام نہاد تیمور تاش کی مخالفت کی۔ اور بادشاہِ متوفّی ابو سعید کی بہن اور اپنے دادا چوبان کی بیوہ ملکہ ساتی بیگ کی وکالت کی۔ چنانچہ ۷۳۹ھ (۹-۱۳۳۸ء) میں اس کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اور حسنِ بزرگ اور حسنِ کوچک کے درمیان صُلح ہو گئی ؛

ان سازشوں کا مزید تتبّع کرنا لا حاصل ہے۔ جو ناظرین اُن کے بارے میں اور شیخ حسن کوچک کی پیچدار سیاست کے متعلق اطلاعات حاصل کرنا چاہیں وہ دوسّوں اور ہوورتھ کی تاریخوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ عیار شیخ حسن کوچک نے طغای تیمور کیساتھ دغا کی اور ہلاکو کی اولاد میں سے سلیمان خان ایک اور کٹھ پتلی کو کھڑا کر دیا۔ اور ساتی بیگ کی اس سے شادی کر دی۔ ادھر حسن بزرگ نے بطور حریف اباقا کے اخلاف میں سے ایک شخص شاہجہان تیمور کو کھڑا کیا۔ ۱۳۴۰ء میں مراغا کے قریب دونوں گروہوں میں ایک جنگ ہوئی۔ شیخ حسن بزرگ کو زک ہوئی۔ اور وُہ سب کُچھ چھوڑ چھاڑ بغداد چلا گیا۔ اور وہاں اپنی کٹھ پتلی شاہجہان تیمور کو معزول کیا۔ اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے جلائروں کے خاندان کی بُنیاد ڈالی جو سیاسی تاریخ کی نسبت ادبی تاریخ میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے ۱۴۱۱ء تک مغربی ایران اور عراق پر حکومت کی۔ اور بغداد اپنا پایۂ تخت رکھّا۔ رہا چوبان کا پوتا شیخ حسن کوچک، سو وہ ۱۳۴۳ء میں اپنے حریف کے

خلاف لشکر کشی کر رہا تھا۔ کہ اس کی بیوی عزت ملک نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اُسے اس جُرم کی سزا یہ ملی کہ سخت رُسوائی اور بے رحمی کی موت ماری گئی۔ اس واقعے پر معاصر شاعر سلیمان ساوجی (جو شیخ حسن بزرگ کا پروردہ ہونے کے سبب چوبان کے پوتے کے مرنے پر خوش ہؤا) ذیل کے اشعار کہتا ہے جو شاید ہی ترجمے کے متحمل ہوسکیں ؎

زہجرتِ نبوی رفتہ ہفصد و چل و چار | در آخرِ رجب اُفتاد اتّفاقِ حَسَن
زنی چگونہ زنی خیرِ خیراتِ جہان | بزورِ بازوئی خود خُصیَتَینِ شیخ حسن
گرفت محکم ومیداشت تا بمُرد وبرفت | زہی خجستہ زنی خایہ دار مرد افگن

ایران میں مغولی اقتدار اب ختم ہو چکا تھا۔ اور جب تک تیمور کے لشکروں نے ملک پر یکبارگی تسلط نہ کیا (۱۳۸۴ء تا ۱۳۹۳ء) ایران کم سے کم چار سلطنتوں میں بٹا رہا یعنی خاندان جلائر، خاندانِ مظفری، خاندانِ کرت اور خاندان سربدار کی سلطنتیں۔ اُن کی تاریخ ایک اور باب میں ملاحظہ کی جائیگی ؁

ابنِ بطوطہ کے سفر نامے کے علاوہ جن کے حوالے حواشی میں جا بجا دیئے گئے ہیں فرائر اوڈورک آف پورڈی نون کی سیاحت

لہ حبیب السیر جلد سوم ص ۱۳۱ (بمبئی چاپ سنگی ۱۸۵۷ء) مجھ کو کلیاتِ سلیمان (طبع سنگی بمبئی) میں یہ اشعار نہیں مل سکے لیکن مطلع السعدین میں دئے ہیں ؁

لہ Friar Odoric of Pordenone.

ایران[1] (تقریباً ۱۳۱۸ء)، اُسقفِ سلطانیہ کے نوشتہ (سنہ ۱۳۳۰ء) ایک رسالے میں "بُوساییٹ" یا "بُوسَیِیہ" (یعنی ابو سعید) اور اُس کی سلطنت کے حالات، نیز اُن قونصلوں کے بیانات[2] جو ۱۳۰۵ء اور ۱۳۳۲ء کے درمیان تبریز اور دیگر ایرانی شہروں میں وینس کے مفادات کی نمائندگی کرتے رہے، اس دور کی تاریخ پر بہت سی روشنی ڈالتے ہیں ؛

---

[1] اس تصنیف کی ایک عُمدہ اڈیشن بہ تصحیح و ترتیب ایم ہنری کوردی ایم (M Henri Cordier) سنہ ۱۸۹۱ء میں پیرس کے لوڑوک (Leroux) نے شائع کی تھی ؛

[2] دیکھو ہوورتھ، تصنیف مذکور، جزو ۳، ص ۶۲۸ - ۶۳۳ ؛

باب دوم

ایلخانی دَور کے مؤرخین

یہ دَور بڑے بڑے مؤرخوں کا دَور ہے

زیر مطالعہ تقریبًا ستر برس کا زمانہ خاص طور پر ادبی نقطۂ نظر سے بہت قابلِ توجہ ہے کیونکہ اس نے بہت سے ممتاز فارسی مؤرخ پیدا کئے۔ ان میں کم سے کم آٹھ تو کسی قدر مفصّل تذکروں کے مستحق ہیں ان کے علاوہ ایک قدرے بڑی تعداد قابلِ اعتنا شاعروں کی ہے جن میں اگر متوسط درجے کے شاعر بھی ملا لئے جائیں تو ان کا شمار بآسانی بڑھ سکتا ہے۔ ان فارسی مصنّفوں پر غور کرنے سے پہلے بہرحال ضروری ہے کہ چند الفاظ اس عہد کے عربی ادب پر کہے جائیں۔ اُن طلبہ کے لئے بھی جو مقدّم طور پر فارسی علم و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں مناسب ہے کہ اس عربی ادب کا ایک عام تصوّر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں:

اس دَور میں عربی ادب

جب تک خلافت قائم رہی اور بغداد اگر راسخ العقیدہ مسلمانوں کا مرکز رہا نہیں تو کم از کم سمجھا ضرور جاتا رہا

عربی زبان کو تمام وسیع اسلامی ممالک میں ویسا ہی رُتبہ حاصل رہا جیسا ازمنۂ وسطیٰ میں لاطینی کو یورپ میں رہا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زبان اُن دنوں صرف علوم دینی فلسفہ اور سائنس کی زبان نہ تھی۔ یہ حیثیت تو اسے آج بھی نصیب ہے بلکہ اُن دنوں یہ زبان بہت حد تک سفارت، شائستہ سوسائٹی اور ادبیات کی زبان بھی تھی۔ تاتاریوں کے ہاتھوں جب انقراضِ خلافت عمل میں آیا۔ تو اُس نے اس زبان کے رُتبے کو بُہت گھٹا دیا۔ اور اسکی حیثیت کو ضُعف پہنچایا۔ لیکن جب تک وُہ لوگ زندہ رہے جنھوں نے قبل اسکے کہ اسلام نے اس زبردست آفت کا مُونہہ دیکھا اپنی تعلیم مکمّل کر لی تھی (یعنی سقوطِ بغداد سے کوئی پچاس ساٹھ سال بعد تک) یہ تنزّل بُہت نمایاں نہ ہوُا۔ متاخّر زمانوں میں جن کا ہم مطالعہ کریں گے معاصر عربی ادب کی واقفیت (جو اگرچہ ایرانی تاریخ اور ادب کے طالبعلم کے لئے ہمیشہ اہم ہے) اتنی ضروری نہیں رہتی۔ لیکن زیر بحث زمانے میں تو یہ اَور بھی ناگزیر ہے خصوصًا تاریخ سیرت اور سیاحت کے شعبہ جات میں۔ اور دینیات، فلسفہ اور سائنس کا تو ذکر ہی کیا وہاں تو اس کے بغیر بالکل چارہ ہی نہیں *

عربی ادب کی تین قسمیں جو فارسی کے مُطالعہ کرنیوالوں کیلئے اہم ہیں

عربی ادب جس سے ہمارا یہاں واسطہ ہے تین قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اول ان دو زبانی ایرانیوں کی عربی تصانیف جن کی فارسی تالیفات اُنہیں

اپنے ملک کی ادبی تاریخ میں مذکور ہونے کا حقدار بناتی ہیں۔ اس قسم اول کی مثال کے طور پر قاضی القضاۃ ناصر الدین بیضاوی کو لیا جا سکتا ہے البیضا جس سے اس کی نسبت مأخوذ ہے صوبۂ فارس کی ایک بستی کا عربی نام ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ ایک سفید مقبرہ (تربت سفید)[1] ہے

(۱) ان دو زبانی مصنفوں کی عربی تصنیفات جو فارسی ادب کی تصنیفی خدمات کے باعث ذکر کے مستحق ہیں

جس کے سبب یہ مقام مشہور ہے۔ البیضاوی کی سب سے زیادہ شہرت قرآن کی مشہور تفسیر موسوم بہ اسرار التنزیل کے مصنّف کی حیثیت سے ہے۔ یہ تفسیر عربی میں لکھی گئی[2] ہے۔ لیکن اس نے فارسی میں نظام التواریخ کے عنوان سے ایران کی ایک تاریخ بھی قلمبند کی جس کا ذکر اس باب کے دوران میں کیا جائیگا۔ بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم اسے محض ایک اوسط درجے کا مؤرخ کہکر چھوڑ دیں اور مفسّر

(۲) وہ عربی تصانیف جنھوں نے ایرانی فکر پر گہرا اثر ڈالا

کی حیثیت سے اسکے کہیں زیادہ اہم کام کو نظر انداز کریں۔ دوسری قسم غیر ایرانیوں کی عربی مصنّفات کی ہے جنھوں نے ایرانی فکر پر عمیق اثر ڈالا۔ مثلاً شیخ محی الدین ابن العربی کی فصوص الحکم اور دیگر تصانیف اور شیخ صدر الدین قونوی کی مصنفات۔

---

[1] دیکھو نزہۃ القلوب (طبع گائی لوسٹرینج) سلسلہ یادگار گب ۲۳ جلد اول ص ۱۲۲، س ۲۱ ببعد؛ [2] دیکھو بروکلمن کی تاریخ ادبیاتِ عرب جلد اوّل ص ۴۱۶ تا ص ۴۱۸؛

یہ وُہ سرچشمے تھے جن سے فخرالدین عراقی جیسے شعراء نے معنوی فیضان حاصل کیا ؎

تاریخ - جغرافیہ اور سیرت کی عربی تصانیف

تیسری اور سب سے اہم قسم عربی کی تاریخی، جغرافی اور سیرتی تالیفات کی ہے۔ یہ اشخاص، مقامات، حالات اور خیالات پر روشنی ڈالتی ہیں جن سے ہمیں تحقیق کے دوران میں سابقہ پڑیگا۔ ان میں خاص طور پر جن کتابوں کا ذکر ہونا چاہیئے وہ یہ ہیں:۔
طبقات الاطباء[1] مصنفہ ابن ابی اصیبعہ (متوفی ۶۶۸ھ مطابق ۱۲۷۰ء)، ابن خلکان (متوفی ۶۸۱ھ = ۱۲۸۲ء) کی بلند پایہ سیرت کی تصنیف موسوم بہ وفیات الاعیان[2]، زکریا بن محمد القزوین (متوفی ۶۸۲ھ = ۱۲۸۳ء) کی آثار البلاد[3]، مختصر الاول[4] لابی الفرج بار ہیبریس (متوفی

---

[1] دیکھو بروکلمن کی تاریخ ادبیاتِ عرب، جلد اوّل ص ۶-۳۲۵، متن دو جلدوں میں قاہرہ میں چھپا ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء)؛ [2] ایضاً جلد اوّل ص ۸-۳۲۶، انگریزی خوان یہ تصنیف بیرن میک گوگن ڈی سلین (Baron McGuckin de Salne) کے اعلےٰ ترجمے میں پڑھ سکتے ہیں۔ ۴ جلدیں لندن اور پیرس ۱۸۴۳ء تا ۱۸۷۱ء؛

[3] ایضاً جلد اول ص ۲-۴۸۱، ووسٹن فیلڈ نے اسی مصنف کی مشہور تر لیکن نسبتہً کم قابلقدر کتاب عجائب المخلوقات کیساتھ اسے ۱۸۴۸ء میں گوٹنگن سے شائع کیا؛

[4] ایضاً، جلد اوّل ص ۳۴۹ تا ص ۳۵۰ میں۔ نے پوکوک (Pococke) کی ایڈیشن آکسفورڈ ۱۶۶۳ء) سے استفادہ نہیں کیا بلکہ بیروت کے چھپے ہوئے متن (۱۸۹۰ء) سے ؎

۳۰ رجولائی ۱۲۸۹ء)، یہ عمومی تاریخ ہے۔ تاتاری دور کے لئے خاص طور پر اہم ہے؛ ابو الفدا فرمانروائے حماۃ (متوفی ۷۳۲ھ مطابق ۱۳۳۱ء) کی مشہور تاریخ "المختصر فی تاریخ البشر"[1]، ابن بطوطہ (متوفی ۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷ء) کا بصیرت افروز سفرنامہ[2] جو چوبیس برس (۱۳۲۵ء تا ۱۳۴۹ء) کی سیاحت پر حاوی ہے۔ اور جس میں نہ صرف ایران کی بلکہ قسطنطنیہ سے ہندوستان اور چین تک اور عرب سے افغانستان اور ماوراالنہر تک ایشیا کے بیشتر حصے کی سیاحت شامل ہے۔

آثار البلاد کی قدر و قعت ایرانی تاریخ اور ادب کا متعلم جو ان کتابوں کو نظر انداز کرتا ہے قابلِ اعتبار اطلاعات کے بعض نہایت گراں مایہ منبعوں سے محروم رہتا ہے۔ با ایں ہمہ ایسے ایسے ماہرین نے بھی ان سے بے اعتنائی برتی ہے۔ جن کی تصانیف فارسی شاعری اور دیگر متعلقہ موضوعات پر سند سمجھی جاتی ہیں۔ قزوینی کی مذکورہ بالا آثار البلاد ہی کو لیجئے اور پھر نامی شاعروں کی فہرست ذیل ملاحظہ فرمائیے جن کا ذکر اُن شہروں کے تحت میں آیا ہے جہاں اُنھوں نے اپنی زندگی بسر کی۔ اور پھر دیکھئے کہ اُن کے بارے میں

---

[1] ایضاً، جلد دوم، ص ۴۴-۴۶

[2] ایضاً جلد دوم، ص ۲۵۶-۲۵۷؛ فرانسیسی ترجمے کے ساتھ ڈیفریمری Defremery اور سینگوینیٹی Sanguinetti نے چار جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیا (پیرس ۱۸۵۳ء-۱۸۵۸ء اور ۱۸۷۴ء-۱۸۷۹ء)؛

کتنی معلومات ایسی دی ہیں جن کے لئے عام طور سے فارسی تذکروں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور بے فائدہ وہاں اُن کی تلاش کی جاتی ہے[۱]:-

انوری (ص ۲۴۲)، عسجدی (ص ۲۷۸)، اوحد الدین کرمانی (ص ۱۶۴) فخری جرجانی (ص ۳۵۱)، فرخی (ص ۲۷۸)، فردوسی (ص ۹-۲۷۸، اور ص ۱۳۵ پر شاہنامے کا ایک شعر منقول ہے) جلالِ طبیب (ص ۲۵۷)، جلال خواری (ص ۲۴۳) خاقانی (ص ۳-۲۷۲، جہاں اُسکے کلام کے تین اشعار نقل ہیں، نیز ص ۴۰۲)، ابو طاہر الخاتونی (ص ۲۵۹)، مجیر بیلقانی (ص ۳۴۵)، نظامی (ص ۲-۳۵۱)، ناصر خسرو (۹-۳۲۸)، ابو سعید ابن ابی الخیر (ص ۲-۲۴۱)، سنائی (ص ۲۸۱)، شمس طبسی (ص ۳-۲۷۲)، عمرِ خیام (ص ۳۱۸)، عنصری (ص ۲۷۵)، رشید الدین وطواط (ص ۴-۲۲۳)

غرض ہمارے پاس اس کتاب میں فارسی کے اُنیس ایسے اہم شاعروں کے ذکر موجود ہیں جو تیرھویں صدی کے دوران میں یا اس سے قبل زندہ تھے۔ ان مذکورات میں بعضے خاصے مکمل ہیں اور ان میں ایسی معلومات ملتی ہیں جو اَور کہیں میسّر نہیں۔ بہت حالتوں میں یہ مذکورات محفوظ مذکورات[۲] میں سب سے پُرانے ہیں۔ کیونکہ اس سے

---

[۱] اس فہرست میں حوالے طبع ووسٹن فیلڈ سے دئے ہیں جو معیاری ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ تصنیف کسی یورپی زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی *

[۲] حاشیہ اگلے صفحے پر؛

زیادہ قدیم فارسی تصانیف جو شاعروں کے حالاتِ زندگی سے کم وبیش منظّم طور پر بحث کرتی ہیں صرف لباب الالباب عوفی اور چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی ہیں۔ اس پُر لطف کتاب کے ان متعدّد مباحث کے منجملہ جو فارسی کے متعلم کے لئے دلچسپ ہیں شاعروں کے حالات کا یہ موضوع بھی ہے۔

آیئے اب ہم مؤرخین کو لیتے ہیں۔ مَیں پہلے کہہ چکا ہُوں کہ یہ طبقہ اس عہد کے مصنّفوں میں اہم ترین طبقہ ہے۔ کیونکہ جہاں اس سے متقدم اور متأخّر دونوں زمانوں نے بڑے بڑے شاعر پیدا کئے۔ جو تعداد میں بھی ویسے ہی فائق تھے جیسے شہرت میں، وہاں اُن میں کسی نے ایسے مؤرخ پیش نہیں کئے جو زمانۂ زیرِ غور کے مؤرّخوں سے ٹکّر کھا سکیں۔

تاریخِ جہانگشا عطا ملک جوینی کی تاریخِ جہانگشا یعنی فاتحِ عالم چنگیز خان کی تاریخ کا اس کتاب کی ایک سابقہ جلد میں مکرّر ذکر کیا جا چکا[۱]

(حاشیہ صفحہ گزشتہ [۲]) آثار البلاد کے ص ۳۳۴ پر مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی سے اس کی ملاقات سنہ ۶۳۰ھ (۳-۱۲۳۲ء) میں ہوئی اور مصنف کے خود نوشتہ نسخۂ تصنیف پر سنہ ۶۷۴ھ (۶-۱۲۷۵ء) کی تاریخ درج ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ ان دو حدوں کے درمیان لکھی گئی۔

[۱] تاریخ ادبیاتِ ایران جلد دوم۔ اس کے چیدہ حوالے ص ۴۴۳، ۴۳۵، ۴۴۳، اور ص ۴۷۳ ہیں۔

ہے۔ لیکن یہاں اس پر کچھ اضافہ ضروری ہے۔ یہ کتاب ۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء) میں مکمل ہوئی۔ اور ۶۵۵ھ (مطابق ۱۲۵۷ء) کے واقعات اور خصوصاً مصنف کے آقا اور مربّی ہلاکو خان کے ہاتھوں حشیشین کی تباہی کیساتھ ختم ہوتی ہے۔ چند قلمی نسخوں میں بغداد کی لوٹ پر جو ایک سال بعد کا واقعہ ہے ایک ضمیمہ بھی ملتا ہے۔ لیکن غالبًا یہ بعد کے کسی شخص کے قلم کا اضافہ ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ چنگیز خان، اُس کے اجداد اور چغتائی تک اس کے اخلاف کی تاریخ سے بحث کرتا ہے دوسرے میں خوارزم شاہیوں اور بالخصوص اس سلسلے کے آخری دو تاجداروں یعنی قطب الدین محمد اور جلال الدین کی تاریخ بیان ہوئی ہے تیسرا حصہ اسمٰعیلی فرقے خصوصًا حسن بن صبّاح اور اُسکے جانشینوں یعنی اَلمُوت کے حشیشین سے متعلق ہے۔ پس یہ تاریخ عمومی تاریخ نہیں بلکہ مخصوص طور پر چنگیز خان کے اسلاف و اخلاف پر ایک تاریخی تصنیف ہے۔ جس میں ان دو شاہی خاندانوں کے حالات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن سے ایران اور عراق میں چنگیز خان کی مجادلت رہی۔ اس نہایت قابلِ قدر اور بُنیادی تاریخ کے متعلق مزید تفصیلات مَیں نے اپنے ایک مضمون میں دی ہیں جو مَیں نے مجلّۂ انجمن ہمایونِ ایشیائی (جنوری ۱۹۰۴ء ص۷۱-۱) میں دیا تھا۔ اس کی تین جلدوں میں جن پر یہ مشتمل ہے پہلی اور دوسری[1] "سلسلۂ یادگارِ گب" میں بالترتیب ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۶ء میں شائع

[1] واضح رہے کہ ۱۹۳۷ء میں اس کی تیسری جلد بھی سلسلۂ مذکور میں شائع ہو چکی ہے (۱۶م جلد سوم)۔ (مترجم)!

ہو چکی ہیں (سلسلہ ۱۶، جلد اوّل و دوم) ان کی تصحیح و ترتیب میرے فاضل دوست میرزا محمد ابن عبدالوہاب قزوینی نے کی ہے۔ اُنہوں نے جلد اوّل کے شروع میں بطور مقدمۂ کتاب اسکے مصنف اور مدبروں کے اس خاندان پر جس سے وہ تعلق رکھتا تھا ایک مفصل اور محققانہ تبصرہ لکھا ہے[1] مصنف مارچ ۱۲۸۳ء میں مرا۔ اس کے بھائی شمس الدین صاحب دیوان نے اس کی وفات پر ذیل کا شعر کہا ؎

گوئی من و او دو شمع بودیم بہم
یک شمع بمُرد و دیگرے می سوزد

اس کی وفات پر ذیل کا قطعۂ تاریخ صدر الدین علی ابن نصیر الدین طوسی نے تصنیف[2] کیا ؎

آصفِ عہد علاءِ حق و دین زبدۂ کون
کرد بدرود جہان را چو سر آمدش زمان
در شب شنبہ چہارم زمہ ذی حجہ
سال بر ششصد و ہشتاد و یکی در اران

تاریخ وصّاف | تاریخ وصّاف جیسا کہ اس کا مصنف ہمیں بتاتا ہے متذکرہ بالا تاریخ کی تعقیب کے خیال سے لکھی گئی تھی۔ اسلئے مناسب

---

[1] مقدمہ انگریزی صفحہ یہ تا صب، مقدمۂ فارسی ص ج تا قکح؛

[2] یہ دونوں شعر مجمل فصیحی نسخۂ ریورٹی (Raverty) ورق ۴۶۶ (حوادث ۶۸۱ھ) سے منقول ہیں؛

طور پر ہم اس کا ذکر جہانگشا کے بعد کر سکتے ہیں۔ گو اُس کی تاریخِ تصنیف جامع التواریخ سے جس کا تذکرہ ہم اسکے بعد کریں گے ذرا بعد کی ہے۔ اس تاریخ کا اصل عنوان "تجزیۃ الامصار و تجزیۃ الاعصار" ہے۔ اور اس کے مصنّف کا اصل نام عبداللہ ابن فضل اللہ شیرازی ہے۔ گو عموماً وہ صرف وصّاف (مدح گر) یا وصّافِ حضرت (درباری مدحگر) کے ناموں سے معروف ہے۔ تاتاری حکومت میں وہ مالیہ کی تحصیل پر ملازم تھا۔ اور مقتدر وزیر رشید الدین کا متوسّل تھا۔ جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے[1]۔ رشید الدّین نے یکم جُون ۱۳۱۲ء کو سلطانیہ میں اسے اس کی

اسکے محاسن اور نقائص کا تخمینہ از ڈاکٹر ریو

کتاب کیساتھ اولجائتو کے حضور میں پیش کیا۔ ڈاکٹر ریو نے خوب کہا ہے[2]، "اس کی تاریخ میں ایک اہم دور کی مستند معاصر رویداد ملتی ہے۔ لیکن اس کے لاریب افادے میں ترتیب کی بے اصولی سے تا حدّے فرق آگیا ہے۔ اور اسکے اسلوب کی انتہائی تصنّع آمیز نوعیت اور ناگوار حشویت نے اسے اَور بھی گھٹا دیا ہے۔ بدقسمتی سے اوروں نے اس کتاب کو تاریخ کا ایک صحیح نمونہ سمجھا۔ چنانچہ ایران کی متأخر تاریخی تصنیفات پر اُس نے مُضر اثر ڈالا ہے"۔ جن لوگوں کو اس کتاب کے استعمال کا اتّفاق ہُوا۔ ان میں کوئی

---

[1] ص ۵۴۴ بعد بمبئی کی نفیس سنگی طبع (۱۲۶۹ھ مطابق ۳-۱۸۵۲ء)؛

[2] برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست، ص ۱۶۲؛

اس تنقید کی معقولیت سے انکار نہیں کریگا۔ اور پھر مصنّف خود صاف اظہار کرتا ہے۔ کہ اس کا اولین مقصد شاندار اسلوب کی تحریر ہے اور تاریخی واقعات جنہیں وُہ قلمبند کرتا ہے محض وہ پارچے ہیں جن پر اپنی مرصّع لفاظی کی لطیف گلکاری کرے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب مصنّف نے دربار میں اس کی عبارتیں پڑھ کر سُنائیں تو اولجائتو ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ ناظرین میں اگر کوئی صاحب فارسی کے جاننے والے نہیں ہیں تو اس پُر تکلّف، آراستہ اور ثقیل طرزِ تحریر کا کچھ تصور جلد اوّل کے جرمن ترجمے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ جو ہیمر[1] نے مع اصل متن کے ۱۸۵۶ء میں شائع کیا ہے۔ جس دور (۱۲۵۷ء تا ۱۳۲۸ء) سے یہ کتاب بحث کرتی ہے۔ اگر اس کی تاریخ کے ایک مستند بنیادی مأخذ ہونے کی حیثیت سے اس کو اتنی وقعت حاصل نہ ہوتی جتنی کہ ہے تو ہم اسکے مصنّف کو زیادہ آسانی سے معاف کر سکتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہ یہ کتاب جتنی ملال انگیز ہے اتنی ہی اہم بھی ہے۔ اس کی پانچ جلدیں ہیں، جن کے مندرجات ریو نے مجملاً بیان کئے ہیں۔ (تصنیف مذکور ص ۳-۱۶۲) ہیمر کی مذکورہ بالا جزوی ایڈیشن کے علاوہ رجب ۱۲۶۹ھ (اپریل ۱۸۵۳ء) میں بمبئی سے اس کی ایک نہایت عمدہ سنگی طبع شائع ہوئی ہے۔

مُعجم فی آثارِ ملوک العجم | یہاں میرے خیال میں ایک نیم تاریخی تصنیف

---

[1] (Hammer

کا ذکر بھی ہونا چاہیئے ۔ جو اندازِ تحریر میں تاریخِ وصاف کی طرح ہے۔ لیکن قیمت و وقعت میں اس سے کہیں فروتر ہے ۔ میری مراد معجم فی آثار ملوک العجم' سے ہے ۔ یہ ساسانی زمانے تک ایران کے شاہانِ قدیم کی ایک بیحد لفاظانہ تاریخ ہے فضل اللہ الحسینی کی لکھی ہوئی ہے اور نصرت الدین احمد بن یوسف شاہ' اتابکِ لُرِ بزرگ' کے نام معنون ہے ۔ جس نے ۱۲۹۶ء سے تقریباً ۱۳۳۰ء تک حکومت کی۔ اس باب میں دوسری جتنی تاریخیں مذکور ہیں ان سب سے یہ کتاب بیحد فروتر ہے ۔ طہران سے بہ چاپ سنگی شائع ہو چکی ہے ۔ اور بڑے بڑے مشرقی کُتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے ملتے ہیں[۱] ؀

جامع التّواریخ اب ہم جامع التواریخ کو لیتے ہیں جس کا ضمنی ذکر پچھلے باب میں اس کے نامی گرامی مصنّف رشید الدین فضل اللہ کے سلسلے میں آچکا ہے ۔ جو طبیب، مدبّر، مؤرّخ اور مخیّرِ عوام سب کی حیثیت سے برابر کا امتیاز رکھتا ہے۔ اس کی عوامی زندگی اور المناک انجام کا بیان ہم اوپر دے آئے ہیں۔ یہاں نہ صرف اس کی تاریخ کی حدِ موضوع اور اس کے مشتملات پر کچھ اَور کہنا ضروری ہے بلکہ اس کی شخصی زندگی اور ادبی سرگرمی کا مزید تذکرہ بھی لازمی ہے ۔ یہ بدقسمتی ہے کہ اس کی تاریخ اب تک کبھی پوری شائع نہیں ہوئی اور اسکے

---

[۱] دیکھو ریو کی فہرست مخطوطات فارسی ص۱۸۱ ؛ ایتھے (Ethe) کی فہرست بوڈلین Bodleian Cat. ص۲۸۵ ؛ ایتھے کی فہرست دیوان ہند ص۲۳۴ ، ص۲۳۵ ؛

نسخے نسبتہً کمیاب ہیں۔ لیکن اسکے چھپے ہوئے اجزا میں ہلاکو کی

مصنف کے حالات پر کاترمیر[1] کا محققانہ تبصرہ

سوانحعمری ہے جسے کاترمیر نے ۱۸۳۶ء میں فرانسیسی ترجمہ اور بہت سے مفید حواشی کے ساتھ پیرس سے شائع کیا۔ اس کا عنوان یہ ہے :۔ "تاریخِ مغولانِ ایران بزبانِ فارسی از رشید الدین جس کو فرانسیسی ترجمے کیساتھ باضافۂ حواشی و ذکرِ احوال و تصانیفِ مصنف شائع کیا گیا[2]"۔

جو اصحاب زیادہ مکمل اور مفصل معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس اعلیٰ تذکرے کی طرف رجوع کریں۔ رشید الدین کی زندگی اور تصنیف و تالیف کے درجِ ذیل چیدہ حالات بیشتر اسی سے لئے گئے ہیں :۔

اس کی ولادت ۱۲۴۷ء

۱۲۴۷ء میں ہمدان میں پیدا ہوا۔ اس کے دشمن اسے یہودی نژاد بتاتے تھے۔ اسی سالِ ولادت میں جب ہلاکو نے اَلمُوت پر قبضہ کیا تو رشید الدین کا دادا موفق الدولہ علی مشہور منجم نصیر الدین طوسی اور رئیس الدولہ کی معیت میں بادلِ ناخواستہ وہاں کے حشیشین کا مہمان تھا۔ چنانچہ وہ جھٹ ہلاکو کی ملازمت میں لے لیا گیا۔ اباقا کے عہد میں رشید الدین کو شاہی

---

[1] Quatremere

[2] Histoire des Mongols de la Perse, ecrite en persan per Raschid-eldin, publiee, traduite en francais, accompagnee de notes et d'unt memoire sur la vie et les ouvrages

طبیب کی حیثیت سے خاصا رسوخ اور اعزاز حاصل رہا۔ لیکن اسکے جوہروں کی اصل قدر شناسی غازان کے عہد میں ہوئی جو ۱۲۹۵ء میں تخت پر

۱۲۹۸ء میں وہ غازان کا وزیر اعظم مقرر ہوتا ہے

بیٹھا۔ تین برس بعد سابق وزیر صدر الدین زنجانی معروف بہ صدر جہاں کی موقوفی اور قتل پر غازان نے اُسے اور سعد الدین دونوں کو بالاشتراک اس کا جانشین منتخب کیا۔ ۱۳۰۳ء میں جب غازان نے شام کے خلاف لشکر کشی کی تو رشید الدین عربی محرّر کی حیثیت سے اسکے ہمراہ ہؤا۔ اسی دوران میں جبکہ تاتاری دربار فرات کے کنارے عانہ کے مقام پر قائم ہُؤا۔ اُس نے حسبِ مذکور (ص۶۷) ۳ر مارچ ۱۳۰۳ء کے دن تاریخ وصّاف کے مصنّف کو غازان کی خدمت میں پیش کیا۔

خدا بندہ کے زیرِ سایہ اُس کے اقتدار کی برقراری اور افزونیٔ افتخار

اولجائتو (یا خدا بندہ) کے زمانۂ حکومت میں رشید الدین اسی عالی منصب پر فائز رہا جو اُسے اُس کے پیشرو کے عہد میں نصیب تھا۔ اور اُسے نئے بادشاہ کی عنایت اور اعتماد کے بہت سے غیر معمولی ثبوت بہم پہنچے۔ رشید الدین نے نئے پایۂ تخت سلطانیہ میں ایک نواحی بستی بھی بسائی جو اسی کے نام پر رشیدیّہ کہلائی، اس میں ایک عالیشان مسجد تھی ایک مدرسہ، ایک ہسپتال اور دیگر عوامی عمارات تھیں۔ اس کے علاوہ چند ہزار گھر تھے

۱۳۰۷ء میں اسی کے وسیلے سے بغداد کے دو شافعی عالموں یعنی شہاب الدین سہروردی اور جمال الدین کی برائت ثابت کی گئی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے مصر کیساتھ کچھ باغیانہ خط و کتابت کی تھی[1]۔

رشید الدّین نے رُبعِ رشیدی کی بنا ڈالی اور اُس کو وقف کیا

کوئی دو سَو برس بعد قصبۂ غازانیہ کے پاس جو تبریز کے مشرق میں غازان کے مقبرے کے اردگرد آباد ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک اَور خُوبصورت نواحی بستی تعمیر کی اور بڑی لاگت سے ٹھوس چٹانوں میں سے نہریں کاٹ کر دریائے سراو رود کو وہاں لائے[2]۔ ان اغراض کے لئے اور سعادت اور رفاہِ عام کے دُوسرے مُستحسن کاموں کے لئے بے اندازہ رقموں کی ضرورت تھی۔ لیکن رشید الدین کو جیسا کہ وُہ خود اعلان کرتا ہے فراخدل اولجائتو سے ایسی ایسی رقمیں ملیں کہ کسی سابق خاقانِ زمانہ نے اپنے وزیر یا درباری کو عطا نہ کی ہوں گی۔ تاریخِ وصّاف کی رُو سے رشید الدّین نے اپنی متعدّد تصنیفات کے استنساخ، جلد بندی، تصاویر اور نقشوں پر کم

---

[1] ملاحظہ ہو کاترمیر، تاریخِ مغول، ص ۱۰ تا ۱۲۔ یہاں جس شہاب الدین کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ شیخ سعدی کا اُستاد نہیں جو ۶۳۲ھ (۱۲۳۴-۵ء) میں فوت ہُوا۔

[2] ملاحظہ ہو گائی لوسٹرینج کی 'ممالکِ خلافتِ شرقیہ' (Lands of the Eastern Caliphate by G. le Strange.) صفحہ ۱۶۲ تا ۱۶۳۔

سے کم ساٹھ ہزار دینار (یعنی پانچ لاکھ چھیالیس ہزار روپے) صرف کیے؛

رقابتیں اور سازشیں

۱۳۱۲ء کے آغاز میں رشید الدین کے شریکِ منصب سعد الدین ساوجی کا زور ٹوٹا۔ اور وہ مارا گیا۔ جس سازش کا وہ شکار ہوا اس کا سرغنہ چالاک اور بیباک علی شاہ تھا۔ جس نے فوراً وزیر متوفی کا عہدہ سنبھال لیا عنقریب ہی ایک اور خطرناک سازش رشید الدین کے خلاف کی گئی لیکن خوش قسمتی سے اس کے بانی خود اس کی لپیٹ میں آگئے۔ اور رشید الدین کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ دوسری طرف یہ معاملہ مشکوک ہے۔ کہ آیا وہ سید تاج الدین نقیب الاشراف[1] کے بیرحمانہ قتل کا ذمہ دار تھا یا نہیں۔ کاترمیر اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔

رشید الدین کا تنزّل اور اُس کی ہلاکت ۱۳۱۸ء

۱۳۱۵ء میں رشید الدین اور علی شاہ کے درمیان اشتعال انگیز تنازعات رونما ہوئے۔ جھگڑا اس بات پر تھا کہ فوج کی تنخواہ کے لئے روپے کی کمی کا ذمہ دار کون ہے۔ چنانچہ اولجائتو نے ایران اور ایشیائے کوچک کے مختلف صوبوں کا بندوبست الگ الگ دونوں کو بانٹ دیا۔ تاہم علی شاہ نے اپنے ساتھی کے خلاف بدگوئی کی مہم جاری رکھی۔ اور رشید الدین بہ مشکل تمام اپنی جان چھڑانے میں کامیاب ہوا۔ یہی رقابت اور سازش اولجائتو کی موت اور ابوسعید

---

[1] اشراف سے مراد آلِ علیؑ ہے؛

کی تخت نشینی کے بعد جاری رہی تا آنکہ رشید الدین نے اپنے بدگوؤں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ اکتوبر ۱۳۱۷ء میں اپنے عُہدے سے محروم کر دیا گیا۔ اور بالآخر ۱۸؍جولائی ۱۳۱۸ء کو اپنے بیٹے ابراہیم سمیت پادشاہِ متوفی کی زہر خورانی کے الزام میں مارا گیا۔ اس وقت ستر برس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ اور اس کا بیٹا سولہ برس کا نوجوان تھا۔ اسکے املاک ضبط کر لئے گئے۔ اُس کے اقارب پر جور و تعدی کی

اُس کے بنا کردہ اوقافی اداروں کی تخریب اور قبر کی بے حرمتی

گئی اور اُنہیں لُوٹا گیا اُسکے خیراتی اداروں کو اُن کے اوقاف سے محروم کر دیا گیا۔ اور ربعِ رشیدی کی بستی جو اُس نے بسائی تھی مسمار کر دی گئی۔ اس کی تدفین اس مقبرے میں ہوئی تھی جو اُس نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر تیار کرایا تھا۔ لیکن اس کے جسم نے مر کے بھی چین نہ پایا۔ کیونکہ کوئی ایک صدی آگے چل کر تیمور کے بیٹے میراں شاہ نے اپنی مجنونانہ قساوت کی لہر میں اسے اُکھاڑ کر یہودیوں کے قبرستان میں گاڑ دیا۔ علی شاہ نے اپنے حریف کے تنزّل پر مسرت کا ثبوت دیتے ہوئے حرمِ کعبہ پر بیش بہا چڑھاوے چڑھائے اور ستم کی مکافات سے جس نے اسکے اکثر ساتھیوں کو آلیا تھا بچ کر چھ سال بعد (۱۳۲۴ء) میں اپنے بستر پر سکون کی موت مرا اور جیسا کہ اوپر اشارا کیا جا چکا ہے وُہ ایلخانوں کا پہلا وزیر تھا جسے طبعی موت

نصیب ہوئی۔ رشید الدین کے فرزند غیاث الدین کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے۔ وُہ اپنی نیک سیرتی۔علم و فضل۔ پبلک زندگی حتّٰی کہ اپنے حسرت ناک انجام میں بھی اپنے باپ سے مشابہ ہے۔ کیونکہ وُہ بھی ۱۳۳۶ء کے موسمِ بہار میں مارا گیا ؎

جامع التّواریخ کی تجویز اور اُس کی تکمیل

کاترمیئر[1] کی رائے میں جامع التّواریخ کے تصوّر کا سہرا غازان خان کے سر ہے جس نے مآل اندیشی سے کام لیتے ہوئے یہ سوچا کہ ہر چند تاتاری فی الوقت ایران میں برسرِ اقتدار ہیں۔ لیکن مرورِ ایّام کے ساتھ یہ بات ہو کر رہے گی کہ وہ ایرانیوں میں جذب ہو جائینگے۔ پس اُس نے چاہا کہ آئندہ نسلوں کے لئے ان کے مآثر کی ایک یادگار چھوڑ جائے۔ جس کی صُورت یہ ہو کہ فارسی میں ان کی تاریخ اور فتوحات کا ایک صحیح دفتر مرتّب کیا جائے۔ اس معرکۃ الآرا کام کی انجام دہی کیلئے اُس نے رشید الدّین کو چُنا اور بیشک اس سے بہتر انتخاب ناممکن تھا۔ چنانچہ تمام سرکاری دفاتر سندات اس کیلئے مہیا کئے گئے اور ان تمام اشخاص کی خدمات اُسے بہم پہنچائی گئیں جو تاتاری تاریخ اور آثار سلف کے متبحر عالم تھے۔ ہر چند وزیر اس وسیع سلطنت کے ملکی معاملات میں مُنہمک رہتا تھا۔ لیکن وُہ اپنی تحقیقات جاری رکھنے اور اُنہیں ضبطِ تحریر میں لانے کا وقت نکالنے میں کامیاب

[1] تاریخِ مغول، صفحہ ۷۴ ؛

ہوُا۔ گو بقولِ دولت شاہ[1] کل وقت جو اسے اس کام کے لئے میسّر تھا وہ نمازِ فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان کا وقت تھا ؎

جامع التواریخ کے موضُوعات کا تجزیہ

ابھی رشید الدین کی مغولی تاریخ مکمّل نہ ہوئی تھی کہ غازان چل بسا (۱۷ مئی ۱۳۰۴ء) لیکن اس کے جانشین اولجائتو نے اُسے حکم دیا کہ تاریخ پوُری کی جائے اور جیسا کہ شروع میں ارادہ تھا غازان ہی کے نام معنون ہو۔ چنانچہ تصنیف کے اس جُزو کو جو عموماً پہلی جلد کہلاتا ہے بعض مرتبہ 'تاریخ غازانی' کا عنوان دِیا جاتا ہے۔ اولجائتو نے مصنف کو اسی کے ساتھ کی ایک اَور جلد لکھنے کا حُکم دیا۔ جس میں دُنیا کی ایک عمومی تاریخ اور خصوصًا اسلامی ممالک کی تاریخ ہو۔ اور ایک تیسری جلد لکھنے کو کہا جو جغرافیے سے بحث کرے۔ یہ آخری جلد یا تو ضائع ہو چکی ہے یا سرے سے لکھی ہی نہیں گئی اور محض تجویز ہی رہی۔ چنانچہ آج یہ تصنیف جس صورت میں ہمارے علم میں ہے صرف دو جلدوں پر شامل ہے۔ پہلی تاتاریوں کی تاریخ پر ہے جو غازان کے لئے لکھی گئی۔ دُوسری عمومی تاریخ ہے۔ پوری تصنیف ۷۱۰ھ (مطابق سنہ ۱۳۱۰-۱۳۱۱ء) میں مکمل ہوئی۔ گو دو برس آگے چل کر بھی مصنّف اولجائتو کے عہدِ حکومت کی ضمنی تاریخ لکھنے میں مصروف تھا ؎

اس زبردست تاریخ کے موضوعات مجملاً حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] میری اڈیشن کا ص ۲۱۷؎

جلد اوّل، پہلا باب :- مختلف ترک اور مغول قبائل کی تاریخ، اُن کی تقسیم، انساب، شجرے، اساطیر وغیرہ، یہ سب کچھ ایک دیباچے اور چار فصلوں میں ہے ❖

دوسرا باب :- چنگیز خان، اس کے اسلاف اور اخلاف کی تاریخ غازان خان تک ❖

جلد دوم - دیباچہ :- حضرت آدم، بطارقۂ بنی اسرائیل اور انبیائے یہود کے بیان میں،

پہلا حصّہ :- شاہانِ قدیم ایران قبل اسلام کی تاریخ - چار فصلوں میں ❖

دوسرا حصّہ :- محمد رسول اللہ کی تاریخ اور خلافت کی تاریخ، تاتاریوں کے ہاتھوں اس کے انقراض در ۱۲۵۸ء تک ❖

اسلامی عہد کے ایرانی شاہی خاندانوں کی تاریخ، جن کی تفصیل یہ ہے :- سلاطینِ غزنہ، سلاجقہ، خوارزمشاہی خاندان، فارس کے سلغری اتابک اور مغرب و مشرق کے اسمٰعیلی - اوغوز اور اس کی اولاد یعنی ترکوں کی تاریخ، چینیوں کی تاریخ، فرنگیوں اُنکے شہنشاہوں اور پاپاؤں کی تاریخ، ہندوستانیوں کی تاریخ جس کیساتھ ساکی منی (مہاتما بدھ) اور اُس کے بناکردہ مذہب کا ایک طویل اور مفصّل تذکرہ ہے ❖

جامع التواریخ کی مجوّزہ ترتیب

مندرجۂ بالا ترتیب وُہ ہے۔ جو دیوانِ ہند اور عجائب خانۂ برطانوی کے نسخوں میں واقعی اختیار کی گئی ہے۔ لیکن اپنے مقدمے میں مصنّف نے جو قسمیں تجویز کی ہیں ذرا مختلف ہیں۔ کیونکہ اس کا ارادہ تھا کہ دُوسری جلد پادشاہِ وقت اولجائتو کی تاریخ سے شروع کرے اور اُسے اسکی ولادت سے لیکر ۷۰۶ھ (مطابق ۷-۱۳۰۶ع) تک لائے۔ اور پھر اسی کے آخر میں ایک ضمیمے کا اضافہ کرے جس میں اس فرماں روا کی تاریخ سال بہ سال درج کرے۔ یہ پریشان کن ترتیب اکثر نُسخوں میں فی الواقع ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ اور اگر ان میں سے کسی کے اندر اولجائتو کا عہد شامل ہے تو وہ اس کے مناسب قدرتی محل پر درج ہے۔ یعنی جلد اوّل کے آخر میں غازان کے بعد۔ جامع التواریخ کے موجودہ نسخوں میں اگر کوئی مکمل ہیں تو بُہت کم۔ گو اس کا ہر حصّہ کسی نہ کسی نسخے میں مل جاتا ہے۔ مجلّۂ انجمنِ ہمایونی ایشیائی بابت جنوری ۱۹۰۸ئہ (ص ۳۷-۱۷) میں نے اس کے مشتملات کا ایک زیادہ مکمل لب لباب پیش کیا ہے۔ اور اُس کیساتھ اس کی مکمل اڈیشن کا جس کی بیحد ضرورت ہے ایک خاکہ بھی تجویز کیا ہے ؂

سات جلدوں میں جامع التواریخ کی مکمل اشاعت کے لئے تجویز

مصنّف کی پیچیدہ اور اُلجھا دینے والی تقسیم سے قطع نظر میں نے ساری کتاب کو سات جلدوں میں شائع کرنیکی تجویز پیش کی تھی۔

اس کے مطابق پہلی تین جلدیں جو تُرکوں اور مغولوں کی تاریخ پر مشتمل ہوں گی اصل کتاب کی جلد اول کے مطابق ہوں گی۔ اور بقیہ چار جلدیں اصل کی دُوسری جلد کے مطابق۔ ترتیب ذیل ملاحظہ ہو:۔

(سلسلہ ۱، ترکوں اور مغولوں کی خصوصی تاریخ)

جلد اوّل:۔ چنگیز خان کے آغاز سے اُس کی وفات تک،

جلد دوم:۔ اوگتائی کے جلوس سے قوبیلائی خان کے پڑپوتے تیمور (اولجائتو) کی وفات تک[1]۔

جلد سوم:۔ ہلاکو[2] کی تخت نشینی سے غازان کی وفات تک، مع متأخر ایلخانوں کی تاریخ کے ایزاد کے، جو رشید الدین کی تصنیف کے ضمیمے کے طور پر شاہ رُخ کے عہد میں اسی کے حُکم سے تالیف ہوئی۔

(سلسلہ ۲، عمومی تاریخ)

جلد چہارم:۔ تمہید، ایران کے شاہانِ قدیم کی تاریخ ساسانیوں کے زوال تک اور پیغمبرِ اسلام محمد صلعم کے وقائع عمری،

جلد پنجم:۔ خلافت کی پوری تاریخ حضرت ابو بکر سے خلیفہ المستعصم تک،

جلد ششم:۔ اسلامی زمانے کے سلسلہ ہائے سلاطینِ ایران (غزنوی،

---

[1] یہ وہ حصہ ہے جو ایم۔ بلوشے M. Blochet نے سلسلۂ یادگار گب میں شائع کیا ہے (۱۹۱۱ء)؛ [2] اس جلد کا وہ حصہ جو ہلاکو سے متعلق ہے حسب مذکور کاترمیر نے "تاریخِ مغولانِ ایران" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ (پیرس ۱۸۳۶ء)؛

سلجوق، خوارزمشاہی، سلغری اور اسمٰعیلی)؛

جلد ہفتم:- تصنیف کا بقیہ حصہ جو ترکوں، چینیوں، اسرائیلیوں، فرنگیوں ہندوستانیوں کی تاریخ پر حاوی ہے جو اُن کی اپنی روایات اور اُن کے اپنے بیانات سے ماخوذ ہے۔

جامع التواریخ نہ صرف اپنے وسیع میدان اور اس احتیاط کے سبب قابلِ ذکر ہے جس کے ساتھ یہ تمام دستیاب کتابی اور زبانی ماخذ سے تالیف کی گئی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں معلومات کی جدت ہے۔ فارسی نثریہ تصانیف اور کم سے کم شعبۂ تاریخ میں شاید ہی کوئی کتاب اپنی منفعت کے لحاظ سے اس کے مقابلے پر آسکے۔ اِس بات کو دیکھتے ہوئے یہ امر اور بھی قابلِ افسوس ہے کہ یہ ابتک غیر مطبوع ہے، اور تقریبًا ناقابلِ رسائی ہے۔ کاترمیر لکھتا ہے[1]:- "تالیف رشید الدین کی انتہائی اہمیت کے مزید ثبوت بہم پہنچانا اب غیر ضروری ہے۔ اس اعلیٰ تالیف نے جس کا بیڑا نہایت نامساعد حالات میں اُٹھایا گیا۔ اور جس کی انجام دہی کے لئے ایسے ایسے وسائل مہیا تھے کہ کسی واحد مصنف کو اس سے قبل حاصل نہ ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ اہلِ ایشیا کو کل عالم کی تاریخ اور جغرافیہ کا ایک مکمل نصاب بہم پہنچایا"۔ یہی مصنف رشید الدین کی غایت رسی اور استقصاء کے ثبوت میں اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ کس حد تک اس نے اپنی تاریخ کا وہ حصہ لکھنے میں

---

[1] تصنیف مذکور صفحہ عد؛

جو خطا کے بارے میں ہے[1] زبانی اور کتابی چینی مآخذ سے استفادہ کیا اور وہ افسوس کا اظہار کرتا ہے جس میں ہم سب کو شریک ہونا چاہیئے کہ اس کی کتاب کا جُغرافی حصّہ تلف ہوچکا ہے۔ یا کم سے کم اب تک دریافت نہیں ہُوا۔ غالبًا جیسا کہ کاترمیر کا قیاس ہے[2] یہ حصّہ ربع رشیدی کی مسماری اور لُوٹ میں ضائع ہوگیا جو رشید الدین کی وفات کے فوراً بعد واقع ہوئی۔

رشید الدین کی دیگر تصانیف رشید الدین نے جامع التواریخ کے علاوہ اور متعدد کتابیں لکھیں ان کا اور انکے موضوعات کا ایک مفصل تذکرہ کاترمیر نے پیش کیا ہے[3] ان میں کتاب الاحیاء

کتاب الاحیاء والآثار والآثار ہے۔ یہ چوبیس ابواب پر شامل تھی جو متفرق مضامین سے بحث کرتے تھے۔ یہ مضامین ان چیزوں سے متعلق تھے: علم کائنات الجو، زراعت، درخت کاری، شہد کی مکھیوں کی پرورش، ضرر رساں حشرات الارض کو ہلاک کرنیکے طریقے، مرغیوں، مویشیوں وغیرہ کی پرورش، فنِ تعمیر، قلعہ بندی، جہاز سازی کان کنی اور فلز کاری۔ بدقسمتی سے یہ کتاب ضائع ہوچکی ہے۔

"توضیحات" رشید الدین کی تصانیف میں سے ایک اَور 'توضیحات' ہے۔ یہ علمِ دین اور تصوّف کی کتاب ہے۔ اس کے موضوعات ایک دیباچے اور انیس مراسلات پر مشتمل ہیں۔ یہ اولجائتو کی فرمائش پر لکھی

---

[1] تصنیف مذکور صفحہ عج؛ [2] ایضًا صفحہ فا؛

[3] ایضًا صفحہ قیب تا قمو؛

گئی۔ کاترمیر نے پیرس کے قومی کُتب خانے کے ایک نسخے سے اس کی کیفیت بیان کی ہے ؎

مفتاحُ التفاسیر اس کے بعد ایک اَور دینی کتاب مفتاح التفاسیر تصنیف ہوئی۔ اس میں قرآن کی ربّانی فصاحت، مفسّرین اور اُن کے اصولوں نیز خیر و شر، مدّتِ حیات، تائیدِ غیبی، تقدیر اور حشر الموتیٰ کی بحث ہے۔ ان مضامین کے علاوہ عقیدۂ تناسخ کا ایک ردّ اور بعض اصطلاحات کی تعریفات بھی شامل ہیں ؎

الرسالۃ السلطانیہ الرسالۃ السلطانیہ اسی طرز کی ایک اور کتاب ہے۔ جس پر رشید الدین نے ۹ رمضان ۷۰۶ھ (۱۴ مارچ ۱۳۰۷ء) کو ایک بحث کے نتیجے کے طور پر قلم اُٹھایا جو اولجائتو کے حضور میں دینی مسائل پر ہوئی تھی ؎

لطائف الحقائق لطائف الحقائق چودہ مکتوبات پر مشتمل ہے اور ایک کشف کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں مصنف نے ۲۶ رمضان ۷۰۵ھ (۱۱ اپریل ۱۳۰۶ء) سے قبل کی شب کو دیکھا کہ وہ حضورِ نبویؐ میں پیش کیا گیا ہے۔ اسکے موضوعات بھی دینی ہیں۔ یہ اور پچھلی تین کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں۔ اور سب مل کر "مجموعۂ رشیدیہ" بنتی ہیں۔ اس مجموعے کا ایک دیدہ زیب نسخہ مؤرخہ ۷۱۰ھ (مطابق ۱۱-۱۳۱۰ء) پیرس میں موجود ہے۔ اسی کتب خانے کے ایک اور نسخے[1] میں لطائف الحقائق کا ایک فارسی ترجمہ ملتا ہے۔ اور وہیں

---

[1] شعبۂ مخطوطاتِ فارسی، قومی کتب خانہ پیرس ۱۲۲، اوراق ۱۱۳ تا ۱۲۲؛

رشید الدین کے صحیح الایمان ہونے کی تصدیق کی دو نقلیں بھی محفوظ ہیں جن پر دینیاتِ اسلام کے ستر سرکردہ علماء کے دستخط ہیں۔ اس شہادت نامے کے لکھے جانے کا سبب یہ ہُوا کہ رشید الدین کے خلاف ایک کینہ پرور شخص نے شریعت سے تہاون برتنے کے الزامات لگائے۔ اُس نے ایک خیراتی وقف سے جو غازان خان نے مرتے ہوئے علماء و فضلاء کے لئے مقرر کیا تھا۔ کچھ وظیفہ پانے کی کوشش کی تھی اور جب ناکام رہا تو رشید الدین کا دُشمن ہو گیا تھا۔

بیان الحقائق

رشید الدین کی ایک اور تصنیف بیان الحقائق ہے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ ہمیں اس کے مضامین کی عام نوعیت کے سوا کچھ معلوم نہیں۔ یہ سترہ خطوط پر مشتمل ہے جو بیشتر دینی مسائل سے متعلق ہیں۔ اگرچہ دُوسرے موضوعات مثلاً چیچک اور حرارت کی نوعیت اور اس کی قسموں پر بھی بحث کی گئی ہے۔

اپنی کتابوں کے تحفظ کے لئے رشید الدین کی پیش بندیاں

اپنی ادبی عرق ریزیوں کے ثمر آئندہ نسلوں تک پہنچانے کیلئے رشید الدین نے پُرزحمت پیش بندیاں کیں (مگر صد حیف کہ ناکافی رہیں) ان کی نہایت مکمل تفصیل کاتر میر نے لکھی ہے۔ یہاں اُنہیں صرف مختصراً دُہرایا جا سکتا ہے۔ پہلے تو اس نے دوستوں اور عالموں کو مُستعار دینے کے لئے ہر کتاب کی کئی کئی نقلیں کرائیں۔ انہیں کُھلے بندوں اجازت تھی۔

کہ اپنے استعمال کے لئے انہیں نقل کر لیں پھر اُس نے اپنی تمام فارسی تصنیفات کے عربی ترجمے اور عربی تصنیفات کے فارسی ترجمے تیار کرائے اور دونوں زبانوں کی متعدد کاپیاں ربع رشیدی (جو اُس کے نام پر ہے) کے کتابخانۂ مسجد میں رکھائیں کہ کوئی شخص جو انہیں پڑھنا یا نقل کرنا چاہے ان سے استفادہ کرے۔ اس نے ایک ضخیم جلد بھی تیار کرائی جس میں اپنے جملہ رسالوں کو یکجا کر دیا۔ اور اس کیساتھ ضروری نقشے اور تصویریں شامل کیں۔ جامع التصانیف الرشیدی اس کا نام رکھا[1]۔ اور اسے بھی مذکورہ بالا عام کتاب خانے میں رکھوا دیا۔ اپنی چار اور تصنیفات کے جو طب اور تاتاری نظامِ حکومت سے متعلق ہیں تین زبانوں میں یعنی چینی، عربی اور فارسی میں نسخے تیار کرائے۔ پھر اُس نے ان تمام لوگوں کو جو ان کتابوں میں سے کسی ایک کو یا تمام کو نقل کرنا چاہتے پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اسی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ مسجد کے لئے اس نے جو اوقاف معین کئے تھے ان کی آمدنی میں سے ایک سالانہ رقم اس بات کے لئے مقرر کی کہ ہر سال اُسکی تصنیفات کی دو مکمل نقلیں تیار کی جائیں۔ ایک عربی میں اور ایک فارسی میں

---

[1] یہ بات کہ یہ صحیح عنوان ہے اس مجموعہ کے متن سے ظاہر ہوتی ہے جسے کاترمیر نے مع ترجمہ شائع کیا ہے۔ دیکھو اس کی "تاریخ مغولان" صفحہ قط، س ۳، مجموعہ صرف چار رسالوں پر مشتمل ہے (اوپر ملاحظہ ہو ص ۱۲۵) اور جامع میں رشید الدین کی جملہ مصنفات شامل تھیں۔

اور وہ اسلامی دُنیا کے خاص خاص شہروں میں کسی ایک شہر کو ہدیۃً پیش کی جائیں۔ یہ نقلیں بغداد کے بنے ہوئے نفیس ترین کاغذ پر نہایت عُمدہ اور صاف خط میں ہوتی تھیں۔ اور پھر باحتیاط اُن کا اصل خط کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوتا تھا۔ کاتب بہت جانچ کر چُنے جاتے تھے۔ اور اُن کے کام کی نفاست اور رفتار دونوں کا خیال رکھنا ہوتا تھا۔ اور وقف کے منتظمین جیسی ہدایت دیں اسکے مطابق مسجد کے نواح ہی میں اُن کے قیام کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ ہر کاپی جب مکمل، مجلد اور مزین ہو چکتی تو اسے مسجد میں لاتے اور ممبر اور محراب کے درمیان ایک رحل پر رکھ کر اس پہ مصنف کے حق میں ایک دُعا پڑھی جاتی جو اُس نے خود تصنیف کی تھی وہ درج ذیل ہے[1]:-

اللھم یا مُلھم الاسرار و یا معلم الاخبار والآثار کما وفقت عبدک المفتقر الی رحمتک الواسعۃ رشید الطبیب لتصنیف ھذہ الکتب المشتملۃ علی التحقیقات المقویۃ لقواعد الاسلام والتدقیقات الممھدۃ لبیان الحکم والاحکام المفیدۃ

---

[1] پروفیسر براؤن نے ذیلی حاشیہ میں لکھا ہے۔ کہ اصل عربی دُعا کاترمیر نے تاریخ مغولاں کے صفحہ قنکٹ پر دی ہیں اور اس کا ترجمہ جو لطیف زیادہ ہے۔ اور لفظی کم صفحہ قم تا قمۂ پہ دیا ہے۔ خود پروفیسر براؤن نے جو ترجمہ دیا ہے وہ بقول ان کے اصل عربی سے کیا گیا ہے۔ میں نے کاترمیر سے اصل دُعا یہاں شامل کر دی ہے ۔ (مترجم)!

للمتاملین فی بدایع المصنوعات النافعۃ (النافعۃ) المتفکرین فی غرایب المخلوقات ووفقتہ ایضًا لان وقف بعض املاکہ شارطاً ان یتخذ من منالہا نسخ من ہذہ الکتب لینتفع بہا المسلمون من اہل البلدان فی کل حین واوان فتقبل اللّٰہم کلہ منہ قبولاً حسنا واجعل سعیہ مشکوراً و ذنبہ مغفوراً واغفر للساعین فی اتمام ہذا الخیر والمستفیدین من ہذہ الکتب والناظرین فیہا والعاملین بما فی مطاویہا وآتہ الحسنۃ فی الدنیا والآخرۃ انک اہل التقوی واہل المغفرۃ ،

ترجمہ :۔ "اے خدا! اے بھیدوں کے بذریعہ الہام کھولنے والے! اور اے تاریخ و روایات کا علم بخشنے والے! جس طرح تو نے اپنے بندے (رشید طبیب) کو جو تیری وسیع رحمت کا حاجتمند ہے ان کتابوں کی تصنیف کی توفیق عطا کی جو اسلام کے بنیادی اصولوں کو تقویت دینے والی تحقیقات، اور حکمتوں اور (قدرت کے) قانونوں کی توضیح پیش کرنیوالی موشگافیوں پر مشتمل ہیں، صنعتوں کی ایجادات پر غور کرنیوالوں کیلئے مفید ہیں مخلوقات کی عجیب و غریب باتوں پر فکر کرنیوالوں کے لئے پُرمنفعت ہیں اسی طرح تو نے اسے یہ توفیق بھی دی کہ اپنے املاک کا کچھ حصہ وقف کر دے۔ اس شرط پر کہ ان کی آمدنی سے ان کتابوں کے نسخے تیار کئے جائیں کہ (تمام) ممالک کے مسلمان کل زمانوں

میں ان سے فائدہ اُٹھائیں، یا اللہ! اس کے جملہ (مساعی) کو حُسنِ قبولیت کیساتھ قبول کر اور اس کی کوشش کو (لوگوں میں) مشکور کر اور اس کے گناہ بخش دے۔ اس کارِ خیر کی انجام دہی میں کوشش کرنیوالوں اور اُنکے پڑھنے اور جو کچھ ان کی تہوں (یعنی اوراق) میں (لکھّا) ہے اس پر عمل کرنے والوں کو مغفرت دے اور اسے (یعنی رشید الدین کو) دُنیا اور آخرت میں نیکی دے۔ بیشک تجھی سے ڈرنا مناسب ہے اور تو ہی بخشش کرنیکا اہل ہے"۔

اس طرح پر جو نقلیں تکمیل پاتیں یہ دُعا ان کے اخیر میں بھی درج کرنی ہوتی تھی اور اس کے بعد ایک مُختصر مناجات ہوتی۔ یہ بھی رشید الدین کی اپنی تصنیف تھی اور آخر میں متولیٔ اوقاف کے قلم سے ایک خاتمۂ کتاب ہوتا جس میں وُہ بیان کرتا کہ ہر نقل کس عہد میں اور کس خاص شہر کے لئے تیار کی گئی۔ اس کیساتھ وہ اپنا نام اور نسب بھی دیتا تاکہ مومنوں کی دعاؤں میں اسے بھی یاد کیا جائے۔ آخر کار تکمیل یافتہ کتاب تبریز کے قاضیوں کو پیش کرنی ہوتی جو اس بات کی تصدیق کریں کہ آیا نسخہ مصنّف کے معیّن کئے ہوئے تمام ضوابط میں سے گزر چکا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد یہ نسخہ مقررہ شہر کو بھیجنا ہوتا اور وہاں کسی کتابخانۂ عامّہ میں رکھوانا ہوتا جہاں تمام متعلمین آزادی سے اسے استعمال کر سکتے۔ اور مقصدیِ کتاب خانہ جو رقم مناسب سمجھتا وہ دیگر ایک

وثیقے کے بدلے کتاب مستعار بھی لے سکتے تھے۔ مجموعۂ رشیدیہ کے عربی ترجمے اور اسکے ساتھ بیان الحقائق اور کتاب الاحیاء والآثار کی ایک نقل وقف کے اُستاد کے لئے بھی تیار کرنی ہوتی۔ جسے روزانہ اسکے مندرجات کا کچھ حصّہ طالبعلموں کو پڑھ کر سُنانا اور سمجھانا ہوتا۔ مزید برآں وقف کے ہر مدرس پر واجب تھا کہ زمانۂ تدریس میں ایک تصنیف ان میں سے عربی یا فارسی میں نقل کرے۔ اگر وُہ اس سے قاصر رہتا تو اسے برطرف کر کے اس کی جگہ کوئی زیادہ مستعد آدمی رکھنا ہوتا۔ یہ نقل جب تیار ہو جائے تو اسے اختیار تھا کہ اسے بیچ دے ڈالے یا پاس رکھے۔ جو لوگ کتابخانے میں یہ تصانیف نقل کرنا چاہتے اُنہیں تمام سہولتیں مہیا کرنا ضروری تھا۔ لیکن انہیں اس کی چار دیواری سے باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ آخر میں وقف کے متولیوں کے لئے تاکید تھی کہ مخیر کی تمام وصیتوں پر نہایت مستعدی سے حرف بحرف عمل کیا جائے۔ اور جو منتظم اس میں کوتاہی کریں اُنہیں بد دُعائیں دی گئی تھیں۔

تاہم جیسا کہ کاترمیر جتاتا ہے[1] ان تمام زحمت آمیز احتیاطوں کے باوجود ہم اس فاضل مؤرخ کی تصانیف کا بیشتر حصّہ کھو بیٹھے ہیں اور جو جو پیشبندیاں اُس نے کیں انکو شہنشاہ ٹیسی ٹس[2] کی ان تدبیروں

---

[1] تصنیف مذکور صفحہ قسمو؛

[2] رومن شہنشاہ Tacitus ستمبر ۲۷۵ء تا اپریل ۲۷۶ء (مترجم)؛

سے بڑھ کر کامیابی نہ ہوئی جو اُس نے اپنے نامی قرابت دار کی مصنفات کا تحفظ حاصل کرنے کے لئے کی تھیں۔ۃ۔ زمانے کے حادثات اور انسان کی غارت گری ان دو آفتوں نے باقیاتِ سلف کے ان گنت شاہکار ہم سے چھین لئے ہیں اور بہت سے دُوسرے آثار کو بھی تباہ کر دیا ہے جو اگرچہ اتنے شاندار نہ تھے لیکن کچھ کم مفید نہ تھے۔ اور یوں دیکھو تو بیشمار لایعنی کتابیں ہر طرف بکھری پڑی ہیں اور کتبخانوں کی الماریوں میں بھری رکھی ہیں۔ اور ہم ان چند اہم تصانیف کا جاں گداز ماتم کرنیکو زندہ ہیں جن کے فقدان کی تلافی ممکن نہیں"۔

رشید الدین کے مجموعۂ مکاتیب کا قلمی نسخہ

میری خوش قسمتی ہے کہ اس قسم کی اہم تصانیف میں سے ایک میری ذاتی ملکیت کی چیز ہے۔ جس کا بظاہر کا ترمیر کو علم نہیں یہ رشید الدین کے خطوں کا مجموعہ ہے۔ جو اکثر سیاسی اور مالی امور کے متعلق اُس نے اپنے بیٹوں اور دُوسرے لوگوں کو لکھے ہیں جو حکومت مغول میں مختلف عُہدوں پہ مامور تھے۔ ان خطوں کو اُس کے

ۃ اس قرابتدار سے مراد شہنشاہ ٹیسی ٹس کا مورث اعلیٰ ٹیسی ٹس ہے جو مشہور مؤرخ تھا۔ ۵۵ء میں پیدا ہؤا اور ۱۲۰ء میں مر گیا۔ شہنشاہ ٹیسی ٹس نے اپنے عہدِ حکومت میں یہ حکم جاری کیا کہ اس کے مورث کی کتابوں کی سالانہ دس نقلیں تیار کی جائیں اور سلطنتِ روم کے مختلف کتبخانوں میں رکھی جائیں یہاں غالبًا اس فرمان کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھو گبن ص ۳۴۴ (مترجم)!

محرر محمد ابرقوہی نے یکجا کر کے ان کی تصحیح و ترتیب کی ہے۔ اس مجموعے کے دو نسخوں کے حصول کے لئے میں اپنے دوست مسٹر گائی لوسٹرینج کی فیاضی کا مرہونِ منت ہوں۔ اُنہوں نے یہ نسخے آنجہانی سر البرٹ ہاؤٹم شنڈلر سے حاصل کئے تھے۔ ان میں سے ایک پُرانا ہے اور دوسرا اسی کی جدید تر نقل ہے اور بظاہر شہزادہ بہمن میرزا بہاء الدولہ کیلئے تیار کی گئی ہے۔ اس کا ایک انگریزی کا ملخص ترجمہ مسٹر لوسٹرینج نے کیا ہے۔ جو ابھی قلمی حالت میں ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے:-
"مراسلات رشید الدین کے فارسی قلمی نسخے کے مندرجات کا خلاصہ جو سر اے ہاؤٹم شنڈلر کے مہیا کئے ہوئے نوٹوں سے نقل کیا گیا۔ اور بعد میں موصوف نے اس کی تصحیح کی"۔ اس تالیف کی انتہائی نایابی اور اس کے مضامین کی دلچسپی کے خیال سے ذیل میں اس کے مشمولہ ۵۳ مراسلات کی فہرست مکتوب الیہم کے ناموں کیساتھ درج کی جاتی ہے

لہ G. le Strange ؎ Sir Albert Houtum—Schindler

؎ ملاحظہ ہو سر البرٹ ہاؤٹم شنڈلر کے۔ سی۔ آئی۔ ای کے فارسی مخطوطات پر میرا مضمون مجلۂ انجمن ہمایونی ایشیائی بابت اکتوبر ۱۹۱۷ء۔ ص ۴۔ ۶۹۳؛

؎ Summary of the contents of the Persian M.S. Despatches Of Rashidu'd-Din : copied from notes supplied by Sir A. H. Schindler, and afterwards corrected by him : December 1913.

۱۔ دیباچہ مرتب محمد ابرقوہی، شروع میں ناقص ہے؛

۲۔ رشید الدین کا خط بنام مجد الدین اسمٰعیل فالی؛

۳۔ اوپر کے خط کا جواب،

۴۔ رشید الدین کا خط اپنے بیٹے امیر علی والیِ عراق عرب کے نام۔ اُسے حکم دیا ہے کہ اہل بصرہ کو ان کے باغیانہ چلن کی سزا دے؛

۵۔ اپنے بیٹے امیر محمود حاکمِ کرمان کے نام۔ اسے اہل بام پر ظلم کرنے پر زجر و توبیخ کی ہے؛

۶۔ اپنے خادم سنقر باورچی حاکم بصرہ کے نام۔ اُسے ہدایت دی ہے کہ کس حکمتِ عملی پر کاربند ہو؛

۷۔ اپنے بھانجے خواجہ معروف حاکم عانہ وحدثیہ وہیت وجبہ و ناعوسہ وعشارہ (؟) ورحبہ وشفاثہ و بلد العین کے نام۔ اس میں اسے رُوم کا والی مقرر کیا ہے۔ سلطانیہ سے سنہ ۶۹۰ھ مطابق ۱۲۹۱ء ریا شاید سنہ ۶۹۶ھ مطابق سنہ ۷-۱۲۹۶ء) میں لکھا گیا؛

۸۔ نائبینِ کاشان کے نام، یہ دو ہزار دینار وظیفے کے متعلق ہے، جو کاشان کے مالیے میں سے سید افضل الدین مسعود کے نام جاری ہوا؛

۹۔ اپنے فرزند امیر محمود کے نام (دیکھو اوپر نمبر ۵) اسے بام، خبیص وغیرہ کے غربا کو کھانا تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے؛

۱۰۔ اپنے بیٹے خواجہ سعد الدین حاکمِ انطاکیہ وطرسوس وسوس و العواصم وسواحلِ فرات کے نام۔ اسے نظم و نسق کے طریقوں کے اختیار

کے بارے میں پدرانہ نصیحت کی ہے۔ تن آسانی اور شراب خواری کے خلاف اور راگ رنگ اور لہو و لعب سے شغف کے خلاف تنبیہہ کی ہے؛

۱۱۔ اپنے فرزند عبدالمومن حاکم سمنان و دامغان و خوار کے نام، اسے قاضی شمس الدین محمد بن حسن بن محمد بن عبدالکریم سمنانی کو سمنان کا قاضی القضاۃ مقرر کرنیکا حکم جاری کیا ہے؛

۱۲۔ شیخ صدرالدین بن شیخ بہار الدین زکریا کے نام، شیخ کے ایک بیٹے کی موت پر تعزیت کی ہے؛

۱۳۔ مولانا صدرالدین محمد ترکئی کے نام، محصولات کے ایک اصلاح کردہ پیمانے کے متعلق ہے جو اصفہان اور دوسرے مقامات کے لوگوں پر عائد کیا جاتا ہے؛

۱۴۔ اپنے بیٹے امیر علی حاکم بغداد اور اس شہر کے ادنیٰ و اعلیٰ تمام لوگوں کے نام ایک اعلان۔ اس میں شیخ مجدالدین کے شیخ الاسلام مقرر کئے جانے اور خانقاہ شاہ متوفی غازان خان کے اُستادوں، متولیوں اور طالبعلموں کے لئے بندوبست کرنیکا ذکر ہے؛

۱۵۔ امیر نصرت الدین ستای عامل موصل و سنجر کے نام۔ یہ شرف الدین مستوفی کے متعلق ہے؛

۱۶۔ مولانا صدرجہاں بخاری کے پیش کردہ مذہبی اور فلسفی سوالات کے جوابات؛

۱۷۔ اپنے بیٹے خواجہ جلال کے نام، اس میں فرمائش کی ہے۔ کہ رُوم کے

چالیس نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس کے پاس تبریز بھیجے کہ اس نے رُبع رشیدی کی تفریح گاہ میں جو پانچ دیہات شامل کیئے ہیں اُن میں ایک کی آبادی کے لیئے یہ نوجوان بُنیادی جماعت کا کام دیں ؛

۱۸- خواجہ علاء الدین ہندی کے نام- اس سے رُبع رشیدی کے ہسپتال کے لیئے متفرق ادویاتی روغن حاصل کر کے بھیجنے کی درخواست کی ہے ؛

۱۹- اپنے فرزند امیر علی حاکم بغداد کے نام مختلف علمائے دین کے وظائف اور عطیات کے متعلق ؛

۲۰- اپنے فرزند خواجہ عبداللطیف والیٔ اصفہان کے نام اسے نصیحت کی ہے ؛

۲۱- اپنے فرزند خواجہ جلال الدین حاکم رُوم کے نام، اسے بھی نصیحت کی ہے اور تبریز کے ہسپتال کے لیئے متفرقہ جڑی بُوٹیاں اور اَور دوائیں بھیجنے کی فرمائش کی ہے ؛

۲۲- اپنے بیٹے امیر شہاب الدین حاکم بغداد کے نام، اُسے نصیحت کی ہے اور خوزستان کی آمدنی کا خلاصہ لکھا ہے ؛

۲۳- مولانا مجدالدّین اسمٰعیل فالی کے نام، اپنے نو بیٹوں کی شادیوں میں جو اس کے اہتمام سے مختلف رئیس زادیوں کیساتھ قرار پائی ہیں۔ شریک ہونے کی دعوت دی ہے ؛

۲۴- قرا بُوقا حاکم کیفی و پالُو کے نام ؛

۲۵- مولانا عفیف الدین بغدادی کے نام ؛

۲۶ - قیصریہ (واقع روم) کے موالی کے خط کے جواب میں ؛

۲۷ - اپنے بیٹے امیر غیاث محمد کے نام ، خدا بندہ اولجائتو نے امیر غیاث محمد کو خراسان کا ناظر مقرر کیا ہے اس موقع پر ؛

۲۸ - اہل سیواس کے نام ، دار السیادتِ غازانی (سادات کیلئے غازان کا بنا کردہ خیرات خانہ) اور اس کی خاطر خواہ کفالت کی ضرورت کے بارے میں ؛

۲۹ - ملتان (واقع سندھ) سے مولانا قطب الدین مسعود شیرازی کے نام ، ایران سے ہندوستان تک کے سفر کا حال لکھا ہے - یہ سفر اس نے ایلخان کے حکم سے ہندوستانی بادشاہوں سے ملنے اور اسکے علاوہ ایسی دوائیں اور مسالے واپس لے جانے کے لئے اختیار کیا تھا جو ایران میں میسّر نہیں ؛

۳۰ - تختاج انجو کے نام - اہل فارس نے اس کے جور و ظلم کی شکایتیں کی ہیں - یہ خط ان کی بابت لکھا ہے - اُن کی تحقیق و اطّلاع کے لئے وُہ اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہے ؛

۳۱ - مولانا محمد رومی اور مدرسۂ ارزنجان (جہاں کے وُہ رئیس مقرّر ہوئے ہیں) کی تعلیم کے بارے میں ؛

۳۲ - شیروان شاہ فرمانروائے شابران و شماخی کے نام ، فتح آباد کا باغ جو اُس نے تیار کرایا ہے دیکھنے کی دعوت دی ہے ؛

۳۳ - خوزستان کے افسرانِ مالیات کے نام مختلف مالیاتی اور

اور انتظامی امور کے اور اس بارے میں کہ خواجہ سراج الدین دزفُلی کو محاسبہ تحقیق اور کیفیت لکھنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے؛

۳۴۔ اپنے بیٹے خواجہ مجد الدین کے نام، ہندوستان کو تسخیر کرنے کے لئے جو فوج مخصوص کی گئی ہے۔ اس کے لئے ذخیرہ جمع کرنے کا حکم دیا ہے؛

۳۵۔ ارزنجان کے سلجوق حکمران ملک جلال الدین کیقباد بن علاء الدین کیقباد کا خط جس میں بعض امور پر مشورہ مانگا ہے۔ مع رشید الدین کے جوابات کے؛

۳۶۔ مولانا صدر الدین محمد ترکۂ کے ایک خط کے جواب میں رشید الدین کا خط جو ایک خطرناک علالت کے دوران میں لکھا گیا۔ اس میں اپنی متعدد اور وسیع جاگیروں اور دیگر املاک کو اپنی اولاد میں تقسیم کرنے کے متعلق وصیت نامہ لکھا ہے۔ ربعِ رشیدی کے لئے وہ سائنس، تاریخ اور شعر کی ساٹھ ہزار جلدوں کا ایک کتب خانہ وقف کرتا ہے۔ ان میں مُختلف اعلیٰ خطاطوں کے لکھے ہوئے ایک ہزار قرآن شامل تھے۔ دس قرآن یاقوت المستعصمی کے، دس ابن مقلہ کے اور دو سو احمد سہروردی کے لکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے چودہ بیٹوں کے نام شمار کرتا ہے وہ یہ ہیں:۔ (۱) سعد الدین، (۲) جلال الدین، (۳) مجد الدین، (۴) عبد اللطیف، (۵) ابراہیم، (۶) غیاث الدین محمد، (۷) احمد، (۸) علی، (۹) شیخی، (۱۰) پیر سلطان، (۱۱) محمود، (۱۲) ہُمام، (۱۳) شہاب

الدین، (۱۴) علی شاہ؛ اور اپنی چار بیٹیوں کے نام:- (۱) فرمان خاند (۲) آی خاتون، (۳) شاہی خاتون، (۴) ہدیۃ ملک؛

۳۷- رشید الدین کا خط مولانا صدر الدین ترکئی ہی کے نام، ایک کتاب کے بارے میں جو انہوں نے لکھی اور اس کے نام معنون کی، نیز روپیہ، ثیابِ فاخرہ، ایک گھوڑا اور متفرق اشیائے خوردنی تحفۃً بھیجنے کا ذکر ہے؛

۳۸- اہلِ دیارِ بکر کے نام، ایک نئی نہر کھدوانے اور اُس کے دونوں طرف ۱۴ گاؤں بسانے کے بارے میں۔ اس کے ساتھ نئے گاؤں کا نقشہ اور اُن کے نام دئے ہیں جو اکثر اس کے چودہ بیٹوں کے ناموں پر ہیں؛

۳۹- اپنے بیٹے جلال الدین حاکمِ رُوم کے نام، فرات سے ایک نئی نہر نکالنے اور دس دیہاتوں کی بُنیاد رکھنے کے بارے میں، یہ نہر اُس کے آقائے مرحوم غازان خان کے نام پر کہلائے گی۔ اُن دیہاتوں کا نقشہ اور اُن کے نام دئے ہیں؛

۴۰- اپنے مغیب خواجہ کمال الدین سیواسی مستوفیِ رُوم کے نام، خواجہ احمد نامی ایک تاجر کے ہاتھ ٹیونس اور مغرب کے دس علماء کو (جن کے نام دئے ہیں نقد و جنس میں کچھ تحائف پہنچانے کا حکم بھیجا ہے اُنہوں نے وزیر کی سخاوت کا حال سُن کر اسے چھتیس جلدوں میں دس کتابیں ارسال کی تھیں (ان کے عنوان دئے ہیں)، یہ ہدیات ان کا

معاوضہ ہیں ؛

۴۱۔ شیراز کے اربابِ اختیار کے نام، مولانا محمود بن الیاس کو جنہوں نے لطائفِ رشیدیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور رشید الدین کے نام معنون کی تھی۔ نقد و جنس میں کچھ مخصوص تحائف پیش کرنے کا حکم ہے ؛

۴۲۔ ہمدان کے اربابِ اختیار کے نام، دارو خانہ اور دار الشفا جو اُس نے قائم کئے تھے اور جن کے معائنے اور کیفیت کیلئے ابنِ مہدی نام ایک طبیب کو بھیج رہا ہے۔ اُن کی کفالت کے بارے میں؛ قیصریہ سے ۶۹۰ھ مطابق ۱۲۹۱ء) میں لکھا گیا ؛

۴۳۔ اپنے بیٹے امیر محمود حاکمِ کرمان کے نام، خواجہ محمود ساوجی کو اس کی خبر گیری اور اعانت کے سپرد کیا ہے جسے وہ سلطان علاء الدین کے پاس سفارت پر ہندوستان بھیج رہا ہے نیز اس لئے کہ کرمان میں رشید الدین کا اپنی جاگیروں کی طرف جو روپیہ نکلتا ہے وصول کرے ؛

۴۴۔ اپنے بیٹے پیر سلطان حاکمِ گرجستان کے نام، شام و مصر کے خلاف بادشاہ کی مجوزہ مہم کی بابت، نیز ایک مجوزہ تعزیری لشکر کشی کے بارے میں جس میں دس مغول امراء کی سرکردگی میں (جن کے نام دئے ہیں) ۱۲۰۰۰ کی فوج ہو گی اور جسے گرجستان میں سے گزرنا ہے۔ کہ ابخاز اور طرابزون کے سرکش لوگوں کو سزا دے۔ پیر سلطان کو اُس کیساتھ جانا ہے اور اپنی غیر حاضری میں حکومتِ گرجستان

کو اپنے نائب خواجہ معین الدین کے سپرد کرنا ہے ؛

۴۵ - شیخ صفی الدین اردبیلی کے نام - بہت سے آداب و تسلیمات کے بعد اشیاء کی ایک فہرست ہے جس میں گوشت، گوشت مرغ، چاول مکھن، شہد، دہی، عطریات اور زرِ نقد شامل ہیں - یہ سب چیزیں وُہ شیخ موصوف کی خانقاہ پر میلادِ نبیؐ کے عُرس کیلئے مہیا کرنیکا ارادہ رکھتا ہے ؛

۴۶ - ملک معین الدین پروانہ رومی کا خط رشید الدین کے نام، اپنے صُوبے میں ترکمانوں کی لُوٹ مار کی شکایت کی ہے ؛

۴۷ - ملک علاء الدین کا خط جو وُہ رشید الدین کو بصرہ کے رستے ہندوستان سے بھیج رہا ہے - اس کیساتھ وُہ بیش بہا اشیاء، خوشبودار ادویات، جانور، مربّے، گرم مسالے، خشک میوے، غالیچے، مختلف قسم کے تیل، نادر عمارتی لکڑی، سونے چاندی کے برتن، ہاتھی دانت وغیرہ بطور سوغات ارسال کر رہا ہے ؛

۴۸ - رشید الدین کا خط اپنے بیٹے امیر محمود کے نام جو اُن دنوں کرمان میں تصوف کی تعلیم حاصل کر رہا تھا ؛

۴۹ - اپنے بیٹے امیر احمد کے نام جو اُن دنوں اردبیل کا گورنر تھا اس میں سات وصیات ہیں اور اس بات پر ناراضی کا اظہار کیا ہے کہ وُہ جوتش کے شوق میں لگا رہتا ہے ؛

۵۰ - مولانا شرف الدین طیبی کے نام اُن کے لڑکے کی تعزیت

کا خط اور شمس الدین ابرکوہی کو حکم دیا ہے کہ انھیں سالانہ خورد و نوش وغیرہ کا کچھ مخصوص سامان مہیا کرے؛

۵۱۔ اپنے بیٹے سعد الدین والیِ قزوین کے نام، اس میں ربعِ رشیدی (واقع تبریز) کی تکمیل یابی کا حال لکھا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل چیزوں کی توصیف لکھی ہے:۔ ۲۴ سرائیں، ۱۵۰۰ دُکانیں، تیس ہزار مکانات، باغ، حمام، گودام، کاغذ سازی کے اور دیگر کارخانے اور ٹکسال؛ اہلِ حرفت اور کاریگر جو ہر ملک و شہر سے لائے گئے ہیں، قرآن پڑھنے والے، مؤذّنین اور علمائے دین جو کوچۂ علماء میں آباد کئے گئے۔ چھ یا سات ہزار طلبہ۔ ہندوستان، چین، مصر اور شام سے آئے ہوئے پچاس طبیب جن میں ہر ایک پر واجب ہے کہ دس شاگردوں کو تعلیم دے۔ دارالشفا۔ اس کے ماہرینِ امراضِ چشم۔ اس کے جرّاح اور ہڈّی بٹھانے والے۔ ان میں ہر ایک کے ذمّے رشید الدین کے پانچ ملازموں کی تعلیم ہے۔ اور نقد و جنس کے وہ رواتب جوان سب کے لئے بندھے ہوئے ہیں؛

۵۲۔ اپنے بیٹے خواجہ ابراہیم حاکمِ شیراز کے نام۔ کابل اور سیستان کی مہم کا حال لکھا ہے اور معین مقدار میں جنگی سامان اور ہتھیار طلب کئے ہیں؛

۵۳۔ اپنے کئی بیٹوں کے نام۔ علم و فضل۔ حلم، عقل اور سخاوت کی صفات کے متعلّق۔ نسخہ کی عبارت اس خط کے بیچ میں ناگہاں رُک

جاتی ہے ؎

یہ خطوط جو ضرور شائع ہونے چاہئیں[1] غیر معمولی دلچسپی کے حامل ہیں کیونکہ یہ اس حیرت انگیز شخص کے چند در چند مشاغل پر بہت سی روشنی ڈالتے ہیں جو بیک وقت ایک مدبر، طبیب، مؤرّخ اور علم و ادب و فن کا مربّی تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کا کیسا المناک انجام ہوا۔ اور اس نے اپنی کتابوں کی حفاظت کے لئے اور پھر اپنے ان خیراتی اداروں کے تحفظ کے لئے جو اس نے علم و فضل اور خیرات کے فروغ کے لئے قائم کئے تھے۔ جیسی کچھ احتیاط اور لمبی چوڑی تدبیریں کیں۔ سب کو اس انجام نے بڑی حد تک بیکار کر دیا۔ ایک حقیقی فاضل بزرگ کی مقدس یاد میں ہم کم سے کم جو کچھ کر سکتے ہیں یہ ہے کہ اسکی مصنفات میں سے جو کچھ بچ رہا ہے اسے ہمیشہ کے لئے تلف ہونے سے محفوظ کر لیں ؎

حمد اللہ مستوفی قزوینی گو رشید الدین اپنی تمام تصنیفات کی بقا میں ناکام رہا۔ لیکن اُس نے دُوسرے مؤرخوں کے لئے ایک مفید مثال قائم کی۔ چنانچہ بڑی حد تک یہ اسی کا طفیل ہے کہ یہ عہد معلومات کے اس میدان کی خوبی میں اس درجہ

---

[1] ناظرین مطلع ہوں کہ ان خطوط کا اصل فارسی متن مع انگریزی ترجمہ جناب خان بہادر مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، طبع کرا رہے ہیں عنقریب شائع ہو جائے گا ؎ (مترجم)

ممتاز ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیونکر اُس نے وصّاف کی امداد کی۔ اور ایلخان کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی۔ اب ہم اسکے سب سے مقلّد حمداللہ مستوفی کی تالیف و تصنیف کو لیتے ہیں۔ اس کے حالاتِ زندگی کے متعلق سوائے ان باتوں کے کچھ معلوم نہیں جو وُہ ضمناً اپنی تصنیفات میں بتا جاتا ہے۔ وہ اپنے تئیں عربی نژاد جتاتا ہے اور اپنا نسب حُر بن یزید الرّیاحی سے ملاتا ہے۔ لیکن اس کا خاندان مُدت سے قزوین میں سکونت پذیر تھا۔ اس کا پردادا امین الدین نصر مستوفیِ عراق تھا۔ لیکن بعد میں اس نے راہبانہ زندگی اختیار کی۔ اور بالآخر تاتاریوں کے ہاتھوں قتل ہُوا۔ اس کا بھائی زین الدین محمد رشیدالدین کے ماتحت کسی منصب پر فائز تھا۔ اور خود حمداللہ کو بھی اسی وزیر نے ۱۳۱۱ء کے قریب قزوین، ابہر، زنجان اور طارمین کا ناظرِ مالیات مقرر کیا۔ رہا باقی سو وہ ہمیں بتاتا ہے کہ چھوٹی ہی عُمر سے وہ بڑے اشتیاق سے علماء کی صُحبت میں شریک رہا۔ خصوصًا خود رشیدالدین کی صحبت میں، اور عالمانہ مباحثوں میں اکثر حصّہ لیتا رہا۔ بالخصوص اُن میں جو تاریخ پر ہوتے تھے۔ چنانچہ ہرچند تاریخ نویسی کی باقاعدہ تربیت اسکو حاصل نہیں تھی۔ لیکن اس نے عزم کیا کہ فرصت کے اوقات کو عالم کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ تالیف کرنے میں صرف کرے۔ اس کی تصانیف میں سے تین یعنی تاریخ گزیدہ، ظفرنامہ اور نزہت القلوب ہم تک پہنچی ہیں۔ ان تینوں میں پہلی دو تاریخی ہیں اور تیسری جغرافی ؎

تاریخ گزیدہ

تاریخ گزیدہ ۷۳۰ھ (مطابق ۱۳۳۰ء) میں لکھی گئی اور رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین کے نام معنون کی گئی ہے - جو مئی ۱۳۲۸ء میں وزیرِ اعظم بنایا گیا - اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مئی ۱۳۳۶ء میں مارا گیا - مصنف اپنے کوئی دو درجن

تاریخِ گزیدہ کے ماخذ

ماخذ شمار کرتا ہے - ان میں مندرجۂ ذیل شامل ہیں :-

(۱) سیرت النبیؐ (غالباً ابن ہشام کی[1]) ؛ (۲) قصص الانبیاء (غالباً ثعلبی کی[2]) ؛ (۳) رسالہ قشیریہ[3] ؛ (۴) تذکرۃ الاولیاء (غالباً فرید الدین عطار کا[4]) ؛ (۵) مدوینِ امام الدین الیافعی[5] ؛ (۶) تجارب الامم[6] (غالباً ابنِ مسکویہ کی) ؛ (۷) مشارب التجارب ؛ (۸) دیوان النسب[9] ؛

۱؎ مرتبہ وُوسٹن فیلڈ، گوٹنگن، ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۰ء ؛ جرمن ترجمہ از وائل Weil شٹٹ گارٹ Stuttgart ۱۸۶۴ء ؛ ۲؎ مطبوعہ قاہرہ در ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴-۵ء اس طبع کے حواشی میں الیافعی کی روض الریاحین چھپی ہے ؛ ۳؎ مطبوعہ بولاق ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷-۸۰ء) ؛ ۴؎ میرے جاری کئے ہوئے سلسلۂ کتب تواریخ فارسی (Persian Hist. Text Series) کی تیسری اور چوتھی جلد، مرتبہ ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن ؛ ۵؎ دیکھو حاجی خلیفہ (طبع فلوگل Flugel) جلد دوم صفحہ ۲۵۴ نمبر ۲۷۷۳، جہاں مصنف کی تاریخ وفات ۶۲۳ھ (۱۲۳۶ء) دی گئی ہے ؛ ۶؎ اس کی پانچویں اور چھٹی جلدیں سلسلۂ یادگار گب میں بہ چاپ عکسی شائع ہو چکی ہیں (سلسلہ ۷، جلد اول ؛ ۷؎ جلد پنجم ؛ ۸؎ جلد ششم ؛ ۹؎ غالباً انساب کی ایک تصنیف بعنوان کتاب الانساب ؛

(۹) تاریخ محمد جریر الطبریؒ؛ (۱۰) تاریخ حمزہ اصفہانیؒ؛ (۱۱) تاریخ الکامل لابن الاثیرؒ؛ (۱۲) زبدۃ التواریخ، جمال الدین ابو القاسم کاشی؛ (۱۳) نظام التواریخ، قاضی ناصر الدین البیضاویؒ؛ (۱۴) عیون التواریخ، لابی طالب علی الخازن البغدادی؛ (۱۵) کتاب المعارف لابن ابی قتیبہؒ؛ (۱۶) تاریخ جہانگشای عطاء ملک جوینیؒ؛ (۱۷) عتبی کی کتاب الیمینی کا فارسی ترجمہ از قلم ابو شرف جرباذقانی؛ (۱۸) سیاست نامہ نظام الملکؒ؛

۱؎ پندرہ جلدوں میں ۱۸۷۹ء اور ۱۹۰۱ء کے درمیان عربی کے برگزیدہ علماء کی ایک بین الاقوامی جماعت نے لیدن Leyden سے شائع کی، اس کے صدر آنجہانی پروفیسر دوخویہ de Goeje تھے؛ ۲؎ لاطینی ترجمے کیساتھ گوٹ والٹ Gottwaldt نے مرتب کی، لائپزگ (Leipzig) ۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۸ء

۳؎ طبع ٹورنبرگ، ۱۴ جلدیں، لیڈن ۱۸۵۱ء تا ۱۸۷۶ء؛ قاہرہ، بارہ جلدیں؛ ۱۲۹۰ھ تا ۱۳۰۳ھ (۱۸۷۳ء تا ۱۸۸۶ء)؛ ۴؎ اس تصنیف اور اسکے مصنف کی بحث اس باب میں آگے آئیگی؛ ۵؎ طبع ووسٹن فیلڈ گوٹنگن ۱۸۵۰ء؛

۶؎ کتاب کی کل تین جلدوں میں سے پہلی دو بہ تصحیح و ترتیب میرزا محمد قزوینی سلسلہ یادگار گب میں شائع ہو چکی ہیں، سلسلہ ۱۶ جلد اول؛ ۱۶ جلد دوم (تیسری جلد ۱۹۳۷ء میں اس سلسلے میں شائع ہو چکی ہے، مترجم)؛ ۷؎ اصل عربی کی کتاب طبع سنگی ۱۸۴۷ء میں دِلّی سے شائع ہوئی، ۱۲۸۶ھ (۷۰-۱۸۶۹ء) میں المنینی کی شرح کیساتھ قاہرہ میں چھپی، جرباذقانی کا فارسی ترجمہ ۱۲۷۲ھ (۶-۱۸۵۵ء) میں طہران سے بہ چاپ سنگی شائع ہوا؛ ۸؎ مرتبہ شیفر (Schefer) پیرس ۱۸۹۱، ۱۸۹۳؛

(یہاں اس کا نام سیر الملوک دیا گیا ہے)؛ (۱۹) شاہنامۂ فردوسیؒ[1]؛ (۲۰) سلجوق نامۂ ظہیری نیشاپوری؛ (۲۱) مجمع ارباب المسلک مؤلفہ قاضی رکن الدین جوینی؛ (۲۲) استظہار الاخبار مصنفہ قاضی احمد دامغانی؛ اور آخر میں (۲۳) مصنف کے مرحوم مربی و آقائے شہیدؒ[2] رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ[3]*

مختلف سمت جو وقت کے شمار میں مستعمل ہیں

اپنے مآخذ گننے کے بعد جو ذیلی حواشی سے ظاہر ہے کہ سب براہ راست ہماری دسترس میں ہیں مصنف ان مختلف سمتوں کا ذکر کرتا ہے جو مختلف قوموں کے ہاں رائج ہیں۔ ان میں بعض حضرت آدمؑ سے شروع ہوتے ہیں بعض طوفانِ نوحؑ سے۔ بعض حضرت ابراہیمؑ[4] یا حضرت موسیٰؑ سے، بعض فرعون کی تباہی سے۔ بعض تعمیر کعبہ یا حبشیوں کے حملۂ یمن سے، اہل یونان سکندر سے شروع کرتے ہیں۔ قبطی لوگ بخت نصر

---

۱ اس کی تین طبعیں یہ ہیں: مرتبہ ٹرنر میکن (Turuer Macon) کلکتہ ۱۸۲۹ء مرتبہ ژول مول (Jules Mohl) (پیرس ۱۸۷۸ء۔ ۱۸۳۸ء)؛ مرتبہ فولر Vuller ولنڈاور (Landauer)، اسٹرلیس برگ ۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۴ء، تین جلدیں، سکندرِ اعظم پہ آکر ختم ہوتی ہیں؛

۲ مصنف اسے مخدومِ سعیدِ شہید، لکھتا ہے، ص ۵۵۸، تاریخ گزیدہ طبع عکسی، سلسلہ یادگار گب ۱۴/۱، جلد اول (مترجم)؛

۳ دیکھو اوپر ص ۱۱۲ تا ص ۱۱۳، ص ۱۱۸ تا ص ۱۲۴؛

سے، اور جاہلیت کے قریش عام الفیل سے۔ اس کے بعد وہ تاریخ نگاری کی اس اُلجھن پر بحث کرتا ہے۔ جو اس بات سے پیدا ہوئی ہے کہ عالم کے نقطۂ آغاز کے بارے میں اختلافات ہیں۔ اور یہ اُلجھن اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ فلسفی دنیا کو لا ابتدا قرار دیتے ہیں۔ اور ماہرینِ دینیات کا کہنا ہے کہ دنیا کا آغاز بھی ہوا۔ اور انجام بھی ہوگا۔ لیکن دونوں سروں کی تعیین سے قاصر ہیں۔ ہندوستان، چین اور یورپ میں یہ عقیدہ ہے کہ حضرت آدم کو گزرے دس لاکھ برس ہو چکے ہیں۔ اور یہ کہ آدم کئی ہوئے ہیں۔ ان میں ہر ایک اپنی اولاد سمیت ایک مخصوص زبان بولتا تھا۔ لیکن ان میں صرف ایک (یعنی آدمِ عبرانی) کے سوا باقی سب کی نسلیں مٹ گئیں۔ بخلاف اس کے ایران کے اکثر مسلمان علماء، حضرتِ آدمؑ اور حضرت محمد صلعم کے درمیان کا زمانہ چھ ہزار سال بتاتے ہیں۔ گو بعض اس میں کچھ کمی بیشی کرتے ہیں منجمین طوفانِ نوحؑ سے شمار کرتے ہیں۔ مصنف کے وقتِ تحریر (یعنی ۶۹۸ یزدگردی مطابق تقریباً ۱۳۳۰ء) اس کا سن ۳۷۴۴ گنا جاتا ہے؛

تاریخ گزیدہ کے مندرجات تاریخ گزیدہ ایک فاتحہ، چھ ابواب، اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر باب کئی کئی فصلوں میں تقسیم ہے۔ ذیل میں ملاحظہ ہو:-

فاتحہ:- آفرینشِ کائنات و آدم کے بیان میں؛

بابِ اوّل۔ دو فصلوں میں:-

فصلِ اوّل :- انبیاء کے بیان میں ،

فصلِ دوم :- پیغمبرانِ مرسل اور ان حکماء کے بیان میں جو ہر چند پیغمبر نہ تھے۔ لیکن اُنہوں نے دین کی بہتری کے لئے سعی کی ؛

باب دوم :- پادشاہانِ قبل از اسلام کے بیان میں - چار فصلوں میں :-

فصلِ اوّل :- پیشدادیان گیارہ بادشاہ (مدتِ حکومت ۲۴۵۰ سال)

فصلِ دوم :- کیانیان دس بادشاہ (مدتِ حکومت ۷۳۴، سال)

فصلِ سوم :- ملوک الطوائف (اہل پارتھیا) بائیس بادشاہ[1]، (مدتِ حکومت ۳۱۸ سال[2])؛

فصلِ چہارم :- ساسانیان، اکتیس بادشاہ (مدتِ حکومت ۵۲۷ سال[3])

باب سوم :- محمدؐ مصطفےٰ صلعم اُن کے خلفاء، صحابہ اور اولاد

---

[1] تاریخ گزیدہ کی طبعِ عکسی (سلسلۂ یادگار گب) میں تعداد بیست ویک دی گئی ہے۔ صا۱۰ (مترجم)

[2] سکندرِ اعظم اور ملوک الطوائف کے زوال کے درمیانی وقت کا وجود در اصل تقریباً ساڑھے پانچ سو برس کا زمانہ ہے) اندازہ مسلمان مصنف ہمیشہ کم کرتے رہے ہیں سوائے (جہاں تک مجھے معلوم ہے) مسعودی کے ایک استثنا کے جو اپنی کتاب التنبیہ والاشراف (ص ۸-۹۷) میں ان سیاسی اور مذہبی اغراض کی تشریح کرتا ہے جنہوں نے اردشیر بابکان بانیٔ خاندانِ ساسانی کو اس بات کی ترغیب دلائی کہ دانستہ اس زمانے کو تقریباً نصف کر کے مشہور کر دے ؛ [3] (نوٹ اگلے صفحے پر)؛

کے بیان میں، ایک مقدمہ اور چھ فصلوں میں ہیں:۔

مقدمہ:۔ پیغمبرؐ کا نسب؛

فصل اوّل:۔ شرحِ احوال و غزوات و ازواج و دبیران و اقربا و موالی و مخلفاتِ پیغمبرؐ؛

فصل دوم:۔ خلفاء راشدین، تعداد پانچ (امام حسنؑ ان میں شامل ہیں) ان کی مدتِ خلافت ۱۰ ربیع الاول ۱۱ھ تا ۱۳ ربیع الاول ۴۱ھ (مطابق ۸ جون ۶۳۲ء تا ۱۷ جولائی ۶۶۱ء) جب کہ امام الحسنؑ معاویہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو گئے؛

فصل سوم:۔ بقیۂ ائمۂ اثنا عشر، تعداد دس (حضرت علیؓ کے اور امام حسنؑ جنہیں ۴۹ھ (مطابق ۷۰-۶۶۹ء) میں زہر دیا گیا کے علاوہ) مدت ۲۱۵ سال یعنی ۲۸ صفر ۴۹ھ تا رمضان ۲۶۴ھ (مطابق ۱۴ مارچ ۶۶۹ء تا مئی ۸۷۸ء)

فصل چہارم:۔ بعض صحابہ و تابعین کے تذکرے،

فصل پنجم:۔ ملوکِ بنی امیہ (مصنف انہیں خلفاء میں شمار نہیں کرتا) چودہ بادشاہ مدتِ حکومت ۹۱ سال یعنی ۱۳ ربیع الاول ۴۱ھ تا ۱۳ ربیع الاول ۱۳۲ھ (۱۷ جولائی ۶۶۱ء تا ۳۰ اکتوبر ۷۴۹ء)؛

فصل ششم:۔ خلفاء بنی عباس، تعداد ۳۷، مدتِ خلافت ۵۲۳ سال ۲ مہینے

(نوٹ ۲ صفحہ گذشتہ) اس مدت کے اندازے میں ایک صدی سے زیادہ کی زیادتی ہے۔ اس خاندان کا زمانہ ۲۲۶ء سے ۶۵۲ء تک تھا۔

اور ۲۳ دن، یعنی ۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۲ھ تا ۶ صفر سنہ ۶۵۶ھ

(مطابق ۳۰ اکتوبر سنہ ۷۴۹ء تا ۱۲ فروری سنہ ۱۲۵۸ء)؛

باب چہارم :- ایران میں دور اسلامی کے بادشاہ، بارہ فصلوں پر مشتمل ہے :-

فصلِ اوّل :- سلسلۂ صفاریان، تین بادشاہ، مدتِ حکومت ۳۵ سال

از سنہ ۲۵۳ھ تا سنہ ۲۸۷ھ (مطابق سنہ ۸۶۷ء تا سنہ ۹۰۰ء) اس کے

بعد اُن کی نسل کچھ عرصہ سیستان میں حکمران رہی؛

فصلِ دوم :- سلسلۂ سامانیان، ۹ بادشاہ، مدتِ حکومت ۱۰۲ سال ۶ ماہ

ربیع الثانی سنہ ۲۸۷ھ تا ذوالقعدہ سنہ ۳۸۹ھ (مطابق اپریل سنہ ۹۰۰ء

تا اکتوبر-نومبر سنہ ۹۹۹ء)؛

فصلِ سوم :- سلسلۂ غزنویاں، چودہ بادشاہ، مدتِ حکومت ۱۵۵ سال،

(۳۰ سال ایران کے بیشتر حصے میں اور باقی عرصہ غزنہ میں)،

از سنہ ۳۹۰ھ تا سنہ ۵۴۵ھ (مطابق سنہ ۱۰۰۰ء تا سنہ ۱-۱۱۵۰ء)؛

فصلِ چہارم :- سلسلۂ غوریاں پانچ بادشاہ، مدتِ حکومت ۶۴ سال از

سنہ ۵۴۵ھ تا سنہ ۶۰۹ھ (مطابق سنہ ۱-۱۱۵۰ء تا ۳-۱۲۱۲ء)؛

فصلِ پنجم :- دیالمہ یا آل بویہ، سترہ بادشاہ، مدتِ حکومت ۱۲۷ سال،

از ذی قعدہ سنہ ۳۲۱ھ تا سنہ ۴۴۸ھ (مطابق سنہ ۹۳۳ء تا ۱۰۵۶-۷ء)

فصلِ ششم :- سلاجقہ تین شعبوں میں :-

(۱) سلجوقیانِ ایران و عراق، تعداد ۱۴، مدتِ حکومت ۱۶۱

سال از ۴۲۹ھ تا ۵۹۰ھ (مطابق ۳۸-۱۰۳۷ء تا ۱۱۹۴ء)

(۲) سلجوقیانِ کرمان، گیارہ بادشاہ، مدتِ حکومت ۱۵۰ سال از ۴۳۳ھ تا ۵۸۳ھ (مطابق ۲-۱۰۴۱ء تا ۸-۱۱۸۷ء)؛

(۳) سلجوقیانِ روم۔ گیارہ بادشاہ، مدتِ حکومت ۲۲۰ سال از ۴۸۰ھ تا ۷۰۰ھ (مطابق ۸-۱۰۸۷ء تا ۱-۱۳۰۰ء)؛

فصلِ ہفتم :- سلسلۂ خوارزمشاہیاں، ۹ بادشاہ، مدتِ حکومت ۱۳۷ سال از ۴۹۱ھ تا ۶۲۸ھ (مطابق ۱۰۹۸ء تا ۱-۱۲۳۰ء)؛

فصلِ ہشتم :- سلسلۂ اتابکان دو شعبوں ہیں :-

(۱) اتابکانِ شام و دیارِ بکر، مدتِ حکومت[1] ۱۲۰ سال ۴۸۱ھ تا ۶۰۱ھ (مطابق ۹-۱۰۸۸ء تا ۵-۱۲۰۴ء)؛

(۲) اتابکانِ فارس معروف بہ سلغریان، گیارہ بادشاہ۔ مدتِ حکومت ۱۲۰ سال، از ۵۴۳ھ تا ۶۶۳ھ (مطابق ۹-۱۱۴۸ء تا ۵-۱۲۶۴ء)؛

---

[1] تاریخ گزیدہ طبع عکسی کے حساب سے مدتِ حکومت ۱۷۷ سال ہوتی ہے۔ وہاں ۴۸۱ھ تا ۶۵۸ھ لکھا ہے (ص ۴۰۵) ممکن ہے براؤن کا ماخذ کوئی دوسرا نسخہ ہو اصل میں اتابکوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرنے سے ترتیب زمان خلط ملط سی ہوجاتی ہے۔ لین پول نے "سلسلہ ہائے سلاطینِ اسلامی" Mohammadan Dynasties میں اتابکوں کی چھوٹی بڑی کوئی دس شاخیں گنی ہیں ان میں شاخ دیار بکر جسے وہ شام اور میسوپٹیمیا کی شاخ سے الگ قرار دیتا ہے کا عہد اس کی رو سے ۷۱۲ھ تک چلتا ہے؛ (مترجم)

فصلِ نہم :- سلسلۂ اسمٰعیلیان، دو مقالوں میں :-

(۱) اسمٰعیلیانِ مصر و شام و مغرب (خلفاء فاطمی) چودہ خلفاء، مدّتِ حکومت ۲۶۰ سال، ۲۹۶ھ تا ۵۵۶ھ (مطابق ۹-۹۰۸ء تا ۱۱۶۰ء)؛

(۲) اسمٰعیلیانِ ایران معروف بہ ملاحدہ (حشیشیینِ الموت) تعداد ۹۔ مدّتِ حکومت ۱۷۱ سال۔ از ۴۸۳ھ تا ۶۵۴ھ (مطابق ۱-۱۰۹۰ء تا ۱۲۵۶ء)؛

فصلِ دہم :- قراختائیانِ کرمان۔ دس[1] بادشاہ۔ مدّتِ حکومت ۸۵ سال از ۶۲۱ھ تا ۷۰۶ھ (مطابق ۱۲۲۴ء تا ۷-۱۳۰۶ء)؛

فصلِ یازدہم :- اتابکانِ لُرستان، دو شعبوں میں :-

(۱) اتابکانِ لُرِ بزرگ۔ سات بادشاہ۔ مدّتِ حکومت ۱۸۰ سال از ۵۵۰ھ تا ۷۳۰ھ (مطابق ۶-۱۱۵۵ء تا ۳۰-۱۳۲۹ء)

(۲) اتابکانِ لُرِ کوچک۔ گیارہ بادشاہ۔ مدّتِ حکومت ۱۵۰ سال از ۵۸۰ھ تا ۷۳۰ھ (مطابق ۵-۱۱۸۴ء تا ۳۰-۱۳۲۹ء)

فصلِ دوازدہم :- پادشاہانِ مغولِ ایران مشہور بایلخانیان۔ تیرہ ۱۳ بادشاہ۔ مدّتِ حکومت تا زمانِ تالیف تاریخ گزیدہ

---

[1] طبع عکسی میں نُہ تن دیا ہے اور تذکرہ بھی نو ہی بادشاہوں کا ہے۔ لین پول نے سلسلہ ہائے سلاطینِ اسلامی میں بحذف سلطان حجاج آٹھ بادشاہ گنے ہیں؛ (مترجم)؛

۱۳۱ سال۔ از ۵۹۹ھ تا ۷۳۰ھ (مطابق ۳-۱۲۰۲ء تا ۳۰-۱۳۲۹ء)۔ مصنف اضافہ کرتا ہے "اس سے بعد کی تاریخ آگے لکھنے والا لکھے"۔

باب پنجم:۔ اُن لوگوں کے بیان میں جو اپنے تقدس یا فضیلت کے باعث قابلِ ذکر ہیں۔ چھ فصلوں میں:۔

فصلِ اوّل:۔ ائمہ و مجتہدین (بارہ کا تذکرہ ہے)؛

فصلِ دوم:۔ قراء (نو کا تذکرہ ہے)؛

فصلِ سوم:۔ محدثین (سات کا تذکرہ ہے)؛

فصلِ چہارم:۔ مشایخ و صوفیاء (تقریباً تین سو کا تذکرہ ہے)؛

فصلِ پنجم:۔ علمائے الہیات و فقہ و طب (تقریباً ستر کا تذکرہ ہے)؛

فصلِ ششم:۔ شعراء۔ ان میں کوئی پانچ عربی اور ستاسی فارسی شاعروں کے تذکرے ہیں۔ ان میں کے فارسی شاعروں کے تذکرے میں نے اکتوبر ۱۹۰۰ء اور جنوری ۱۹۰۱ء کے مجلّہ انجمنِ ہمایونی ایشیائی میں شائع کیے ہیں۔ اور اس مجموعے کی الگ چھپی ہوئی کاپیاں بھی تشر کی ہیں۔

باب ششم:۔ احوالِ شہر قزوین کہ مؤلف کا مولد و منشا ہے، سات فصلوں میں:۔

لہ طبع عکسی میں صد و سی و پنج ہے۔ اس حساب سے تاریخ گزیدہ کا زمانہ تالیف ۷۳۴ھ ہوتا ہے۔ اغلب ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے؛ (مترجم)

فصلِ اوّل[1] :- روایات متعلقہ قزوین۔ کوئی چالیس روایتیں دی ہیں جن میں چھتیس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تدوینِ الرّافعی[2] کے ایک نسخے سے ماخوذ ہیں جو مصنف کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ تقریباً سب روایتوں میں قزوین کو "جنّت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ" کہا گیا ہے؛

فصلِ دوم :- اس شہر کی وجہ تسمیہ؛

فصلِ سوم :- قزوین کی قابلدید عمارات۔ اس کے ۹ محلّے اور اس کی تعمیراتی تاریخ شاپور اوّل کے عہد سے جو اس کا اصل بانی تھا۔ عربوں کا اسے فتح کرنا اور اس کا قبولِ اسلام؛

فصلِ چہارم :- اس کے نواحی، دریا، زمین دوز نہریں، مسجدیں اور مقبرے۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعض باشندے آج تک خُفیہ طور پر دینِ مزدک کے پیرو ہیں؛

فصلِ پنجم :- وہ مشہور اشخاص جو قزوین میں وارد ہوئے۔ ان میں صحابہ تابعین، خلفاء، مشایخ، علماء، پادشاہ، وزراء، خواقین

---

[1] طبع عکسی میں روایات کی یہ فصل غائب ہے۔ اس میں فصلِ اول وہ ہے جو فہرستِ بالا میں فصلِ دوم ہے (مترجم)؛ [2] مصنف کی نزہت القلوب کی طبع گائی لوسٹرینج مع ترجمہ ملاحظہ ہو (سلسلہ یادگار گب نمبر ۲۳، جلد اول ص ۸-۵۶ اور جلد دوم ص ۳-۶۲) جہاں اسی سند پر مبنی ان میں سے بہت سی روایات دی گئی ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو اوپر صفحہ ۱۲۵، حاشیہ ذیلی ۵؛

اور امرا شامل ہیں؛

فصلِ ششم:- حکّامِ قزوین؛

فصلِ ہفتم:- قزوین کے بڑے بڑے قبائل اور خاندان - ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:-

افتخاری (جن کے مورثِ اعلیٰ ملک سعید افتخار الدین محمد بن ابو نصر نے مغولی اور ترکی دونوں زبانوں کی تحریر و تقریر سیکھی تھی - اور کلیلہ و دمنہ کا مغولی میں اور سند باد نامہ کا ترکی میں ترجمہ کیا تھا)؛

بازداری یا آلِ مظفر - بشاری - بُرہانی - حنفی - حلوانی - خالدی - خلیلی - دبیری - رافعی - زاکانی - زبیری - زادانی شیر زادی - طاؤسی - عبّاسی - غفاری - فیلوا گوشانی قیفوی قراول - تمیمی - کرجی یا دُلفی (مشہور جغرافیہ نویس زکریا بن محمد بن محمود اسی خاندان سے تھا) - کیاسی یا کیسی - ماکانی - مستوفی (مصنّف کا اپنا خاندان جسے کہا گیا ہے کہ حُر بن یزید الریاحی کی نسل سے ہے) - مُؤمنی - مختاری - معافی یا معافانی مرزبانی - نیشاپوری اور بُولا تیموری یا طابا بگانی (طابا بک خان ان کا مورثِ اعلیٰ تھا)۔

خاتمہ:- ایک شجرۂ انساب جو رشید الدین کے اختراع کردہ شجرے پر مبنی ہے - لیکن یہاں اس پر اصلاح کی گئی ہے جتنے نسخے

میں نے دیکھے ہیں اُن سب میں یہ شجرہ محذوف ہے ۔

تاریخ گزیدہ کے میدان مبحث کی وسعت اور اُس کی نسبتہً قلیل ضخامت (ایک لاکھ ستر ہزار الفاظ تقریباً) کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت ملخص کی سی ہے اور اس سے بہت تفصیل کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی۔ تاہم یہ ایک مفید کتاب ہے۔ اور اس میں بہت سی دلچسپ معلومات ہیں۔ جو اَور کہیں نہیں ملتیں۔ اور معاصر تاریخ پر تو یہ قطعی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ مُدت سے اس کے متن کی ایک مکمل ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ ۱۹۱۰ء تک اسکے جو حصے چھپے ہوئے ملتے تھے حسب ذیل تھے :-

(۱) باب چہارم مکمل۔ ایران میں اسلامی دور کے بادشاہوں پر۔ فرانسیسی ترجمے کے ساتھ موسیو ژول گانتین نے مرتب کی ہے (پیرس ۱۹۰۳ء) تعداد صفحات ط + ۴۲۳،

(۲) باب ششم مکمل (باستثنائے فصل اول جو روایات پر ہے جس میں شہر قزوین کا حال ہے۔ فرانسیسی ترجمہ از قلم موسیو باربی اے دو مینار[1] ۱۸۵۷ء کے فرانسیسی مجلہ آسیائی[2] (سلسلہ ۵، جلد ۱۰، ص ۲۵۷ بعد)؛

(۳) فصلِ ششم باب پنجم۔ فارسی شعرار کے حالات میں نے اکتوبر

---

[1] M. Barbier de Meynard

[2] Journal Asiatique ؛

۱۹۰۰ء اور جنوری ۱۹۰۱ء کے مجلۂ انجمن ہمایونی ایشیائی میں اس کا ترجمہ شائع کیا تھا ⁂

۱۹۱۰ء میں البتہ ایک خاصے صحیح اور پُرانے نُسخے زتاریخ استنساخ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء) کا عکسی چاپ سلسلۂ یادگار گب میں شائع ہُوا (سلسلہ ۱۴ جلد اوّل) اور اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں سلسلۂ مذکورہی میں اس کا ایک ملخص ترجمہ مع مفصّل اشاریات چھپا۔ جو راقم اور ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن نے تیار کیا تھا۔ (سلسلہ ۱۴، جلد دوم) چنانچہ اب پوری تصنیف علماء کے لئے قابلِ رسائی ہے۔ اور وہ اس کی قدر و وقعت پر اپنی رائے خود قائم کر سکتے ہیں ⁂

ظفر نامہ تاریخ گزیدہ کے دیباچے میں حمد اللہ مستوفی ایک بڑی تاریخی نظم کا ذکر کرتا ہے جس کی تصنیف میں وُہ ان دنوں مشغول تھا۔ اور جس کے وہ اس وقت (۷۳۰ھ مطابق ۱۳۳۰ء) تک کل ۷۵ ہزار میں سے ۵۰ ہزار سے کچھ اوپر شعر لکھ چکا تھا۔ یہ مثنوی موسوم بہ ظفر نامہ جو پانچ برس بعد مکمل ہوئی دراصل شاہنامۂ فردوسی کی ذیل ہے۔ اس کا واحد معلوم نسخہ[1] عجائب خانۂ برطانوی میں محفوظ ہے (شعبۂ شرقیہ نمبر ۲۸۳۳) یہ ۷۷۹ اوراق کی ایک ضخیم جلد ہے اور مسٹر سڈنی چرچل نے ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ ایران سے برٹش میوزیم کیلئے خریدا۔ اس

---

[1] اس بیش قیمت نسخے کی مکمل کیفیت کیلئے دیکھو ریو کا ضمیمۂ مخطوطاتِ فارسی نمبر ۲۶۳، صفحہ ۱۷۲ تا صفحہ ۱۷۴ نیز ایتھی نیم Athenaeum ۱۸۸۵ء، صفحہ ۲۱۴؛

میں علاوہ ظفر نامہ کے شاہنامہ کا ایک تصحیح شدہ متن بھی ملحق ہے جس پر مستوفی نے چھ سال صرف کئے تھے۔ ظفر نامہ پیغمبرِ اسلام کے وقائع عمری سے شروع ہوتا ہے۔ اور مصنف کے اپنے عہد یعنی ۷۳۲ھ مطابق ۲-۱۳۳۱ء تک آتا ہے جبکہ ابوسعید ابھی تختِ شاہی پر متمکن تھا۔ اس میں حسب مذکور ۷۵،۰۰۰ شعر ہیں۔ ساڑھے سات صدیوں میں جن سے مصنف نے بحث کی ہے ہر ایک کیلئے دس ہزار اشعار مخصوص کئے ہیں۔ یا اگر تصنیف کے بڑے بڑے حصوں کو لیں تو ۲۵۰۰۰ شعر عربوں کے لئے۔ ۲۰۰۰۰ ایرانیوں کے لئے اور ۳۰،۰۰۰ مغلوں کے لئے مخصوص ہیں۔ مصنف نے جب مثنوی شروع کی تو اس کی عمر چالیس برس تھی۔ اور اُس نے اس کی تالیف پر ۱۵ سال صرف کئے لہذا یقیناً وہ ۶۸۰ھ (مطابق ۲-۱۲۸۱ء) کے آس پاس پیدا ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر ریو نے نسخے کی جو کیفیت لکھی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اِس تالیف کی تاریخی قدر و وقعت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ لکھتا ہے (مقام مذکور ص ۱۷۴) "مصنف واقعات اور تاریخوں کے معاملے میں بڑا تحقیق پسند واقع ہوا ہے۔ اس کا تیسرا دفتر مغلی عہد کی تاریخ کے لئے مفید پایا جائیگا۔ مثلاً وہ (ورق ۵۱۲ الف پر) اپنے مولد قزوین میں تاتاریوں کے قتلِ عام کا ایک نہایت واضح نقشہ کھینچتا ہے۔ اس کی اطلاعات کسی قدر اس کے پردادا امین نصر مستوفی کی روایات پر مبنی ہیں۔ جس کی عمر اس وقت ۹۳ برس تھی۔

اُس حصے میں سے ذیل کا انتخاب نمونے کا کام دیگا ؎

وزینؔ[1] رو بقزوین سُبتای[2] بجنگ — در آمد بکردار غرّان پلنگ
بدانگه که شد شہر دریای خون — ده و ہفت بودی ز ششصد فزون
ز شعبان گذر کرده بُد ہفت[3] روز — کی پیدا شد آن محنتِ دردوسوز
در آن وقت بُد حاکم این دیار — مظفر لقب مہتری نامدار

واقعۂ شہر قزوین

بحکم خلیفہ درین شہر شہر — ز کار حکومت ورا بود بہر
چو لشکر درین مرز آمد بجنگ — ببستند دروازہا ہمچو سنگ
بر آمد ببار و بسی جنگ جُو — بسوی مُغل کرد در جنگ رُو
سہ روز اندرین کس ندیدند راہ — چہارم بشہر اندر آمد سپاہ
مغل اندر آمد بقزوین دلیر — سرِ ہمگنان آوریدند زیر
ندادند کس را بقزوین امان — سر آمد سران را سراسر زمان
ہر آنکس که بود اندر آن شہر پاک — ہمہ گشتہ افگندہ بُد در مغاک
ز خرد و بزرگ و ز پیر و جوان — نماندند کس را بتن در روان
زن و مرد ہر جا بسی کشتہ شد — ہمہ شہر را بخت برگشتہ شد

---

[1] یعنی زنجان سے ؛ [2] نسخے میں سُنتای لکھا ہے (ب کے بدلے ن) لیکن رجوع کرو تاریخ جہانگشا سلسلہ یادگار گب ۱۶/۱، جلد اوّل ص ۱۱۵، س ۱۷ ؛

[3] ۷ رشعبان ۶۱۷ھ مطابق ۷ راکتوبر ۱۲۲۰ء ؛

بسی خوب رویان ز بیم سپاہ | بکردند خود را بخیرہ تباہ
ز تخم نبی بی کران دختران | فروزندہ چون بر فلک اختران
ز بیم بدِ لشکرِ رزمخواہ | نگون درفگندند خود را بچاہ
ہمہ شافعی مذہب اند آن دیار | حنیفی نباشد یکے از ہزار[1]
درآن قتل بود از حنیفی شمار | کی بودند کشتہ دہ و دو ہزار
ہم بر فگندہ بہر جای گاہ | تن کشتگان را بہی راہ و راہ
نماند اندر آن شہر جای گزر | ز بس کشتہ افگندہ بی حد و مر
ز بیمِ سپاہِ مغل ہر کسی | گریزاں برفتند ہر جا بسی
برفتند چندی بجامع درون | پُر اندوہ جان و بدل پُر ز خُون
چو بودند از آن دشمن اندیشناک | فرازِ مقرنش نہان گشت پاک
بمسجد مغل اندر آتش فگند | زبانہ برآمد بچرخِ بلند
بآتش سقوف و مقرنس بسوخت | وزان کار کفر و ستم برفروخت

نزہت القلوب اس محنتی مصنف کی ایک تیسری تالیف مشہور کتاب نزہت القلوب ہے۔ یہ جغرافیہ اور علم کائنات کا ایک رسالہ ہے۔ اس کے نسخے کافی عام ہیں۔ لیکن ۱۹۱۵ء تک اس کا متن صرف بمبئی کی سنگی طبع (۱۳۱۱ھ مطابق ۴-۱۸۹۳ء) میں عام طور پر میسّر تھا۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں متن کی ایک محققانہ طبع مسٹر گائی

---

[1] مقابلہ کرو نزہت القلوب دسلسلہ یادگار گب ۲۳ جلد اوّل ص ۵۹ آخری سطر؛

لوسٹرینج نے 'سلسلہ یادگار گب' میں شائع کی (سلسلہ نمبر ۲۳ جلد اول) اور اس کا انگریزی ترجمہ (سلسلہ نمبر ۲۳ جلد دوم) جو آجکل چھپ رہا ہے عنقریب نکل آئیگا[1]۔

نزہت القلوب ظفر نامے کے پانچ برس بعد اس طوائف الملوکی کے دوران میں لکھی گئی جو ابوسعید کی وفات کے بعد رونما ہوئی مصنف اس موت کی طرف متاثرانہ اشارہ کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس تصنیف پر قلم اٹھانے کی ترغیب اسے بعض دوستوں کی درخواست سے ہوئی۔ جنہوں نے جغرافیے پر ایک فارسی تصنیف کی ضرورت محسوس کی کیونکہ

نزہت القلوب کے ماخذ

اس موضوع کی اکثر کتابیں عربی میں تھیں۔ اپنے ماخذ میں وہ ذیل کی تصانیف شمار کرتا ہے۔ اور ان کی اطلاعات کا تکملہ اُس نے اپنے ذاتی مشاہدہ سے کیا ہے جو اس نے سیاحتِ ایران کے دوران میں جمع کیئے :-

صور الاقالیم مصنفہ زید احمد بن سہل البلخی[2]؛ تبیان مصنفہ احمد بن ابی عبداللہ؛ مسالک والممالک مولفہ ابوالقاسم عبداللہ ابن

---

[1] واضح ہو کہ یہ ترجمہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہو چکا ہے؛ (مترجم)

[2] یہ مصنف غالباً ابن البلخی ہی ہے جس کا فارس نامہ مسٹر گائی لوسٹرینج 'سلسلۂ یادگار گب' میں شائع کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں؛ (اطلاعاً درج ہے کہ فارس نامہ مسٹر لوسٹرینج اور ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن نے مل کر مرتب کیا ہے اور ۱۹۲۱ء میں سلسلہ مذکورہی میں شائع ہو چکا ہے، سلسلۂ جدید ۱، مترجم)؛

خوردادذبہ[3]؛ اور ایک کتاب بعنوان جہان نامہ اور اُن کے علاوہ اُنیس اَور تصنیفات جن کے نام آکو ریو کی فہرست فارسی میں ملیں گے (ص ۹-۴۱۸)، کتاب مقدم طور پر ایک فاتحہ، تین مقالات اور ایک خاتمہ میں منقسم ہے۔ تیسرا مقالہ تصنیف کا اہم جزو ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ ہے وہ علمِ کائنات، افلاک، زمین، موالیدِ ثلاثہ اور آدم سے متعلق ہے۔ تیسرا مقالہ جو کتاب کے جغرافی حصے پر مشتمل ہے پہلے حرمین اور بیت المقدس کے جغرافیے سے بحث کرتا ہے۔ اس کے بعد ایران، عراق اور رُوم کے جغرافیے سے جس کیساتھ ایران کے طبعی جغرافیے پر ایک ضمیمہ ہے؛ پھر ایران کے سرحدی ممالک سے اور چند دُوسرے ممالک سے جو کبھی سلطنتِ ایران میں شامل نہ ہوئے۔ خاتمے میں دُنیا اور خصوصاً ایران کے عجائب کا تذکرہ ہے۔ زمانۂ وسطی کے ایران کے جغرافیہ اور حالات کے لئے یہ کتاب خاصی مفید ہے۔ مسٹر گائی لوسٹرینج نے نزہت القلوب کی مذکورہ بالا ایڈیشن شائع کرنے سے پہلے اپنی کتاب" ممالکِ خلافتِ شرقیہ"[2] کی تاریخ میں اس سے بہت سا استفادہ کیا۔

---

[1] تاریخ تصنیف تقریباً سنہ ۲۳۰-۴ ھ (۸۴۴-۸ ء) ہے۔ دیکھو بروکلمن جلد اوّل ص ۲۵۵-۶۔ اس کا متن دوخویہ کے قابل قدر" سلسلۂ مطبوعات جغرافیہ بزبان عربی" میں شامل ہے؛

[2] Lands of the Eastern Caliphate

البیضاوی کی نظام التواریخ اس باب کے شروع میں (اوپر ص ۱۰۳) نظام التواریخ نام ایک مختصر تاریخی رسالے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جو مشہور قاضی اور مفسّر نصیر الدین البیضاوی کی لکھی ہوئی ہے۔ جس کا باپ شیخ سعدی کے ممدوح اتابک ابوبکر سعدِ زنگی کے زمانے میں اسی منصب پر مامور تھا۔ اس بے مایہ اور بے لطف کتابچے میں عہد آدم سے لے کر ۶۹۴ھ (۵-۱۲۹۴ء) تک کی ایک عمومی تاریخ ہے ۶۷۴ھ (مطابق ۱۲۷۵ء) میں تالیف ہوا۔ اس کیساتھ ۶۸۳ھ (مطابق ۵-۱۲۸۴ء) تک کا ایک ایزاد ہے جو بظاہر خود مصنف نے کیا ہے۔ اس کے آگے ۶۹۴ھ (مطابق ۵-۱۲۹۴) تک کا ایک اَور ایزاد ہے جو غالبًا کسی دُوسرے کے قلم سے ہے۔ اب تک یہ رسالہ شائع نہیں ہوا[1] اور نہ غالبًا وہ اشاعت کے قابل ہے کیونکہ شاید ہی اس میں کوئی نئی یا کام کی بات ملے۔ یا یہ قیاس کیا جا سکے کہ مصنّف کی اس شہرت کو بڑھا دیگا جو اُسے ایک فقیہہ ماہرِ دینیات اور مفسّر کی حیثیت سے نصیب ہے[2]۔

تاریخِ بناکتی اس عہد کا ایک اَور غیر مطبوعہ تاریخی رسالہ معروف بہ "تاریخِ بناکتی" ہے جس کا پُورا عنوان "روضۃ اولی

---

[1] یہ تاریخ ۱۹۳۵ء میں طہران سے شائع ہو چکی ہے؛ (مترجم)

[2] مزید اطلاعات کے لئے ملاحظہ ہو ریو کی فہرست فارسی ص ۴-۸۲۳؛

الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب[1]، ۷۱۷ھ (۱۳۱۷ء) میں ابوسلیمان داؤد بناکتی[2] نے تالیف کیا یہ امر بدیہی اور باقرارِ مصنف ثابت ہے کہ یہ رشید الدین کی بلند پایہ تصنیف کے نمونے پر لکھی گئی۔ اس کی ۹ قسمیں یعنی فصلیں ہیں ان کی تفصیل یہ ہے :۔

(۱) انبیاء و بطارقہ ؛ (۲) شاہان قدیم ایران ؛ (۳) محمد مصطفیٰ اور خلفاء ؛ (۴) خلفائے عباسیہ کے ہمعصر ایران کے شاہی خاندان ؛ (۵) اہلِ یہود ؛ (۶) عیسائی اور فرنگی اقوام ؛ (۷) اہل ہند ؛ (۸) اہلِ چین ؛ (۹) قومِ مغول ؛

ایک لحاظ سے اس کتاب میں رشید الدین کے وسیع تر تصورِ تاریخ کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے وہ یہ کہ نصف سے زیادہ کتاب غیر مسلم اقوام کے حالات کے لیئے وقف کی گئی ہے۔ جن کے نام آخری پانچ قسم کی سُرخیوں میں مذکور ہیں۔ یعنی اہلِ یہود، اقوامِ یورپ (جن میں پاپایان و شہنشاہانِ رُوم بھی شامل ہیں)، اہلِ ہند، اہلِ چین، اور قومِ مغول، ان قوموں کے حالات کا بیان اگرچہ بیشتر مختصر اور تشنہ ہے۔ تاہم اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو چیدہ واقعات

---

[1] واحد نسخہ جس تک مجھے رسائی حاصل ہے (اور جو بدقسمتی سے شروع اور آخر میں ناقص ہے) آنجہانی سر البرٹ ہاوٹم شنڈلر کے کتب خانے کا ہے سابقاً یہ کتابوں کے اس زبردست عاشق شہزادہ بہمن میرزا بہاء الدولہ کی ملکیت تھا ؛

[2] بناکت یا فناکت ماوراء النہر کا ایک مقام ہے ؛

کا حقیقی علم حاصل تھا۔ علاوہ بر آں غیر اسلامی مذاہب کے بیانات بے لاگ ہیں اور درشتی اور تعصب سے پاک ہیں۔ بر خلاف اس کے البیضاوی جو اکثر ایرانی مؤرخوں کی طرح جو رشید الدین کی رہنمائی سے

البیضاوی اور بناکتی کی تاریخوں کا تفاوت اور اس کی وجہ

براہِ راست بہرہ مند نہیں ہیں باقی تمام تاریخ کو نظر انداز کر دیتا ہے اور صرف اس تاریخ کو لیتا ہے جو اسلام اور اہلِ اسلام، شاہانِ قدیمِ ایران، انبیائے یہود اور بطارقہ سے وابستہ ہے۔ ان دو تاریخی رسالوں کا یہ فرق بڑی حد تک اس وجہ سے ہے کہ بیضاوی فارس کا باشندہ تھا۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ علاقہ مغرب اور مشرق کی باہمی آمد و رفت کے اس سیلِ عظیم کی زد سے باہر تھا جسے مغولی حکومت نے جاری کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں تاریخ بناکتی کا مصنف ماوراء النہری تھا۔ اور غازان خان (۷۰۱ھ مطابق ۲-۱۳۰۱ء) کے ہاں ملک الشعراء ہونے کے سبب مغولی دربار سے اور بہت سے اجنبیوں سے جو بکثرت وہاں آتے تھے۔ بلاشبہ واقف تھا۔ یہودیوں عیسائیوں ہندوستانیوں، چینیوں اور مغولوں کے بارے میں اس کی اطلاعات

بناکتی کی معلومات اور دلچسپیوں کا وسیع تر دائرہ

گو بڑی حد تک اور اکثر انہی لفظوں میں تاریخ رشید الدین سے لی گئی ہیں تاہم اس میں کوئی

شک نہیں کہ مصنف نے ان کی تکمیل ان معلومات سے کی جو اُس نے زیرِ بحث اقوام کے نمائندوں سے زبانی حاصل کیں۔ ایسے مقامات، اشخاص اور تاریخی واقعات کی طرف جو اکثر مسلمان مصنفوں کی سرحدِ نظر سے باہر ہیں۔ اس کتاب میں جتنے اشارے پائے جاتے ہیں مغولی دور سے پہلے کسی تاریخ میں نہیں پائے جاتے اور اس کے بعد بھی کم ہی تاریخوں میں ملتے ہیں۔ مقامات میں پُرتگال، پولینڈ، بوہیمیا، انگلستان، سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، کیٹیلونیا[1]، لمبارڈی[2]، پیرس اور اور کولون[3] جیسی جگہوں کا ذکر اس میں ملتا ہے۔ اشخاص میں رومیولس سے آگے رُوم کے تمام شہنشاہوں کا ذکر اور ادھر سینٹ پیٹر سے لیکر مصنف کے ہمعصر پاپا تک جو سلسلے کا ۲۰۲ واں گنا گیا ہے تمام پاپاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ تاریخی واقعات میں مُختلف مذہبی مجالسِ شوریٰ، پوپ ایلیوتھیریس[4] کے زمانے میں انگلستان کا عیسائی ہو جانا نسطوری بدعت وغیرہم مذکور ہیں۔ نمونے کے طور پر اس کی دلچسپ ترین عبارتوں میں عبارتِ ذیل قابلِ توجہ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ چین میں لکڑی کے ٹھپوں سے چھپائی کیونکر ہوتی ہے۔ اس احتیاط کا حال

---

[1] Catalonia، سپین کا ایک پُرانا صُوبہ جو ۱۸۳۳ء میں چار صُوبوں میں تقسیم کردیا گیا؛ (مترجم)؛ [2] Lombardy) اٹلی کا شمالی صُوبہ (مترجم)؛

[3] (Cologne) دریائے رائن Rhine کے کنارے جرمنی کا ایک بڑا اور مشہور شہر ہے وادیٔ رُور میں واقع ہے؛ [4] Pope Eleutherious

لکھ کر جس کیساتھ اہلِ چین اپنی قدیم کتابوں سے تاریخی اور دوسری تحریریں نقل کرتے ہیں وہ کہتا ہے:۔

تاریخ بناکیتی سے چینی چھپائی کا حال

"پھر ایک طریقے کے مطابق جو اُن کے ہاں رائج ہے۔ وہ اس کتاب سے ایسے ڈھنگ کیساتھ نقلیں تیار کیا کرتے اور اب بھی کرتے ہیں کہ متن میں کسی تغیّر یا تبدّل کا امکان نہیں رہتا۔ چنانچہ جب وہ چاہتے ہیں کہ کوئی کتاب جس میں اُن کے لئے قابلِ قدر مطالب درج ہیں اچھی طرح لکھنی ہو۔ اور صحیح، مستند اور اصل حالت میں قائم رہے تو وہ ایک باکمال خطّاط کو حکم دیتے ہیں کہ ایک تختی پر صاف خط میں اس کتاب کا ایک صفحہ نقل کرے۔ پھر تمام علمار بڑی احتیاط سے اس کی درستی کرتے ہیں۔ اور تختی کے پچھلی طرف اپنے دستخط کر دیتے ہیں۔ پھر کاریگر اور ماہر حکّاکوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان حرفوں کو کھود دیں۔ اور جب اس طرح کتاب کے تمام صفحوں کی نقل لے چکتے ہیں تو سب (ٹھپّوں) پر ترتیب وار نمبر لگا کر ان تختیوں کو سربمہر تھیلوں میں رکھ دیتے ہیں جس طرح ٹکسال میں ٹھپّے رکھے جاتے ہیں۔ پھر مستحکم حفاظت کے ساتھ اُنہیں کمروں میں رکھ دیتے ہیں جو خاص اس غرض کے لئے الگ کیئے ہوتے ہیں۔ اور انہیں قابلِ اعتبار آدمیوں کے سپرد کر دیتے ہیں جو اس کام پر مامور ہوتے ہیں۔ ان کمروں کے قفل پر وُہ ایک خاص اور الگ قسم کی مُہر لگاتے ہیں۔ پھر جب کوئی

شخص اس کتاب کی نقل چاہتا ہے تو کمیٹی کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔ اور حکومت کی مقرر کی ہوئی قیمت ادا کرتا ہے۔ پھر وہ تختیاں نکالی جاتی ہیں اور کاغذ کے اوراق پر ان کے ٹھپّے لگا دیتے ہیں۔ بعینہٖ جیسے سکّوں پر ٹھپّے لگائے جاتے ہیں۔ پھر یہ کاغذ اس کے حوالے کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ناممکن ہے کہ ان کی کسی کتاب میں کوئی زوائد یا احذاف واقع ہوں۔ لہٰذا وہ ان کتابوں پر پورا وثوق رکھتے ہیں۔ اور اس طور پر اپنی تاریخیں آئندہ نسلوں تک پہنچاتے ہیں"۔

مجمع الانساب اس عہد کی ایک اَور کم قدر تاریخ مجمع الانساب ہے یہ محمد ابن علی شبانکاری کی تالیف ہے جو فخر بناکتی کی طرح شاعر بھی تھا مؤرخ بھی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دو مرتبہ مختلف صُورتوں میں لکھی گئی۔ پہلی مرتبہ ۷۳۳ھ (۱۳۳۲-۳ء) میں برآمد ہوئی۔ اور دُوسری مرتبہ تین سال بعد یعنی ابو سعید کی وفات کے ایک سال بعد، اس تصنیف میں تخلیقِ کائنات سے لے کر دمِ ارقام تک کی ایک عمومی تاریخ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مجھے اس کی کوئی نقل پڑھنے کے لئے نہیں مل سکی اور ان ناکافی معلومات کیلئے میں ریو کی قابلِ تعریف فہرست مخطوطاتِ فارسی کا مرہونِ منت ہوں (ص ۸۲-۸۴) بقول ایتھے پہلی بار جب یہ کتاب لکھی گئی تو رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین کے گھر کی لوٹ میں تلف ہوگئی۔ مصنّف نے

ے Ethe. فہرست مخطوطاتِ فارسی در دیوانِ ہند، کالم ۱۰ و ۱۱، نمبر ۲۱، ۲۲۔

اپنی یاد سے دوبارہ اسے لکھا۔ اور ایتھے کے قول کی رُو سے یہ دُوسری ترتیب ۷۴۳ھ (۳-۱۳۴۲ء) میں مکمّل ہوئی +

اس دور کی دو منظوم تاریخیں بھی تذکرہ کی مستحق ہیں ایک شہنشاہ نامہ یا چنگیز نامہ مصنفہ احمد تبریزی ہے۔ اس میں ۷۳۸ھ (۸-۱۳۳۷ء) تک مغولوں کی تاریخ ہے۔ اس کے تقریبًا ۱۸۰۰۰ شعر ہیں اور ابو سعید کے نام معنون ہے۔ دُوسری غازان نامۂ نورالدین ابن شمس الدین محمد ہے۔ یہ ۷۶۳ھ (۲-۱۳۶۱ء) میں تصنیف ہوئی۔ دونوں تصنیفیں بُہت نادر ہیں۔ ریو نے پہلی کے ایک نسخے کی کیفیت بیان کی ہے جو ۸۰۰ھ (۸-۱۳۹۷ء) میں لکھا گیا۔ اور ۱۸۸۵ء میں کونت دی گوبنیو[1] کے کتابخانے کی فروخت میں برٹش میوزیم کیلئے خریدا گیا[2]۔ دوسری نظم کا ایک عمدہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ یہ تبریز میں ابوالنصر حسن بیگ بہادر خاں کے شاہی کتابخانے کے لئے لکھا گیا۔ تاریخ استنساخ ۸۷۳ھ (۹-۱۴۶۸ء) ہے۔ مجھے یہ نسخہ اگست ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر رضا توفیق نے دیا تھا۔ جو اُن دِنوں ترکیہ کی مجلسِ مقنّنہ میں ادرنا کے نمائندے تھے۔ دونوں مثنویاں شاہنامۂ فردوسی کی طرح بحرِ متقارب میں ہیں۔ اور اسی کے نمونے پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے پہلی لمبائی میں دُوسری سے تقریبًا نصف ہے (کچھ نو ہزار اور دس ہزار

---

[1] Comte de Gobineau

[2] ضمیمہ فہرست مخطوطاتِ فارسی ۲۰۱، ص ۱۳۵ ؛

کے درمیان ابیات ہیں[1]) تاریخ اور شاعری کے طور پر ان دونوں تصنیفوں میں کوئی بھی کسی غیر معمولی خوبی کی حامل نہیں اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس عہد سے بحث کرسکتی ہیں۔ اسکے متعلق پُرصبر چھان بین کے بعد ان میں سے مفید معلومات نکالی جاسکتی ہیں ؀

---

[1] مختصر منثور دیباچے میں جہاں مصنف بیان کرتا ہے کہ کیونکر یہ مثنوی سلطان اویس کے لئے لکھی گئی۔ اشعار کی تعداد دس ہزار بتائی گئی ہے۔ سلطان اویس نے مصنف کا جس کی عمر اس وقت ۵۰ برس تھی وہ وظیفہ بحال کردیا تھا جو اسے غازان خاں کے عہد میں ملتا تھا ؀

باب سوم

ایلخانی دَوْر کے شعراء اور صُوفیا

مغولی دَوْر میں شاعری

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ادبی نقطۂ نظر سے زیرِ غور زمانے کا خاص مابہ الامتیاز تارِیخ نویسوں کا معیار اور ان کی مقدار ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ شاعرانہ استعداد میں بھی یہ عہد پُرمایہ تھا۔ لیکن اتنا قابلِ ذکر نہیں ہے کیونکہ ایران میں شاید ہی کوئی زمانہ ایسا آیا جب وہاں شاعروں کا قحط ہؤا ہو۔ قریب قریب ہر تعلیم یافتہ ایرانی موقع آنے پر خاصے شعر موزوں کر لیتا ہے۔ لہٰذا اُن تمام لوگوں کا ذکر کرنا بھی ایک بے معنی اور بیکار بات ثابت ہوگی جو محض تُک بندوں کی صف سے ذرا آگے نکل کر بجا طور پر شاعر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، ایک کڑا انتخاب ضروری ہے لیکن آسان نہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو مناسب حد تک شاعر کے ہموطنوں کی اپنی رائے کا پاس رکھنا ضروری ہے، خواہ وہ ہماری رائے سے مطابقت نہ بھی رکھتی ہو۔ دُوسری طرف یہ

احتیاط رکھنی بھی ضروری ہے کہ ہم کسی صاحبِ ندرت ولیاقت شاعر کو صرف اس لئے نظر انداز نہ کر جائیں کہ وہ فارسی تذکرہ نگاروں کے التفات سے محروم رہا ہے۔ یہ لوگ یوں بھی اور بالخصوص اپنے معاصروں کے معاملے میں ذاتی، سیاسی حتیٰ کہ مذہبی تعصبات اور رُجحانات کی رو میں بہ جانے پر مائل ہوتے ہیں ؎

وُہ بزرگ ترین شاعر جو اس دَوْر میں آگر ابھی زندہ تھے اور جن کی بحث ایک سابقہ جلد میں آچکی ہے۔ یعنی مولوی جلال الدّین رُومی اور شیخ سعدیؒ

جس عہد سے اب ہمیں سابقہ پڑا ہے اس میں کُچھ نہیں تو بیس شاعر ایسے ہوئے جن کے قابلِ ملاحظہ ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں دو کہیں بڑھ کر بزرگ ترین شاعر مولانا جلال الدین رومی اور شیخ سعدی ہیں۔ سابق الذکر نے ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) میں بعمر ۶۶ سال رحلت کی۔ اور مؤخر الذکر نے تقریباً ۶۹۰ھ[1] (۱۲۹۱ء) میں جیسا کہ عموماً بیان کیا جاتا ہے ۱۱۰ سال[2] (قمری) کی بہت لمبی عُمر پاکر انتقال کیا۔ پس یہ دونوں شاعر دراصل دورِ

[1] شیخ کی تاریخِ وفات باختلافِ روایات ۶۹۰ھ، ۶۹۱ھ اور ۶۹۴ھ دی گئی ہے۔ ان میں سب سے مشہور ۶۹۱ھ ہے جو لفظ "خاص" سے نکلتی ہے۔ (مترجم)

[2] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

سابق سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے بموجب ان کی بحث ایک سابقہ جلد میں آچکی ہے[1]۔ ناظرین کی توجہ اس کی طرف دلائی جاتی ہے۔ موجودہ جلد میں بھی جو ان کے حذف کے سبب کم مایہ رہتی ہے۔ یہ اسی قدر بجا طور پر شامل کئے جاسکتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے ادبی مشاغل کا زمانہ بڑھ کر اس دور میں داخل ہوا جس سے اوراقِ حاضرہ بحث کرتے ہیں۔ دونوں شاعروں کے اس عہد کی بعض سرکردہ شخصیتوں کے ساتھ روابط پیدا ہوئے۔ شیخ سعدی کے تعلقات خاندانِ بزرگِ جوینی میں صاحبِ دیوان اور اس کے بھائی علاؤ الدین کے ساتھ اور خود اباقا خان کے ساتھ قائم ہوئے[2] اور مولانا جلال الدین رُومی کی بدنصیب معین الدین پروانۂ رُوم کے ساتھ راہ و رسم رہی جسے اباقا نے ۶۷۵ھ (۱۲۷۶-۷ء) میں مصریوں کیساتھ سازباز رکھنے کے شبہ میں مروا ڈالا تھا[3]۔ یہاں ان دونوں بزرگوں پر بہت سے صفحے اور وقف کیے جاسکتے

(نوٹ ص ۱۷۳) میرزا محمد قزوینی نے تاریخ جہانگشا کی جلد سوم کے آخر میں جو حواشی و اضافات قلمبند کیے ہیں ان میں اُنہوں نے سعدی کی عمر پر بحث کی ہے، انہوں نے اس بات پر دلیل قائم کی ہے کہ سعدی کی اس غیر معمولی طور پر لمبی عمر کے لئے ہمارے پاس کوئی قابلِ اطمینان شہادت موجود نہیں ہے۔ رک بہ کتاب مذکور ص ۶-۴۶۵ (مترجم)؛

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران جلد دوم ص ۵۱۵ تا ص ۵۳۹؛

[2] ملاحظہ ہو سلسلہ یادگار رگب" ۱۶ جلد اوّل ز تاریخ جہانگشای جوینی مرتبہ میرزا محمد، صفحہ نب تا ند؛

[3] ملاحظہ ہو بارہیبریس کی مختصر الدول (طبع بیروت ۱۸۹۰ء) ص ۳-۵۰۱؛

بغیر اس کے کہ پہلے جو باتیں کہی جا چکی ہیں ان میں سے کوئی دُہرائی جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس باب کے میدانِ مبحث کو پھیلانے کی بجائے سمیٹنا منظور رہے۔ اور اس لئے ہر چند جی نہیں چاہتا کہ انہیں چھوڑا جائے لیکن ہمیں چھوڑنا ہی پڑیگا ؛

ایسے شعراء کا حذف جنہوں نے گو فارسی میں شاعری کی لیکن نسل یا وطن کی رُو سے ایرانی نہ تھے

اسی تنگ دامانی کے سبب میں اس عصر کے تین اَور شاعروں کے بہت مُختصر سے تذکرے پر قناعت کروں گا جنہیں فارسی کے متعلم خصوصًا وُہ جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر تعلیم پائی ہے۔ مذکورہ بالا دو عظیم شاعروں کے بعد جگہ دینگے، میری مراد امیر خسرو دہلوی، حسن دہلوی اور بدر چاچ سے ہے۔ ہندوستان میں ان تینوں شاعروں کا بڑا رُتبہ سمجھا جاتا ہے لیکن ان میں سے کوئی کبھی ایران نہیں گیا وہاں رہنا تو درکنار۔ اس کتاب کے مضامین کو معقول حدود کے اندر رکھنے کے لئے یہ بات اَور بھی ناگزیر ہو جاتی ہے کہ فارسی کے ہندوستانی

ہندوستانی فارسی ادب کو خارج رکھنے کی بنا

قلم پردازوں کی کثیر اور بڑھتی ہوئی تعداد کو خارج کر دیا جائے۔ گنجائش کی تنگی کے علاوہ دو اَور وجوہ ایسے ہیں جن سے مجھے یہ روش بجا معلوم ہوتی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے۔ کہ

چونکہ انگلستان والوں کو قدرتًا ہندوستان سے زیادہ دلچسپی ہے اس لئے یہاں ہندوستانی فارسی مصنّفوں پر خواہ شاعر ہوں یا مؤرّخ خاص ایرانی اہلِ قلم کی نسبت کہیں زیادہ خامہ فرسائی ہوئی ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ ایک غیر اہلِ زبان متعلّم کو اظہارِ رائے کی اجازت دیں تو میَں کہوں گا کہ ہندوستان میں جو فارسی ادب پیدا ہوُا اس میں کلّیتہً اصلی ایرانی ادب کی بُو باس نہیں کہ یہ چیز ہر مُلک کی دیسی ادبی پیداوار کی اپنی ہوتی ہے۔ بغیر کسی ناگوار موازنے یا مقابلے کے یہ بات بلا روک ٹوک کہی جا سکتی ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط سے اُنیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں جو وافر فارسی ادب پیدا ہوُا اس کو ایک جُداگانہ موضوع کے طور پر لینے کی ہمارے پاس معقول وجہ ہے۔ یہی وجہ انگلستان کے مقابلے پر امریکہ کے پیدا کردہ انگریزی ادب پر بھی عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا اِس باب میں امیر خسرو کو چھوڑ دینا ایسا ہی جائز ہے جیسا کہ انگریزی کی کسی جدید ادبی تاریخ میں والٹ وٹمین[1] کو شامل نہ کرنا۔ خصوصًا جبکہ سابق الذکر کا ایک طویل تذکرہ ایلیٹ کی تاریخ ہند[2] میں دیا گیا ہے[3]۔ یہی قول تھوڑی حد تک افغانستان اور ترکستان کے فارسی ادب پر صادق آتا ہے۔

---

[1] Walt Whitman

[2] Elliot's History of India

[3] جلد سوم ص ۵۲۴ تا ص ۵۶۶؛

باوجود اس کے کہ فارسی زبان آج بھی بہت سے افغانوں کی بول چال کی زبان ہے اور سلاطین ترکی (خصوصًا سلطان سلیم "ظالم"[1] نے ایرانیوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتے ہوئے بھی ادبی اغراض کے لئے ان کی زبان کے استعمال کو کسرِ شان نہ سمجھا۔ البتہ چند ایسے ایرانیوں کے حق میں استثناء سے کام لیا جائیگا۔ (خصوصًا اُس دور میں جو اس جلد کے مشمولہ آخری دور کے بعد آتا ہے) جو ایران ہی کے زائیدہ ہیں اور دہلی کے مغل شہنشاہ کی بے پایاں فیاضیوں سے کھنچ کر ہندوستان کو ہجرت کر گئے۔ اس امید میں کہ وہاں اپنے ذہنی مصنوعات کا سودا زیادہ نفع پر چکائیں جو ان کے اپنے وطن میں ممکن نہ ہو ؎

شعر العجم ہے۔ اور مرحوم شبلی نعمانی کی تالیف ہے (سنہ ۱۳۲۵ھ (سنہ ۱۹۰۷ء) یا اس کے آس پاس علی گڑھ سے بہ چاپ سنگی دو جلدوں میں شائع

[1] سلطان سلیم کے فارسی دیوان کی ایک نہایت پُرتکلف طبع مرتبہ آنجہانی ڈاکٹر پال ہورن Paul Horn استاذ جامعۂ سٹراس برگ Strassbug سنہ ۱۹۰۴ء میں شہنشاہ جرمنی کے حکم سے تیار ہوئی تھی۔ اس غرض سے کہ سلطان عبد الحمید مرحوم کو ہدیۃً پیش کیجائے میری خوش قسمتی ہے کہ اس نادر اور دلآویز تصنیف کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے ؎

ہوئی ہے۔ اس میں فردوسی اور اس کے متقدمین سے لیکر خواجہ حافظ تک ایران کے کوئی بیس ایک کلاسکی شاعروں کے تبصرے شامل ہیں[۱] علاوہ ازیں ایک طویل مذکور[۲] امیر خسرو دہلوی کے لئے وقف کیا گیا ہے[۳] جس میں ضمنی طور پر ان کے ہمدم ہمعصر اور ساتھی شاعر حسن دہلوی کے بارے میں بہت کچھ معلومات درج ہیں۔ جو ناظرین اردو نہیں پڑھتے ان کی توجہ ایک اَور اعلیٰ اور فاضلانہ تصنیف کی طرف دلائی جاتی ہے جو میرے دوست سر ڈینی سن رُوس[۴] کی نگرانی میں ایک ہندوستانی فاضل[۵] نے تیار کی۔ یعنی کتاب خانۂ بانکی پور کے فارسی اور عربی مخطوطات کی فہرست۔ اس میں فردوسی سے حافظ تک فارسی شاعر شامل ہیں کلکتہ

---

[۱] جیساکہ ناظرین بخوبی واقف ہونگے شعرالعجم کل پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پروفیسر براؤن مرحوم جب یہ جلد لکھ رہے تھے۔ تو صرف مذکورہ بالا دو جلدیں ہی شائع ہوئی تھیں، ان دو جلدوں کی ایک محققانہ تنقید میرے بزرگ مشفق پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی مرحوم نے باقساط مجلّہ "اردو" (انجمن ترقیٔ اُردو) میں شائع کی تھی جو حال ہی میں نظرِ ثانی کے بعد سلسلۂ انجمن ترقیٔ اردو میں چھپی ہے (سلسلہ ۱۸۲) (مترجم)

[۲] تصنیف مذکور، جلد دوم ص۱۰۷ تا ص۱۹۵ ؛

[۳] یہی مذکور الگ طور پر "بیان خسروؒ" کے عنوان سے کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے ؛

[۴] Sir Denison Ross

[۵] یعنی خان بہادر مولوی محمد مقتدر (مترجم) ؛

Catalogue of the Arabic and Persian Manuscripts in the Oriental Public Library at Bankipur.

سے ۱۹۰۸ میں شائع ہوئی۔ اس جلد کے بیس صفحے (ص ۱۷۶ تا ص ۱۹۵) امیر خسرو اور اُن کی مختلف تصنیفات کے لیئے وقف ہیں۔ اور اس سے اگلے چار صفحے ان کے دوست امیر حسن کے لیئے۔ دونوں شاعر مشہور دلی خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے مُرید تھے۔ جنہوں نے ۷۲۵ھ (۱۳۲۴ء) میں امیر خسرو سے صرف سات مہینے پہلے انتقال کیا۔ امیر خسرو ان ہی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ امیر حسن ان کے بعد بہت کم (غالباً دو) سال زندہ رہے۔

امیر خسرو کا مختصر حال

امیر خسروؒ جو شاعر کے علاوہ ماہر موسیقی ہونے کی حیثیت سے بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہیں ترکی النسل تھے۔ ان کے والد امیر سیف الدین مغلوں سے جان بچا کر خطۂ بلخ سے ہندوستان ہجرت کر گئے۔ یہاں انجام کار وہ پٹیالی میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہیں امیر خسرو ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) میں متولّد ہوئے۔ چنانچہ دمِ مرگ ان کی عمر اکہتر برس تھی[2] اور "یکے بعد دیگرے دلّی

---

[1] "امیر خسرو کے سوانح اور ان کی تصنیفات" (The Life and Works of Amir Khusrau) کے عنوان سے جناب ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے ایک جامع کتاب بزبان انگریزی لکھی ہے جو ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے اہتمام سے نہایت دیدہ زیب چھپائی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ شائقین اس کی طرف توجہ فرمائیں (مترجم)۔

[2] امیر خسرو کی عمر ۷۴ برس ہوتی ہے خود براؤن نے یہاں ان کی تاریخ ولادت ۶۵۱ھ دی ہے اور اوپر تاریخ وفات ۷۲۵ھ لکھی ہے۔ (مترجم)

کے پانچ سلاطین کی عنایات سے مستفیض ہوئے"۔ بیحد پُرگو تھے۔ دولت شاہ کوئی پانچ لاکھ اشعار ان کی طرف منسوب کرتا ہے۔" میرزا بایسنغر لگاتار کوشش کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار شعر جمع کرنے میں کامیاب ہؤا لیکن اس کے بعد جب اسے اُن کی غزلیات کے دو ہزار ابیات اَور ملے کہ اُن کے دیوان میں نہیں تھے۔ تو اس نتیجے پر پہنچا کہ شاعر کا کل کلام جمع کرنا بہت مشکل ہے چنانچہ اُس نے یہ خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا[1]۔

اگرچہ اوپر کی بیان کردہ وجوہات کی بنا پر میں امیر خسرو کے حالات میں طوالت سے کام لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لیکن عربی کی اس کہاوت کے مطابق کہ مالا یُدرَک کلّہ، لا یُترَک کلّہ، میں یہاں تیمّناً و تبرّکاً لیلےٰ مجنوں میں سے ایک مختصر سا انتخاب پیش کرتا ہوں۔ اس میں وہ کرب و درد کے ایک غیر معمولی اثر کے ساتھ اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کی موت کا ماتم کرتے ہیں۔ کہ یہ دونوں ۶۹۸ھ (۹-۱۲۹۸ء) میں چل بسے تھے۔ شاعر کا اپنی ماں سے اتنی محبّت کرنا جو اپنی بیٹی کی ناقدری سے بہت دُور کا تفاوت رکھتا ہے اس کی سیرت کے دلکش ترین پہلوؤں میں سے ہے[2]:

---

[1] دیکھو فہرست مذکورہ بالا فہرست مخطوطات بانکی پور، جلد اول ص ۷۰-۱۷۶، نیز تذکرۂ دولت شاہ، دمیری ایڈیشن ص۲۴۰؛ [2] پانچ اشعار جن میں اپنی دُختر سے خطاب کیا ہے جس کا نام ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ عفیفہ تھا آپکو شعر العجم جلد دوم کے ص ۱۲۵ پر ملیں گے اور جن اشعار میں والدہ سے خطاب ہے ص۱۲۶-۷ پر۔ (اپنی دُختر سے شاعر جن الفاظ میں مخاطب ہے ان میں ایسا اظہار کیا ہے کہ کاش تو پیدا نہ ہوتی اس کے بعد کہا ہے کہ خیر اب خدا نے تجھے پیدا کر دیا ہے تو میں نے تجھے قبول کیا۔ آگے اسے نصیحتیں کی ہیں۔ مترجم)؛

امسال دو نور ز اخترم رفت | ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بختِ خفتۂ من | گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم | چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غمم دو افتاد | فریاد کہ ماتمم دو اُفتاد
حیف است دو داغ چون منی را | یک شعلہ بس است خرمنی را
یک سینہ دو بار بر نگیرد | یک سر دو خمار بر نگیرد
چون مادرِ من بزیرِ خاکست | گر خاک بسر کنم چہ باک است
ای مادرِ من کجائی آخر | روی از چہ نمی نمائی آخر
خندان ز دل زمین برون آی | بر گریۂ زارِ من بخشای
ہر جا کہ ز پای تو غباریست | مارا ز بہشت یادگاریست
ذاتِ تو کہ حفظ جانِ من بُود | پُشتِ من و پُشتبانِ من بُود
روزی کہ لبِ تو در سخن بود | پندِ تو صلاحِ کارِ من بود
امروز منم بمہر پیوند | خاموشی تو ہمی دہد پند

بدرِ چاچ بدر چاچ باشندۂ ماوراء النہر ایک اور شاعر ہے جسے ہندوستان میں خاصی شہرت حاصل ہے۔ لیکن ایران میں تقریباً گُمنام ہے۔ شہر چاچ یا شاش جس کے باشندہ ہونے کا بدر کو دعویٰ تھا آجکل کا تاشقند ہے۔ اس کا کلام جو مَیں نے نہیں پڑھا۔ لیکن جس کے مترجمہ نمونے سر ایچ ایلیٹ نے اپنی "تاریخِ ہند" میں دئے ہیں[1] بہت مُشکل

---

[1] جلد سوم ص ۵۶۷ تا ص ۵۷۳؛

مشہور ہے۔ یہ خصوصیت ان تمام لوگوں کے کلام میں بالعموم پائی جاتی ہے جو ترکی النسل ہیں یا جنھوں نے ترکی اثر یا سرپرستی کے زیر شاعری کی۔ لیکن اپنی ذات میں کسی نقطۂ نظر سے یہ خصوصیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم بدر چاچ کو شعراء کے اس جائزے میں شامل کریں؛

قانعی یہاں ایک غیر معروف شاعر قانعی کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ جو تاتاریوں کی لرزہ خیز یورش سے خائف ہو کر اپنے وطن طوس (واقع خراسان) سے بھاگ نکلا۔ اور ہندوستان جا پہنچا۔ وہاں سے اُس نے عدن، مکّہ، مدینہ اور بغداد ہوتے ہوئے روم (ایشیائے کوچک) کی راہ لی۔ وہاں اُس نے اپنے تئیں قونیہ کے سلجوق حکمرانوں کے دربار سے وابستہ کر لیا۔ اُن کے لئے اس نے شاہنامہ کے نمونے پر اس خاندان کی ایک بے حد لمبی چوڑی منظوم تاریخ تالیف کی اور کتاب کلیلہ و دمنہ کا نظم میں ایک ترجمہ کیا۔ آخر الذکر کے ایک نسخہ مملوکہ عجائب خانۂ برطانوی کی کیفیت ریو نے بیان کی ہے[۱]۔ جس کے ہاں سے یہ اطلاعات لی گئی ہیں۔ ان دو چیزوں اور دیگر شعری نتائج کی بدولت جن کے متعلق اس کا فخریہ دعویٰ ہے کہ وُہ تیس جلدوں میں سماتے ہیں اور تین لاکھ ابیات پر مشتمل ہیں اسے ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ اس نے خاصی لمبی عُمر پائی ہوگی کہ مولانائے بزرگ جلال الدین رُومی کی وفات پر اس نے مرثیہ لکھا جو حسبِ مذکورِ سابق ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) کا واقعہ ہے؛

---

[۱] Ad. 7766. "فہرست مخطوطاتِ فارسی در عجائب خانۂ برطانوی" ص ۵۸۲-۵۸۲؛

پور بہای جامی اس دور کا ایک اَور ابتدائی لیکن نامعلوم شاعر پور بہای جامی ہے۔ دولت شاہ نے اس کے لئے ایک مقالہ وقف کیا ہے[1]۔ جس میں اس کی زندگی کے حالات بُہت کم ہیں۔ دُوسرے تذکرے مثلاً ہفت اقلیم، آتشکدہ، مجمع الفصحا، اس پر چنداں اضافہ نہیں کرتے، اس کا اصل مربی خواجہ وجیہ الدین زنگی (از روئے دولتشاہ) یا طاہر فریومذی (از روئے ہفت اقلیم) تھا۔ لیکن بعد میں زبردست وزیر صاحب دیوان کی تربیت سے فیضیاب ہؤا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے انوکھے صنائع و بدائع کا بڑا شوق تھا۔ دولت شاہ نے اس کا ایک اُستادانہ قصیدہ نقل کیا ہے۔ جس میں ۲۸ ابیات ہیں اور جس میں شاعر نے بہت سے مغولی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے[2]

قامان[3] طرّہ ہای تو چون کلک بخشیان
کردند مشق بر رُخِ تو خط ایغوری

---

[1] میری اڈیشن کے صفحات ۱۸۱ تا ۱۸۵؛

[2] دولت شاہ (میری ایڈیشن) ص۱۸۲ س۔۳-۲۲؛

[3] دیکھو دوستوں جلد اول ص ۱۷- دوسوں نے قامان کی تعریف یہ کی ہے۔ کہ یہ تاتاریوں کے کے الھڑ مذہب کے پروہت تھے۔ جو بیک وقت جادُوگر، معبّر، فال گیر، کاہن، نجومی اور اورطبیب ہوتے تھے۔ "بخشی" وہ خطاط تھے جو خطّ ایغوری میں کتابت کرتے تھے جو پندرھویں صدی عیسوی تک ترکستان میں رائج رہا؛

ذیل کی رُباعی بھی خاصی پاکیزہ ہے ایک دوست سے مخاطب ہوکر لکھی گئی ہے جس کا ایک دانت جاتا رہا ہے ؎

گر شد گہری ز درج نوشینت کم — در حسن نگشت ہیچ تمکینت کم
صد ماہ ز اطراف رخت می تابد — گو باش ستارۂ زپروینت کم

پور بہا کی مندرجہ ذیل دو نظمیں اس پر شکوہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں جسے درباری شعراء ترقّی دیتے تھے۔ اور یہ پیچیدہ لفظی رعایتوں اور دُور ازکار استعاروں سے پُر ہیں۔ خاص طور پر یہ نظمیں اس لئے جاذبِ توجہ ہیں کہ ان کی پوری پوری تاریخِ تصنیف معیّن کی جاسکتی ہے۔ پہلی میں نیشاپور کی تباہی کی طرف اشارہ ہے جو سنہ ۶۶۶ھ (۸-۱۲۶۷ء) کے زلزلے سے واقع ہوئی اور دُوسری میں اس شہر کی بحالی کی طرف جو سنہ ۶۶۹ھ (۱-۱۲۷۰ء) میں حسب الامر اباقا عمل میں آئی، دونوں نظمیں فصیحی خوافی کی نادر تصنیف مجمل[1] میں سے لی گئی ہیں ؎

زز خم زلزلہ زیر و زبر شدست چنانک — سماک[2] زیر سمک شد سمک فرازِ سما

---

[1] ہمیں اس تصنیف کے صرف چار نسخوں کے وجود کا علم ہے، دو پیٹرو گراڈ (آجکل کا لینن گراڈ مترجم) میں اور دو کیمبرج میں، اس نادر کتاب پر میرا مقالہ ملاحظہ ہو۔ یہ میوزیوں (Museon) کے اس شمارے میں شائع ہُوا ہے جو مطبع جامعۂ کیمبرج میں بلجیم کے جلا وطن پروفیسروں نے چھپوایا؛

[2] سماک آسمان کے بلند ترین ستاروں میں سے گنا جاتا ہے مسلمانوں کے نسبتہً کم تعلیمیافتہ عوام کے نظریۂ کائنات میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین کو ایک بہت بڑی مچھلی (عربی سمک، فارسی ماہی) تھامے ہوئے ہے۔ یہ مچھلی ایک وسیع سمندر میں تیرتی ہے جو بادل کے ساحلوں (باقی حاشیہ ص۱۸۵ پر)

بجور و قهر براند اختش ز بُن بُنیاد بگل و جزر فرو ز تختش ز هم اجزا
نهاده سر بزمین بی سجود مقصوره مناره قامت خود بی رکوع کرد دوتا
کتابخانه نگون رسمِ مدرسه مدروس خراب مسجد آدینه منبر اندروا
گمان مبر که ز نقصان بُد این نکبت زمن ببر بس اگر نیست باورت که چرا
چو حق عنایتِ بسیار داشت در حقِ او نظر فگند بر احوالِ او بچشمِ رضا
چو هیبت نظر و پرتوِ تجلّی او براو فتاد ز هیبت در او فتاد زپا
نه از تجلّی او کوه طور پاره شدست کلیم چون بدعا خواست از خدای لقا

چو کهنه بود و قدیمی بناءِ نیشاپور نهاد روی سوی او خرابی از هر جا
خدای خواست که بازش ز نو بنا سازند بعهد دولتِ نوشیروانِ عهد ابقا
خدایگان جهان پادشاه روی زمین جهانگشای عدو بند شاه شهر کشا
بسال ششصد و ہفتصد و نه اتّفاق اُفتاد بنا نہادن این شہرِ شُہرۂ زیبا
اواخر رمضان آفتاب و زُہرہ بثور قمر بحوت و عطارد نشستہ در جوزا
بنا نہادن شہر نوت مبارک باد بعہد دولتِ تو شہر باد ہر صحرا
بدولت تو نشاپور کہنہ نو شد باز بسان پیر خرف گشتہ کو شود برنا
سہ چیز بادو بماناد ہر سہ تا بأبد بقاء خواجہ[1] دگر شہر و شعر پُور بہا

(باقی حاشیہ ص ۱۸۴) میں گھرا ہوا ہے۔ اسی لئے عربی میں کہتے ہیں "من السمک الی السماک"۔ جیسے فارسی میں کہتے ہیں "از ماہ تا بماہی" یعنی اسفل سے ارفع تک؛

[1] غالباً صاحبِ دیوان سے مراد ہے؛

امامی ہروی امامی ہروی کی بابت کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے حالات کچھ ایسے معلوم بھی نہیں۔ بقول صاحب تاریخ گزیدہ[1] اس کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن ابوبکر بن عثمان تھا۔ وہ سلاطین و وزرائے کرمان کا مدح گر تھا۔ اور مجمع الفصحا[2] کی رُو سے ۶۶۷ھ (۱۲۶۸-۹ء) میں مرا، اس کے نام کا ایک غیر معمولی طور پر پیچیدہ معمّہ آپکو تاریخ گزیدہ میں ملیگا[3]۔ جو اس نے محاسبانِ سرکاری کی اصطلاحات کے حساب سے لکھا، سب سے زیادہ گراں قدر خراجِ تحسین جو اسے کبھی وصول ہُوا غالبًا وہ تھا جو معین الدین پروانہ، ملک افتخار الدین، نور الدین رصدی اور صاحب دیوان کے ایک منظوم سوال کے جواب میں اسکے ہمعصر شاعر مجد الدین ہمگر نے اسے ادا کیا۔ اشخاص مذکورہ نے اس استفسار میں ہمگر سے خود اسکے شیخ سعدی کے اور امامی کے اضافی فضائل پوچھے تھے[4]۔ ہمگر کا جواب یہ تھا:

ماگرچہ بنطق طوطیٔ خوش نفسیم ۔۔۔ بر شکرِ گفتہ ہای سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری باجماعِ اُمم ۔۔۔ ہرگز من و سعدی بامامی نرسیم

---

[1] طبع عکسی سلسلہ یادگار گب ص ۵-۸۱۴ (مترجم)؛ [2] جلد اول ص ۹۸؛

[3] ملاحظہ ہو اس کتاب کے بابِ پنجم کی فصل ششم کا ترجمہ جو مَیں نے کیا اور اکتوبر ۱۹۰۰ء اور جنوری ۱۹۰۱ء کے مجلۂ انجمنِ ہمایونی ایشیائی میں شائع کیا۔ یہی ترجمہ الگ کتاب کی صورت میں چھپا ہے۔ اس کے صفحات ۱۳ تا ۱۵، (طبع عکسی سلسلہ یادگار گب میں یہ معمّہ ص ۵-۸۱۴ پر درج ہے، مترجم)؛

[4] یہ رباعی دولت شاہ نے دی ہے، میری ایڈیشن ص ۱۶۶، سطر ۲۴ تا ص ۱۶۷، سطور ۱ تا ۴؛

اماؔمی نے اس کا جواب ذیل کی تحسین آمیز رُباعی میں دیا[1] ؎

در صدرِ بلاغت ارچہ بادستِ رسیم در عالمِ نظم ارچہ مسیحا نفسیم
دانم کہ بخاکِ درِ دستورِ جہاں سحبانِ[2] زمانہ مجدِ ہمگر نرسیم

ادھر شیخ سعدی نے اپنے دل کا بُخار ذیل کی رُباعی میں نکالا ؎

ہر کس کہ بپایگاہ سامی نرسد از بخت بدو سیاہ کامی نرسد
ہمگر چو بعمر خود نکرد ست نماز آری چہ عجب گر باماؔمی[3] نرسد

جہاں تک مجھے معلوم ہے اماؔمی کے کلّیات کبھی شائع نہیں ہوئے۔ نہ ہی ان کے نسخے عام ہیں، میں نے اپنی تحقیقات میں جو یقیناً محدود ہیں عجائب خانۂ برطانوی کے نسخے سے کام لیا ہے[4]۔ اس کی خوب ترین نظموں میں سے جو میرے دیکھنے میں آئی ہیں ایک غزلِ مسلسل ہے جو نسخۂ مذکورہ کے ورق ۱۹۸ ا پر مرقوم ہے اور یُوں ہے ؎

یک روز بود عید بیک سال بیک بار
ہموارہ مرا عید ز دیدارِ تو ھموار
یک روز بشاخ اندر پُر بار بود گُل
روی تو مرا ہست ہمیشہ گُلِ پُر بار

---

[1] نسخۂ عجائب خانۂ برطانوی (Or. 3713) ورق ۱۷۹ ب؛ [2] سحبان ابن وائل، قدیم زمانے کا ایک عرب جس کی فصاحت ضرب المثل ہے؛ [3] یہاں صنعتِ تجنیس ہے، اماؔمی کا مطلب پیش نماز بھی ہے اور اماؔمی شاعر بھی؛ [4] Or. 2847

یک روز بنفشہ بر دمد[1] از باغ بدستہ
زلفین تو پیوستہ بنفشہ است بخروار
یک ہفتہ پدیدار بود نرگسِ دشتی
آن نرگسِ چشمِ تو ہمہ سالہ پدیدار
نرگس نبود تازہ کہ بیدار نباشد
تازہ است سیہ نرگسِ تو خفتہ و بیدار[2]
باشند سمن زاران بہنگامِ بہاران
بر سنبلِ تو ہست شب و روز سمن زار
از جعدِ سیاہِ تو رسد فیض بہ سنبل[3]
کین مایۂ جان آمد و آن مایۂ عطّار
این را وطن از سیم[4] شد آنرا وطن از سنگ
این از برِ سروِ سہی آن از برِ کہسار
سرو است کہ در باغ ہمہ سالہ بود سبز
با قدِ تو آن سرو بود کوژ و نگونسار

---

[1] نسخے میں 'چیتم' تھا۔ میں نے مصرعے کے وزن کی خاطر تصحیح کی ہے؛

[2] پھول کو 'بیدار' کہتے ہیں جب پوری طرح کھلا ہو؛

[3] 'سنبل' ایک عام استعارہ ہے جو بالوں کے لئے آتا ہے؛

[4] یعنی سفید سیمیں جلد؛

کچھ عرصہ فخرالملک کہ وزراء وصدور خراسان سے تھا[1] امامی کا مربّی رہا۔ ایک مرتبہ اس نے امامی کو ذیل کا قطعہ بطور استفتاء بھیجا[2]

سر افاضل دوران امام ملّت و دین
خدایگانِ شریعت درین چہ فرماید
کہ گربہ گر قفص قمری و کبوتر را
میانِ شب زرہ جور و ظلم برباید
خدایگان کبوتر زروی شرع وقصاص
اگر بریزد خون گربہ را ہمی شاید

اس استفتاء کا امامی نے حسب ذیل جواب دیا

ایا لطیف سؤالی کہ در مشام خرد
ز بوی نکہت خلقت نسیم جان آید
بگربہ نیست قصاصی کہ صاحب ملّت
چنین قصاص بشرع گزین نفرماید
نہ کم زگربۂ بیدست[3] گربۂ صیّاد
کہ مرغ بیند و بر شاخ پنجہ بکشاید
اگر بساعدِ سیمین خودسری دارد
بخون گربہ ہمان بہ کہ دست نالاید
بقای قمری و عمر کبوتر ار خواہد
قرارگاہ قفس را بلند فرماید

معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے شعری استفسارات اس زمانے کی وضع میں داخل تھے۔ کیونکہ کاشان کے بعض لوگوں نے مجدالدین ہمگر کو اسی طرح کا ایک منظوم استفسار انوری اور ظہیر فاریابی کے اضافی فضائل کے بارے میں بھیجا، امامی نے بھی اس سوال کا نظم میں جواب دینا مناسب

---

[1] بظاہر وہی وزیر فخرالملک شمس الدولہ ہے جسکی شان میں امامی کے ہاں بہت سے قصائد ملتے ہیں۔

[2] براؤن نے ان اشعار اور ان کے آگے امامی کے جوابی اشعار کا صرف منظوم ترجمہ انگریزی میں دیا ہے اور ذیلی حاشیہ میں اصل اشعار کا حوالہ دولت شاہ کی اپنی اڈیشن (ص ۱۶۹) سے دیا ہے۔ میں نے اصل فارسی اشعار مأخذ مذکور سے لیکر شامل کر دئے ہیں۔

[3] بید مجنوں کو فارسی میں گربۂ بید بھی کہتے ہیں۔

سمجھا۔ اس مراسلت کا متن اور اس کا ترجمہ تاریخِ گزیدہ میں دئے ہیں[1]۔ اس میں سوال اور اس کے دو جواب شامل ہیں جو ناظرین چاہتے ہیں وہاں رجوع کریں۔ مجد الدین کے جواب میں اس کی تاریخِ تحریر بھی درج ہے۔ یعنی آخرِ رجب ۶۷۴ھ (۱۹ر جنوری ۱۲۷۶ء) وہ اور امامی دونوں انوری کو ظہیر پر ترجیح دینے میں متفق ہیں تمام ماہر نقّاد اس فیصلے کی تائید کرینگے۔ بخلاف اس کے مجد الدین کا یہ دعویٰ کہ امامی کے کلام کو نہ صرف اسکے اپنے کلام پر بلکہ شیخ سعدی کے کلام پر بھی ترجیح ہے خلوصِ نیّت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ضرور کسی ذاتی غرض کی تحریک ہے۔ مثلاً یہ کہ اسے امامی کو خوش کرنا اور شیخ سعدی کو دِق کرنا منظور تھا۔ تمام اُن فارسی مصنّفوں نے جن کی نظر سے یہ بات گذری ہے مجد الدین کے اس نظریے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ جسے اس نے پیش کرنے کے قابل سمجھا۔ کیونکہ حقیقت بھی یہ ہے کہ امامی کی شاعری میں جہاں تک ہم دولت شاہ[2]، آتشکدہ[3] اور مجمع الفصحاء[4] کے دئے ہوئے متنوں کو دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کوئی امتیازی خصوصیت یا ندرت نہیں ہے۔ اسکے مقابلے میں شیخ سعدی کے

---

[1] تاریخ گزیدہ کے باب پنجم کی فصل ششم کا ترجمہ جو میں نے کیا ہے مجلۂ انجمن ہمایونی ایشیائی بابت اکتوبر ۱۹۰۰ء و جنوری ۱۹۰۱ء، نیز یہی ترجمہ کتاب کی شکل میں الگ چھپا ہے۔ اس کے صفحات ۶۰ تا ۶۴ (طبع عکسی سلسلہ یادگار گب میں یہ مراسلت محذوف ہے؛ مترجم)؛

[2] میری اڈیشن کے صـ ۱۶۷ تا صـ ۱۷۰؛ [3] طبع سنگی ۱۲۷۷ھ (۶۱-۱۸۶۰ء) کا صـ ۱۳۷؛

[4] جلد اول صـ ۹۸ تا صـ ۱۰۱؛

اس حق سے آج تک کسی نے اختلاف نہیں کیا کہ ان کا شمار اپنے ملک کے چھ[1] بزرگ ترین شاعروں میں ہونا چاہیئے ؎

مجد الدین ہمگر تاریخ گزیدہ کی رُو سے[2] ہمگر یزد کا رہنے والا تھا - اور فارس کے جابر حاکم بہار الدین جوینی کا وابستۂ دولت تھا جو ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ء) میں مرا[2] - جب شاعر یزد سے اصفہان آیا تو اپنی بُوڑھی بیوی کو یزد ہی میں چھوڑ آیا لیکن وہ جلد ہی اسکے پیچھے اصفہان چلی آئی - اسکے پہنچنے کی خبر مجد الدین کو اس کے ایک شاگرد نے آکر دی - اس نے کہا خوشخبری ہو! آپ کی بیگم صاحبہ گھر میں آن اُتری ہیں مجد الدین نے سن کر جواب دیا "بیشک خوشخبری ہے کاش کہ گھر اُن پر آن اُترتا" اس بُڑھیا کو جب یہ بات پہنچائی گئی تو اس نے اپنے شوہر کو ان بے مہری کے کلمات پر ملامت کی - اور عمر خیام کی وُہ رُباعی پڑھی جس کا پہلا مصرعہ ہے ؏ پیش از من و تو لیل و نہاری بودست[3]

مجد الدین نے سُن کر جواب دیا - مجھ سے پہلے تو شاید ہوں لیکن خدا نہ کرے کہ روز و شب تجھ سے پہلے بھی ہوئے ہوں[4]"

---

[1] طبع عکسی سلسلہ یادگار گب (۱۴)، جلد اول) ص ۸۲۵ (مترجم) ؛ [2] دیکھو اوپر ص ۳۸ ؛

[3] دیکھو سلسلہ مطبوعاتِ شرقیہ ٹریوبنر Trubuer's Oriental Series. میں ونفیلڈ کی مرتبہ رباعیاتِ عمر خیام اور اُن کا ترجمہ، رباعی ۳۳، (ص ۵ - ۲۴) ؛

[4] یہ قصہ تاریخ گزیدہ ہی سے منقول ہے - دیکھو براؤن کا ترجمہ باب پنجم، فصل ششم جو جلۂ ہمایونی ایشیائی میں اکتوبر ۱۹۰۰ء و جنوری ۱۹۰۱ء میں چھپا ہے - نیز الگ طور پر یہی ترجمہ کتاب کی صورت میں چھپا ہے - اس کا ص ۵۹ طبع عکسی سلسلہ یادگار گب میں یہ واقعہ محذوف ہے (مترجم) ؛

بقول دولت[1] شاہ مجد الدین ہمگر کا دعویٰ تھا کہ اس کا سلسلۂ نسب نوشیروانِ ساسانی سے ملتا ہے۔ اور اس سبب سے جن درباروں میں وہ بکثرت حاضر رہتا تھا وہاں کسی حد تک عنایاتِ خاص سے بہرہ یاب تھا اس ادعائی نسب کی طرف شاعر ذیل کے اشعار میں اشارہ کرتا ہے[2] ؎

برمن زمانہ کرد ہنرہا ہمہ وبال — وز غم بر بخت خونِ جوانیم چرخ زال
کلکم زدست بستد تیر[3] حسود شکل — برمن کمان کشید سپہرِ کمان مثال
چرخا چہ خواہی ازمنِ عورِ برہنہ پای — دہرا چہ خواہی ازمنِ زارِ شکستہ بال
از چشمِ باز توختہ کن لقمہای بوم — وز رانِ شیر ساختہ کن طعمۂ شغال
از زخمِ او چو طبل بنالم بہیچ روی — ور خود ز پشتِ من بمثل برکشد دوال
ای پای پیل فتنہ مرا نرم تر بکوب — ای دستِ چرخ سفلہ مرا سخت تر بمال
ای مالشی کہ یافت دلم روشنی گرفت — روشن شود ہر آینہ آئینہ از صقال
وقتی چنین کہ شاخِ گل از خاک بر دمید — طالع نگر کہ بخت مرا خشک شد نہال
عیبم ہمین کہ نیستم از نطفۂ حرام — جرمم ہمیں کہ زادہ ام از نسبتِ حلال
ہستم ز نسلِ ساسان نز تخمۂ تگین — ہستم ز صلب کسریٰ نز دودۂ ینال[4]

---

[1] میری اڈیشن کا صفحہ ۱۷۶؛ [2] مجمع الفصحاء جلد اوّل ص ۵۹۶ پر منقول ہیں؛

[3] تیرِ چرخ عطارد کو کہتے ہیں یہ وہ ستارہ ہے جو مصنفوں، خطاطوں اور شاعروں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتا ہے؛

[4] تگین یا تگین ترکی ناموں کا ایک لاحقہ ہے (مثلاً سبکتگین، الپتگین وغیرہ)، ینال ایک اور ترکی نام یا لقب ہے، کسریٰ خسرو کی عربی شکل ہے جو نوشیروان اور پرویز کا اصل نام ہے اور خاندانِ ساسانی کے تمام بادشاہوں کے لقب کے طور پر آتا ہے۔

شعری بخوشِ مذاقی چون چاشنیٔ وصل کلکی بنقشبندی چون صورتِ خیال
زفتی ندیدہ چشمِ کس از من بوقتِ جود لا ناشنودہ گوشِ کس از من گہ سؤال

دلرا نشاط لہو نباشد پس از شباب
خورشید را فروغ نباشد پس از زوال

مجدِ ہمگر کی رُباعیات

مجدِ ہمگر نے شمس الدین محمد صاحب دیوان کی مدح میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔ اور اتابک سعد بن ابوبکر کی مدح میں بھی۔ اسکے کلام کے نسخے نادر ہیں۔ لیکن ایک عمدہ پرانا نسخہ عجائب خانۂ برطانوی میں موجود ہے جو ۱۲۹۳ء تا ۱۲۹۸ء کے دوران میں شاعر کے پوتے نے لکھا۔ اس میں ہمگر کی چند رُباعیاں شامل ہیں، عمر خیام، ابوسعید بن ابی الخیر اور اس صنفِ سخن کے دُوسرے اُستادوں کی رُباعیوں کے برعکس مجد ہمگر کی رُباعیوں میں صُوفیانہ اور فلسفیانہ مضامین کی بحث کم ہے۔ اور اشیائے خارجہ اور اشخاص کی زیادہ، بعض تو محض فاحش ہجویات ہیں مثلاً رباعیِ ذیل ؎

آن مادرِ شوم قحبہ چون زاد ترا
از گنجہ با بخاز فرستاد ترا
وآن دایۂ خوک خوار سگ بان لعنا
شیرِ سگ و خونِ خوک می داد ترا

ذیل کی رُباعی جس میں شوقِ سیاحت کا اظہار ہے لفظی رعایات کے لحاظ

سے بے حد طبّاعانہ ہے ؎

ای چرخ عنانم از سفر ہیچ متاب
نانم ز سرندیب دہ آبم ز سراب
ہر شام ز بامیان دہم قرصی نان
ہر بام ز شام دہ مرا شربتی آب[1]

ذیل کی دو رُباعیوں میں اپنے روز افزوں بُڑھاپے کا ماتم کرتا ہے ؎

آن شد کہ دلم ز طبع چون آتش و آب
می ریخت بدیہہ ہای چون دُرِّ خوشاب
عشق و جوانی و کامِ دل بود
وین ہر سہ دگر بارہ نبینیم بخواب

این پای مرا کہ نیست پروای رکاب
نہ روی رکوب ماند و نہ رای رکاب
زین سان کہ بتنگ آمدم از پیری و ضعف
نہ دستِ عنان دارم و نہ پای رکاب

---

[1] سرندیب سنسکرت کے لفظ سُوَرن دیپ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، یہ نام عرب جغرافیہ نویسوں نے لنکا کیلئے لکھا ہے، سراب آذربائجان کا ایک شہر ہے ان دو ناموں میں ایک قسم کی لفظی رعایت ہے لیکن اس سے بہت زیادہ مکمل لفظی رعایت رُباعی کے نصف ثانی میں ہے، ایکطرف تو لفظِ بام (بمعنی صبح) اور بامیان (شمال مشرقی افغانستان کے شہر) کے درمیان اور دوسری طرف شام (بمعنیٔ وقت مغرب) اور شام (بمعنیٔ دمشق) کے درمیان، یہ آخری تجنیس تام کی مثال ہے؛

ذیل میں ایک اَور ہتک آمیز رُباعی دی جاتی ہے لیکن یہاں بھی حسبِ سابق مخاطب کا اتا پتا کچھ باقی نہیں ؂

ای دیدنِ خوک بیشِ دیدار تو خوب
با چہرۂ تو بوزنہ معشوقِ قلوب
از روی تو خوی تو بسی زشت تر است
با زشتیٔ خوی تو زہی روی تو خُوب

بعض رُباعیاں ناموں کے معمّے ہیں مثلاً رباعیِ ذیل ؂

اعدادِ حروفِ نام آن دلبرِ چُست
چون بخش فلک سیصد و شصتست دُرُست
حرفِ سومش نہ یکِ چارم حرفست
وز ثانی حرف شش یکی حرف نُخُست

ذیل کی رُباعی میں اپنے دلبر سے مخاطب ہے ؂

نے برگ کہ خیمۂ زنم پہلوییت
نے سیم کہ خانۂ خرم در کوییت
من دیدہ و گوش را بدان مے خواہم
تا بشنوم آواز و ببینم روییت

منقولۂ بالا بعض رُباعیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجد الدین نے بڑی لمبی عُمر پائی۔ ایک اور رُباعی میں وُہ اپنی عُمر اسّی سال سے اُوپر بتاتا ہے۔ لیکن میں اس کی پیدائش اور وفات کی پوری پوری تاریخیں

معیّن نہیں کر سکا ؎

عراقی یہاں اب ایک ایسے شاعر کا ذکر کرنا ضروری ہے جو تذکرہ بالا شاعروں سے کہیں زیادہ صاحب کمال و ندرت تھا۔ یعنی فخرالدین ابراہیم ہمدانی جو اپنے تخلّص عراقی سے زیادہ مشہور ہے صوفیوں اور شاعروں کے اکثر متأخّر تذکروں میں اس کے حالاتِ زندگی کے مذکور ملتے ہیں۔ خصوصًا نفحات الانس جامیؒ اور مجالس العشّاقِ حسین میرزا بایقرہ میں۔ لیکن ان تذکروں میں جو اطلاعات دی ہیں معاصر شہادت کی عدم موجودگی میں ہمیں ان کے قبول کرنے میں قدرے احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ خود اس کی اپنی نگارشات میں سے جو تقریبًا تمامتر عاشقانہ اور صوفیانہ نوعیت کی ہیں اس کے ذاتی سوانح کے بارے میں کچھ خوشہ چینی ممکن نہیں۔ اور ہے تو بہت کم۔ وہ قلندروں کا صحیح نمونہ ہے جو نام و نمود سے بے نیاز ہے اور ہر حسین چہرے یا چیز میں اسے حسن قدیم کا عکس اسی طرح نظر آتا ہے جیسے آئینے میں عکس ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کا ایک تذکرہ نگار لکھتا ہے "عشق اس کی سرشت میں کارفرمائے غالب تھا" اور چنانچہ اسی لئے اس کی غزلیں ایک طرح کے عاشقانہ انداز کی حامل ہیں جس نے اسے چند نقّادانِ یورپ خصوصًا شپرینگر کے شدید اعتراضات کا نشانہ بنا دیا ہے اور ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے افلاطون کے جن جذبات و تأثرات کی تحسین کرتے ہیں یا اُن سے اغماض

؎ طبع نساؤ لیس ص ۷۰۰ تا ص ۷۰۲؛

کرتے ہیں وہی اگر ایک ایرانی کے ہاں نظر آئیں تو انہیں شرمناک دکھائی دیتی ہیں[1]۔

بقول جامی عراقی ہمدان میں پیدا ہوا اور صغر سنی میں اُس نے قرآن حفظ کیا اور اسے صحت کے ساتھ نہایت خوش الحانی سے پڑھ سکتا تھا۔ کوئی سترہ برس کی عمر ہوگی کہ قلندروں کی ایک جماعت ہمدان میں وارد ہوئی۔ ان میں ایک نہایت خوبرو جوان بھی تھا۔ جب وہ لوگ ہمدان سے رخصت ہونے لگے تو عراقی اس جواں سال درویش کے حسن سے کھچ کر ان کی ہمراہی میں ہندوستان جا پہنچا۔ ملتان میں اُس نے شیخ بہاء الدین زکریا کے سامنے زانوئے ارادت تہ کیا جن کے متعلق وُہ ایک غزل میں کہتا ہے ؎

پرسی اگر از جہان کیست امام الانام
نشنوی از آسمان جز زکریا جواب

وہاں پہنچا ہی تھا کہ مرشد کی طرف سے اس پر چلّہ کی ریاضت عائد ہوئی لیکن دسویں روز بقیہ درویش شیخ کے پاس آئے اور شکایت کی کہ مراقبہ

[1] اس عاشقانہ انداز سے جو بقول پروفیسر براؤن نقادانِ یورپ کی نکتہ چینی کا ہدف ٹھہرا ہے۔ امرد پرستی کی طرف اشارہ ہے۔ یوروپ کے لوگوں نے فارسی شاعروں کو اس کے اظہار پر بہت ملامت کی ہے یہ انکے تعصب اور ان کی تنگ نظری کا ثبوت ہے کہ افلاطون کی امرد پرستی سے چشم پوشی کرتے ہیں یا اس کے استحسان کی حجت ڈھونڈتے ہیں اور مشرق کے شاعروں کو اس صفت پر برا بھلا کہتے ہیں۔ (مترجم)۔

کرنے کی بجائے عراقی ایک غزل گا رہا ہے جو اس نے لکھی ہے یہ غزل چند دنوں کے عرصے میں شہر کے تمام خراباتیوں کی زبان پر تھی۔ جو اسے چنگ و چغانہ کے ساتھ میخانوں میں گا رہے تھے۔ یہ غزل جو عراقی کی مشہور ترین غزلوں میں سے ہے درجِ ذیل ہے ؎

نخستیں بادہ کاندر جام کردند زچشمِ مست ساقی وام کردند
چو باخود یافتند اہلِ طرب را شراب بیخودی در جام کردند
لبِ میگونِ جانان جام درداد شرابِ عاشقانش نام کردند
سرِ زلفِ بُتان آرام نگرفت زبس دلہا کہ بی آرام کردند
بمجلس نیک وبد را جای دادند بجامی کار خاص وعام کردند
چو گوی حُسن در میدان فگندند بیک جولان دو عالم رام کردند
ز بہرِ نقلِ مستان ازلب وچشم مہیا شکر و بادام کردند
ازان لب کآرزوی جملہ دلہاست نصیبِ بی دلان دُشنام کردند
دلی را تا بدست آرند ہردم سرِ زلفین خود را دام کردند
بغمزہ صد سخن گفتند باجان بدل زابرو دو صد پیغام کردند
نہان با محرمی رازی بگفتند جہانی را ازآن اعلام کردند
بعالم ہر کجا درد و غمے بود بہم کردند و عشقش نام کردند

چو خود کردند رازِ خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند

جب شیخ بہاء الدین نے آخری شعر سُنا تو کہا "کارِ او تمام شد" پھر عراقی

کے حجرے پر جا کر کہا "عراقی اکنون مناجات در خرابات میکنی، بیرون آی" غرض عراقی باہر آیا اور شیخ نے اُسے اپنے تن مبارک کا خرقہ اُتار کر پہنایا اور اسے زمین پر سے اُٹھایا جہاں اُس نے اپنے تئیں گرا دیا تھا۔ اور بعد میں اپنی دُختر اُس کے عقد نکاح میں دے دی جس کے بطن سے آگے چل کر کبیر الدین نام ایک لڑکا پیدا ہوا ؀

پچیس سال گُزر گئے اور شیخ بہار الدین نے انتقال کیا اور عراقی کو اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ لیکن دُوسرے درویشوں کو یہ نامزدگی ناگوار ہوئی اور وہ بادشاہ کے پاس عراقی کی آزادروی کی شکایت لیکر گئے۔ اس پر اُس نے ہندوستان کو خیرباد کہی اور حرمینِ شریفین کی زیارت کی وہاں سے رُوم چلا گیا۔ قونیہ میں اس نے شیخ محی الدین ابن العربی کی فصوص شیخ صدر الدین قونیوی کے درس سُنے اور اپنی مشہور ترین کتاب 'لمعات' لکھی اور یہ شیخ کی خدمت میں پیش کی گئی اُنہوں نے پسند کی، رُوم کا طاقتور امیر معین الدین پروانہ عراقی کا مرید و معتقد تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اس نے علاوہ دوسری عنایات کے اس کے لئے توقات میں ایک خانقاہ بنوائی، اس کے مرنے پر عراقی روم سے مصر کو روانہ ہوا اور کہا جاتا ہے کہ وہاں سلطانِ وقت اس سے بڑے حسنِ سلوک سے پیش آیا۔ دشمنوں نے سلطان کو بہکانے کی کوششیں کیں لیکن باوجود ان کے شاعر نے بادشاہ کے التفات کو ہاتھ سے نہ گنوایا۔ اسکے بعد اس نے شام کا قصد کیا اور وہاں

؎ ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" جلد دوم ص ۴۹۷ تا ص ۵۰۱؛

بھی اس کا ویسا ہی استقبال ہوا۔ چھ ماہ کے قیام کے بعد اس کا بیٹا کبیرالدین ہندوستان سے اس کے ساتھ آملا۔ یہیں ۸ ذوالقعدہ ۶۸۸ھ (۲۳ نومبر ۱۲۸۹ء) کو عراقی نے وفات کی اور قبرستانِ صالحیۂ دمشق میں صوفیٔ جیّد شیخ محی ابن العربی کے پہلو میں دفن ہوا۔ جو اس سے پچاس سال پہلے فوت ہوئے اور جن کا اثر ایران میں جو آج بھی عام طور پر حاوی ہے بڑی حد تک عراقی، اوحدالدین مراغی اور اسی دبستان کے دوسرے بزرگوں کی بدولت ہے؛

منقولہ بالا غزل کے علاوہ ذیل کی منظومات اس کے طرز کلام کے مخصوص نمونوں کے طور پر پیش کی جاتی ہیں ؎

سر بسر لطفی و جانی ای پسر	خوشتر از جان چیست آنی ای پسر
میلِ دلہا جملہ سوی روی تست	وہ کہ شیرین دلستانی ای پسر
زآن بچشم من درآئی ہر زمان	کز صفا آبِ روانی ای پسر
از مئ حسن ارچہ سرمستی مکن	با حریفان سرگرانی ای پسر
وعدۂ امید اگرچہ کج بود	از بہانہ در نمانی ای پسر
برلبِ خود بوسہ دہ و آنگہ ببین	ذوقِ آبِ زندگانی ای پسر
زآن شدم خاکِ درت کز جامِ مے	جرعۂ بر من فشانی ای پسر
گوش جانہا پُر گہر شد بسکہ تو	از سخن دُر می فشانی ای پسر
از لطیفی می نماند کس بتو	زان یقینم شد کہ جانی ای پسر
در دل و چشم ز حسن و لطف و تو	آشکارا و نہانی ای پسر

نیست در عالم عراقی را دمی
بر لبِ تو کامرانی ای پسر

ذیل میں ایک نہایت دلآویز ترجیع بند کا پہلا بند دیا جاتا ہے ؎

أکؤوسٌ تلألأت بمدام — أم شموسٌ تهلّلت بغمام
از صفای می لطافتِ جام — در هم آمیخت رنگِ جام و مدام
همه جامست و نیست گوئی می — یا مدامست و نیست گوئی جام
تا هوا رنگ آفتاب گرفت — هر دو یکسان شدند نور و ظلام
روز و شب باهم آشتی کردند — کارِ عالم از آن گرفت نظام
گر ندانی که این چه روز و شبست — یا کدام است جام و باده کدام
سرِ آب حیات در عالم — چون می و جام فهم کن تو مدام
انکشاف حجاب علمِ یقین — چون شب و روز فرض کن وسلام
ور نشد زین بیان ترا روشن — جمله آغازِ کار تا انجام
جامِ گیتی نمای را بطلب — تا ببینی بچشمِ عقل تمام

که همه اوست هر چه هست یقین
جان و جانان و دلبر و دل و دین

ذیل میں ایک اَور غزل کا ایک قطعہ ہے ؎

از پرده برون آمد ساقی قدحی در دست
هم پردهٔ ما بدرید هم توبهٔ ما بشکست
بنمود رُخِ زیبا گشتیم همه شیدا

چون ہیچ نماند از ما آمد بر ما بنشست
زلفش گرہی بگشاد بند از دلِ ما برخاست

جان دل ز جهان برداشت و اندر سرِ زلفش بست
در دامِ سرِ زلفش ماندیم همه حیران

وز جام مے لعلش گشتیم همه سرمست
از دست بشد چون دِل در طرّهٔ او زد چنگ

غرقه زند از حیرت در هرچه بیابد دست
چون سلسلهٔ زلفش بند دل حیران شد

آزاد شد از عالم وز هستیٔ خود وا رَست

ولہٗ

مرا جز عشق تو جانی نمی بینم نمی بینم
دلم را جز تو جانانی نمی بینم نمی بینم

بخود صبری و آرامی نمی یابم نمی یابم
ز تو لطفی و احسانی نمی بینم نمی بینم

ز ردی لطف بنما رو که دردی را که من دارم
بجز ردی تو درمانی نمی بینم نمی بینم

بیا گر خواهیم دیدن که دور از روی خوب تو
بقای خویش چندانی نمی بینم نمی بینم

بگیر اے یار دستِ من کہ در گردابی افتادم
کہ آنرا ہیچ پایانی نمی بینم نمی بینم
زروی لطف و دلداری بیا سامان کارم کن
کہ خودرا بی تو سامانی نمی بینم نمی بینم
عراقی را بدرگاہت رہی بنما کہ در عالم
چو او سرگشتہ حیرانی نمی بینم نمی بینم

عشّاق نامہ غزلیہ شاعری کے علاوہ عراقی نے عشاق نامہ کے عنوان سے ایک مثنوی بھی تصنیف کی۔ لیکن میں نے یہ کبھی پڑھی نہیں اور نہ فی الحال اس کا کوئی نسخہ میری پہنچ میں ہے[1]۔ اس لئے اب میں اس کی نہایت قابلِ ذکر نثریہ تصنیف لمعات کو لیتا ہوں یہ ایک متصوفانہ رسالہ ہے جس کی تصنیف کی تحریک حسبِ مذکور سابق شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی کی تعلیم سے ہوئی جو عرب کے مشہور قبیلہ طیّ کی نسل سے تھے اور اندلس ان کا وطن تھا۔

لمعات لمعات نسبتہً ایک چھوٹی کتاب ہے۔ جو غالباً سات ہزار اور آٹھ ہزار کے درمیان لفظوں پر مشتمل ہے اور گو نثر میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس میں متعدد نظمیہ قطعات بھی شامل ہیں، جامعِ علوم اور صاحبِ

---

[1] یہ مثنوی سلسلۂ مطبوعات انجمن تحقیق اسلامی (Islamic Research Association Series) میں بہ تصحیح و ترتیب مسٹر آرتھر جے آربری Arthur J. Arberry مع ترجمہ انگریزی و سوانحِ مصنف بمبئی سے بہ ۱۹۳۹ء شائع ہو چکی ہے۔ (مترجم)

کمالات مولانا جامی نے جن پر ہم ایک آیندہ باب میں گفتگو کرینگے اس کی ایک شرح لکھی جس کا عنوان اشعۃ اللمعات[1] ہے۔ اس شرح کے دیباچے

اِس تصنیف کے بارے میں جامی کی رائے

میں وہ لکھتے ہیں کہ شروع شروع میں وہ کتاب اور اس کے مصنف سے بدظن تھے۔ لیکن جب ان کے مرشدوں میں سے ایک بزرگ نے ان سے کتاب کے متن کا مقابلہ اور اس کی تصحیح کرنے کی استدعا کی تو انھوں نے اسے خوب پایا۔ اس کی توصیف انہی کے لفظوں میں دیکھئے[2] "عبارات خوش و اشاراتِ دلکش جواہر نثر و نظم بر ہم ریختہ و لطایف عربی و پارسی در ہم آمیختہ آثار علم و عرفان از آن پیدا و نورِ ذوق و وجدان در آن ہویدا خفتہ را بیدار کند و بیدار را واقفِ اسرار گرداند آتشِ عشق برافروزد و سلسلۂ شوق بجنباند" کتاب ۲۸ 'لمعات' میں تقسیم ہے۔ غالباً حروفِ ہجا کی مطابقت سے یہ تعداد رکھی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر میں لمعۂ اوّل کے آخر تک افتتاحی صفحات نقل کرتا ہوں[3]:-

---

[1] ۱۳۰۳ھ (۶-۱۸۸۵ء) میں دیگر صوفی رسالوں کیساتھ طہران میں بچاپ سنگی شائع ہوچکی ہے؛

[2] پروفیسر براؤن نے اس توصیفی عبارت کا صرف انگریزی ترجمہ دیا ہے۔ میں نے اشعۃ اللمعات کے نسخۂ کتابخانہ جامعۂ پنجاب سے اصل عبارت نقل کردی ہے، نسخۂ مذکورہ ورق ۲ الف (مترجم)؛

[3] براؤن نے افتتاحی صفحات کے حصۂ نثر کا صرف انگریزی ترجمہ دیا ہے۔ اور حصۂ نظم کا اصل اور ترجمہ دونوں، چونکہ اس عبارت میں تصوّف کی اصطلاحات بکثرت آئی ہیں (باقی حاشیہ ص ۲۰۵ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی نوّر وجہ حبیبہ بتجلیات الجمال فتلألأ نوراً وابصر فیہ غایات الکمال وفرح بہ سروراً فصدّرہ علی یدہ وصافاہ وآدم لم یکن شیئاً مذکوراً ولا القلم کاتباً ولا اللوح مسطوراً فھو مخزن کنز الوجود ومفتاح خزائن الجود وقبلۃ الواجد والموجود وصاحب لواء الحمد والمقام المحمود الذی نطق بلسان مرتبتہ لبیان منقبتہ یقول:۔

وانّی وان کنتُ ابنَ آدمَ صورۃً فلی فیہ معنیً شاھدٌ بأبوّتی[1]

(باقی حاشیہ ص ۲۰۴) اس لئے میں نے مناسب جانا کہ اصل یہاں نقل کر دوں، مسٹر آرتھر جے آربری نے اپنی تدوین عشاق نامہ میں جو دیباچہ لکھا ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ 'لمعات' طہران سے بہ چاپ سنگی شائع ہو چکی ہے۔ یہ طبع میری رسائی میں نہیں ہے۔ اس لئے میں نے کتاب خانۂ جامعہ پنجاب کے دو نسخوں کے مقابلہ کے بعد یہ اصل عبارت مرتب کی ہے۔ ایک نسخہ اشعۃ اللمعات کا جس کا ذکر اوپر ذیلی حاشیہ میں کیا جا چکا ہے۔ دوسرا لمعات کا جو ابھی میں پروفیسر شیرانی صاحب مدظلہٗ کے ذاتی کتابخانے کے ساتھ خریدا گیا ہے، مؤخر الذکر نسخہ قرن دہم کا لکھا ہوا ہے۔ (مترجم)

[1] جیسا کہ مولانا جامی نے ہمیں بتایا ہے یہ شعر ابن الفارض کے قصیدۂ تائیہ میں سے ہے، اگرچہ بحسب صورتِ حسّی و بدنِ عنصری پیغمبرِ اسلام حضرت آدمؑ کے صلب سے پیدا ہوئے۔ لیکن درحقیقت وہی تخلیق کائنات کی غایت و علّت ہیں چنانچہ حضرت آدمؑ کا وجود اُن کے وسیلے سے ہوا نہ کہ ان کا وجود حضرت آدمؑ کے وسیلے سے۔ مسلمان (باقی حاشیہ ص ۲۰۶ پر)

گُفتا بصورت ارچه ز اولادِ آدمم | از روی مرتبه ہمہ حال برترم
چون بنگرم در آینہ عکسِ جمالِ خویش | گردد ہمہ جہان بحقیقت مصوّرم
خورشیدِ آسمانِ ظہورم عجب مدار | ذرّات کائنات اگر گشت مظہرم
ارواحِ قدس چیست نمودارِ معنیم | اشباحِ انس چیست نگہدارِ پیکرم
بحرِ محیط رشحۂ از فیضِ فائضم | نورِ بسیط لمعۂ از نورِ ازہرم
از عرش تا بفرش ہمہ ذرّۂ بود | در نورِ آفتابِ ضمیرِ منوّرم
روشن شود ز روشنیِ ذاتِ من جہان | گر پردۂ صفاتِ خود از ہم فرو درم
آبی کہ خضر گشت ازو زندہ جاودان | آن آب چیست قطرۂ از حوضِ کوثرم
آن دم کز و مسیح ہمی مردہ زندہ کرد | یک نفخہ بود از نفسِ رُوحِ پروَرم
فی الجملہ مظہرِ ہمہ اسماست ذاتِ من | بل اسمِ اعظم بحقیقت چو بنگرم

صلی اللّٰہ علیہ وسلّم

اما بعد کلمہ چند در مراتبِ عشق بر سننِ سوانح[1] بزبان وقت املا کردہ می آید تا آئینہ معشوق نمای ہر عاشق آید با آنکہ رتبۂ عشق برتر از انست کہ بقوّت فہم و بیان پیرامنِ سراپردۂ جلالِ او توان گشت یا بدیدہ کشف عیان بجمالِ حقیقت او نظر توان کرد قطعہ ؎

تعالی العشقُ عن ھممِ الرّجالِ | وعن وصفِ التفرّقِ والوصالِ

(باقی حاشیہ ص ۲۰۵) اللہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ پیغمبر سے کہہ رہا ہے" لولاکَ لما خلقت الافلاکَ"۔ (اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)؛

[1] عشق وعاشق ومعشوق پر شیخ احمد غزالی کے ایک رسالے کا عنوان؛

منی ما جلّ شیئٔ عن خیال　　یجلّ عن الاحاطۃ والمثال

به تتقِ عزّت محتجب است و بکمال استغنا منفرد، حجب ذات او صفات اوست وصفاتش مندرج در ذاتِ عاشق، و عاشق جمالِ او جلال اوست و جمالش مندمج در جلال، علی الدوام خود با خود عشق بازد و با غیر خود نپردازد، ہر لحظہ از روی معشوقی پردهٔ براندازد و ہر نفس از راهِ عاشقی پردهٔ آغازد ؎

عشق در پرده می نوازد ساز　　عاشقی کو کہ بشنود آواز

ہر نفس نغمهٔ دگر سازد　　ہر زمان زخمهٔ کند آغاز

ہمه عالم صدای نغمهٔ اوست　　کہ شنید این چنین صدای دراز

راز او از جهان برون افتاد　　خود صدا کی نگاهدار د راز

سرّ او از زبان ہر ذرّہ　　خود تو بشنو کہ من نیم غمّاز

ہر زمان بهر زبان راز خود با سمع خود گوید ہر دم بهر گوش سخن خود از زبانِ خود بشنود و ہر لحظہ بهر دیده روی خود را بر دیدهٔ خود جلوه دہد، و ہر لمحہ بهر روی وجودِ خود را بر شهود خود عرضہ کند، وصف او چنانکہ ہست از من بشنو:

یحدّث ثنی فی صامتٍ ثمّ ناطقٍ[1]

وغمز عیونٍ ثمّ کسر الحواجب

دانی چہ حدیث میکند در گوشم ؟ میگوید :

عشقم کہ در دو کون مکانم پدید نیست　　عنقای مُغربم[2] کہ نشانم پدید نیست

---

[1] مخلوقِ متکلّم و غیر متکلّم کے ذریعے یا مخلوق ذوی الاعضاء و غیر ذوی الاعضا کے ذریعے ؛

[2] عنقای مُغرب کی صحیح شرح مشکوک ہے - دیکھو لین (Lane-) کی عربی انگریزی لُغت ؛

زابرو و غمزه هر جهان صید کرده ام — مِنگر بدان که تیر و کمانم بدید نیست
چون آفتاب در رُخ هر ذرّه ظاهرم — از غایتِ ظهور عیانم بدید نیست
گویم بهر زبان و بهر گوش بشنوم — وین طرفه تر که گوش و زبانم بدید نیست
چون هر چه هست در همه عالم همه منم — مانند در دو عالم از آنم بدید نیست

مقدمه

بدانکه در اثناء هر لمعه از لمعات ایمای کرده می آید از حقیقتی منزّه از تعیّن خواه حُبّش نام خواه عشق اذ لا مشاحة فی الالفاظ واشارتی نموده می شود بکیفیت سیر او در اطوار و ادوار و سفر او در مراتب استبداع و استقرار و ظهور او بصورت معانی و حقایق و بُروزِ او بکسوت معشوق و بانز انطوا، عاشق در معشوق عیناً و انزواء معشوق در عاشق حکماً و اندراج هر دو در سطوات وحدت وهنالك اجتمع الفرق وارتتق الفتق واستتر النور وبطن الظهور فی الظهور ونودی من وراء سرادقات العزّة

ألا کلّ شیءٍ ما خلا الله باطل

وغابت العین فی العین لا رسم ولا اثر وبرز والله الواحد القهار؛

لمعهٔ اوّل

(در بیان مبدأیه عشق بر معشوق و عاشق را و کیفیت انتشار شان از وی و این در تعین اوّل است و در بیان آنکه هر یک در چیز محتاجست

بآن دیگر)

اشتقاق عاشق و معشوق از عشق است و عشق در مقرّ عزّ خود از تعین منزّه است و در حریم عین خود از ظهور و بطون مقدس ولیکن بهر اظهار کمال ازان روی که عین ذات خودست وصفات خود را در آینهٔ عاشقی معشوق برخود عرضه کرد حسن خود را بر نظر خود جلوه داد از روی ناظری و منظوری نام عاشقی و معشوقی پیدا آمد. نعت طالبی و مطلوبی ظاهر گشت ظاهر را بباطن بنمود آوازه عاشقی برآمد باطن را بظاهر بیار است نام معشوقی آشکار اشده

یک عینِ متفق که جز او ذرّهٔ نبود

چون گشت ظاهر این همه اغیار آمده

ای ظاهر تو عاشق و معشوق باطنت

مطلوب را که دید طلب گار آمده

ذات عشق از روی معشوقی آئینه عاشق آمد تا در وی مطالعه ذات خود کند روی عاشقی آئینهٔ معشوق تا در و اسما و صفات خود ببیند هرچند در دیده جز یک بیش نیامد امّا چون یک روی بدو آئینه نماید هر آئینه در هر آئینه روی دیگر پیدا آید ؎

وَمَا الْوَجْهُ اِلّا وَاحِدٌ غَیْرَ اَنّهٗ

اِذَا اَنْتَ عدّدْتَ الْمَرَایا تعَدّدَا

بیت :-

غیری چگونہ روی نماید چو ہرچہ ہست
عینِ دگر یکیست پدیدار آمدہ

اوحدالدّین کرمانی شیخ ابو حمید اوحدالدین کرمانی بھی عراقی کی طرح شیخ بزرگ محی الدّین ابن العربی کا پیرو تھا۔ اور جیسا کہ مجمع الفصحاء سے ظاہر ہوتا ہے[1] شیخ کا ذاتی دوست بھی تھا۔ اور اسی ماخذ کی رو سے صوفی مجذوب شمسِ تبریز سے ملا تھا۔ جن کی روحانی تحریک سے مولانا جلال الدین نے اپنی مثنوی اور اپنا دیوان تصنیف کئے جیسا کہ بعضوں کا کہنا ہے، اوحدی مراغی اور خود عراقی سے بھی اس کی شناسائی تھی جس کے ساتھ وہ اپنی بے نیازئ ہیئت اور جمال کی والہانہ دلدادگی میں کسی قدر مشابہت رکھتا ہے۔ شیخ شہاب الدین نے جن کو اختلاف زمانی کی دلیل سے مشہور شہاب الدین سہروردی نہیں مانا جاسکتا اسے سخت ناپسند کیا۔ اور اسے 'مبتدع' (بدعتی) کہا اور اسے اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی، اوحدالدین نے جب یہ سُنا تو ذیل کا عربی شعر پڑھا[2]

مَاسَاءَنِی ذِکْرَاکَ لِی بِمَسَبَّۃٍ بَلْ سَرَّنِی أَنِّی خَطَرْتُ بِبَالِکَا

---

[1] دیکھو طہران کی طبع سنگی جلد اول ص۹۸ تا ص۹۴، نیز جامی کی نفحات ص۶۸۵؛

[2] ملاحظہ ہو جامی کی نفحات الانس طبع نساؤلیس، ص۶۸۴ تا ص۶۸۹؛ بدیع الزمان ہمدانی نے یہ شعر مسمی دُمینہ کے نام منسوب کیا ہے (رسائل، طبع بیروت ۱۸۹۰ء ص۹۶، نیز حاشیۂ ذیل ص۴) اپنی اصل شکل میں یہ شعر ایک عورت سے خطاب کیا گیا تھا۔ اور یوں ہے:۔

لَئِنْ سَاءَنِی أَنْ نِلْتِنِی بِمَسَاءَۃٍ لَقَدْ سَرَّنِی أَنِّی خَطَرْتُ بِبَالِکِ

(تمہارا گالی کے ساتھ یاد کرنا مجھے بُرا نہیں لگا۔ بلکہ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی۔ کہ میں تمہارے خیال میں تو آیا)

مولانا جامی نے اس معاملے میں اس کی وکالت کی ہے۔ کہ وہ "شہودِ حقیقت کے لئے مظاہرِ صوری کا وسیلہ پکڑتا تھا۔ اور جمالِ مطلق کا صوَرِ مقیّدہ میں مشاہدہ کرتا تھا" اور آگے لکھا ہے کہ جب شمس تبریزؒ نے اُس سے پُوچھا کہ یہ کیا کرتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا "ماہ را در طشتِ آب می بینم" مراد یہ کہ جمالِ خالق کا مشاہدہ جمالِ مخلوق میں کرتا ہوں۔ اس پر شمس تبریزؒ نے جواب دیا "اگر بر قفا دُمّل نداری چرا بر آسمانش نمی بینی" یعنی اگر تمہاری گدّی پھوڑے میں مبتلا نہیں ہے، تو خود آسمان ہی پر چاند کیوں نہیں دیکھ لیتے! اسی طرح جب مولانا جلال الدین رومی کو بتایا گیا کہ اوحد الدین شاہد باز ہے لیکن پاکباز ہے تو مولانا پکار اُٹھے "کاش کہ کردی و گزشتی" اوحد الدین خود اپنا نقطۂ نظر ذیل کی رُباعی میں پیش کرتا ہے ؎

زان می نگرم بچشم سر در صورت
زیرا کہ ز معنیست اثر در صُورت
این عالم صورت است و ما در صُوَریم
معنی نتوان دید مگر در صُورت

علاوہ ان چند رُباعیات کے جو نفحات الانسِ جامی، مجمع الفصحاءِ رضا قلی خان اور دُوسرے تذکروں میں منقول ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اوحد الدین

نے ایک مثنوی موسوم بہ مصباح الارواح کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ جس میں سے طویل اقتباسات مجمع الفصحاء میں دئے ہیں اور ذیل کے آٹھ شعر نفحات الانس میں (ص ۹-۶۸۸) سے

تا جنبشِ دست ہست مادام	سایہ متحرک است ناکام
چون سایہ ز دست یافت مایہ	پس نیست خود اندر اصل سایہ
چیزی کہ وجودِ او بخود نیست	ہستیش نہادن از خرد نیست
ہست است ولیک ہستِ مطلق	نزدیک حکیم نیست جز حق
ہستی کہ بحق قوام دارد	او نیست ولیک نام دارد
برنقشِ خود است فتنہ نقّاش	کس نیست دریں میان تو خوش باش
خود گفت حقیقت و خود اشنید	وآن روی کہ خود نمود خود دید
پس باد یقین کہ نیست واللہ	موجود حقیقیٔ سوی اللہ

اوحدی مراغی

اوحد الدین کے مرید اوحدی مراغی کا تذکرہ بھی یہاں ہونا چاہیئے۔ وہ اصفہانی بھی کہلاتا ہے۔ کیوں کہ گو سابق الذکر مقام اس کا وطن پیدائشی تھا۔ لیکن اس نے اپنی عُمر کا ایک قابلِ لحاظ حصہ اصفہان میں گزارا[۱]۔ معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار اس کے

---

[۱] ملاحظہ ہو دولت شاہ (راقم کی ایڈیشن) ص ۲۱۰ تا ص ۲۱۵؛ مجمع الفصحاء، جلد دوم۔ ص ۹۰۲ تا ص ۹۰۸؛ ہفت اقلیم در ذیل اصفہان وغیرہ، جامی نے البتہ ان دو شہروں کے منصب اُلٹ کر لکھے ہیں ⁂

حالات کچھ نہیں جانتے۔ لیکن عام طور پر رائے یہ ہے کہ وہ ۷۳۸ھ (۸-۱۳۳۷ء) میں مرا۔ اس کی خاص نظم ایک مثنوی بہ عنوان جامِ جم ہے جو حدیقۂ سنائی کے اتباع میں لکھی گئی ہے۔ تذکرہ نویسوں نے بافراط اس کے اقتباسات دئے ہیں۔ اور میرے پاس اس کا ایک اچھا نسخہ ہے[1]۔ دولت شاہ بہ تقلیدِ ہفت اقلیم بیان کرتا ہے کہ یہ مثنوی اس قدر مقبول تھی کہ اس کی برآمد کے بعد ایک مہینے کے اندر اندر اس کی ۴۰۰ نقلیں تیار ہوئیں اور اچھی قیمت پر فروخت ہوئیں لیکن یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کے اپنے زمانے (۸۹۲ھ مطابق ۱۴۸۷ء) میں کم ہی دیکھنے میں آتی اور پڑھی جاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واحد مثنوی ہے جو اس نے لکھی۔ لیکن ایک دیوان بھی چھوڑ مرا جس کے متعلق رضا قلی خان صاحب مجمع الفصحاء کا تخمینہ ہے کہ اس میں قصائد و رباعیات ملا کر چھ یا سات ہزار اشعار ہیں[2]۔ اس کا ایک انتخاب تذکرہ نویسوں نے دیا ہے۔ ذیل کا کلام اس کے انداز کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:۔

(ایک قصیدے کا جزء ماخوذ از ہفت اقلیم)

چند زین ریش و جُبّہ و دستار ... دوست آن دوست گیر و دست بدار

دردِ دل کن بجنبش و حرکت ... قُوتِ جان ساز در سکون و قرار

---

[1] مؤرخہ ۹۱۶ھ (۱۱-۱۵۱۰ء) متن تقریباً ۵۰۰۰ اشعار پر شامل ہے (چاپخانۂ فردوسی طہران سے یہ مثنوی بہ سنہ ۱۳۰۴ شمسی (۱۹۲۹ء) چھپکر شائع ہو چکی ہے، مترجم)

[2] دولت شاہ نے دس ہزار تعداد لکھی ہے (راقم کی ایڈیشن صفحہ ۲۱۰)؛

رنگ و بوی خود از میان بر گیر　　تا ترا تنگ در کشد بکنار
تا نگردی شکسته کی بینی　　بدرستی جمال آن رخسار
آنچه گوید اگر توانی کرد　　هر چه گوئی توان کند ناچار
خویشتن او بس ز دیگران بگذر　　چون مجرّد شوی ز خویش و تبار
چون ز خود رستهٔ ز خود برپرس　　که خدا کیست ای خدا آزار
از تو این ما و من که مے گوید　　با تو این نیک و بد که داد قرار
گر کسی دیگرست باز شجوی　　ور توئی چیست زحمتِ اغیار
هست فرقی میان دیدن و وصل　　نیست زرقی مرا درین گفتار
وصل و دیدار گر یکے بودی　　دیده خونین شدی ز دیدنِ خار
ساغری داده ات مریز و بنوش　　دیگری می دہم بگیر و بدار
جز یکی نیست صورت خواجہ　　کثرت از آئینہ است و آئینہ دار
سکّۂ شاہ و نقشِ سکّہ یکیست　　عدد از درہم است و ز دینار
از یکے آب نقش می بندد　　بر سرِ گلبن ار گلست از خار
از یکی آفتاب گیرد رنگ　　خواہ نارنج گوی و خواہی نار
نقطۂ را ہزار دائرہ است　　گر قدم پیشتر نہد پرکار
ہمہ عالم نشانِ صورتِ اوست　　باز جوئید یا اولی الابصار
ہمہ تسبیح او ہمی گویند
ریگ در دشت و سنگ بر کہسار

ذیل کا قطعہ کسی قدر دلکشی کا حامل ہے۔ لیکن شیخ سعدیؒ کے

ایک قطعے کے تتبع میں لکھا گیا ہے[1] ؎

ای رنج ناکشیدہ کہ میراث میخوری | بنگر کہ کیستی تو و مال کہ مے بری
او جمع کرد چون ہمی خورد از و بماند | دریاب کز تو باز بماند چو بگذری
زر غولِ مرد باشد و زن غُلِّ گردنش | در غُلّ و غول باشی تا با زن و زری
فرزند بندہ است خدا را غمش مخور | تو آن نۂ کہ بہ ز خدا بندہ پروری
گردِ ہوا مگرد کہ گردد وبالِ تو | گر خود ببالِ جعفرِ طیار[2] مے پری
دریای فتنہ این ہوس و آرزوی تست | در موجِ او مرو چو نداری شناوری
این شست و شوی جُبّہ و دستار تا بکی | دست از جہان بشوی کہ این است گازری
ہرگز بباشدت ببدِ دیگران نظر | در فعلِ خویشتن تو اگر نیک بنگری

گفتار اوحدی نبود بے حقیقتی
قولش قبول کن کہ باقبال رہ بری

غزلِ ذیل اوحدی کے کلام کا ایک اور مناسب نمونہ ہے ؎

بسکہ بعد از تو خزانی و بہاری باشد
شام و صبح آید و لیلی و نہاری باشد

---

[1] دیکھو کلکتہ کی ایڈیشن ۱۷۹۵ء، جلد دوم، اوراق ۲۳۸ الف تا ۲۳۹ ب؛

[2] یعنی جعفر ابن ابیطالب پیغمبرؐ کے عمزاد جو غزوۂ مُوتہ (ستمبر ۶۲۹ء) میں رُومیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے اور جن کے متعلق پیغمبرؐ نے فرمایا "مرّ بی ابی جعفر البارحۃ فی نفر من الملٰئکۃ لہ جناحان مختضب القوادم بالدّم" (ابن الاثیر طبع ٹورن برگ Tornberg، جلد دوم ص ۱۸۱) اس سے اُنکو "شہیدِ طیار" کہنے لگے (میور کی سیرتِ محمدیؐ جدید ملخّص ایڈیشن ص ۴۲۱ حاشیۂ ذیلی)؛

دل نگه دار کہ بر شاہدِ دُنیا نہی
کین نہ یاریست کہ اورا غمِ یاری باشد

تو کہ امروز نکژدم ہمہ زا نیش زنی
مؤنسِ گورِ تو ننگ است کہ ماری باشد

یک دلِ سوختہ بنواز کہ کاریست عظیم
ورنہ آزار دلِ خلق چہ کاری باشد

خاکسارانِ جہان را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ درین گرد سواری باشد

آخر میں ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو ؎

گر نام وننگ داری ازآن فخر عار دار
فخری کہ از وسیلتِ دونی رسد بتو

در کاسۂ نخست نظر بر خُمار دار
چون جام دولتت بکفِ دست بر نہند

اورا کہ با تو گفت چنین بی مہار دار
بد مہر تُختی است سراسیمہ نفسِ تو

محمودِ شبستری تبریز کے قریب آذربائیجان کے گاؤں شبستر (یا چبستر) نے تیرھویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ ایک اَور قابلِ ذکر صوفی پیدا کیا۔ یعنی سعد الدین محمود جو عموماً اپنے وطن کی نسبت سے شبستری کہلاتا ہے۔ اس کی زندگی کے حالات کچھ معلوم نہیں۔ جو ظاہر ہوتا ہے کہ تبریز میں یا اسکے آس پاس نہایت سکون سے گذری اور جہاں تک ان تلاطم خیز ایام نے اجازت دی اہم حوادث سے خالی رہی۔ تبریز ہی میں ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) کے آس پاس شبستری

نے وفات کی۔ شبستری ہرگز ایک پُرگو شاعر نہ تھا۔ لیکن اس کی مثنوی گلشنِ راز جو تقریباً ایک ہزار ابیات پر مشتمل ہے تصوّف کے بہترین اور جامع ترین رسالوں میں سے ہے اور آج بھی اس کو حُسنِ شہرت حاصل ہے۔ اسے مسٹر ای ونفیلڈ[1] نے مع ترجمہ، مقدّمہ اور مفید حواشی کے مرتّب کیا ہے۔ اپنے مقدّمے میں انہوں نے مصنّف کے چند معلوم حالات دیئے ہیں۔ اور مثنوی کی مختصر سی تاریخ قلمبند کی ہے۔ ۱۷۰۰ء سے یورپ کے سیّاحوں کی توجّہ اس کیطرف منعطف ہوئی۔ اور آئندہ صدی میں مغرب کے بعض کتابخانوں میں پہنچ گئی۔ ۱۸۲۱ء میں ڈاکٹر ٹھولک[2] نے اپنی کتاب موسومہ "تصوّف[3]" میں اس سے استفادہ کیا۔ اسی مصنّف نے ۱۸۲۵ء میں اپنی کتاب "تصوّف مشرقی کے پھولوں کا گلدستہ[4]" میں اس کے کچھ حصّے کا ترجمہ کیا۔ اور ۱۸۳۸ء میں مکمّل منظوم جرمن ترجمہ کے ساتھ اسے ہامر پُرگشٹال[5] نے مرتّب کیا۔ جیسا کہ شاعر خود ہمیں اطلاع دیتا ہے یہ مثنوی شوال ۷۱۰ھ (فروری۔ مارچ ۱۳۱۱ء) میں تالیف ہوئی۔ اور خراسان کے ایک شخص امیر حسین نام نے تصوّف پر پندرہ سوالات کا ایک سلسلہ پیش کیا تھا جس

---

[1] Whinfield ؛

[2] Dr. Tholuck ؛

[3] Saufismus ؛

[4] Bluthensammlung aus der Morgenlandirchen Mystik.

[5] Hammer Purgstall ؛

کے جواب میں لکھی گئی[1]۔ یہ سوالات جو مثنوی میں بھی داخل کئے گئے ہیں مجملاً حسبِ ذیل ہیں:۔

پندرہ سوالات جن کے جواب گُلشنِ راز میں دئے گئے ہیں،

(۱) تفکّر کیا چیز ہے؟

(۲) کیا وجہ ہے کہ فکر کبھی گناہ ہوتا ہے اور کبھی طاعت، اور کس قسم کا فکر صوفی پر واجب ہے؟

(۳) 'میں' کون ہوں؟ 'اندر خود سفر کردن' کا کیا مطلب ہے؟

(۴) "مسافر" کس کو کہتے ہیں۔ اور 'مرد تمام' کون ہوتا ہے؟

(۵) وہ کون سا 'عارف' ہے جو 'سرِّ وحدت' سے واقف ہوجاتا ہے؟

(۶) اگر 'عارف و معروف' ایک ہی 'ذاتِ پاک' ہے۔ تو اس 'مشتِ خاک' میں کیا 'سودا' سمایا ہے؟

(۷) کلمۂ 'انا الحق' کس نقطے سے وابستہ ہے؟

(۸) 'مخلوق' کو واصل کیوں کہتے ہیں؟ اسے 'سلوک و سیر' کیونکر حاصل ہوتے ہیں؟

(۹) وصالِ ممکن و واجب' کیا چیز ہے؟ 'قرب و بعد' اور 'بیش و کم' کا قصّہ کیا ہے؟

(۱۰) وہ کون سا سمندر ہے جس کا ساحل 'نطق' ہے؟ اور وہ کون سا 'گوہر' ہے جو اس کی گہرائیوں سے حاصل ہوتا ہے؟

---

[1] اسکی ایک غیر مؤرخہ طبع "مطبعہ شاخ فتح الکریم واقع بمبئی" سے شائع ہوئی ہے۔ (مترجم)

(۱۱) وہ کون سا جزو ہے جو کل سے زیادہ ہے؟ اس جزو کو پانے کا رستہ کون سا ہے؟

(۱۲) 'قدیم و محدث' کیونکر جدا ہوئے کہ یہ 'عالم' بن گیا اور وہ دوسرا خدا ہو گیا؟

(۱۳) 'مرد معنی' کا اس عبارت سے کیا مطلب ہے؟ جس میں 'چشم' و 'لب' کی طرف اشارہ ہے؟

وہ شخص جو "مقامات واحوال کے اندر ہے' زلف و خط و خال' سے کیا مراد لیتا ہے؟

(۱۴) 'شراب' 'شمع' 'شاہد' کے کیا معنی ہیں؟ خراباتی ہونا کیا دعوی ہے؟

(۱۵) 'بت' 'زنار' و 'ترسا' اس گفتار میں سب کفر ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو کہو پھر وہ کیا ہیں؟

کتاب میں نہ صرف ان سوالات کے جواب ہیں بلکہ چند ضمنی تمثیلیں حکایتیں اور انحرافات موضوع ہیں اور فی الجملہ تصوف کے بہترین رسالوں میں ہے جو اس وقت موجود ہیں۔ خصوصاً اسے عبدالرزاق الآہجی کی بلند پایہ شرح کے ساتھ ملا کر لیا جائے ÷

چونکہ پوری تصنیف انگریزی خواں کے لئے ونفیلڈ کے اعلے ترجمے میں قابل رسائی ہے۔ اس لئے ذیل کا مختصر نمونہ کفایت کریگا ۔

(سوال دهم)

اقتباس از گلشنِ راز

چه بحر است آنکه نطقش ساحل آمد ؟
ز قعر او چه گوهر حاصل آمد ؟

(جواب دهم)

یکی دریاست هستی نطق ساحل — صدف حرف جواہر دانشِ دل
بہر موجی ہزاران دُرّ شہوار — برون ریزد ز نقل و نص و اخبار
ہزاران موج خیزد ہر دم از وی — نگردد قطرهٔ ہرگز کم از وی
وجود علم از آن دریای ژرفست — غلاف دُرّ او از صوت و حرفست
معانی چون کند اینجا تنزّل — ضرورت باشد او را از تمثّل

تمثیل

شنیدم من که اندر ماهِ نیسان — صدف بالا رود از قعرِ عُمّان
ز شیب قعر بحر آید بر افراز — بروی بحر بنشیند دہن باز
بخاری مرتفع گردد ز دریا — فرو بارد بامرِ حق تعالے
چکد اندر دہانش قطرهٔ چند — شود بسته دہان او بصد بند
رود با قعر دریا بادلے پر — شود آن قطرهٔ باران یکی دُر
بقعر اندر شود غوّاص دریا — وزو آرد برون لولوی لالا
تن تو ساحل و ہستی چو دریاست — بخارش فیض و باران علم اسماست
خرد غواص آن بحرِ عظیم است — که او را بس جواہر در کلیم است
دل آمد علم را مانند یک ظرف — صدف بر علم دل صوتست تا حرف

نفس گردد روان چون برق لامع | رسد زو حرفہا در گوش سامع
صدف بشکن برون کن دُرِّ شہوار | بیفگن پوست مغز نغز بردار
لغت با اشتقاق و نحو با صرف | ہمی گردد ہمہ پیرامن حرف
ہر آنکو جملہ عمر خود درین کرد | بہرزہ صرف عُمر نازنین کرد

شیخ محمود شبستری کو ہم بہت سے فارسی شاعروں کی طرح پُر گوئی کا الزام نہیں دے سکتے۔ کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے گلشنِ راز اس کی واحد نظم ہے اور اس کی باقی تصنیفیں صرف دو ہیں۔ ایک حق الیقین اور دُوسری رسالہ شاہد۔ ان میں سابق الذکر خاصی عام ہے اور طہران سے دُوسرے صُوفی رسالوں کے ساتھ بچاپ سنگی شائع ہو چکی ہے۔ دوسری کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ مشہور تر رسالے کا پورا عنوان "حق الیقین فی معرفت رب العالمین" ہے۔ اس میں جنّت کے آٹھ دروازوں کے مطابق آٹھ ابواب ہیں۔ ان کے موضوعات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے[1]:-

اوّل :- در ظہور ذاتِ حق تعالےٰ و بیان معرفت ؛

دوم :- در ظہور صفاتِ او و بیان مقام علم ؛

سوم :- در مظاہر و مراتب و بیانِ مبدأ ؛

چہارم :- در وحدت و وجوبِ او ؛

---

[1] عنوانوں کی یہ فہرست مَیں نے حق الیقین کے مخطوطہ کتاب خانۂ جامعہ پنجاب سے نقل کی ہے ؛ (مترجم)

پنجم :- در ممکن الوجود و کثرت ؛

ششم :- در تعین و حرکۃ و تجدّد ذات ؛

ہفتم :- در حکمت تکلیف و جبر و قدر و (عمل[1]) ؛

ہشتم :- در معاد و بیان حشر و نشر و حقیقت ؛

ربیعی بوشنجی ربیعی بوشنجی جو ہرات کے سلطان فخر الدین کرت کا مدحگر تھا غیر معروف شاعر ہے لیکن اس کا ایک طویل تذکرہ فصیحی خوافی کی نادر اور پُر قیمت تصنیف مجمل میں در ذیل سنہ ۸۰۲ھ (سنہ ۱۳۹۹ء و سنہ ۱۴۰۰ء) ہوا ہے[2] - ربیعی شراب خوار تھا اور ادھر فخر الدین بھنگ نوشی میں مبتلا تھا - اس بات کی طرف ذیل کی دو رُباعیوں میں اشارہ کیا گیا ہے ؎

ہرگہ من از سبز[3] طرب ناک شوم   شائستۂ سبز خنگِ افلاک شوم
باسبز خطان سبز[4] خورم بر سبزہ   زان پیش کہ ہمچو سبزہ در خاک شوم

---

[1] نسخہ مذکورہ میں یہ لفظ محذوف ہے (مترجم) ؛ [2] میں نے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے سابقاً کرنل ریورٹی (Col. Raverty) کی ملک تھا اور انکی وفات پر مؤتمنانِ سرمایۂ یادگار گب" نے خرید لیا - ایک دوسرا نسخہ جو اب میری ملکیت میں ہے آنجہانی سر البرٹ ہاؤٹم شنڈلر کے ذاتی کتابخانے سے آیا ہے - ایک تیسرا نسخہ سینٹ پیٹرز برگ میں موجود ہے - بدقسمتی سے نسخۂ ریورٹی میں سنین ۷۱۸ھ تا ۸۴۰ھ (۱۳۱۸ء تا ۱۴۳۶ء) کے حالات کا وسیع رخنہ ہے ؛

[3] بھنگ ، فارسی میں اسکے دو عرف ہیں جن میں اسکے ہرے رنگ کی طرف اشارہ ہے - "آقای سید" اور "طوطیِ سبز" (بھنگ کو آقای سید اس نسبت سے کہتے ہیں کہ آج سے دس پندرہ سال پہلے تک ایران میں تمام سادات سبز عمامہ باندھتے تھے ، مترجم)

میخوارہ اگر غنی بود عور شود
وز عربدہ اش جہان پُر از شور شود
در حقّۂ لعل ازان زمرّد ریزم[1]
تا دیدۂ افعیِ غمم کور شود

ربیعی جب قید خانے میں تھا تو اُس نے ایک نظم بعنوان 'کارنامہ' اور دُوسری نظمیں لکھیں جن میں بادشاہ کے رحم کو ابھارنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مجملِ فصیحی میں ان نظموں کے کوئی ستّر اشعار منقول ہیں۔ ان میں سے ذیل کے اشعار نمونے کے طور پر دئے جاتے ہیں ؎

(از کارنامہ)

شاہِ جہان خسرو روئے زمین	وارثِ جمشید مُلک فخرِ دین
داشت یکی بندِ گراں ساختہ	ز آہن و فولاد بپرداختہ
کرد مرا بستہ بدان بندپای	سرِ مکش از خواہش گیہان خدای
آن دگران را ہمہ آزاد کرد	چرخ فلک بین کہ چہ بیداد کرد
من شدہ پس بستۂ بندِ گراں	راست چو کاوس بمازندران
بارِ غمی بر دل و بر پای بند	با ہمہ غم ہمنفسم تا بچند
جان من از صحبتشان در غریو	بلعجبی چند نہ مردم نہ دیو
یک دل ازیشان بجہان شاد نہ	چون دلشان آہن و پولاد نہ

---

[1] اس میں شاید بھنگ کا دھواں پینے کی طرف اشارہ ہے۔ اس لحاظ سے بھنگ کے لئے زمرّد کا استعارہ لایا ہے اور چلم کے لئے حقّۂ لعل کا!

دیو یکی مسخره در گردشان — خرس یکی لت خورہ شاگردشان

عادتشان بستن و آویختن — خصلتشان کشتن و خون ریختن

کار همه عُمر برون کوب و زور — روی همه سال بخیسار و غور[1]

کوه روانند نبردِ آزمای — کوه روانند بصنع خدای

ده تن ازین قوم نگهبانِ من — وای برین حالِ پریشانِ من

ایک اَوْر قصیدے میں جو قید ہی کے زمانے میں لکھا گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس وقت میری عمر اکتیس سال ہو چکی ہے۔ اور اس مدت میں سے سترہ سال میں نے بادشاہ کی خدمت میں بسر کئے۔ اور چودہ حرمین میں سے

سی و یک رفت ز عمرم غرض از حرمتتان
هفده در خدمتِ تو چار دہ در بیتِ حرم

اسی رنگ کی ایک اَوْر نظم جو انہی حالات میں لکھی گئی (اور مثنوی ہے) مجمل میں درج ہے۔ لیکن شاعر کی تمام فریادیں لاحاصل رہیں۔ اور بدنصیب اس قید خانے ہی میں خدا جانے کس حال میں راہیٔ عدم ہُوا!

همام الدّین تبریزی همام الدین اس دور کا ایک اَوْر شاعر ہے جو مختصر ذکر کا مستحق ہے۔ مجمل کی رُو سے وہ ۶۱۴ھ

---

[1] بخیسار، خراسان میں ایک قلعہ ہے۔ ہرات سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے (یاقوت جلد دوم ص۵۰۷) غور افغانستان کا ایک پہاڑی صوبہ ہے۔ شاید سابق میں یہ جگہیں تعزیری بستیوں کے طور پر نظربندی وغیرہ کیلئے استعمال ہوتی تھیں جیسے آج کل کلاتِ نادری؛

(سنہ ۱۳۱۴ء) میں ۱۱۶ سال کی عمر پاکر مرا۔ اس کے علاوہ ایک مشہور حکایت[1] اسے شیخ سعدی (متوفی سنہ ۶۹۰ھ مطابق سنہ ۱۲۹۱ء) سے مرتبط کرتی ہے جس کیساتھ اس کا ایک لفظی مجادلہ[2] ہوُا۔ جو چنداں شائستہ نہ تھا۔ اس میں اسے بُری طرح زک ہوئی۔ اس کی زندگی کے باقی حالات مجھے کچھ معلوم نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ صاحب دیوان کے شاگردوں میں سے تھا[3]۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے کلام پر شیخ سعدی کا اثر بہت ہوُا۔ ذیل کے نمونے ہفت اقلیم میں سے لئے گئے ہیں ؎

در آن نفس کہ بمیرم در آرزوی تو باشم
بدان امید دہم جان کہ خاکِ کوی تو باشم
بوقتِ صبحِ قیامت چو سر ز خواب برآرم
بآرزوی تو خیزم بجست و جوی تو باشم
حدیث روضہ نگویم گل بہشت نبویم
بسوی حور نپویم در آرزوی تو باشم

---

[1] دیکھو سر گور آؤسلے کی کتاب "تذکرات شعرائے فارسی" Sir Gore Ouseleys' Biographical Notices of Persian Poets. (لندن سنہ ۱۸۴۶ء) ص ۱۴ تا ۱۵؛

[2] اردو خواں اصحاب یہ حکایت شعر العجم میں دیکھ سکتے ہیں (جلد دوم ص ۵۲ بعد) نیز اصل فارسی دولت شاہ میں (ص ۲۰۳ ببعد) (مترجم)؛

[3] ملاحظہ ہو تاریخ جہانگشای جوینی مرتبہ میرزا محمد قزوینی (سلسلہ یادگار گب ۱۶ جلد اوّل) جلد اوّل میں انگریزی مقدمہ صفحہ ی ج؛

ولہٗ

وداعِ یار و دیارم چو بگذرد بخیال
شود منازلم از آبِ دیده مالا مال
فراق را نفسی چون هزار سال بود
ببین کہ چون گذرد روز و ہفتہ و مہ و سال

ولہٗ

قیامت دیدم آن روزِ جُدائی   چہ بودی گر نبودی آشنائی
غنیمت دان حضورِ دوستان را   کہ دوران می نماید بے وفائی

ولہٗ ایضاً

شد دوش بر یار حکایت آغاز   از ہر بُنِ مویم بر آمد آواز
شب رفت حدیثِ ما بپایان نرسید   شب راچہ گنہ قصۂ ما بود دراز

اس دور کے دُوسرے شاعر اگر گنجائش ہو تو اس دور کے بہت سے اور شاعروں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً افضل کاشی، اثیر اومانی، سیف الدین اسفرنگی، رفیع الدین ابہری فرید احول اور نزاری قہستانی۔ البتہ ان میں آخر الذکر کے متعلق چند الفاظ

نزاری قہستانی کہنے ضروری ہیں۔ کیونکہ ضمیمۂ فہرستِ مخطوطاتِ فارسی کی اشاعت کے بعد عجائب خانۂ برطانوی کیلئے اس کے کلّیات کا ایک نسخہ حاصل کیا گیا ہے[1]۔ خزان ۱۹۱۳ء میں میرے

---

[1] Or, 7901.

لئے ایک ہندوستانی کاتب مولوی اسمٰعیل علی نے اس نسخے کی ایک نقل تیار کی۔ اس نسخے کے حاصل کرنے کا میں اس لئے خواہشمند تھا کہ مجھے شدید احتمال تھا کہ نزاری فرقۂ اسمٰعیلیہ (یا ملاحدہ یا حشیشیین) سے تعلق رکھتا ہے اور مجھے امید تھی کہ شاید اس کے کلام سے اس کا ثبوت مل جائے اور ممکن ہے کہ یہ طبّاعی کا ایک ایسا نمونہ ہم پر منکشف کرے کہ اس کا مقابلہ ناصرِ خسرو سے کیا جا سکے جو الی الآن اسمٰعیلیوں کا واحد بلند پایہ شاعر ہے۔ جیسے ہم جانتے ہیں۔ نزاری کے اسمٰعیلی ہونے کا اس کے تخلص اور وطن سے قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے وثوق سے یہ بات لکھی ہے یا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آٹھویں فاطمی خلیفہ المستنصر (۱۰۳۵ء تا ۱۰۹۴ء) کی وفات پر اس کے دو بیٹوں المستعلی اور نزار[2] کے درمیان جانشینی کے لئے جنگ ہوئی۔ نزار نے اس میں تخت اور جان دونوں سے ہاتھ دھوئے لیکن مشرقی یا ایرانی اسمٰعیلی (جن میں ان ہی کی شامی شاخ بھی شامل ہے) پھر بھی برابر اسے منصبِ امامت کا جائز وارث سمجھتے رہے۔ بلا شبہ اسی نام کی نسبت سے شاعر نے نزاری تخلّص کیا۔ کیونکہ دوسرا قیاس کہ یہ تخلص فارسی صنعت 'نزار' (دبلا پتلا) سے ماخوذ ہے قابل قبول نہیں۔ علاوہ بر آں قہستان حشیشین کا ایک بھاری مرکز

---

[1] راقم کی کتاب "تاریخ ادبیاتِ ایران" جلد دوم کے صفحات ۲۱۷ تا ۲۴۷ ملاحظہ ہوں؛ [2] تاریخ ادبیاتِ ایران۔ جلد دوم ص ۱۹۹، ص ۲۰۱، ص ۲۰۳، ص ۲۰۴، ص ۲۰۶ وغیرہ؛

قوت تھا[1]۔ خصوصاً اس میں قاین اور بیرجند کے شہر جن کی طرف وہ اپنی ایک نظم میں خاص طور پر اشارہ کرتا ہے کہتا ہے ؎

نشستہ بر سرِ گنجینۂ خویش   اگر در بیرجندم ور بقاین
نزاری بعد ازین آزاد و فارغ   توئی و گنج فقر و کُنجِ ایمن

نزاری کے دیوان کا مذکورہ بالا نسخہ صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزلیں گو کافی جاندار ہیں لیکن اکثر و بیشتر حسبِ معمول اسی رندانہ طرز کی ہیں۔ اور شاعر کے مذہبی خیالات یا عام حالات کا کچھ پتہ نہیں دیتیں۔ اور دیتی ہیں تو بہت کم۔ اس قسم کے اظہار عموماً قصیدوں اور مثنویوں میں ملا کرتے ہیں۔ اور بدقسمتی سے نسخۂ زیر بحث میں ان اصناف کی نمائندگی نہیں ہوئی۔ بقول شپرینگر[2] نزاری ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں فوت ہوا اور دو مثنویاں چھوڑ مرا۔ جن میں ایک کے متعلق جس کا عنوان دُستور نامہ ہے وہ کہتا ہے کہ "بہت ظریفانہ اور پر لطف ہے"۔ لیکن میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔ نزاری کی مصنفات کا مزید مطالعہ کریں تو غالباً محنت وصول ہوگی ؛

سلطان وَلَد اور اُس کا رباب نامہ آخر میں ضروری ہے کہ سلطان ولد پر چند سطور لکھی جائیں۔ یہ مولانائے بزرگ جلال الدین رُومی کا فرزند تھا۔ اور آخر میں جاکر اُن کا رُوحانی جانشین

---

[1] دیکھو گائی لوسٹرینج کی "ممالک خلافتِ شرقیہ" ص ۵-۳۵۴ ؛

[2] Sprenger "فہرست کتاب خانۂ شاہانِ اودھ" Catalogue of the Library of the Kings of Oudh. جلد اول ص ۵۲۴ ؛

بھی ہوا۔ روم میں لارَندَ (آجکل کا قَرمان) کے مقام پر ۶۲۳ھ (۱۲۲۶ء) میں پیدا ہوا۔ جب اسکے والد کی عمر ابھی کل اُنّیس برس تھی۔ اس کا اصل نام بہاء الدین احمد تھا۔ اس کی مشہور ترین تصنیف ایک مثنوی ہے جس کا عنوان رباب نامہ ہے۔ گو فارسی میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں ۱۵۶ اشعر تُرکی زبان میں ہیں جو بالفاظِ گِب "مغربی ترکی شاعری کا ہمارے پاس سب سے اہم ابتدائی نمونہ ہے۔ ان اشعار نے جن کی زبان اب متروک الاستعمال ہے فون[1] ہیمر، وکرہاوزر[2]، برن[3] ہاؤر، سالمان[4] اور ریڈلوف[5] کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائی ہے۔ اور گِب[6] نے اپنی جامع کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ" کی جلد اوّل میں ان پر اور اُن کے مصنّف پر سیر حاصل بحث کی ہے (ص ۱۴۹ تا ۱۶۳) وہ لکھتا ہے (مقام مذکور ص ۱۵۶-۷) "سلطان وَلَد کو نہ صرف وہ اعزاز سزا ہے۔ جو ہر کارِ خیر میں سبقت کرنیوالے کا حق ہوا کرتا ہے، بلکہ وہ اس آفرین کا بھی مستحق ہے جو بجا طور پر ایک دشوار مہم کو کامیابی کیساتھ سرانجام دینے والوں کو دی جاتی ہے۔ ایک قوم کی شاعری کا سنگِ بُنیاد

---

۱ Von Hammer ۲ Wickerhauser ۳ Bernhauer

۴ Salumann حوالوں کیلئے دیکھو گب کی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ" جلد اول ص ۱۵۷ ذیلی حواشی، ریڈلوف کے مقالے کا جس کا ذکر گب نے نہیں کیا عنوان یہ ہے "پُرانے پراکرتوں پر ایک نظر؛ حصہ اوّل: رباب نامے میں سلجوقی (یعنی ترکی) اشعار" سینٹ پیٹرز برگ سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا؛

۵ Radloff

۶ History of the Otteman Poetry

رکھنا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ہر شخص فخر کر سکتا ہے"۔ غرض گب ایسا ترکی شاعری کا اتنا بڑا مدّاح بھی اس اعتراف پر مجبور ہے کہ یہ شاعری اپنی ابتدا کے لئے ایک ایرانی کی مرہونِ منّت ہے۔ اور فی الواقع ایک طرح سے فارسی شاعری کی ایک شاخ ہے۔ اور ساڑھے پانچ صدیوں (۱۳۰۰ء تا ۱۸۵۰ء) تک اس کی رہین منّت رہی۔ اس لحاظ سے کہ فارسی شاعری اس زمانے میں اس کے لئے منبعِ افکار بنی رہی۔ بہر حال عثمانی سلطنت اور ترکی ادب دونوں کا طلوع اس دور سے تعلّق رکھتا ہے جس پر ہم نے موجودہ باب اور سابقہ ابواب میں بحث کی ہے۔ لہٰذا لازمی ہوگا کہ آئندہ ابواب میں ان دونوں کے حوالے زیادہ کثرت سے دِئے جائیں ؎

دفتر دوم

تیمور لنگ کی ولادت سے
وفات تک

(۷۳۶ھ تا ۸۰۷ھ ۔ ۱۳۳۵ء تا ۱۴۰۵ء)

بابِ چہارم

عہدِ تیموری

زیرِ نظر دور کی تعیین ابوسعید کی وفات ہوئی (۱۳ر ربیع الثانی ۷۳۶ھ مطابق ۳۰ر نومبر ۱۳۳۵ء) تو ایران میں مغولوں کی طاقت عملاً اختتام کو پہنچی۔ کوئی آٹھ مہینے گزرے تھے (۲۵ر شعبان = ۸ر اپریل ۱۳۳۶ء) کہ تیمور معروف بہ لنگ نے عالمِ کون و فساد میں قدم رکھا۔ یہ بھی ایشیائے غربی و وسطی کے مسلمانوں کے حق میں ایسی ہی آفت بن کر آیا تھا جیسی کہ چنگیز خانی بلا تھی۔ ادھر ایران میں مغولوں کے آخری ذی اقتدار بادشاہ کی موت، ادھر تاتاری مار دھاڑ کو پھر سے تنظیم دینے والے کی پیدائش، ان دو واقعات کی مقارنت کی طرف صاحبِ مطلع السعدین نے توجہ دلائی ہے[۱]۔ پس جس ستر برس کے زمانے کا ہم مطالعہ کرنیوالے ہیں یہ مقارنت اپنی تاریخ کو اس زمانے کا پُرسہولت نقطۂ آغاز ٹھہراتی ہے۔ یہ زمانہ باوصف اس طوائف الملوکی کے جس کیساتھ یہ

---

[۱] ملاحظہ ہو ریو کی فہرست مخطوطاتِ فارسی ص ۱۸۲؛

شروع ہؤا۔ اور اس خونریزی کے جس کیساتھ ختم ہؤا اپنے پیدا کردہ شاعروں اور قلم پردازوں کے معیار و مقدار دونوں میں یکساں طور پر قابلِ ذکر ہے

اس دور کے ممتاز اہلِ قلم

شاعروں میں سلمان ساوجی، خواجو کرمانی، عبید زاکانی، عمادِ کرمانی۔ عصّارِ تبریزی جلال عضدی، جلال طبیب، کمالِ خجندی، مغربی، بُسحاق اور آخرین از روئے ذکر لیکن اوّلین از روئے فکر شاعرِ بے بدل خواجہ حافظ شیرازی تھے نثر نگاروں میں تیمور کے وقائع نویس نظامؔ شامی اور شرف الدین علی یزدی تھے۔ اور آلِ مظفّر (جو تیمور کے ہاتھوں فنا ہوئی) کا مؤرّخ معین الدین یزدی تھا۔ اور ایسوں کا تو ذکر ہی کیا جو ایرانی تھے لیکن اُنھوں نے بیشتر عربی میں لکھا۔ مثلاً سیّدِ شریف جرجانی، سعد الدین تفتازانی اور عضد الدین الایجی؛

ایران پر تیمور کے تین حملے

ایران پر تیمور کا پہلا حملہ ۱۳۸۰ء میں ہؤا جب اس نے خراسان۔ سیستان اور ماژندران کو فتح کیا۔ دُوسرا حملہ ۵-۱۳۸۴ء میں ہؤا۔ جب اس نے پھر ماژندران پر چڑھائی کی اپنے اقدامات کو آذربائیجان، عراقِ عجم۔ اور گرجستان تک بڑھایا اور تسخیرِ شیراز اور اصفہان میں ستّر ہزار بندگانِ خدا کے قتلِ عام پر لاکر مہم کو ختم کیا۔ تیسرا اور آخری حملہ ۱۳۹۲ء میں کیا جب اس نے دوبارہ فارس کو زیر کیا۔ اور دودمانِ مظفّری کا استیصال کیا۔ اس سے پہلے (۱۳۸۱ء میں) وہ سبزوار کے سربداروں اور

اور ۱۳۸۹ء میں ہرات کے کُرتوں کو فنا کر چکا تھا۔ اس پینتالیس سال کے زمانے میں جو تیمور کی پیدائش اور ابو سعید کی موت سے شروع ہُوا (۱۳۳۵ء تا ۱۳۸۰ء) قدرت نے ایران کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اور

چھوٹے چھوٹے خاندان جنہیں تیمور نے تباہ کیا

کل ملک چار پانچ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں بٹ گیا۔ ان میں مظفری جو فارس، عراق عجم اور کرمان پر حکمران تھے سب سے اہم تھے۔ ان کے بعد بغداد اور آذربائیجان کے جلائر (یا ایلخانی) اور آخر میں سبزوار کے سربدار اور ہرات کے کرت کہ دونوں شمال مشرق میں تھے، ان سلسلہ ہائے سلاطین کی تاریخ بڑی پیچ در پیچ ہے اور اُنکے تفصیلی مطالعہ سے شاید ہی کچھ حاصل ہو۔ اور پھر جن مملکتوں میں انکا تسلط چلتا تھا۔ ان کی کوئی تعیین نہ تھی۔ ان کی سرحدیں اگر سرے سے کچھ تھیں تو مسلسل انتقال پذیر تھیں۔ اور اکثر بلکہ عموماً ایک ہی گھرانے کے افراد مں باہم جنگ رہتی تھی۔ اور ان کا ورثہ حریف بھائیوں اور عمزادوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تقسیم ہو جاتا تھا۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ

ایرانی ادب ابتری کے ایّام میں سب سے زیادہ فروغ پذیر رہا ہے

بالکل یہی شورش اور تفریقِ اقتدار کے زمانے وہ ہیں جب ایرانی ادب سب سے زیادہ فروغ پذیر رہا ہے۔ چنانچہ جہاں زیر بحث پینتالیس سال کے قلیل زمانے میں کوئی درجن بھر چوٹی کے شاعر موجود تھے۔ وہاں صفوی دور کے کل

۲۳۴ برس (۱۵۰۲ء تا ۱۷۳۶ء) میں گنئے تو بمشکل اس سے نصف تعداد ایسے شاعروں کی پیدا ہوئی جو مقامی شہرت سے آگے بڑھے حالانکہ یہ وہ دن تھے کہ ایران اپنے جبروت، شکوہ وجلال اور استحکام کے اس درجے پر پہنچا جس کا جواب جدید زمانوں نے پیش نہیں کیا۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ وہاں کی صنعتیں خوب رنگ لائی تھیں اور علمِ دینیات اپنے اوجِ کمال پر پہنچا تھا۔ اس تعجب خیز حقیقت پر مزید بحث ہوگی جب ہم صفوی دور کا تذکرہ کرینگے۔ لیکن اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ متعدد چھوٹے چھوٹے درباروں کا وجود جو باہم رقیب تھے۔ ہر ایک کی یہ کوشش کہ نیکنامی میں دوسرے سے آگے بڑھ جائے۔ یہ حالات شعرا اور دوسرے اہلِ قلم کے حوصلوں کے لئے بیحد مساعد ہوتے تھے۔ کہ یہ لوگ اگر ایک شہر میں دل برداشتہ یا بے قدر ہوتے تو آسانی سے انہیں کوئی اور جگہ مل جاتی جہاں ان کی زیادہ اچھی آؤ بھگت ہوتی تھی ؛

تیمور کا بیان چھیڑنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ایران کے ان چھوٹے چھوٹے خاندانوں کا کچھ حال پیش کریں جو نصف صدی کے ان ایامِ فترت میں برسرِ حکومت تھے۔ ان میں مظفری سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتے تھے۔ اس لئے کہ حیثیت اور وسعتِ قلمرو میں اوروں پر فائق تھے اور فاضل شعرا، خصوصاً خواجہ حافظ شیرازی اُن کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ اُنکے بعد ہم سلاطینِ جلائر یا ایلخانی کو رکھ سکتے ہیں کہ براہِ راست

آلِ مظفر

خاندانِ جلائر یا ایلخانی

مغولی اقتدار کی تلچھٹ کے وارث ہونے کی حیثیت سے بغداد اور تبریز پر سلطنت کرتے تھے۔ اور اسی طرح ان کے سایۂ سرپرستی میں بھی بہت سے ممتاز شعراء تربیت پاتے تھے۔

سلسلۂ سربداران

سبزوار کے سربداروں (یا سربدالوں) کا تسلّط معلوم ہوتا ہے کہ بڑے محدود علاقے پر تھا اور (جیسا کہ ان کے نام سے مفہوم ہے) درحقیقت کامیاب قزاقوں اور رہزنوں سے ذرا ہی بہتر تھے۔ اور ہرات کے کُرت گو زیادہ متمدّن تھے علم و

خاندانِ کُرت

فضل کے زیادہ بڑے مربّی تھے۔ اور زیادہ پائدار تھے (کہ انہوں نے ۱۴۴ سال یعنی ۱۲۴۵ء تا ۱۳۸۹ء حکومت کی) لیکن وُہ ایسے خطّے میں تھے جو آج ایران میں شامل نہیں ہے بلکہ افغانستان کا حصّہ ہے اور خود بھی یہ لوگ شاید نسل کے افغانی یا نیم افغانی تھے۔ ان سلطنتوں میں ہر ایک کا مختصر حال اب یہاں دیا جانا چاہئے۔

آلِ مظفّر

مظفّریوں کی تاریخ کے مُستند مآخذ

روضۃ الصّفا وغیرہ عمومی تاریخوں کے علاوہ جن سے فارسی کا ہر متعلّم واقف ہے ہمارے پاس آلِ مظفر کی ایک جداگانہ تاریخ موجود ہے۔ یہ ایک معاصر فاضل معین الدین یزدی کی تصنیف ہے جو کسی قدر

شہرت کا مالک ہے ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں کرمان کی ایک درس گاہ کا استاد مقرر ہوا۔ یہ تاریخ صرف قلمی نسخے کی حالت میں موجود ہے[1] مجھے ایک پرانے نسخے میں اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے جو کیمبرج کے دار الآثارِ فٹز ولیم[2] کی مِلک ہے اور اس کی تاریخ کتابت ۷۷۸ھ (۷-۱۳۷۶ء) ہے[3]۔ جنوری ۱۹۱۷ء سے مجھے اسکے دو اَور نسخے آنجہانی سر البرٹ ہاوٹم شنڈلر کے ذاتی کتاب خانے سے میسر آئے ہیں جن سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ ان میں ایک مصنّف کے حینِ حیات کا لکھا ہوا ہے۔ اس تاریخ کے اندراجات ۷۶۷ھ (۶-۱۳۶۵ء) تک آتے ہیں۔ لہٰذا اس خاندان کے آخری تیس سال اس میں قلم انداز ہیں علاوہ بر آں ایک تصنّع اور طمطراق کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ تاریخ اتنی ادق تھی کہ محمود کُتبی ایک شخص نے ۸۲۳ھ (۱۴۲۰ء) میں جبکہ وہ تاریخِ گزیدہ کے استنساخ میں مشغول تھا یہی بہتر سمجھا کہ خاندانِ مظفری کی ایک جداگانہ روداد خود اپنے قلم سے اضافہ کر دے[4]۔ یہ روداد تاریخ گزیدہ کے ایک پرانے نسخے کی طبعِ عکسی میں شامل ہے جو سلسلہ یادگار گب میں شائع ہوئی ہے۔ (سلسلہ ۱۴، جلد اوّل، ص ۶۱۳ تا ص ۷۵۵[5])، یہ بابِ ملحق اس

---

[1] رک بہ فہرست ریو، ص ۱۶۸، نیز ضمیمۂ فہرست ص ۳۳؛ [2] Fitzwilliam Museum

[3] فرینک میکلین کا مجموعہ کتب Frank McClean Collection

[4] تاریخ گزیدہ طبع عکسی سلسلۂ یادگارِ گب ص ۴-۶۱۳، (مترجم)

[5] نیز دیکھو فہرست ریو ص ۸۲؛

خاندان کی تاریخ ان کے اختتام تک پہنچاتا ہے یعنی رجب ۷۹۵ھ (مئی ۱۳۹۳ء) تک، ذیل میں خاندان کا جو مختصر حال دیا جاتا ہے۔ اس کی ترتیب میں خاص طور پر روداد مذکور اور اس کے علاوہ اس روداد سے استفادہ کیا گیا ہے جو حاجی میرزا حسن کے جدید العہد "فارس نامۂ ناصری میں شامل ہے (ص ۴۹ تا ص ۶۶) لیکن میں ان کی تاریخ کے ایک اعلیٰ اور نہایت قابلِ مطالعہ خاکے کی ممنونیت کا اعتراف بھی کروں گا۔ جو مس گرٹروڈ لوتھین بیل کی کتاب "انتخاب دیوانِ[2] حافظ" کے مقدمے میں درج ہے ؛

مظفری خاندان کا نسب آلِ مظفر کے اسلاف کہا جاتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے ابتدائی ایام میں عرب سے ایران آئے۔ اور خراسان میں خواف کے قریب سکونت کی۔ مغولی یورش کے زمانے میں سلسلے کے پہلے فرمان فرما مبارز الدین محمد کے دادا امیر غیاث الدین حاجی خراسانی نے یہاں سے یزد کو ہجرت کی۔ اس کے تین بیٹوں میں سے ابوبکر تین سو سوار ساتھ لیکر ہلاکو کی مہم بغداد میں اس کا ہمرکاب ہؤا تھا۔ لیکن بعد کو مصر میں بنو خفاجہ کے عربوں کے ہاتھوں ہلاک ہؤا۔ اس کا بھائی محمد والئ بغداد کی نیابت پر اس کا

---

[1] اس کی سنگی طبع طہران سے ۱۳۱۳ھ (۹۶-۱۸۹۵ء) میں شائع ہوئی ؛

[2] Lowthian Bell's "Poems from the Diwan of Hafiz."

[3] لندن : ہائن من Heinemann ۱۸۹۷ء ؛

جانشین ہوا لیکن بے اولاد مرگیا۔ تیسرا فرزند جلال الدین منصور یزد کے پاس میبد میں مقیم تھا۔ وہ بھی اسی طرح تین بیٹے چھوڑ مرا۔ شرف الدین مظفر، زین الدین علی اور مبارز الدین محمد۔ ان میں پہلے کے متعلق کہتے ہیں کہ اسے خواب میں اس فضیلت و منزلت کی بشارت ہوئی جو اس خاندان کے نصیبے میں لکھی تھی اور ابھی نوجوان تھا کہ اس نے ڈاکوؤں کے ایک جتھے کو پامال کر کے اپنے جوہر دکھائے۔ یہ لوگ فارس سے آئے تھے۔ اور اس کے صوبے میں لوٹ مار کرتے تھے۔ ۶۸۵ھ (۱۲۸۶ء) میں وہ کرمان پہنچا اور وہاں سورغتمش قراختائی کی خدمت میں داخل ہوا۔ آگے چل کر اس نے چار مغولی تاجداروں یعنی ارغون، گیخاتو، غازان اور اولجائتو خدابندہ کی ملازمت کی۔ ان میں اخیر الذکر کے حضور میں وہ ۷۱۱ھ (۱۳۱۱ء) میں خانقین کے مقام پر باریاب ہوا۔ اور اس شاہ نے اسے زیادہ وسیع علاقے کی ولایت عطا کی۔ ۷۱۳ھ (۱۳۱۴ء) میں اس نے قضا کی اور اپنے بیٹے مبارز الدین کو قائم مقام چھوڑ مرا کہ ابھی تیرہ سال کا لڑکا ہی تھا۔ اولجائتو (متوفی ۱۶ دسمبر ۱۳۱۶ء) نے اسے باپ کے مناصب پر برقرار رکھا۔ ۲۹ سال کی عمر میں اس نے سرغتمش کی پوتی بانوجہاں سے اپنی دوسری شادی کی۔ اس کے پانچ بیٹے ہوئے۔ شرف الدین مظفر (متولد ۷۲۵ھ = ۱۳۲۵ء، ۷۵۴ھ = ۱۳۵۳ء) میں ایک زخم کے سبب مرا؛ شاہ شجاع (متولد ۷۳۳ھ = ۱۳۳۲ء)؛ قطب الدین محمود (متولد ۷۳۷ھ = ۱۳۳۶ء)؛ اور دو اور

جن کے نام احمد اور بایزید ہیں ؂

مبارز الدّین محمّد مبارز الدین محمد عموماً سلسلۂ مظفری کا پہلا بادشاہ گنا جاتا ہے۔ جن کی مجموعی مدّتِ حکومت اس کے سنِ جلوس ۱۳۱۴ عیسوی سے ۱۳۹۳ء تک اسّی سال ہوتی ہے جبکہ تیمور نے اس خاندان کا خاتمہ کیا۔ اس کی اصلی ریاست جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں یزد کے پاس میبد کی مختصر بستی تھی۔ لیکن ۱۳۱۹ء میں یزد بھی اس کے حلقۂ اختیار میں آگیا۔ ۱۳۴۰ء میں کرمان بھی اس کے ہاتھ لگا۔ گو وہاں کے سابق حکمران قطب الدین نے اعانت کے لئے ہرات کے کرت بادشاہو کا دامن پکڑا اور جان توڑ مقابلہ کیا۔ ۱۳۵۳ء میں ایک اَور بھی لمبی چپقلش کے بعد ابو اسحٰق انجو سے فارس کا صوبہ ہتھیانے میں کامیاب ہوا۔ اس کا صدر مقام شیراز تھا۔ ابو اسحٰق کا خورد سال بیٹا علی سہل رفسنجان میں شاہ شجاع کے ہاتھوں گرفتار ہو کر بے رحمی سے مارا گیا۔ مبارز الدین کی اولین کارروائیوں میں ایک یہ تھی کہ عیش دوست شیرازیوں میں شراب خواری اور دوسری بدچلنیاں جو عام تھیں اُنکے انسداد کے لئے اُس نے شدید قانون صادر کئے۔ اس سلسلے میں اس کے بیٹے شاہ شجاع نے ذیل کی رُباعی کہی ؂

در مجلسِ دہر سازِ مستی بشکست   نے چنگ نہ قانون و نہ دف بردست
رنداں ہمہ ترکِ مے پرستی کردند   جز محتسبِ شہر کہ بے مے بشکست

کہا نہیں جا سکتا کہ یہ اسی نامقبول اقدام کا نتیجہ تھا یا اَور کوئی بات

تھی۔ لیکن اگلے سال یعنی ۱۳۵۴ء میں مظفریوں کے خلاف باغیوں نے سر اٹھاکر شیراز پر قبضہ جمایا لیکن جلد ہی ان سے واپس لے لیا گیا۔ انہی دنوں مبارز الدین نے المعتضد[1] کی بیعت کا اعلان کیا جو محض نام کا خلیفہ تھا اور خطبہ اسکے نام کا پڑھوایا۔ ۱۳۵۷ء میں اصفہان پر چڑھائی ہوئی اور انجام کار یہ اس کے تصرف میں آگیا۔ اس کا حکمران شیخ ابو اسحٰق انجو گرفتار ہؤا۔

ابُو اسحٰق انجو مارا جاتا ہے

اور شیراز لایا گیا۔ وہاں مبارز الدین کے حسب فرمان امیر قطب الدین ابن سید امیر حاجی ضرّاب نے اس کو مار ڈالا۔ کہ اس کے باپ نے ابو اسحٰق کے حکم سے ہلاکت کا مُنہ دیکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ مرنے سے پہلے ابو اسحٰق ذیل کی دو رُباعیاں پڑھتا تھا ؎

افسوس کہ مرغ عمر را دانہ نماند و امید بہیچ خویش و بیگانہ نماند
دردا و دریغا کہ درین مُدّتِ عُمر از ہر چہ بگفتیم جز افسانہ نماند

باچرخ ستیزہ کار مستیز و برو با گردشِ دہر در میاویز و برو
یک کاسۂ زہر ست کہ مرگش خوانند خوش درکش و جُرعہ بر جہان ریز و برو

---

[1] ابو الفتح ابو بکر المعتضد ابن المستکفی، عباسی خاندان کے برائے نام خلفاء میں سے تھا۔ جنہوں نے بغداد کی بربادی سے عثمانیوں کی فتح مصر تک (۱۲۶۲ء تا ۱۵۱۷ء) مصر میں محض نام کی حکومت کی۔ المعتضد ۷۵۳ھ (۳-۱۳۵۲ء) میں اپنے بھائی الحاکم بامر اللہ کا جانشین ہؤا۔ اور ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) میں فوت ہؤا۔ دیکھو السیوطی کی تاریخ الخلفاء (طبع نساؤلیس کلکتہ ۱۸۵۷ء)، ص ۵۱۶؎

اصفہان فتح کر کے مبارز الدین نے تبریز پر فوج کشی کی اخی جوق کے لشکروں کیساتھ دو معرکے لڑنے کے بعد شہر پہ قبضہ کیا۔ مبارز کے بیٹوں نے نخجوان تک اخی جوق کا پیچھا کیا۔ لیکن اس کی قسمت اس کی دشمن نکلی۔ محمود اور شجاع اسکے بیٹوں کو اپنی جانب اس کی نیت سے کھٹکا ہؤا۔ یہ فوج سمیت سب واپس آ رہے تھے کہ اصفہان پہنچ کر انہوں نے اس کو پکڑ کر اندھا کر دیا۔ پہلے اسے قلعۂ طبرک میں قید رکھا۔ پھر فارس کے قلعۂ سفید میں۔ وہاں وہ قلعہ دار کو اپنا ہوا خواہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ بالآخر سرکش بھائیوں کے ساتھ اسکے ملاپ کی کچھ صورت پیدا ہو گئی لیکن زیادہ دیر نبھ نہ سکی۔ اور آخر کو مبارز الدین ربیع الاوّل (دسمبر ۱۳۶۳ء) کے مہینے میں ۶۵ سال کی عمر پا کر بام کے قید خانے میں زندگی کی قید سے آزاد ہؤا[1]۔

---

[1] اس کی سنگدلی کا یہ عالم تھا۔ کہ اس کے ایک مقرب ندیم لطف اللہ ابن صدر الدین عراقی کے قول (منقول در فارس نامۂ ناصری) کے مطابق جب قرآنِ مجید کی تلاوت میں مشغول ہوتا اور فیصلے کے لئے کوئی مجرم پیش کیا جاتا تو اکثر اس کا سر قلم کرنے کے لئے قرآن کو ایک طرف رکھ دیتا اور اس کے بعد دوبارہ نہایت سکونِ قلب کیساتھ تلاوت میں مشغول ہو جاتا۔

شاہ شجاع

(۷۵۹ھ تا ۷۸۶ھ = ۱۳۵۷ء تا ۱۳۸۴ء)

مبارز الدین کے بعد اس کے بیٹے شاہ شجاع نے گدی سنبھالی۔

شاہ شجاع دربارِ شہرت میں جگہ پانے کو اس کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ شاعرِ لافانی خواجہ حافظ کا مربّی تھا۔ خود بھی شاعرانہ استعداد سے بے بہرہ نہ تھا۔ اور عربی فارسی دونوں میں شعر کہتا تھا۔ جن کے نمونے محمود کتبی نے دئیے ہیں[1]۔ اس کے ذہنی کمالات اسی پر موقوف نہ تھے۔ جب نو سال کا تھا تو قرآن اس کو حفظ تھا۔ عربی کے آٹھ اشعار ایک وقت میں سُنتا تو اُنہیں دُہرا سکتا تھا۔ مکتوب نویسی کے اسلوب میں مشہور تھا۔ نہایت خوش خط تھا اور تمام فوجی کسرتوں کا ماہر تھا۔ اربابِ علم کا بھاری سرپرست بھی تھا۔ اور ایک زمانے میں مولانا قوام الدین کے درس میں شریک ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ اس نے فاضل سیّدِ شریف جرجانی کو درسگاہ دار الشفا میں اُستاد مقرر کیا کہ یہ اُس نے شیراز میں قائم کی تھی۔ اس کی حکومت اس قدرے پھیکے جنگی افتخار سے بھی عاری نہ تھی جو ان دنوں متداول تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی محمود سے شیراز واپس لیا۔ جس نے ایک چال سے اسے وہاں سے بے دخل کر دیا تھا۔ پھر کرمان واپس لیا جس پر دولت شاہ نے تصرف کیا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہوں تاریخ گزیدہ کے ایک پرانے نسخے کی طبع عکسی (سلسلۂ یادگارِ گب ۱۴؍ جلد اول) کے صفحات ۶۸۳ اور ۶۸۴؛

اور پھر جب سلطان اویس جلائر مارچ ۱۳۷۵ء کے مہینے میں تبریز میں مرا۔ تو نہ صرف اس شہر پر قبضہ کیا بلکہ نخجوان، قاراباغ، اوجان، سلطانیہ اور شوستر حتٰی کہ بغداد پر بھی۔ غرض کچھ مدت کے وہ ایران کے بیشتر حصے کا مالکِ مختار ہوگیا۔

اپنے خانگی تعلقات میں وہ خاندان کے دوسرے سلاطین کی نسبت کچھ زیادہ خوش نصیب نہ تھا۔ اس کا بھائی محمود جس نے ۱۳۶۸ء کے قریب اُس کی بیوی شیخ ابو اسحٰق کی دختر کا گلا گھونٹ دیا تھا ۱۳۷۵ء میں ۳۸ سال کی عُمر میں مرگیا۔ اس کی موت کی خبر سُن کر شاہ شجاع نے ذیل کی رُباعی کہی ؎

محمود برادرم شد شیرِ مسکین
مے کرد خصومت از پی تاج و نگین
کردیم دو بخش تا بر آساید خلق
او زیرِ زمین گرفت و من روی زمین

اپنے ایک بیٹے سلطان اویس کی سرکشی نے بھی اس کو پریشان کیا یہ سرکشی تو خیر امر واقعی تھی لیکن ایک دوسرے فرزند سلطان شبلی کی نافرمانی محض واہمہ کی عمارت تھی۔ اسے ایک غصے کی لہر میں جسے شراب کی موج نے اَور تیز کردیا تھا اس نے اندھا کرادیا۔ لیکن بعد میں اپنی اس اندھا دھند کارروائی پر پشیمان ہُوا۔ جبکہ پشیمانی بے سود تھی۔ یہ واقعہ ۱۳۸۳ء میں اس کی موت سے ایک سال پہلے ہُوا۔ اس کی وفات ۹ر اکتوبر ۱۳۸۴ء

کو ہوئی۔ اس وقت عمر ۵۳ سال کی تھی اور ۲۷ سال حکمرانی کر چکا تھا۔ بسترِ مرگ پر اُس نے تیمورِ اعظم کو ایک خط لکھا[1]۔ اس میں اپنی اطاعت مندی اور وفاداری کا اظہار کیا۔ اور اپنے بیٹوں اور بھائیوں خصوصًا اپنے قائمقام زین العابدین کو اس کی حمایت و نگرانی کے سپرد کیا۔ اس خط کا اور اس کی اس قسم کی تاکیدوں کا کہ "ایفائے وعدہ جزوِ ایمان ہے" تیمور پر کہاں تک اثر ہوا۔ اس کا مظاہرہ نو سال بعد ہوا جب اُس نے سارے خاندان کے افراد کا صفایا کر دیا۔ شاہ شجاع کی میّت تدفین کے لئے مدینہ پہنچائی گئی۔ یا ایک اور روایت کی رُو سے کوہِ چہل مقام پر ایک جگہ پر دفن کی گئی جو شیراز کے شمال مشرق میں کچھ فاصلے پر ہے۔ اس کی تاریخ وفات کا مادہ "حیف از شاہ شجاع" ہے (مطابق ۷۸۶ھ = ۱۳۸۴ء)؛

زین العابدین

(۷۸۶ھ تا ۷۸۹ھ = ۱۳۸۴ء تا ۱۳۸۷ء)

مجاہد الدّین علی زین العابدین

زین العابدین کا زمانہ مختصر بھی تھا۔ اور بے چینی کا بھی۔ نہ صرف اس لئے کہ ان خانگی فسادات اور برادر کُشانہ چپقلشوں نے جو اس خاندان کا نشانِ امتیازی تھے۔ اسے ابتر کیا تھا بلکہ ادھر تیموری دہشت آرائی کی

---

[1] اس خط کا متن آپ کو تاریخ گزیدہ طبع عکسی (سلسلہ یادگار گب ۱۴/۱ جلد اول) کے صفحات ۷۳۰ تا ۷۳۳ پر ملے گا*

گھٹا زیادہ کڑک دمک سے مُلک پر چھا رہی تھی۔ جلوس کے فوراً بعد زین العابدین کا عمزاد شاہ یحییٰ اس پر چڑھ آیا۔ اور کچھ عرصہ بعد تیمور کا سفیر قطب الدین وارد ہؤا۔ اور مطالبہ کیا کہ ہمارے آقا کا نام خطبے میں داخل کرو۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اسے فرمانروائے بالا دست تسلیم کرو۔ ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں تیمور نے خود عراق اور فارس میں پہلی مداخلت کی۔ اصفہان سے جہاں کی ولایت زین الدین کے چچا مجد الدین مظفّر کے ہاتھ میں تھی اس نے زرِ کثیر کا مطالبہ کیا۔ اس کی تحصیل میں اس کے کارپردازوں نے ایسے جابرانہ اور متحکمانہ طور کا ثبوت دیا کہ اہلِ شہر اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنکو مار ڈالا۔ تیمور نے اُن سے غضب ناک انتقام لیا۔ چھوٹتے ہی قتلِ عام کا حکم دیا۔ جس میں کہتے ہیں کہ ۷۰،۰۰۰ اشخاص نذرِ اجل کئے گئے[1]۔ پھر شیراز کی طرف بڑھا۔ زین الدین آمدِ سیلِ بلا کا انتظار کئے بغیر شوستر کو بھاگ گیا وہاں اس کے عمزاد شاہ منصور نے فریب سے اُسے پکڑ لیا خود اس کے بعد شیراز کو چلا۔ وہاں سے اپنے بھائی یحییٰ کو نکال بھگایا۔ اس نے یزد کو اپنا مرجع بنایا۔

مظفّریوں کی برادر کشانہ خانہ جنگی

آئندہ چھ سال (۱۳۸۷ء تا ۱۳۹۳ء) مسلسل تین مظفّری شہزادوں کے باہمی جنگ و جدل میں گذرے۔ ایک شاہ منصور تھا کہ فارس

[1] یہ وہ تعداد ہے جو فارس نامۂ ناصری میں دی ہے۔ لیکن تاریخ گزیدہ (طبع عکسی صفحہ ۶۳۹) میں تعداد بڑھا کر دو لاکھ بتائی گئی ہے۔

اور اصفہان پر حکومت کرتا تھا۔ دوسرا اس کا بھائی شاہ یحیٰی جو یزد کا حکمران تھا اور تیسرا اس کا عمزاد شاہ احمد کہ کرمان پر متسلط تھا۔ یہ کشمکش جاری رہی تاآنکہ ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں تیمور دُوسری باران منتشر صُوبوں پر چڑھ دوڑا۔ پہلے اس نے قلعہ سفید کو سر کیا۔ محافظ فوج کو قتل کیا۔ زین العابدین کو رہا کیا اور گدّی پر بحال کیا اور شیراز کی طرف کُوچ جاری رکھا۔ شاہ منصور وہاں سے پِل فسا کو بھاگ گیا۔ چند شیرازیوں سے جو اُسکے پیچھے وہاں پہنچے اُس نے پُوچھا کہ اہل شیراز میرے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا " بعضے کہتے ہیں کہ وہ جو دس دس من کے گُرز اٹھاتے تھے اور سترہ من کے ترکش سنبھالتے تھے ایسے دُم دبا کر بھاگے ہیں جیسے بھیڑیوں کے غول سے بکریاں۔ اور اپنے اہل وعیال کو غنیم کیلئے آسان شکار بنا گئے ہیں "۔ شاہ منصور یہ سُن کر زمین میں گڑ گیا۔ اور ساتھ ہی رحم سے جی بھر آیا۔ دل میں ٹھانی کہ شیراز جاؤں گا۔ اور تیموری لشکر سے لڑائی لیتے میں جس اٹل موت کا سامنا ہے اسے قبول کروں گا

شاہ منصور تیمور سے ٹکّر لیتا ہے

صرف تین ہزار لشکری اس کے ہمراہ تھے۔ ان میں دو ہزار نے لڑائی شروع ہوتے ہی پیٹھ دکھائی۔ اُدھر تاتاری لشکر چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے زیادہ تعداد میں تھے "۔ یہ سب کچھ تھا مگر منصور نے دُشمن کا مقابلہ اس جانبازی اور بے جگری سے کیا۔ کہ ایک سے زیادہ دفعہ تیمور کے اتنا قریب جا گھُسا کہ وہ اس کے وار کی زد میں تھا۔ حتیٰ کہ بالآخر گردن اور شانہ پر زخم کھا کر

پسپا ہؤا۔اور شیراز کی جانب فرار کیا۔شاہ رُخ کے کچھ سپاہیوں نے اُسے

شاہ منصور کی موت

آلیا۔گھوڑے پر سے گھسیٹا اور سر تن سے جُدا کر دیا۔"مُلک ہشت" اس کی وفات کی۔ تاریخ ہے (۷۹۵ھ ۔ ۱۳۹۳ء)

تیمور نے مظفری شہزادوں کو تہ تیغ کیا

دُوسرے مظفری شہزادوں نے اپنے تئیں بہ تسلیم و اطاعت تیمور کے حوالے کر دیا۔ احمد عماد الدین اور سلطان مہدی بن شاہ شجاع نے کرمان سے، نصرت الدین شاہ یحییٰ اور اس کے بیٹوں یعنی معزّ الدین جہانگیر اور سلطان محمد نے یزد سے، سلطان ابو اسحٰق ابن سلطان اویس ابن شاہ شجاع نے سیرجان سے اطاعت قبول کی پہلے اُن کیساتھ اعزاز و اکرام کا برتاؤ ہؤا۔لیکن پایانِ کار اصفہان کے ذرا جنوب میں قمیشہ کے مقام پر ۱۰ رجب ۷۹۵ھ (۲۲ رمئی ۱۳۹۳ء) کو سب کے سب تہ تیغ کیے گئے ۔یہ تاریخ ذیل کے اشعار میں محفوظ ہے ؎

بعبرت نظر کن بآلِ مظفر شہانی کہ گوی از سلاطین ربودند
کہ در ہفصد و پنج و تسعین زہجرت دہم شب زماہِ رجب چون غنودند
چو خرما بنان در زمانہا برشتند چو تَرّہ باندک زمانی غنودند

صرف دو کی جان بخشی ہوئی۔زین العابدین اور شبلی۔دونوں اندھے کیئے ہوئے تھے۔ایک کو اس کے عمزاد منصور نے کرایا تھا۔اور دوسرے کو اس کے باپ شاہ شجاع نے۔تیمور انکو اپنے پایۂ تخت سمرقند لیتا گیا

وہاں اُنہوں نے زندگی کے بقیّہ ایام چین سے بسر کیے۔ غرض اس طرح سلاطینِ مظفری کا خاتمہ ہوا۔ جو اسّی برس تک جنوبی اور وسطی ایران کے بیشتر حصّے پر متسلّط رہے۔ ان سلاطین و شہزادگان میں سے کئی ایسے تھے۔ کہ

مظفّریوں کے ادبی ذوق

اپنے ذوقہائے سلیم اور کمالات میں یکساں امتیاز رکھتے تھے۔ علم و ادب کی سرپرستی ان کے دربار میں نہ صرف برگزیدہ شاعروں کو کھینچ کر لاتی تھی جن میں یکتائے روزگار خواجہ حافظ بھی تھے بلکہ عضدالدین الایجی اور معین الدین یزدی جیسے متبحّر فضلا کے لئے بھی مقناطیس کا حکم رکھتی تھی۔ مادّی لحاظ سے اُنہوں نے اپنی رعیت کے فائدے کے لئے کچھ نہ کیا۔ سوائے اسکے کہ چند درسگاہیں تعمیر کرائیں۔ مشرقی تاریخ میں بھی دیکھئے۔ تو کوئی ایسا گھرانہ تلاش کرنا مشکل ہوگا جس میں خانگی تفرقے اس حد تک ہوں اور جن کی افتاد میں اس درجہ یہ برادر کُشانہ چپقلشیں، اقارب کی وحشیانہ اعضا تراشیاں یا خونریزیاں پائی جاتی ہوں۔ جن پر ان کی تاریخ کا اکثر حصّہ منحصر ہے۔

خاندانِ جلائر[1] یا ایلخانی یا ایلکانی

جلائر یا ایلخانی خاندان

مغولی سلطنت کے انتشار کے دِنوں میں دو حسن ملکی معاملات میں بہت نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ ایک وہ جو حسنِ بزرگ کہلاتا ہے۔ اور دوسرا جو حسنِ کوچک مشہور ہے۔ ان میں دوسرا زبردست امیر چوپان کا پوتا تھا۔ امیر چوپان کا اقتدار و رسوخ اَور بھی بڑھ گیا۔ جب ۷۱۹ھ (۱۳۱۹ء) میں اُس نے اولجائتو کی دختر اور ابو سعید کی بہن ساتی بیگ سے شادی کرلی۔ ساتی بیگ کے بطن سے اس کے تین بیٹے ہوئے۔ یہ اُن چھ بیٹوں اور ایک بیٹی (بغداد خاتون) کے علاوہ تھے جو اس کی ایک دوسری بیوی سے تھے۔ ان دس بچوں میں سے سب سے مشہور امیر حسن، تیمور تاش، دمشق خواجہ اور بغداد خاتون تھے۔ امیر حسن اور اس کے تین بیٹے تالش، حاجی بیگ اور غُوچ حسین سب سنہ ۷۲۷-۸ھ (۱۳۲۷-۸ء) کے لگ بھگ تشدّد کی موت مرے۔ تیمور تاش باغی ہؤا اور مصر کو بھاگ گیا۔ وہاں الملک الناصر نے پہلے اس کی اچھّی پیشوائی کی۔ لیکن جب وہ اس کے بڑھتے ہوئے

---

[1] قبیلۂ جلائر کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ مغولانِ ایشیائے وسطی" از این ایلیاس و ای ڈینی سن روس History of the Moghuls of Central Asia by N. Elias and E. Denison Ross مطبوعہ لندن ۱۸۹۸ء، صفحہ ۸۸؛

اثر اور صریحی منصوبوں سے خبردار ہؤا تو اسے ۷۲۸ھ (۱۳۲۶ء) میں مروا ڈالا۔ یہی تیمور تاش شیخ حسن کوچک کا (کہ دادا کے نام پر چوبانی بھی کہلاتا ہے) اور ملک اشرف کا باپ تھا۔ امیر چوبان کا تیسرا بیٹا دمشق خواجہ ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں (کہ یہ سال اس خاندان کے حق میں بڑا منحوس تھا) ابوسعید کے حکم سے مارا گیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ وہ پادشاہِ متوفّی اولجائتو کی ایک بیوہ سے عاشقانہ ساز باز رکھتا تھا۔ اُس کی دُختر دلشاد خاتون اور بہن بغداد خاتون دونوں خاصی صاحبِ شہرت بیگمیں تھیں۔ اور عجیب بات ہے کہ دونوں بیک وقت اپنی زندگی میں سلطان ابوسعید کے ساتھ بیاہی گئیں۔ اور ایک اَور وقت اسی طرح دونوں حریف شیخ حسن بزرگ کے ساتھ کہتے ہیں بغداد خاتون خوبصورتی کے اعتبار سے غیر معمولی عورت تھی ۷۲۳ھ (۱۳۲۳ء) میں شیخ حسن بزرگ کے ساتھ بیاہی گئی لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ ابوسعید نے اسے دیکھ پایا۔ اس کے حسن وجمال کا زخم کھایا۔ اور دل میں اس کا ایسا ہیجانی عشق پیدا ہؤا کہ ۷۲۷ھ (۱۳۲۵ء) میں اس کے شوہر کو مجبور کیا کہ اسے طلاق دے دے تاکہ خود اس سے عقد کر لے۔ ۷۳۶ھ (۶-۱۳۳۵ء) میں ابوسعید کی وفات پر جب ارپا نے جلوس کیا تو چُپ چپاتے بغداد خاتون کو مروا ڈالا۔ اس شُبہ میں کہ اس نے اپنے متوفی شوہر کو زہر دیا ہے۔ ادھر شیخ حسن بزرگ نے اپنی تلافی یوں کی کہ شاہ متوفّی کی دُوسری بیوہ دلشاد خاتون کو اپنے حرم میں داخل کیا[1]۔ اس کے بطن سے سلطان اویس اس کا بیٹا پیدا ہؤا۔ جس کے طاقت و اقتدار میں اس کی ماں آگے چلکر

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھیں)؛

اس کی شریک ہوئی اور سلمان ساوجی نے کئی قصائد اس کی شان میں بھی کہے جس طرح اس کے بیٹے کی مدح میں کہے تھے ؎

شیخ حسنِ بزرگ شیخ حسنِ بزرگ حسین بن آق بُوغا ابن ایدکان کا بیٹا تھا اور سلسلۂ نسب ہلاکو سے ملاتا تھا۔ میرے خیال میں اس نسبت سے یہ خاندان ایلکانی اور جلائرُ کے القابات کے ساتھ معروف تھا۔ (ایلکانی نہ کہ ایلخانی، گو غالبًا یہ اسی کی مختلف شکل ہے۔ جلائر قبیلے کا نام ہے) ابو سعید کی وفات کے بعد کوئی آٹھ برس (۷۳۶ھ تا ۷۴۴ھ ۱۳۳۵ء تا ۱۳۴۳ء) کے لئے ایران کی تاریخ بڑی حد تک ان دو (یعنی چوبانی اور جلائری) گھرانوں کی لڑائیوں اور ریشہ دوانیوں کی داستان ہے۔ جن کا مطلب بالادستی حاصل کرنا تھا۔ ان کی جاہ طلبیوں نے نسل ہلاکو کے کٹھ پتلی سلاطین کی نہایت بھونڈی آڑ لی تھی۔ ان کو وہ یکے بعد دیگرے محض نام کی اور عمومًا قلیل المدّت تاجداری پر متمکّن کرتے تھے۔ ۷۳۷ھ (۱۳۳۷ء) میں شیخ حسن بزرگ بغداد اور تبریز پر متمکّن ہو چکا تھا۔ کہ یہ دونوں پہلے مغول ایلخانوں کے پایۂ تخت تھے اور بعد میں جلائروں کے پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلائر گویا بالکل براہ راست قدیم تر خاندان ہی کی نمائندگی کرتے

(حاشیہ صفحہ ۲۵۲) بغداد خاتون اور اس کی بھتیجی دلشاد خاتون کے ساتھ ابو سعید کی شادی کے جواز کو صاحب حبیب السیر خواندمیر نے یہ فرض کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس نے دلشاد کے ساتھ شادی کرنے سے پہلے بغداد کو طلاق دے دی تھی۔ وہ یہ بھی اثبات کرتا ہے کہ بغداد خاتون نے اپنی بے آبروئی کا بدلہ ابو سعید کو زہر دے کر لیا ؎

تھے۔ لیکن حسن بزرگ کا تسلط ۲۷ رجب ۷۴۴ھ (۱۵ دسمبر ۱۳۴۳ء) کو صرف نسبتہً مضبوط ہؤا۔ جب اس کا حریف شیخ حسن کوچک اپنی بے وفا

بیوی کے ہاتھوں شیخ حسن کوچک کی ہلاکت

بیوی کے ہاتھوں ایک بڑے مکروہ اور دہشتناک طریقے سے مارا گیا۔ تاہم جلائروں کے قصیدہ گو سلمان ساوجی کے قلم سے اس واقعہ پر ایک عُریاں اور ناقابل ترجمہ لطیفۂ منظوم نکلا جس کا متن اوپر صـ ۹۹ پر دیا جاچکا ہے ٭

جلائری یا ایلخانی خاندان جس کی طرح شیخ حسنِ بزرگ نے ڈالی کوئی ۷۵ سال قائم رہا اور گو اُن کی زندگی کے آخری ۱۵ یا ۲۰ سال تیمور کے پے در پے حملوں نے ان کا قافیہ بہت کچھ تنگ کیئے رکھا۔ لیکن وہ کبھی مظفّریوں کی طرح اس کے ہاتھوں کاملاً پامال نہیں ہوئے۔ شیخ حسن اور اس کے بیٹے سلطان اویس جس کی ماں دلشاد خاتون تھی دونوں نے کوئی بیس بیس سال (بالترتیب ۷۳۶ھ یا ۷۴۷ھ تا ۷۵۷ھ اور ۷۵۷ھ تا ۷۷۶ھ حکومت کی۔ اور تینوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بہت سی شہرت اور نیک نامی کے لئے اپنے ان تھک قصیدہ گو سلمان ساوجی کے مرہونِ منت ہیں جس کے اکثر قصائد ان ہی کی مدح کیلئے وقف ہیں۔ پس مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے ان کی جو تصویر کھینچی ہے بڑی مبالغہ آرائی سے پُر ہے۔ گو اُن کے محاسن بڑھا چڑھا کر بتائے گئے ہیں لیکن یہ ماننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ سرے سے بے بُنیاد ہیں

۱۲ر جمادی الاول ۷۷۶ھ (۹ر اکتوبر ۱۳۷۴ء) کو خاندان کی خوش نصیبیاں روبہ تنزل ہوئیں۔ اسی روز فرمانروائے متوفّی کے سب سے بڑے بیٹے حسن کو امراء نے مروا ڈالا اور تبریز میں خالی تخت پر اس سے چھوٹا بیٹا حسین بٹھایا گیا۔ یہ ترکمانوں کیساتھ ایک کامیاب جنگ لڑکر ہٹا تھا۔ کہ شاہِ شجاعِ مظفّری نے اس کو چار ماہ کے وقفے کے لئے تبریز سے باہر نکال دیا۔ اس مدّت کے ذرا بعد اس کے بھائی علی نے اس کے اختیار کی مخالفت کی اور بالآخر صفر ۷۸۴ھ (اپریل مئی ۱۳۸۲ء) میں ایک اور بھائی احمد کے ہاتھوں ہلاک ہؤا۔ اس کے بدلے احمد کی بادشاہی کا اعلان ہؤا۔ یہ بھی تقریبًا فوراً ہی ایک تیسرے بھائی بایزید نام کے ساتھ خانہ جنگی میں مُبتلا ہؤا۔ انجامِ کار سلطنت کے دو حصّے کئے گئے۔ آذربائیجان احمد کے نام ٹھہرا۔ اور عراق بایزید کے نام۔ مگر وہاں جلد ہی دونوں بھائیوں کے درمیان تازہ معرکے ہوئے۔ ان میں پہلے ایک بھائی نے شاہ منصور مظفری سے مدد کی التجا کی پھر دوسرے نے۔ ان بے مصلحت تکراروں کا قصّہ تیموری فوجوں کی آمد نے پاک کیا۔ احمد سے ان کا دیر تک مقابلہ ہؤا۔ لیکن آخر اُنھوں نے اسے

عثمانی سُلطان بایزید یلدرم

مار بھگایا۔ اور اس نے اور قرا یوسف ترکمان نے مجبور ہو کر ترکی سلطان بایزید عرف یلدرم کی پناہ پکڑی۔ وہاں سے مصر کی طرف کو نکل گئے سلطان مصر اس فکر میں تھا۔ کہ انہیں تیمور کے حوالے کر کے اس سے صُلح کرلے پر ان کی خوش قسمتی تھی کہ خونی فاتح کے مرنے کی خبر پہنچ گئی۔ کچھ عرصہ بعد

احمد کی بدنیتی نے قرا یوسف اور اسکے درمیان بگاڑ پیدا کر دیا۔ قرا یوسف نے ۲۵ ربیع الثانی ۸۱۲ھ (۶ ستمبر ۱۴۰۹ء) کو تبریز کے پاس اسے شکست دی۔ اسی رات ستائیس برس کے پُرآشوب اور متلاطم عہدِ حکومت کے بعد اپنے فاتح کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ایلخانی یا جلائر خاندان کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا۔ گو ان کا کامل انقراض قراقونیلو ترکمانوں کے ہاتھوں ایک دو سال بعد عمل میں آیا۔

سلاطینِ کُرت[۱]

اب ہم کرت خاندان کی طرف آتے ہیں جو شمال مشرقی ایران اور اس کے متصلہ ممالک کے ایک وسیع علاقے پر حکمران تھا۔ جس کا پایۂ تخت ہرات تھا۔ ان سلاطین کے مفصل ترین حالات جو میری نظر سے گُزرے ہیں ہرات کی ایک تاحال غیر مطبوعہ تاریخ میں درج ہیں۔ اس تاریخ کا عنوان "روضۃ الجنات فی تاریخ مدینۃ ہرات" ہے۔ مولانا معین اسفزاری کی تصنیف ہے۔ یہ تاریخ ۸۷۵ھ (۴-۱۴۷۳ء) یا اس کے لگ بھگ تک آتی ہے۔ اور ابو اسحٰق احمد بن یٰسین، شیخ عبدالرحمٰن جامی اور سیفی

---

[۱] انگریز مستشرقین نے اس نام کو عموماً کرت (Kart) لکھا ہے۔ لیکن عنوان بالا کے چند سطریں نیچے جس تاریخِ ہرات کا ذکر ہے اسکے ایک احتیاط سے لکھے ہوئے نسخے میں جا بجا کُ پر علامت ضم ہے اس لئے میں نے یہی تلفظ اختیار کیا ہے۔

کی متقدم تصانیف کے علاوہ کُرت نامۂ ربیعی بوشنجی[1] پر مبنی ہے۔ کل ۲۶ روضوں میں تقسیم ہے۔ ہر ایک روضے میں ایک یا دو "چمن" ہیں۔ ان میں روضات ۷ تا ۱۱ زیرِ تبصرہ عہد اور خاندان سے بحث کرتے ہیں۔ میں مسٹر اے جی ایلیس[2] متصدّی معاون کتاب خانۂ دیوانِ ہند کا منّت گزار ہوں۔ کہ انہوں نے مجھے اس تصنیف کا ایک اعلیٰ نسخہ نوشتہ ۱۰۷۳ھ (۳-۱۶۶۲ء) مستعار دیا۔ کہ صحت اور صفائیِ خط کے اعتبار سے عجائب خانۂ برطانوی کے دونوں نسخوں[3] سے برتر ہے۔ ایک اور تصنیف جو اس خاندان کے بارے میں مفید اطلاعات بہم پہنچاتی ہے فصیحی خوافی کی بڑی نادر کتاب مجمل[4] ہے۔ جس میں سے پچھلے باب میں ربیعی کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ خاندان کا کچھ حال ظاہر ہے کہ ایران کی متاخّر العہد عمومی تاریخوں میں بھی درج ہے مثلاً روضۃ الصّفا، حبیب السیر، مطلع السعدین وغیرہ ہیں؛

کرتوں کا مورثِ اعلیٰ ایک شخص تاج الدین عثمان مرغنی تھا جس کا بھائی عزّ الدین عمر مرغنی اپنے وقت میں سلطان غیاث الدین محمد غوری

---

[1] ربیعی معروف بہ خطیب بوشنجی مجمل فصیحی کی رو سے ۷۰۲ھ (۳-۱۳۰۲ء) میں مارا گیا۔

[2] Mr. A.G. Ellis. فخر الدین کرت کا درباری شاعر تھا؛

[3] Or 4104 . اور Add. 22380

[4] دیکھو اوپر ص ۲۴۲ ، حاشیۂ زیریں جہاں نسخے شمار کیے ہیں۔ سینٹ پیٹرز برگ کا نسخہ "وزارت امورِ خارجہ کے ادارہ السنہ شرقیہ" کا نسخہ ۲۷۱ ہے۔ دیکھو بیرن وکٹر روزن Baron Victor Rosen کی مخطوطاتِ فارسی (Manuscrites Persans) ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۳

(متوفی ۵۹۹ھ = ۳-۱۲۰۲ء) کا مقتدر وزیر تھا۔ تاج الدین قلعۂ خیسار کا قلعہ دار مقرر ہؤا تھا۔ اس کے مرنے پر اس کے بیٹے ملک رکن الدین ابوبکر کی سلطانِ موصوف کی دختر سے شادی ہوئی۔ انکا بیٹا شمس الدین

شمس الدین کُرت

۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) میں باپ کا قائم مقام ہؤا۔ اگلے سال سالی نویان کے ساتھ ہندوستان کی ایک مہم میں شریک ہؤا۔ اور ۶۴۵ھ (۸-۱۲۴۷ء) میں ملتان آکر عراقی کے مرشد شیخِ بزرگ بہار الدین زکریا سے ملا۔ آگے چل کر شہنشاہِ مغول منگو قاآن (۶۴۶ھ تا ۶۵۵ھ = ۱۲۴۸ء تا ۱۲۵۷ء) کے دربار میں حاضر ہؤا۔ منگو نے ہرات، جام، بوشنج، غور، خیسار، فیروزکوہ، غرجستان، مُرغاب مرو، فاریاب (جیحوں تک)، اسفزار، فراہ، سیستان، کابل، تیراہ اور (دریائے سندھ تک) افغانستان اس کی حکمرانی میں دے دئے۔ سیستان کو مسخّر کرنے کے بعد ۶۶۲ھ (۴-۱۲۶۳ء) میں ہلاکو کے ہاں حاضر ہؤا اور تین سال بعد اس کے جانشین اباقا کے ہاں۔ جس کے ساتھ دربند اور باکو کی مہم میں شریک ہؤا۔ دوبارہ ۶۷۵ھ (۷-۱۲۷۶ء) میں شمس الدین صاحب دیوان کی معیت میں اباقا کے پاس گیا۔ اب کی بار مغولی بادشاہ کا حُسنِ ظن جو اس کے بارے میں تھا بدظنّی میں تبدیل ہوگیا۔ اور یہ اس کی

شمس الدّین زہر دیکر مارا گیا

موت کا سبب ہوئی۔ شعبان ۶۷۶ھ (جنوری ۱۲۷۸ء) میں تبریز میں حمام کر رہا تھا کہ وہاں ایک تربوز کے ذریعے زہر دیکر مار ڈالا گیا۔ اباقا نے یہاں

تک کیا۔ کہ خراسان میں جام کے مقام پر زنجیروں کے ساتھ اس کی لاش کو دفن کیا۔ مولانا وجیہ الدین نسفی نے ذیل کے اشعار میں اس کی تاریخِ وفات محفوظ کی ہے

بسال ششصد و ہفتاد و شش مہِ شعبان
قضا ز مصحفِ دوران چو بنگریست بفال
بنام صفدرِ ایرانیان محمدِ کُرت
برآمد آیت "وَالشَّمسُ کُوِّرَت" در حال

یہ قرآن کی سورۃ ۸۱ کی پہلی آیت ہے[1]۔

معلوم ہوتا ہے کہ مَلِک کا لقب سب سے پہلے رکن الدین نے اختیار کیا۔ (ملک کے معنی عربی میں بادشاہ کے ہوتے ہیں۔ لیکن ایران میں ان دنوں 'امیر' یا 'رئیس' کے القاب سے زیادہ نہ سمجھا جاتا تھا) لیکن اس سے قبل شیخ ثقۃ الدین فامی نے اس کے چچا عز الدین عمر کو اشعارِ ذیل میں شاہ کے بلند تر لقب سے یاد کیا ہے

ایّام شد مساعد و امید شد غنی
در عہد عزّ دین عمر آن شاہ مرغنی
فرخندہ خسروی کہ ز کحل سخای او
دارد ہمیشہ دیدۂ حاجات روشنی

تاہم 'مَلِک' کا لقب وہ ہے جو اس خاندان کے تمام بعد کے ارکان نے

---

[1] سورۂ تکویر: وَاِذَا الشَّمسُ کُوِّرَت کی طرف اشارہ ہے۔ (مترجم)

اپنے نام کے ساتھ لگایا ؛

شمس الدین کے بعد ۶۷۷ھ (۹-۱۲۷۸ء) میں اس کا بیٹا رکن الدین

رکن الدین شمس الدین کہین کے لقب سے باپ کا جانشین ہوتا ہے

مسندِ حکومت پر بیٹھا اور اُس نے باپ کا لقب باضافۂ صفت "کہین" اختیار کیا۔ خیسار کے مقام پر ۱۲ر صفر ۷۰۵ھ (۳ر ستمبر ۱۳۰۵ء) کو اس نے وفات پائی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہت پہلے اس کے بیٹے فخر الدین نے اسے بے دخل کر دیا تھا۔ فخر الدین کو باپ نے سات سال تک قید رکھا تھا۔ بالآخر مغول جرنیل نوروز کی سفارش پر رہا کیا گیا۔ اس نیکی کا بدلہ اُس نے یہ دیا۔ کہ

اس کا بیٹا فخر الدّین اُسے ہٹا کر خود تخت سنبھالتا ہے

۶۹۶ھ (۷-۱۲۹۶ء) میں نوروز کو دغا سے غازان خان کے ہاتھوں میں گرفتار کرا دیا۔ جس کے خلاف نوروز نے بغاوت کی تھی۔ تین سال بعد فخر الدین خود غازان کے بھائی خدابندہ کے ساتھ نبرد آزما ہوا۔ جو ۷۰۵ھ (۶-۱۳۰۵ء) میں غازان کا جانشین ہوا۔ اور اگلے سال دانشمند بہادر کو سپہ سالار کر کے اس نے ہرات کے خلاف دس ہزار کا لشکر روانہ کیا۔ فخر الدین نے ہرات کی قلعہ بندیاں خوب مستحکم کر لی تھیں۔ دانشمند ایک بڑی پُر فریب چال سے مارا گیا۔ فخر الدین پہلے امان کوہ بھاگ گیا۔ دانشمند کو بہت سے لشکریوں کے ساتھ ہرات پر قبضہ کرنے دیا۔ پھر وہاں سے واپس چڑھ دوڑا اور

شہر پر از سر نو متصرف ہوگیا۔ اسکے بعد جلد ہی ۲۲ر شعبان ۷۰۶ھ (۲۶ر فروری ۱۳۰۷ء) کو فوت ہوگیا۔ وہ علم ادب کا بڑا سرپرست تھا۔ سیفی کہتا ہے کہ چالیس مشہور شاعر اس کے قصیدہ گو تھے۔ اور اس نے خود اپنی مدح میں اسی قصیدے اور ۱۵۰ مقطعات تصنیف کئے۔ دوسری طرف دیکھئے تو اس کی حکومت جابرانہ تھی۔ اس نے عورتوں کو کھلے بندوں پھرنے کی ممانعت کی اور بڑی سختی سے شراب خوری اور علانیہ ماتم کرنے کی روک تھام کی ۔

غیاث الدین جانشین ہوتا ہے فخر الدین کے بعد اس کا بھائی غیاث الدین اس کا جانشین ہوا۔ لیکن جلد ہی اس کی اپنے بھائی علاء الدین سے کچھ تکرار ہوئی۔ اور اپنا مقدمہ مغول بادشاہ خدا بندہ کے سامنے پیش کرنے گیا۔ اس نے بڑے الطاف سے خیر مقدم کیا۔ ۷۰۸ھ (۹-۱۳۰۸ء) میں جب ہرات واپس آیا تو اس نے اپنی سلطنت میں غور، خیسار اور اسفزار کا اضافہ کیا۔ علاؤ الدین ہندو کی سازشوں سے مجبور ہو کر اسے ۷۱۴ھ (۵-۱۳۱۴ء) میں پھر شاہ خدا بندہ کے پاس جانا پڑا۔ اب کی بار شیخ نور الدین عبد الرحمٰن اسفراینی کو بیچ میں ڈالا اور بادشاہ کا اعتماد دوبارہ حاصل کرنے میں اُسے کچھ وقت لگا۔ جب واپس آیا تو پہلے ۷۱۸ھ (۹-۱۳۱۸ء) میں سلطان یسور نکودری[1] کے حملۂ خراسان سے دوچار ہوا۔ اور آئندہ سال قطب الدین اسفزاری

[1] دیکھو ہوورتھ کی تاریخ مغول جزو سوم ص ۱-۵۷۰۔

اور اہل سیستان کی فوج کشی کا سامنا ہوا۔ اس مؤخر الذکر جنگ پر پور بہائی اسفزاری کے ہاں ذیل کے شعر ملتے ہیں ؎

شاہا دگر بہ پشتیِ ستانِ سیستان
آہنگ جنگِ لشکرِ ایرانیان مکن
ریش و بروت بیش نیند اہلِ سیستان
زنہار تکیہ بر نمد و ریسمان مکن

۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں سلطان یسور مارا گیا۔ اور نکودری تتر بتر ہو گئے۔ اسی سال رجب کے مہینے میں (اگست ۱۳۲۰ء) غیاث الدین مکے کی زیارت کرنے نکلا اور اپنے فرزند ملک شمس الدین محمد کو اپنا نائب کر گیا۔ ۷۲۹ھ (۱۳۲۹ء) میں غیاث الدین نے انتقال کیا اور چار بیٹے چھوڑے۔ ایک تو یہی شمس الدین جو اس کا جانشین ہوا۔ دوسرے حافظ اور معز الدین جو یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے؛ اور باقر۔

شمس الدین کے جلوس کا مندرجۂ ذیل عربی قطعۂ تاریخ جمال الدین محمد بن حسام نے لکھا ہے :-

أَضَاءَتْ بِشَمْسِ الدِّينِ كَرْتَ زَمَانُنَا
وَأُجْرِيَ فِي بَحْرِ الْمُرَادَاتِ فُلْكُهُ
وَمِنْ عَجَبٍ تَارِيخُ مَبْدَإِ مُلْكِهِ
يُوَافِقُ قَوْلَ النَّاسِ خُلِّدَ مُلْكُهُ

خُلِّدَ مُلْکُہٗ سے ۷۲۹ھ تاریخ نکلتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس کی برجستگی

بالکل بے معنی ثابت ہوئی۔ کہ شمس الدین تخت نشینی کے دو مہینے بعد چل بسا۔ اور اس کا بھائی حافظ جانشین ہوا۔ وہ بھی دو سال کے مختصر اور مضطرب عہدِ حکومت کے بعد تیسرے بھائی ابوالحسین ملک معزّ الدین کے لئے تخت خالی کر گیا۔

معزّ الدین کی تخت نشینی ۳۲ے۷ھ (۱۳۳۱ء) میں معزّ الدین کی تخت نشینی تین اہم واقعات کے ساتھ قریب قریب مقارن ہوئی۔ یعنی ابوسعید کی وفات (جو گویا ایران میں مغولی تسلّط کے خاتمے کی مُہر تھی)، تیمور کی ولادت اور سربدار خاندان کا طلوع؛

سلسلۂ سربداران

سلسلۂ سربداران مناسب ہے کہ اس خاندان کی تاریخ کو جہاں تک اسے یہاں معرضِ بحث میں لانے کی ضرورت ہے خاندان کرت کی تاریخ کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا جائے۔ سٹینلے لین پول نے اس کا خلاصہ خوب کیا ہے[1]۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ امرار کوئی نصف صدی کے لئے سبزوار اور اس کے نواحی علاقے پر متسلط رہے اس دوران میں یکے بعد دیگرے بارہ امیروں نے سرداری کی باگ ہاتھ میں لی۔ اور نو ان میں سے مرگِ تشدّد کے شکار ہوئے؛

یہاں یہ بھی اضافہ کیا جاتا ہے کہ ان میں سے کسی نے چھ یا سات

---

[1] سلسلہ ہائے سلاطینِ اسلامی ص۲۵۱؛

سال سے زیادہ حکومت نہیں کی اور یہ لوگ شیعہ مذہب کے سرگرم پیرو تھے۔ جبکہ اُدھر نیشاپور اور ہرات میں تسنّن کا بول بالا تھا۔ تاہم سلسلے کا آخری رکن خواجہ علی مؤیّد شہر بسطام اور فرہاد جرد کو تسخیر کرنے اور نیشاپور فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن ۷۷۷ھ (۶-۱۳۷۵ء) میں کُرتوں نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔

اس خانوادۂ شاہی نے جسے شاہی خاندان کہتے ہوئے تأمل ہوتا ہے جس بغاوت کے سہارے طلوع کیا وہ ۱۲ ار شعبان ۷۳۷ھ (۱۶ را مارچ ۱۳۳۷ء) کو ظہور پذیر ہوئی۔ امیر عبدالرزاق بیہقی، شیخ حسین جوری کا مرید تھا۔ جن کے مرید اس مختصر بادشاہی کے لشکر میں ایک اہم عنصر تھے اس نے سب سے پہلے علمِ بغاوت بلند کیا اور للکارا کہ "مفسدوں کا ایک گروہ غلبہ پاکر بندوں پر ظلم رانی کرتا ہے۔ اگر ہم نے توفیق پائی تو ظالموں کے ظلم کو دُور کر دکھائینگے۔ ورنہ اپنا سردار پر (= سربدار) دیکھیں گے۔ کہ اب ہم کو اَور تعدّی سہنے کی تاب نہیں"۔ یہی کلمہ ہے جس کے سبب یہ خاندان سربدار کہلایا[1]۔ ایک قابلِ توجہ شاعر ابنِ یمین سربداروں کیساتھ وابستہ ہے۔ لیکن معرکۂ زاوہ کے بعد جس میں شیخ حسین جوری کام آیا۔ اور سربداری لشکروں کو شکستِ فاش ہوئی۔ ابنِ

---

[1] اصل الفاظ (روضۃ الصفا، مسٹر ایلیس کا نسخہ، ورق ۱۴۷) درج ذیل ہیں: "جمعی مفسدان استیلا یافتہ بر خلایق ستم میکنند، اگر توفیق یابیم دفع ظلم ظالمان نمائیم والّا سرِ خود بر دار بینیم کہ دیگر تحمّل تعدّی ظلم نداریم، بدین سبب ایشانرا سربدار لقب شد"۔

میں ملک معزالدین کرت کے ہاتھ لگا۔ وہ شاعر سے اچھی طرح پیش آیا۔ اور اعزاز کا سلوک کیا۔

معزالدین کرت نے چالیس برس حکومت کی جو شکوہ وشان سے خالی نہ تھی۔ لیکن گاہے ماہے کی وحشیانہ حرکتوں سے بھی مبرا نہیں۔ کہ بدقسمتی سے یہ اس زمانے کے طور میں داخل تھیں۔ مثلاً تسخیر بادغیس کے بعد اُس نے اس طرز میں جسے آگے چل کر تیمور نے معمولی کر دیا۔ دشمنوں کے سروں کے دو کلہ مینار بلند کئے۔ بالآخر ۷۷۱ھ (۷۰-۱۳۶۹ء) میں صاحبِ فراش ہؤا اور داعیِ اجل کو لبیک کہی۔ ذیل کا قطعۂ تاریخ لکھا گیا۔

آنزا کہ جہان پر از زر و زور شود — مانندِ حسینِ کُرت در گور شود
بر دالِ دُعا چو بر زنی یک نقطہ — تاریخِ وفاتِ خسروِ غور شود

ہرات میں غوری سلطان غیاث الدین محمد سام اور اپنے باپ غیاث الدین محمدِ کرت کے پہلو میں دفن ہؤا۔ غیاث الدین پیر علی اس کا بیٹا قائم مقام ہؤا۔

تیموری سیلاب

یہی وہ دن تھے کہ تیمور کا سایہ ملک پر پڑنے لگا۔ لیکن حسب معمول اس کی پہلی پہلی پیشقدمیاں دوستانہ نوعیت کی تھیں۔ اور ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) میں یا اس کے قریب اس نے اپنی بھانجی سیونج قتلغ آغا کو غیاث الدین پیر علی کے بیٹے پیر محمد کے عقد میں دے دیا۔ پانچ سال گزرے کہ ۱۳۸۱ء کے موسمِ بہار میں اپنی پہلی ایرانی فوج کشی کے شروع ہی میں تیمور نے ہرات پر قبضہ کیا۔

اسے اور اس کے متصلہ علاقوں کو اپنے بیٹے میراں شاہ کے سپرد کیا اور کرت حکمران غیاث الدین پیر علی اور اُس کے سب سے بڑے بیٹے پیر محمد کو سمرقند لے گیا۔ وہاں اُنہیں قید کیا۔ اسی طرح گھرانے کے دو[۲] اور رُکن امیر غوری اور ملک محمد

تیمور کے ہاتھوں کُرت خاندان کا انقطاع

اندکان میں قید کئے گئے۔ ۱۳۸۹ء میں ہرات میں ایک ناکام بغاوت ہوئی اور قید کرنے والے کو اُن کے مروانے کا بہانہ ہاتھ لگا۔ اور اسطرح اپنے حریف سرداریوں کا چراغ گل ہونے کے ایک سال بعد کرت خاندان کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اوپر جن چار خاندانوں کی تاریخ کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا۔ ایران بیشتر ان ہی کی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ کہ آٹھویں صدی ہجری اور چودھویں صدی کے ربع اخیر میں تیمور اس سرزمین پر ٹوٹ پڑا۔ اور اسے اسی طرح

تیمور اور چنگیز خان کا مقابلہ

تاراج کیا جیسے اس سے کوئی ایک سو پچاس سال پہلے چنگیز خان نے کیا تھا۔ ان دو وسط ایشیائی فاتحوں میں مشابہت کے بہت سے پہلو ہیں دونوں کو ابتدا میں اپنی ہی قوم میں حریفوں کو کچلنا اور اپنی طاقت کو مستحکم کرنا پڑا۔ دونوں جب ایرانی مہم کے لئے نکلے تو چالیس برس کی عمر سے متجاوز تھے۔ اور دونوں بے اندازہ خونریزی اور مصائب کے ذمہ دار ہوئے صرف دو باتیں خاص طور پر ان کو ایکدوسرے سے ممیز کرتی

ہیں۔ ایک یہ کہ چنگیز خان بے دین تھا۔ اور تیمور کم سے کم نام کا مسلمان تھا۔ دُوسرے یہ کہ چنگیز خان کا جہاں خوارزمشاہیوں کی زبردست سلطنت سے سامنا تھا وہاں تیمور نے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایران کو چھوٹے چھوٹے تاجداروں میں ٹکڑے ٹکڑے پایا۔ جن کے محروسات کی کوئی قطعی سرحدیں نہ تھیں۔ اور جو متواتر نہ صرف ایکدوسرے کے ساتھ بلکہ اپنے ہی خاندان کے جاہ طلب افراد کے ساتھ بھی برسرِ پیکار رہتے تھے تیمور میں بھی ایک طبعی وحشی پن تھا جو چنگیز خان کی خونخواری سے کم نہ تھا۔ لیکن جہاں تک ایران اور دوسرے اسلامی ممالک کا تعلق ہے تیمور کے مسلمان ہونے نے یقیناً اس کی اس خصلت کو کسی حد تک نرم کر دیا تھا کیونکہ اس نے کم سے کم درگاہوں اور مقدس عمارتوں اور ایسے لوگوں کا جن کی فضیلت یا تقدس کا چرچا تھا زیادہ احترام کیا۔ تاہم ہمیں شرف الدین علی یزدی صاحبِ ظفر نامہ[1] جیسے ثناگروں کی روایتوں سے گمراہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ جو کچھ وہ لکھتا تھا فاتح کے سایۂ سرپرستی میں اور اسی کی رضاجوئی کے لئے لکھتا تھا۔ دُوسری طرف یہ بھی مناسب نہیں کہ عربی مصنف احمد ابن عربشاہ نے اپنی "عجائب[2] المقدور" میں جس بدکلامی سے کام لیا ہے ہم اس پر صاد کریں کہ وہاں فاتح کو عادتاً "غدار"

---

[1] ۸-۱۸۸۷ء میں کلکتہ سے "سلسلۂ کتب ہند" Bibliotheca India Series. میں شائع ہُوا ہے۔ اس مطبوعہ نسخے میں یہ تاریخ کوئی ۱۵۶۰ صفحات پر سمائی ہے۔ طولانی، ملال انگیز، مرصّع اور لفاظانہ ہے؛ [2] مطبوعہ لیدن ۱۶۳۶ء، کلکتہ ۱۸۱۸ء، قاہرہ ۱۲۸۴ھ وغیرہ؛

"مجرم"۔ "کلب مجنون" وغیرہ صفات کے ساتھ مذکور کیا ہے لیکن شرف الدین
کی مبالغہ آمیز اور ملال انگیز خوشامد ابنِ عربشاہ کی بدزبانی سے زیادہ ناقابلِ
برداشت ہے۔ کیونکہ یہ تو اس سے بن نہیں پڑتا کہ تیمور نے جو قتلِ عام
کئے اور کلہ مینار بنوائے ان کا ذکر سرے سے غائب کردے۔ لیکن یہ
لکھتے ہوئے اس کے ضمیر کو تامل نہیں ہوتا۔ کہ تیمور کی ذاتِ مکارم آیات
اللہ کے لطفِ نامتناہی کو آشکار کرتی تھی۔ اور اس کے ضمیرِ مستنیر میں
محض خیر و نیک پوشیدہ تھے۔ اور ظاہری طور پر قہر و سیاست کے جو
اعمال اوائلِ فتوحات میں اسکے بعض عالم جاگیر حکم برداروں اور طرفداروں
سے صادر ہوئے اور جو ابھی بیان کئے جائینگے ضروریاتِ جہانگیری اور
لوازمِ کشورکشائی کے سبب سے ظہور میں آئے"۔ ان اعمال قہر کی
مثالوں میں سیستان کا قتلِ عام ہے جو ۷۸۵ھ (۴-۱۳۸۳ء) میں ہوا
اور جس میں اس نے کوئی دو ہزار جنگی قیدیوں کو دیوار میں چنوا دیا؛
دِلّی کے قریب ۸۰۱ھ (دسمبر ۱۳۹۸ء) میں ایک لاکھ ہندوستانی جنگی
قیدیوں کا سفاکانہ قتلِ عام، ۸۰۳ھ (۱-۱۴۰۰ء) میں چار ہزار انسانوں
کا زندہ زمین میں داب دینا۔ اور اسی سال حلب اور دمشق میں بیس
کلہ میناروں کا کھڑا کرنا؛ ۷۸۹ھ (نومبر ۱۳۸۷ء) میں اصفہان کے
ستر ہزار باشندوں کا قتل عام وغیرہ خونریزی اور انسانی کرب و ابتلا
کو معمولی باتیں سمجھنے کی جو بُرقساوت فطرت تیمور لیکر آیا تھا اُوپر کے

---

[1] طبع "سلسلۂ کتب ہند" جلد اول ص ۶-۱۵؛

واقعات اس کے ایسے بہت سے مظاہروں میں سے محض چند مثالیں ہیں
سکندر، چنگیز، تیمور اور نپولین جیسے عظیم فاتح جو اپنے حصولِ مقاصد کی
قیمت میں کسی انسانی مصیبت کو بڑا نہ سمجھتے تھے ان کی بیجا بطل پرستی
کی عینک جن متعلموں کی نظروں پر نہیں چڑھی ہے وہ تیمور کے بارے
میں سر جان میلکم کے خیالات سے اتفاق کرینگے۔ وہ اپنی قابلِ تعریف
"تاریخِ ایران" میں لکھتے ہیں: "تیمور کے لشکری ضرور اسے دیوتا جان کر
پُوجتے ہونگے اور جب چھ سات لاکھ کی کثیر التعداد فوج اس کی ذات
کے ساتھ وابستہ تھی تو وہ کیا پروا کرتا تھا کہ ملّت کی دُوسری جماعتیں
اس کے حق میں کیا رائے رکھتی ہیں۔ اس شہنشاہ کا مدعا یہ تھا۔ کہ فاتح
کی حیثیت سے مشہور ہو۔ اس غرض سے کہیں ایک رفیع الشان شہر
راکھ کر دیا گیا۔ کہیں ایک صُوبے کے باشندوں کا صفایا ہو گیا۔ اور یہ نہیں
کہ یہ سب کارروائی اندھے جوش کے ساتھ کی گئی بلکہ ٹھنڈے دِل کے
ساتھ یہ اندازہ کر کے کی گئی کہ یوں اس کی دہشت کا سکّہ بیٹھے گا جو غایاتِ
ہوس کے حصول میں آسانی پیدا کر دیگا۔ بظاہر تیمور بڑا دیندار بنتا تھا۔
فرائضِ منصبی کی ادائی کا سختی سے پابند تھا۔ باخدا بزرگوں کے ساتھ التفات
برتتا تھا۔ اور وہ اس کی مہربانی کے بدلے اس کو یقین دلاتے رہتے
تھے۔ کہ خدا نے دُوسرے فرمانرواؤں کے ممالک اس کی شمشیرِ ظفر نصیب
کے لئے لکھ رکھے ہیں۔ اُن کی ان الہامی پیشین گوئیوں کا جو کچھ اُس نے

لہ Malcom's History of Persis. لندن ۱۸۱۵ء، ص ۳-۴۸۲

چرچا کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو وہ ان کا معتقد تھا۔ یا اس نے سوچا کہ شاید ان کی اشاعت کا ایسا اثر ہو کہ اس کے منصوبوں کے حق میں مساعد ہو"۔

ذرا آگے چل کر یہ دقیقہ رس مؤرخ لکھتا ہے[1]۔" جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کو دیکھ کر ہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ تیمور گو عظیم ترین اہلِ سیف میں سے تھا۔ لیکن بدترین فرمانرواؤں سے تھا۔ قابل، دلاور اور فیاض تھا لیکن بوالہوس، سنگدل اور موذی تھا۔ اس کی میزانِ طبع میں اس چیز کے فروغ کے مقابلے پر جسے وہ شخصی شکوہ و جلال سمجھتا تھا۔ ہر انسان کی راحت پرِ کاہ کا وزن بھی نہیں رکھتی تھی۔ اور اس شخصی عظمت کا پیمانہ اسکے نزدیک معلوم ہوتا ہے یہ تھا کہ کتنی مملکتوں کو ویران کیا اور کتنی مخلوق کو فنا کیا اس کی طاقت کی وسیع عمارت کسی بُنیاد پر نہ کھڑی تھی۔ صرف اس کے نام کا دبدبہ تھا جس نے اسے تھامے رکھا۔ اور جیسے ہی اس کی قضا آئی اس کا شیشۂ سلطنت ٹوٹ گیا۔ کچھ ٹکڑے اس کی اولاد نے چُنے لیکن لے دیکر ایک ہندوستان تھا جس میں کچھ مدت کے لئے اُنہوں نے اپنا تسلّط برقرار رکھا۔ اس ملک میں آج بھی ہمیں مغلیہ خاندان کی گذشتہ شان و شوکت کے دُھندلے اور مِٹتے ہوئے آثار نظر آتے ہیں۔ دہلی میں برطانوی قوم کے سہارے اب تک ایک نمائشی بادشاہ تخت

---

[1] تصنیف مذکور ص ۴۸۴؛

پر جلوہ آرا ہے[1] اور ہم اس میں انسانی عظمت کے تدریجی زوال کا نظارہ کرتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ چند صدیوں کے عبور نے تیمورِ اعظم کی نسل کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا"۔

نظامِ شامی کی تاریخِ تیموری

اوپر جن دو تیموری تاریخوں کا ذکر آچکا ہے یعنی فارسی میں شرف الدین علی یزدی کا 'ظفر نامہ' اور عربی میں ابنِ عرب شاہ کی 'عجائب المقدور' انکے علاوہ ایک تیسری معاصر تاریخ بھی موجود ہے - یہ اب تک غیر مطبوعہ ہے[2]۔ اور جہاں تک علم ہوا صرف عجائب خانۂ برطانوی کے لاثانی نسخے[3] میں محفوظ ہے۔ اس تاریخ پر جو فارسی ہی میں لکھی گئی اور ظفر نامہ ہی اس کا بھی عنوان ہے ۸۰۴ھ (۲-۱۴۰۱ء) میں نظامِ شامی نے تیمور کے حکم سے قلم اٹھایا اور ۸۰۶ھ (۴-۱۴۰۳ء) میں "تیمور کی موت سے صرف ایک سال

---

[1] سر جان میلکم کی تاریخ ہندوستانی غدر سے (جس کے نتائج میں نسل تیموری یعنی خاندانِ مغلیہ کا انقطاع شامل ہے) بہت پہلے یعنی ۱۸۱۵ء میں شائع ہوئی ۔

[2] بیوری J. B. Bury نے گبن (Decline and Fall of the Roman Empire) کی جلد ہفتم کے صفحہ ۴۴ پر ایک حاشیۂ ذیلی اضافہ کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ سر ڈینی روس نے ظفر نامۂ نظام شامی کو طبع کے لئے مرتب کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوا۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں چیکوسلواکیا کے پایۂ تخت پراگ سے یہ کتاب بہ تصحیح و ترتیب ڈاکٹر ریپکا (Rypka) شائع ہو چکی ہے (مترجم)

[3] Add. 23,980

پہلے مکمل ہو کر اس کی خدمت میں پیش کی گئی۔ ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں جب تیمور نے بغداد فتح کیا تو مصنف اُن دنوں وہیں مقیم تھا۔ اور پہلا شخص تھا جو اُس کی خدمت میں آداب بجا لانے نکلا۔ تیمور نے کہا "خدا تُم پر رحم کرے تم پہلے شخص ہو کہ اس شہر سے میرے سامنے آئے ہو۔" یہ تاریخ جو شرف الدین کی ہمنام تصنیف سے زیادہ مجمل اور جامع اسلوب میں نسبتہً سادہ ہے قابلِ اشاعت معلوم ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متاخر تصنیف اس پر مبنی کی گئی ہے۔ اس باب کے لکھنے میں میرے پاس ظفر نامۂ نظامِ شامی کے مندرجات کی نہ صرف اپنی یادداشتیں استفادے کے لئے حاضر تھیں جو مَیں نے عجائب خانۂ برطانوی میں فرصت کے اوقات میں جمع کی تھیں بلکہ ایک مکمل نقل بھی اس کی میرے پاس موجود رہی جو میرے لئے میرے دوست ڈاکٹر احمد خان صاحب نے تیار کر دی تھی۔

نام نہاد "ملفوظات" "تزکاتِ تیموری"

یہاں نام نہاد "ملفوظات" و "تزکاتِ تیموری" کا ذکر بھی ضرور ہونا چاہئے۔ گو یہ فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور عام یورپی مصنف ان سے استناد اور انہیں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اب بہترین مبصروں کی نظر میں یہ بالعموم جعلی قرار دی گئی ہیں اور میرے

ﻟﮧ نسخہ، ورق ۹۹؛

خیال میں یہ نظریہ درست ہے[1]۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ پہلی مرتبہ ساتویں صدی عیسوی میں بعہدِ شاہجہان (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۹ء) ابوطالب الحسینی ایک شخص نے حوالۂ قلم کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اصل ترکی کے ایک نسخہ سے یہ ترجمہ کیا ہے جو اس نے ایک شخص جعفر پادشاہ والئ یمن کے کتاب خانے سے دریافت کیا۔ اس اصل ترکی تالیف کے وجود کی کسی قسم کی کوئی شہادت بجز ابوطالب کے اس بیان کے موجود نہیں ہے۔ اور یہ بات بہت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس نے خود ہی بابُر[2] کی مستند توزک کے تتبع میں ظفر نامہ اور دوسری تیموری تاریخوں سے مدد لیکر یہ فارسی تصنیف مرتب کی۔ ۱۷۷۹ء میں اس تصنیف کا ایک نسخہ میجر ڈیوی[3] ہندوستان سے انگلستان لایا۔ ۱۷۸۴ء میں اس کے فوت ہونے پر یہ اس کے بیٹے کی ملکیت میں چلا گیا۔ میجر نے ۱۷۷۹ء میں ڈاکٹر وائٹ[4] کو جو اُن دنوں جامعہ آکسفورڈ میں لاڈین پروفیسر آف عربک[5] تھے

۱؎ دیکھو ریو کی فہرست مخطوطات فارسی ص۱۷۷ تا ص۱۸۰، جہاں اس کتاب کے مستند ہونے کے خلاف کئی قوی دلیلیں دی گئی ہیں؛

۲؎ اس بات کا ثبوت کہ یہ نام "بابَر" نہیں بلکہ "بابُر" ہے سر ڈینی رَوس نے اپنے ایک دلچسپ مقالے میں پیش کیا ہے اس کا عنوان ہے "شہنشاہ بابر کی نظموں کا ایک مجموعہ" ۲۶ راکتوبر ۱۹۱۰ء کو مجلّۂ انجمن ایشیائی بنگال کی جلد ششم کے ایک زائد شمارے میں شائع ہوا ہے، تمہید، صفحہ د تا و؛

۳؎ Davy؛ ۴؎ Dr. White؛

۵؎ Laudian Professor of Arabic

اس کتاب کی بیحد تعریف اور اسکے مستند ہونے کی پر جوش حمایت لکھ بھیجی[1]۔ ۱۷۸۳ء میں ان دونوں نے مل کر "تزکات" کا متن مع ترجمہ شائع کیا۔ ۱۷۸۷ء میں پروفیسر لانگلے[2] نے ایک فرانسیسی ترجمہ ذیل کے بوجھل عنوان کے ساتھ پیش کیا:- تیمور معروف بہ تیمور لنگ کی سیاسی اور فوجی تزکات جو اُس نے خود منگولی زبان میں لکھیں اور جو ابو طالب الحسینی کے فارسی ترجمے سے فرانسیسی میں ترجمہ کی گئیں اور ان کے ساتھ بہترین مشرقی تصانیف سے اخذ کر کے فاتح موصوف کی سوانحعمری شامل کی گئی۔ نیز تاریخی اور جغرافی جدولیں اور حواشی وغیرہ اضافہ کئے گئے"۔ ۱۸۳۰ء میں میجر چارلس سٹیوارٹ[3] نے "ملفوظات" یا (نام نہاد) خود نوشتہ سوانح کا انگریزی ترجمہ طبع کرایا؛

نہ صرف اس حیثیت سے کہ تیمور دُنیا کے عظیم ترین فاتحوں میں سے ہے بلکہ اِس لحاظ سے بھی کہ وہ ہندوستان کے نام نہاد مغلیہ خاندان کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ وہ بہُت سے یورپی (خصوصًا انگریز) اور ایشیائی مؤرخوں کا مرجعِ توجہ رہا ہے۔ اور بہت سے مصنّفوں کا موضوع بنا رہا ہے۔ اس کتاب کے اغراض کے لئے جس میں موضوع کا تاریخی حصہ لازمًا ادبی حصے کے ضمن میں آتا ہے تیمور کے حالات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دینا کافی ہوگا۔ یہ بیشتر ظفر نامہ اور ابن عربشاہ کی روایت پر مبنی ہے۔ خصوصًا اس کا وُہ جزو جو ایران سے متعلّق ہے*

---

[1] دیکھو میجر چارلس سٹوارٹ کے ترجمہ ملفوظات ۱۸۳۰ء کے صفحات ۸ تا ۱۲؛

[2] Langles [3] Charles Stewart ؛

تیمور کی ولادت تیمور (جس کے معنی ترکی میں لوہے کے ہوتے ہیں) ماوراءالنہر میں کش کے مقام پر ۲۸ شعبان ۷۳۶ھ
(۱۱ اپریل ۱۳۳۶ء) کو پیدا ہؤا۔ اُن لوگوں کے معاملے میں جو آگے چلکر نامور ہوجاتے ہیں جیسا کہ اکثر ہؤا کرتا ہے تیمور کے شاگردوں نے ایک طرف تو اس کا سلسلۂ نسب (بواسطۂ قراچار نویان) چنگیز خان کے شاہی گھرانے سے ملانے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف اس کی پیدائش کو ہر طرح کے مبارک شگونوں میں گھرا ہؤا پیش کیا ہے کہ اس کی آئندہ عظمت کا پتہ دیتے تھے۔ لیکن ابن عرب شاہ صرف اس کے باپ کا نام (ترغائی) اور دادا کا نام (ابغائی) دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "وہ اور اس کا باپ دونوں گڈرئیے تھے۔ اور بدمعاشوں کی ایک ٹولی سے تعلق رکھتے تھے جن کے پلے عقل تھی نہ دین تھا" اور وہ اس کے لنگ کو جو اُس کے عرف کا سبب ہؤا ایک زخم سے منسوب کرتا ہے جو اُس نے بھیڑیں چُراتے ہوئے کھایا۔ اس کی ابتدائی ہمت آزمائیوں اور اُن مدارج کی تفصیل کے لئے جن کے ساتھ رفتہ رفتہ اس نے اپنی قوم میں سرگردگی حاصل کی ہمیں یہاں توقف کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) میں چوبیس سال کا ہؤا تو پہلی مرتبہ اُس نے نمود حاصل کی۔ دس سال بعد جب شعبان ۷۷۱ھ (مارچ ۱۳۷۰ء) میں اپنے حریف سلطان حسین کو مارنے میں کامیاب ہؤا۔ تو اُس نے صاحبقران کا لقب پایا۔ اگلے چھ یا سات برس اُس نے ماوراءالنہر میں اپنا تسلط

مضبوط کرنے میں صرف کئے اور ایران کی طرف اپنی پوری توجہ ۱۳۸۱ء کی

پہلی ایرانی مہم ۱۳۸۱ء

بہار سے پہلے معطوف نہ کی جبکہ اس کی عُمر ۴۵ سال تھی۔ اس پہلی مہم میں جو ایک سال کے اندر اندر ختم ہوگئی۔ اس کی توجہ خراسان تک محدود رہی۔ اندخود میں ایک کم وبیش سودائی درویش سے نیاز حاصل کرنے گیا جو بابا سنگو کہلاتا تھا[1]۔ اس مقدس لیکن مجنون شخص نے جب اس کے سر پر گوشت کا ایک ٹکڑا پھینکا تو اپنی ضعیف الاعتقادی سے جس نے اس کی درندہ صفت قوتِ عمل کے ساتھ عجیب طرح سے امتزاج پایا تھا تیمور نے اسے فتح ونصرت کی فال سمجھا۔ سرخس والوں نے اس کی اطاعت قبول کی اور تای آباد میں ایک اَور بزرگ زین الدین ابوبکر کی زیارت کرنے کے بعد اس نے بوشنج پر قبضہ کیا اور اسے تباہ کیا۔ اس کے بعد ہرات کی تسخیر ہوئی اور کُرت حکمران غیاث الدین پیر علی نے اطاعت قبول کی۔ پھر طوس، اسفراین (جو منہدم کیا گیا اس کے بہت سے باشندے قتل ہوئے) اور کلات کی باری آئی۔ اسکے بعد جاڑوں کے لئے تیمور واپس سمرقند اور بخارا چلا گیا*

۱۳۸۲ء کی ایرانی فوج کشی

اگلے سال (۱۳۸۲ء) کی بہار میں اس نے ایران کے خلاف اپنی جنگی کارروائیاں پھر سے جاری کیں۔ کلات میں جہاں اس نے پڑاؤ کیا سرخس سے اس کا بیٹا میراں شاہ اس سے آملا۔ اور ادھر ہرات سے غیاث الدین

---

[1] ظفرنامہ جلد اوّل صفحہ ۳۱*

کرت بھی آگیا جو اب اطاعت گزار ہو چکا تھا۔ اس مستحکم مقام کی ناکہ بندی کے بعد تُرشیز کی طرف بڑھا۔ وہاں کے حاکم نے بھی اطاعت قبول کی۔ یہاں فارس کے مظفری تاجدار شاہ شجاع کا ایلچی اس کے پاس حاضر ہوا۔ تیمور نے اپنے پوتے پیر محمد کے عقد کے لئے شاہ شجاع کی دُختر طلب کی۔ امیر ولی حاکمِ ماژندران کی اطاعت گزاری کے بعد تیمور جاڑے گزارنے اپنے دارالحکومت سمرقند کو لوٹا۔ وہاں کچھ عرصہ کے لئے اپنی بیگم دلشاد آغا اور بیگم کی بڑی بہن قتلغ ترکان آغا کی موت کے غم میں مبتلا رہا ؎

تیسری ایرانی یلغار ۱۳۸۳ء تا ۱۳۸۴ء

۱۳۸۳ء کی خزاں میں لامذہب مغلوں کے خلاف قمرالدین کا پیچھا کرنیکو اُس نے ایک لشکر روانہ کیا۔ اور خود پھر ایک بار ماژندران اور سیستان پر فوج کشی کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اکتوبر کے آخر میں سبزوار پر حملہ کیا۔ قلعے کے نیچے سرنگ لگائی اور اسے مسمار کردیا۔ اور کوئی دو ہزار اشخاص کو اسیر کیا۔ اور ان کو اُس نے اوپر تلے جوڑ کر تہیں جمادیں۔ گل و خشت کیساتھ انکو پیوستہ کردیا اور مینار بلند کردئے تاکہ لوگ اس کے قہر کی سطوت سے آگاہی پاکر دیوِ غرور کے دھوکے میں نہ آئیں اور اپنے تئیں ویل و ثبور کے گڑھے میں نہ گرائیں[۱]؎

فراہ کی تسلیم و اطاعت کے بعد اس نے زرہ پر حملہ کیا۔ کوئی پانچہزار

---

[۱] ظفر نامہ جلد اول ص ۲۶۰؛

آدمی بڑی سختی سے اس کے بچاؤ کے لئے لڑے۔ اکثر اُن میں سے کام آئے۔ اور اُن کے سر میناروں میں چنوا دئے گئے۔ دسمبر میں سیستان پر یلغار کر کے اسے فتح کیا۔ اور خزف سے لیکر گوہرِ شاہوار اور نفائسِ اجناس سے لیکر دیوار کی مینخ تک جو کچھ اس ملک میں تھا بادِ تاراج اس کو اُڑا کر لے گئی۔ اور برقِ غارت نے اس ولایت کے بیش و کم سب کو لپیٹ کر خشک و تر کو یکساں جلا ڈالا[1]۔ دو تین اَور قلعے سر کرنے اور دُشمنوں کی کھوپڑیوں کے اَور بہت سے مینار بنوانے کے بعد تیمور نے قندہار کو مسخّر کیا۔ قلعہ کی محافظ فوج کے سرِ لشکر کو پھانسی دی اور اپنے پایۂ تخت سمرقند کو چلا آیا۔ اور تین ماہ تک آرام کیا۔

اپنی زندگی کے بقیہ بیس سال میں تیمور تقریبًا ہر سال جن یورشوں میں مصروف رہا اُن کو تفصیل سے بیان کرنا ملال انگیز ہو گا۔ لیکن مجملاً وہ حسب ذیل ہیں:۔

سنہ ۷۸۶ھ (۵-۱۳۸۴ء) میں تیمور نے مازندران اور آذربائیجان پر دھاوا کیا۔ جاڑے کا موسم رَے میں بسر کیا۔ اور بہار سنہ ۱۳۸۵ء میں اپنی مہم آگے جاری کی۔ بحرِ خزر کے ساحلی علاقے اور سلطانیہ تک شمالی ایران کو زیر کر کے جاڑے کے لئے اپنے پایۂ تخت سمرقند کو لوٹ آیا۔

سنہ ۷۸۸ھ (۷-۱۳۸۶ء) میں جب تیمور نے ایران کا انتشار دیکھا

---

[1] ظفرنامہ جلد اول ص ۹-۳۶۸؛

تو ملک کی مکمل تسخیر کا عزم کیا اور اس کے خلاف ایک سہ سالہ فوج کشی پر نکل کھڑا ہؤا۔ پہلے ملک عزّالدین حاکمِ لُرستان کے خلاف لشکر بڑھایا۔ بروجرد اور خرم آباد کو تاراج کیا۔ اور اپنے بہت سے دشمنوں کو زندہ کھڑی چٹانوں پر سے نیچے گروا دیا۔ اس کے بعد تبریز کی طرف یلغار کر کے بڑھا۔ سلطان احمد جلائر نے وہاں مقابلہ کرنیکو لشکر جمع کیا تھا۔ لیکن جب تیمور قریب پہنچا۔ تو مآل اندیشی کو دلاوری سے بہتر سمجھا اور نخجوان کو بھاگ گیا۔ اور ایک خونریز جنگ کے بعد جان سلامت لیکر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ تیمور نے گرمیوں کا موسم تبریز میں بسر کیا۔ اور مفتوحہ شہر میں جتنے اہلِ حرفت اور کاریگر مل سکے ان میں سے نہایت باکمال صنّاعوں کا ایک انتخاب یہاں سے سمرقند کو روانہ کیا۔ خزاں میں اُس نے دریائے ارس کو پار کیا اور نخجوان کی طرف حملہ کیا۔ قارس کا مضبوط قلعہ سر کرنے کے بعد گرجستان کو غارت کیا۔ تفلس فتح کر کے شکار کی ایک بھاری مہم میں مشغول ہؤا۔ اس میں شکار اتنی افراط سے مارا گیا کہ اس کا اکثر حصّہ وہیں زمین پر پھینک آئے کہ سڑتا رہے[1]۔ اس کے بعد سرما کے پڑاؤ قراباغ کو لوٹ آیا؛

۱۳۸۷ء (۷۸۹ھ) کے موسم بہار میں تیمور نے اپنی مہم روم کے علاقے میں تازہ کی۔ بایزید، ارزروم، ارزنجان، موش، اخلاط اور وان کے شہر مسخر کیئے۔ سلماس اور ارمیہ کے حاکموں نے اطاعت قبول کی۔ خزاں میں فارس کے خلاف لشکر کشی کی جس کا سبب یہ ہؤا کہ مظفری سلطان

---

[1] ظفرنامہ، جلد اول ص ۴۰۴؛

زین العابدین نے اس کی خدمت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے رستے میں اصفہان پڑا۔ شہر میں داخل ہؤا اور اہلِ شہر پر بھاری جنگی محصول لگایا۔ اس پر بلوہ ہو گیا۔ اس میں تیمور کے اگاہی کرنے والوں اور کارپردازوں میں خاصے آدمی ہلاک ہو گئے۔ تیمور نے غضبناک انتقام لیا۔ اہلِ شہر کا قتلِ عام کرایا۔ جس میں حساب لگایا جاتا ہے کہ ستّر ہزار اشخاص فنا ہوئے۔ اُن کے سر گنے گئے اور بعد میں اُن کے کلّہ مینار بلند کئے گئے یہ ۱۸؍ نومبر ۱۳۸۷ء روزِ دوشنبہ کا واقعہ ہے[1]۔ پھر تیمور نے آگے شیراز کی

شیراز میں تیمور کی پہلی مداخلت

طرف کوچ کیا۔ اور یہ شہر اگلے مہینے (دسمبر ۱۳۸۷ء میں) مطیع ہو گیا۔

یہی وہ موقعہ ہے جس پر فرض کیا جاتا ہے کہ فاتحِ عظیم اور شاعرِ بزرگ خواجہ حافظ کی افسانوی ملاقات واقع ہوئی۔ دولت شاہ جو حکایت بیان کرتا ہے[2] حسبِ عادت صحت کی پرواہ نہ کر کے یہ ملاقات ۷۹۵ھ (۳-۱۳۹۲ء) سے منسوب کرتا ہے۔ جبکہ خواجہ حافظ کو انتقال کئے چار برس ہو چکے تھے یہ حکایت جو غالبًا بالکل من گھڑت ہے یوں ہے کہ تیمور نے خواجہ صاحب کو حضوری میں طلب کیا۔ اور ذیل کے شعر پر سرزنش کی ؎

اگر آن ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

---

[1] ظفر نامہ جلد اوّل، ص ۴۳۵؛

[2] دیکھو میری ایڈیشن کے ص ۶-۳۰۵ پر؛

تیمور نے کہا "اپنی شمشیرِ آبدار سے مَیں نے ربعِ مسکون کا اکثر حصّہ مسخر کیا۔ اور ہزاروں شہروں اور ولایتوں کو ویران کیا۔ صرف اس لئے کہ سمرقند و بخارا کو کہ میرے وطن اور تختگاہ ہیں آراستہ کروں اور تُو مردک ایک خال ہندوی ترک شیرازی کے عوض انکو بیچے ڈالتا ہے! خواجہ نے انتہائی تعظیم و آداب کے ساتھ عرض کی "حضور اسی فضول خرچی کا ثمرہ ہے۔ کہ ایسے بُرے دن مجھ پر آپڑے ہیں"۔ کہتے ہیں تیمور اس برجستہ جواب سے ایسا خوش ہؤا کہ نہ صرف شاعر کی تعزیر سے باز رہا بلکہ اسے معقول انعام سے مشرف کیا۔ اس قصّے کی ایک مختلف روایت بھی ہے جو مَیں نے ایران میں سُنی ہے لیکن کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔ اس کی رُو سے خواجہ نے جواب دیا۔ "لوگوں نے میرا شعر غلط نقل کیا ہے۔ مَیں نے یوں نہیں کہا تھا ؎

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

بلکہ یہ کہا تھا ؎

بخالِ ہندوش بخشم دو من قند و سہ خرما را

شرف الدین علی یزدی وغیرہ تیمور کے معاصر سوانح نگاروں کے ہاں اس قسم کی کسی ملاقات کا کوئی مذکور ایراد نہیں ہؤا ہے اور نہ مجھ کو اس کی تائید میں کوئی ثقہ شہادت ملی ہے۔

ہاں تو تیمور کے حملہ فارس کا ذکر تھا۔ مظفری شہزادہ زین العابدین جنوب مغربی ایران میں اپنے عمزاد شاہ منصور عاملِ شوشتر کے ہاں بھاگ گیا تھا۔ شاہ منصور نے قرابت کی بندھنوں کو توڑ مدارات کے تقاضوں

کو چھوڑ اُسے قید میں ڈال دیا۔ آلِ مظفر کے اکثر دُوسرے شہزادے، اتابکانِ لُرستان اور دیگر چھوٹے چھوٹے تاجدار شیراز پہنچے اور تیمور کے حضور میں حاضر ہوئے اور سب نے اپنی اپنی فرمانبرداری کا اظہار کیا۔ لیکن اس فیروزمندی کے لمحے میں بھی فاتح کے پاس ایک ایلچی آیا جس نے سمرقند سے شیراز تک کی طویل مسافت سترہ روز کے ناقابلِ یقین قلیل عرصے میں طے کی تھی۔ اور اس نے خبر لا کر دی کہ سرکش توقامش نے ایک تازہ بغاوت کھڑی کی ہے اور ضرورت ہے کہ تیمور اپنے مُلک کو بچانے کے لئے خود وہاں پہنچے۔ چنانچہ فروری ۱۳۸۸ء میں وہ فوراً سمرقند کی جانب روانہ ہوا اور متاعِ غنیمت کے جزو کے طور پر فاضل سید شریف جرجانی کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔ مظفری شہزادوں میں شاہ یحییٰ، سلطان محمد، سلطان احمد اور سلطان ابو اسحٰق کو بالترتیب شیراز، اصفہان، کرمان اور سیرجان کا والی مقرر کر گیا۔

اگلے چار برس تیمور ایران کو چھوڑ کر توقامش، قومِ مغول، سلطنتِ خوارزم یا خیوا اور دیگر شمالی اقوام کے خلاف مصروفِ جنگ رہا۔ اور ایران کو اس کی توجہات سے مختصر سی فراغت نصیب رہی۔ گو ایک بغاوت جو ۱۳۸۹ء کے موسمِ گرما میں خراسان سے اُٹھی (اور بظاہر جس کی تحریص اس خبر سے ہوئی کہ تیمور توقامش کے ہاتھوں شکست کھا گیا) حسبِ معمول اسی خونی اور وحشیانہ انداز میں میرانشاہ نے فرو کی۔ خصوصاً طوس میں جہاں کوئی دس ہزار اشخاص قتلِ عام میں مارے گئے۔ اور اُنکے سر میناروں میں چُنوا دِئے گئے۔

کچھ تاخیر کے بعد جو ایک خطرناک بیماری کے سبب واقع ہوئی سلخ جولائی ۱۳۹۲ء کو جنوب میں اپنی ایک اَور غازنگرانہ مہم پر تیمور نے ایک بار پھر دریائے جیحوں کو پار کیا۔ یہ لشکرکشی جو یورشِ پنج سالہ کہلاتی ہے ان علاقوں پر مشتمل تھی: بحرِ خزر کے ساحلی صوبے، فارس (جہاں اس نے حسب مذکور بر صفحہ ۲۳۹ بالا سلاطینِ مظفری کا خاتمہ کیا) ارمن، گرجستان، عراق اور جنوبی رُوس، گورگان اور مازندران میں اُسے بعض بدعتی سیّدوں کے ساتھ سابقہ پڑا اُن میں سے اکثر کو اُس نے قتل کرا دیا۔ اور "ان علاقوں کو ان گمراہ مباحیوں[2] کے شرِ فساد سے نجات دی[3]"۔ شرف الدین نے ان کے عقائد کا جو حال لکھا ہے نہ واضح ہے اور نہ مفصل، لیکن بہت ممکن نظر آتا ہے کہ یہ لوگ حروفیوں کے بدعتی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں جن کا بانی فضل اللہ تیمور کے عہد میں رُونما ہُوا اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا رہا اور مارا گیا۔ وہ استرآباد کا متوطن تھا۔ ذرا آگے چل کر ہمیں فضل اللہ اور اس کے مذہب کے بارے میں اَور کچھ کہنا ہوگا۔

دسمبر ۱۳۹۲ء کے اواخر میں تیمور اپنی بیگمات اور بیٹوں پوتوں کی آمد و ملاقات کے بعد جنوبی ایران کو روانہ ہُوا۔ اور دامغان، سمنان رے، قزوین، سُلطانیہ، کُردستان ہوتا ہُوا ۱۴ فروری ۱۳۹۳ء کو بُروجرد

---

[1] ظفر نامہ جلد اول۔ ص ۵۶۱ بعد؛

[2] براؤن نے اس کا ترجمہ Communists کیا ہے (مترجم)؛

[3] ظفر نامہ جلد اوّل ص ۵۷۶-۷؛

پہنچا۔ رستے میں اُس نے بہت سے لُردوں کو تہ تیغ کیا۔ ۲ مارچ کو وزفول پہنچا۔ اور شوستر اس سے ایک یا دو دن بعد۔ یہاں سے شیراز کی راہ پکڑی رستے میں مضبوط قلعہ سفید سر کیا اور سلطان زین العابدین کو رہا کیا جسے شاہ منصور نے اندھا کرا دیا تھا۔ اس کے ساتھ اعزاز کا سلوک کیا اور شاہ منصور سے انتقام لینے کا وعدہ کیا۔ اس انتقام میں کچھ دیر نہ لگی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ چند دن بعد شاہ منصور لڑائی میں قتل ہؤا۔ اور آلِ مظفر کے اکثر باقی شہزادے ۲۲ مئی ۱۳۹۳ء کو تیمور کے حکم سے قتل کئے گئے، بقول شرف الدین "ممالکِ فارس و عراق کے تمام سب سے ہنرمند اہلِ حرفت اور پیشہ وروں کو تیمور نے سمرقند میں منتقل کر دیا[1]۔

۱۰ اگست کو تیمور جبکہ بغداد جا رہا تھا شیخ نور الدین عبدالرحمٰن اسفراینی اس کی خدمت میں سلطان احمد جلائر کی طرف سے ایلچی ہو کر حاضر ہؤا۔ کہ سلطان کی طرف سے بذاتِ خود حاضر نہ ہونے کا عُذر پیش کرے۔ تیمور نے اسکے اعتذار کو بُری نظر سے دیکھا۔ تاہم شیخ کو اعزاز و اکرام سے نوازا کہ از روئے ظفر نامہ (ص ۶۲۹) اربابِ علم و تقویٰ کیساتھ عادتاً وہ ایسے ہی سلوک کرتا تھا[2]۔ جلد ہی اسکے بعد بغداد میں داخل ہؤا اور سلطان احمد کے محلِ خاص پر قبضہ کیا۔ وہ مقابلے پر بھاگ نکلا۔ کچھ تیموری امراء تعاقب میں گئے۔ کربلا کے پاس مفرورین کو جا لیا۔ بہت سامالِ غنیمت اور سلطان احمد کی کچھ بیگمات اور کچھ بیٹے ہاتھ لگے۔ خود سلطان کامیابی سے نکل

---

[1] ظفر نامہ جلد اول ص ۵۸۷؛ [2] ایضاً ص ۶۱۹؛

بھاگا اسکے فرزند علاؤ الدولہ اس کی بیگمات اور بغداد کے منتخب باکمال اہلِ حرفت اور مشہور موسیقار خواجہ عبد القادر کو تیمور نے سمرقند بھیج دیا۔ الملک الظاہر برقوق سلطانِ مصر کی جانب ایک ایلچی بھی روانہ کیا کہ اس کے ساتھ دوستانہ اور تجارتی تعلّقات کا معاہدہ انجام پا جائے ؛

تیمور کی اگلی مہم تکریت کے مضبوط قلعے کی تسخیر تھی جس کی محافظت بڑی جانبازی سے کی گئی۔ لیکن بالآخر محافظین مغلوب ہوئے، مارے گئے اور اُنکے سروں کے کلّہ مینار تعمیر ہوئے۔ اپنی یلغار شمال کی طرف جاری رکھتے ہوئے کرکوک، اردبیل، موصل اور روحہ سے گذرا۔ جہاں طوفانی اور بارانی موسم نے اُسے آلیا۔ اس سے اور ملک عزّ الدین کی خودسری سے مجبور ہوکر اُسے واپس عراق آنا پڑا۔ قلیل عرصے میں اس باغی سردار سے نپٹ کر تیمور نے پھر شمال کا رُخ کیا اور قلعۂ ماردین کو سر کیا۔ قلعہ والی فوج کی خوش بختی تھی کہ اُن ہی دنوں تیمور کو اطلاع ملی کہ سلطانیہ میں ۲۲ مارچ ۱۳۹۴ء کو ایک پوتے کی ولادت ہوئی۔ یہ وہی شاہ رُخ کا بیٹا الغ بے ہے جو آگے چل کر مشہور ہوا۔ یہ مژدہ پاکر تیمور پر ایسی مسرت طاری ہوئی کہ قلعہ والوں کی جان بخش دی۔ جن کا مارا جانا بصورتِ دیگر یقینی تھا[1]۔ اس کے بعد اپریل میں آمد (دیارِ بکر) نے اس کے اسلحۂ ظفر مند کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔ لیکن قلعہ بندیوں کو ڈھانے کی کوشش کا ارادہ تیمور کو ترک کرنا پڑا۔ اسلئے کہ وہ بیحد مستحکم

---

[1] ظفر نامہ جلد اول۔ ص ۴۸۰؛

اور مضبوط تھیں[1]۔ اسکے بعد سیواس، موش، بتلیس، اخلاط اور ایدین کی طرف بڑھا۔ کچھ عرصہ اپنی بیگمات اور چھوٹے بچوں کے استقبال کیلئے صحرائے آلہ داغ میں رکا۔ اُدھر اپنے دشمن قرا یوسف اور اُس کے ترکمان ہوا خواہوں کے تعاقب میں ایک فوج روانہ کی۔ جولائی ۱۳۹۴ء کے آخر میں دریائے ارس کے بالائی حصے کے کنارے قلعۂ آونیک کو زیر کیا۔ اور اسکے حاکم مصر بن قرا یوسف کو سلطان عیسیٰ سابق والیِ ماردین سمیت سمرقند بھیج دیا۔ اس کے بعد گرجستان پر دھاوا کیا اور تفلس پر قبضہ کر لیا۔

ایران کی خوش قسمتی تھی۔ کہ اس موقع پر تیمور کے حریفِ دیرینہ توقتمش کی تازہ دھمکیوں سے پھر اسے اندیشہ پیدا ہؤا۔ اور اس پر فروری ۱۳۹۵ء[2] میں اسے اپنے ملک کے بچاؤ کے لئے شمال کی جانب کوچ کرنا پڑا۔ اس لشکرکشی نے اور اس کے بعد جنوبی رُوس کی یورش نے جس کے دوران میں وہ ماسکو تک جا گھسا تھا[3] اسے ایک سال سے زیادہ مدت کے لئے مصروف کار رکھا۔ اس کی غیر حاضری کے سبب اس عرصے میں ایران میں کئی بغاوتیں اٹھیں۔ مثلاً آذربائیجان میں قرا یوسف ترکمان کی بغاوت[4]۔ سیرجان میں گودرز (جو غالباً زرتشتی تھا) کی بغاوت[5]

---

[1] ظفر نامہ جلد اوّل صفحہ ۶۸۷؛ [2] ایضاً ص ۷۳۵؛ [3] ایضاً ص ۷۶۱؛
[4] ایضاً ص ۷۵۷؛ [5] ایضاً ص ۵-۷۸۴؛

سلطان محمد پسر ابو سعید طبسی کی اور بعض خراسانی سپاہیوں کی بغاوت کہ سابقاً یزد میں مظفریوں کے ملازم تھے - نیز نہاوند میں بہلول کی بغاوت - یہ سب بغاوتیں بہت جلد اور سختی سے دبادی گئیں اور آخر الذکر کا سرغنہ بہلول زندہ جلا دیا گیا۔[1] اگلا مہینہ رمضان کا تھا جو تیمور نے ہمدان رہ کر "طاعت و عبادتِ ذوالمنن اور پابندیِ وظایفِ صیام و قیام اور ہر طرح کے مذہبی فرائض و سنن کی ادای میں" بسر کیا - اس کے بعد اپنے سپہ سالاروں کو خوزستان سے ہرمز تک خلیج فارس کے تمام ساحلی ایران تسخیر کرنے کا حکم دیکر ۱۸ جولائی ۱۳۹۶ء کو خود سمرقند روانہ ہوا ؎

اب کی بار تیمور معمول سے کچھ زیادہ عرصہ اپنے دارالسلطنت میں آرام سے بیٹھا رہا - اور اس نے اپنی بہت توجہ سمرقند اور اس کے مضافات کو خوبصورت بنانے میں صرف کی - اس کے لئے "ان تمام ماہر مہندسوں اور معماروں" کی خدمات حاصل کی گئیں "جو شرق تا غرب تمام اقالیم و ممالک سے مستقرِ سریرِ سلطنت میں جمع کئے گئے تھے"۔[2] اس نے یکے بعد دیگرے بہت سی شاہانہ اور پر تکلف ضیافتیں بھی کیں - خاص خاص ضیافتوں میں ایک وہ تھی جو اس نے اپنے فرزند شاہ رخ کو ممالکِ خراسان و سیستان و مازندران (از فیروز کوہ تا رَے[3]) کی ولایت تفویض کرنے پر ترتیب

---

[1] ظفر نامہ جلد اول ص ۷۸۸ ؛ [2] ایضاً، جلد دوم ص ۶ ؛

[3] ظفر نامہ میں جہاں سے براؤن نے یہ اطلاع اخذ کی ہے "تا فیروز وکوہ رسے" لکھا ہے ملاحظہ ہو جلد اول ص ۸۰۹، (مترجم) ؛

دی۔ یہ جشن مئی ۱۳۹۷ء میں ہؤا[1]۔ ابھی ایک سال نہ گزرا تھا کہ ۱۳۹۸ء کی فصلِ بہار میں تیمور اپنی ہندوستانی یورش پر روانہ ہؤا۔ اس کے اسباب جیسا کہ ظفرنامہ میں بیان ہؤا ہے یہ تھے کہ وہ اسلام کو فروغ دینا اور بُت پرستی کو کچلنا چاہتا تھا۔ اور اس کو اس مسامحت اور رواداری کی اطلاعات پہنچی تھیں جو وہاں کے مسلمان حکمران اپنی ہندو رعایا اور ہمسایہ راجاؤں کیساتھ برتتے تھے۔ سلیمان کوہ کے افغانوں (یا اوغانوں) اور کافرستان کے "سیاہ پوش" کافروں کے ساتھ کچھ تمہیدی معرکہ آرائیوں کے بعد ۱۲ر محرم ۸۰۱ھ (۲۴ر ستمبر ۱۳۹۸ء) کو اُس نے دریائے سندھ پار کیا اور ہندوستان میں تیغ و آتش کا طوفان لیکر داخل ہؤا۔ ہماری اغراض کے لئے ان کارروائیوں[2] کا تفصیلی تتبّع غیر ضروری ہے۔ وہی خونریزی اور وحشیانہ مظالم ان کی خصوصیات تھیں۔ ان میں بدترین حرکت ایک لاکھ ہندوستانی قیدیوں کا بے باکانہ قتلِ عام ہے۔ جو دہلی کے قریب ۱۲ر دسمبر ۱۳۹۸ء کو کیا گیا[3]۔ اس بے پناہ جُرم کے آگے وہ دہشت ناک اقدامات جو کچھ روز بعد دہلی میں صادر ہوئے اور دس ہزار اشخاص کا وہ قتلِ عام جو ایک ماہ پہلے بھٹنیر میں واقع ہؤا سب بالکل بے حقیقت ہو جاتے ہیں ٭

ایران سے وہاں کی شورشوں کی اطلاعات تیمور کو پہنچنے لگیں خصوصًا آذربائیجان سے۔ اس اہم صوبے کی ولایت اس کے بیٹے میراں شاہ کے

---

[1] ظفرنامہ، جلد اوّل، ص ۲-۸۰۳؛ [2] ایضًا، جلد دوم، ص ۱۵؛
[3] ایضًا ص ۹۲؛

سپرد تھی۔ اس کی مخبوط الحواسیاں تباہی کے سامان پیدا کر رہی تھیں۔ اُن کی وجہ بالعموم یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ گھوڑے سے گرا۔ اور سر پر چوٹ لگی۔ غرض تیمور کو اپنی ہندوستانی مہم ۱۳۹۹ء کے شروع میں ناتمام چھوڑ کر اپنے ملک کی طرف بھاگنا پڑا۔ واپسی پر اسی سال ۸ر مارچ کو دریائے سندھ عبور کیا۔ یعنی آغازِ مہم میں اس دریا کو پار کرنے کے پانچ ماہ اور سترہ روز بعد۔ تین ہفتے کے سفر کے بعد دریائے جیحوں کو پار کیا۔ ۷ر اپریل کو اپنے مولد کش یا شہرِ سبز پہنچا۔ اور اپنے دار السلطنت سمرقند میں ۲۷ر اپریل کو داخل ہؤا۔ بارہ روز بعد (۹ر مئی ۱۳۹۹ء کو) اُس نے عالیشان مسجدِ جامع کا سنگ بُنیاد رکھا۔ اپنے پایۂ تخت کی تزئین کے لئے وہ مدت سے اسکی تعمیر کا ارادہ رکھتا تھا ؛

۹ر ستمبر ۱۳۹۹ء کو تیمور نے پھر سمرقند سے باہر قدم نکالا۔ اور آذربائیجان چلا جہاں سے اسکے بیٹے میران شاہ کے ڈانواں ڈول طریقِ عمل کی تازہ خبریں اس کے پاس پہنچی تھیں۔ اور جملہ حالات تیمور کی توجہ کا پُر اصرار تقاضا کر رہے تھے۔ رَے کے قریب ایوانک میں اسکا بیٹا شاہ رُخ اور ایک اَور فوج جو اس نے ماژندران کے رستے بھیجی تھی اس سے آملے۔ میراں شاہ کو باپ کے پڑاؤ پر آنے کی ترغیب دی گئی کہ اپنی کج روی کی جواب دہی کرے۔ اس میں محاصل کے ایک کثیر حصے کا ضائع یا غبن کرنا شامل تھا۔ دُوسرے اس نے محض شبہ پر چند دقیع اشخاص کو مروا ڈالا تھا۔ کہ انکے خلاف اُس کے دل میں عناد پیدا ہو گیا تھا۔

نیز بعض تاریخی عمارتوں کو بلاوجہ تباہ کرا دیا تھا۔ اور اس کے علاوہ فاضل و مشہور وزیر اور مؤرّخ رشید الدین فضل اللہ کی لاش کھود کر یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر دی تھی۔ میراں شاہ کو سزا یہ ملی کہ باپ کے عتاب کا مورد ہؤا۔ اور اس کا اختیار جس کا اُس نے غلط استعمال کیا تھا۔ تمام تر اُسکے بیٹے ابوبکر کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا گیا۔ گو سلطنت اب بھی اُسی کے نام رکھی گئی۔ لیکن تیمور کی تیز تر ین آتشِ غضب چند مطربوں اور شاعروں پر گری جو میراں شاہ کے ندیمانِ خاص رہے تھے۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے میراں شاہ کے مزاج کو بگاڑا ہے۔ اور اس کی فضولخرچیوں کو ترقّی دی ہے۔ ان میں کئی اشخاص کو اس الزام پر موت کی سزا ہوئی اور قزوین میں یا اس کے پاس پھانسی دئے گئے۔ ان میں مولانا محمد قہستانی "کہ مختلف فنون کی مصطلحات سے پوری واقفیت رکھنے کے علاوہ شیوۂ نظم و نثر اور جد و ہزل میں یگانۂ دوران اور اعجوبۂ روزگار تھا[1]" قطب الدین نائی، حبیب عودی اور عبدالمومن گوینده[2] شامل تھے، بقول دولت[3] شاہ محمد قہستانی پھانسی کے تختے پر بھی اپنے مسخرے پن کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ قطب الدین نائی سے کہ وہ بھی اس بدنصیبی میں اس کا شریک تھا مخاطب ہؤا اور کہا "تم پادشاہ کی مجلس میں متقدّم تھے۔ یہاں بھی مجھ سے پہلے

---

[1] ظفر نامہ جلد دوم ص ۴-۲۱۳؛ [2] "گوینده" فارسی میں "قوّال" ہی کا لفظی ترجمہ ہے؛ (مترجم)

[3] راقم کی ایڈیشن کے صفحات ۱-۳۳۰۔ فصیحی کی نہایت نادر کتاب "مجمل" میں دو اَور اشخاص کے نام درج ہیں جن کو پھانسی دی گئی۔ یعنی خواجہ یحییٰ ترّاد اور اردشیر چنگی؛

آؤ" اُس نے جواب دیا" ارے بدبخت ملحد! یہاں تک تو تُو نے نوبت پہنچائی۔ اور اب بھی تُو لطیفہ گوئی سے باز نہیں آتا"! جب محمد قہستانی کے قتل کی باری آئی۔ تو اُس نے ذیل کا قطعہ کہا۔ جس میں تجنیس کی صنعت خوب ہے ؎

پایانِ کار و آخرِ دَور ست ملحدا
گر میروی وگرنہ بدست اختیار نیست
منصور[1] وار گر ببرندت بپای دار
مردانہ پای دار جہان پائدار نیست

تیمور نے اب جس یورش پر قدم اُٹھایا اور جس میں چند معرکۃ الآرا کارنامے شامل ہیں شرف الدین علی یزدی[2] نے اسے" یورشِ ہفت سالہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چونکہ یہ مہم ۸ محرم ۸۰۲ھ (۱۰ ستمبر ۱۳۹۹ع) کو شروع ہوتی ہے۔ اور تیمور واپس اپنے پایۂ تخت سمرقند محرم ۸۰۷ھ (جولائی ۱۴۰۴ع) میں پہنچتا ہے۔ پس یہ نام غلط الاطلاق سمجھا جانا چاہئے اس زمانے کے متعدد خونی کارزاروں اور تیمور کی شاندار کامرانیوں کے ملخص حالات بھی پرائس کی کتاب" نظرِ بازگشتہ بر وقائعِ گزشتہ[3]" کے

---

[1] مشہور صوفی جسے دسویں صدی عیسوی میں انا الحق! پکار اُٹھنے پر بغداد میں پھانسی یا سُولی دی گئی اسکا اصل نام حسین ابن منصور الحلاج تھا۔ ملاحظہ ہو راقم کی" تاریخ ادبیاتِ ایران" جلد اول صفحہ ۴۲۸ تا صفحہ ۴۳۷؛

[2] ظفر نامہ جلد دوم صفحہ ۲۰۶؛ [3] Chronological Retrospect لندن سے چار جلدوں میں شائع ہوئی (۱۸۱۱ع تا ۱۸۲۱ع) یہاں جس حصّے کا حوالہ دیا گیا ہے جلد ششم جزو اول صفحہ ۲۹۷ تا صفحہ ۴۶۳ ہے؛

۱۶۰ صفحات (تقطیع رُبعی) پر سمائے ہیں لہٰذا یہاں صرف اس مہم کے چیدہ واقعات کا بتانا کافی ہوگا؛

۱۳۹۹ء - ۱۴۰۰ء کا جاڑا تیمور نے دریائے ارس کے قریب قرا باغ میں گزارا - اور پیشتر اس کے کہ فصلِ بہار نے برف کو پگھلایا اُس نے ایکبار پھر گرجستان پر چڑھائی کی، ملک کو تاراج کیا، گرجوں اور عیسائی خانقاہوں کو مسمار کیا اور باشندوں کی زبردست تعداد تہ تیغ کی۔ اگست ۱۴۰۰ء میں اونیک، ارزروم، ارزنجان اور سیواس کی راہ رُوم کی سمت لشکر بڑھایا سیواس والوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا - آخر کار جب اُنھوں نے ہتھیار ڈال دِئے تو تیمور نے چار ہزار ارمنی اور عیسائی سپاہیوں کو زندہ زمین میں گڑوا دیا - لیکن مسلمانوں کی جان بخشی کر دی[1] - اس اثنا میں عثمانی سلطان بایزید یلدرم کے ساتھ اس کی ایک پر اشتعال مراسلت جاری تھی - تیمور نے اس سے مطالبہ کیا کہ سلطان احمد بغداد اور قرا یوسف ترکمان دونوں حوالے کر دئے جائیں - بایزید نے انکار کر دیا - کیونکہ یہ تو حال ہی کا ایک موقع ہے جب ترکوں نے اپنی اس روایت کو توڑا ہے - ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ ان کا دستور رہا ہے کہ مہمانوں کے ساتھ اس قسم کی دغا کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے رہے ہیں - مزید برآں جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے اس اعتراف کے بغیر چارہ نہیں کہ جن الفاظ میں بایزید نے انکار کیا - اُن کے لہجے نے اس حریفِ زبردست کی آتشِ خشم کو ٹھنڈا کرنے میں

---

[1] ظفر نامہ جلد دوم ص ۲۶۹؛

مدد نہ دی ہوگی۔ ادھر سلطانِ مصر الملک الناصر فرج کے ساتھ بھی تیمور کی ناچاقی ہوگئی۔ اس لیئے کہ اُس نے قاہرہ میں ادھر کے سفیر کو ناجائز طور پر دیر تک روکے رکھا۔ پس تیمور نے سمندِ یلغار کی باگ نہ صرف دو مغرور بادشاہوں کے سابقہ مقبوضات کی طرف موڑی بلکہ ممالکِ عثمانی و مصری اور ضمنی طور پر دیارِ شام کا رُخ کیا؛

حلب اور دمشق کی تسخیر

عین تاب فتح کرنے کے بعد تیمور نے اکتوبر ۱۴۰۰ء میں حلب کا محاصرہ کیا اور اُسے فتح کیا۔ اور دیگر مالِ غنیمت کے ساتھ اپنے مستقبل کے مؤرخ نظام شامی کو پکڑ کے سمرقند بھیج دیا۔ پھر باری باری حمص اور بعلبک کو زیر کرنے کے بعد دمشق کا محاصرہ کیا۔ یہاں ایک حشیشی نے الملک الناصر سلطانِ مصر کی شہ پر تیمور پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن ناکام رہا اور مارا گیا۔ دمشق والوں نے اطاعت قبول کی لیکن پھر سرکشی کی۔ دوبارہ یہ شہر مارچ ۱۴۰۱ء میں مسخر ہوا۔ اور وہاں کے لوگوں کو تاتاری فتنہ پردازی اور غارت گری کی بلائیں جھیلنے کے بعد تیمور کا نام خطبے میں داخل کرنا پڑا۔ تیموری لشکر کے ایک اَور حصے نے جنوب میں عکا تک ساحلِ شام کو تاخت کیا؛

بغداد کی تاخت

پھر تیمور نے اپنی توجہ بغداد کی طرف منعطف کی کہ منحرف سلطان احمد جلائر کا دار السلطنت تھا۔ اس پر قبضہ کر چکا تو اپنے بہت سے ممتاز منصبداروں کے انتقام میں جو محاصرے میں کام آئے تھے ۲۰ر جون ۱۴۰۱ء کو اُس نے ایک

قہر آمیز قتلِ عام کیا۔ ہر سپاہی کو ایک سر لانے کا حکم ملا[1] اور بالفاظِ شرف الدین علی یزدی "بازار انتقام ایسا گرم ہوا کہ دلّالِ اجل نے پیرِ ہشتاد سالہ اور طفلِ ہشت سالہ کو ایک ہی دام پر بیچا اور قہر کا تنّور ایسا بھڑکا کہ منعمِ صاحبِ مال اور فقیرِ بدحال کا ملبوسِ ہستی یکساں جل کر راکھ ہو گیا"[2]

میّت کدۂ بغداد کو دخان و آتش کے عالم میں چھوڑ کر تیمور نے پھر نشامت کے مارے گرجستانیوں کا رُخ کیا۔ حتّٰی کہ جاڑے کی آمد آمد نے اسے سرما کے پڑاؤ قراباغ جانے پر مجبور کیا۔ فروری ۱۴۰۲ء کے اواسط میں اس نے عثمانی سلطان بایزید پر حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس کی جانب

جنگِ انگوریہ

سے تیمور کو ایک اَور گستاخانہ خط موصول ہوا جس نے اس کے سمندِ قہر پر تازیانے کا کام کیا۔ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء کو انگورا کی یادگار جنگ ہوئی۔ جس میں عثمانی تُرکوں کو فاش شکست ہوئی۔ اور سلطان بایزید "یلدرم" گرفتار ہوا۔ وہ مشہور قصہ کہ تیمور نے اسے ایک پنجرے میں بند کیا اور جہاں جاتا ساتھ لئے پھرتا اب بالعموم مشتبہ ٹھہرایا گیا ہے[3]۔ میرے خیال میں اس کا کوئی مذکور شرف الدین علی یزدی

---

[1] بروایت ابن عربشاہ تیمور کی سپاہ کی تعداد اس موقعہ پر بیس ہزار تھی؛

[2] ظفر نامہ جلد دوم ص ۳۶۷؛ [3] تاہم پروفیسر ایچ اے گبنز H. A. Gibbons نے اپنی دلچسپ تصنیف "عثمانی سلطنت کی بنیاد" Foundation of the Ottoman Empire (آکسفورڈ ۱۹۱۶ء) میں اس قصے کو تسلیم کیا ہے۔ دیکھو ص ۲۵۵ پر ان کا طویل حاشیۂ ذیلی، جہاں اس امر پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے؛

اور تیمور کے دُوسرے ایرانی مؤرخوں کے ہاں نہیں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس قصے کی ابتدا ابنِ عربشاہ کے استعمال کردہ ایک جُملے سے ہوئی ہو۔ اس کے متعلق پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ وہ تیمور سے متنفّر تھا۔ اور اس کے اعمال کو ہمیشہ بدترین رنگ میں پیش کرنے کے درپے رہتا تھا۔ زیرِ بحث جُملہ یہ ہے:

وَقَعَ اَبْنُ عُثْمَانَ فِی قَنَصٍ، وَصَارَ مُقَیِّداً کَالطَّیْرِ فِی الْقَفَصِ،

(ابنِ عثمان ایک شکاری کے جال میں جا پڑا اور قید ہو گیا جیسے پرندہ قفس میں)؛

ضروری نہیں کہ ان الفاظ کا لفظی مطلب لیا جائے اور عین ممکن ہے کہ استعارۃً اور مقفّٰی عبارت کی ضروریات پوری کرنے کو برتے گئے ہوں شرف الدین صاف طور پر کہتا ہے[1] کہ جب بایزید دست بستہ بارگاہِ تیموری میں لایا گیا تو فاتح نے پچھلی سرتابیوں پر ملامت کی اور افسوس کا اظہار کیا۔ کہ مجھے ایک مسلمان کے خلاف جنگ کرنی پڑی جس نے اسلام کی ایسی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں پھر اسکو جتایا کہ اگر حال برعکس ہوتا تو یہی قدرت و استیلا جو اب مجھ کو نصیب ہوئے ہیں تم کو ملتے تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ اور آخر میں کہا کہ "رحمتِ حق سے مجھ کو جو نصرت و فیروزی عطا ہوئی ہے اس کے شکرانے میں مَیں تمہارے ساتھ اور تمہارے آدمیوں کے ساتھ بجز نیکی کے کچھ نہ کروں گا"۔

جو کچھ بھی ان اقوال کی حقیقت ہو بہر حال عثمانی تُرکوں کے خلاف لشکر کشی جاری رہی۔ مسکنِ شاہی بروسا اور "شہرِ کفّار" سمرنا پر حملے ہوئے۔

---

[1] ظفر نامہ، جلد دوم، ص ۹-۴۳۸؛

اور دونوں ویران کئے گئے۔ مؤخر الذکر کی تباہی دسمبر ۱۴۰۲ء میں واقع ہوئی۔ اور ذرا بعد ۲۶ر فروری ۱۴۰۳ء کو بدنصیب بایزید قید میں شکارِ قضا ہؤا۔

مصری سلطان الملک الناصر نے دیکھا کہ ترکوں پر کیا گزری ہے۔ تو اپنا سابقہ متمردانہ رویّہ چھوڑ دیا۔ تیمور کے ایلچی کو رہا کر دیا۔ اور انگورا میں

مصری سلطان الملک الناصر کی اطاعت گزاری

فاتح کے پاس ایک سفارت کے ذریعے اپنا اطاعت نامہ ارسال کیا۔ تیمور نے نہایت الطاف کے ساتھ اس سفارت کا استقبال کیا۔ اگست اور ستمبر ۱۴۰۳ء میں اُس نے پھر گرجستان پر حملہ کیا اور ایک مرتبہ پھر جاڑے کا موسم قراباغ میں گزار کر ۱۰ر مئی کو رَے پہنچا اور سمرقند جولائی ۱۴۰۴ء کے اخیر میں۔

یہاں ایک ماہ بعد ہسپانوی سفارت وارد ہوئی۔ اسکی قیادت

تیمور کے ہاں کلاویجو کی سفارت کا وُرُود

رائی گونزلز دو کلاویجو[1] کے سپرد تھی۔ کلاویجو ہمارے لئے ہسپانیہ سے سمرقند تک کا اور واپسی سفر کا پُرلطف حال اور تیمور کے بارے میں اپنے تأثرات کی دلچسپ کیفیت چھوڑ مرا ہے۔ اس روداد کا ایک انگریزی ترجمہ مرتبہ سر کلیمنٹس۔ آر۔ مارکھم[2] ۱۸۵۹ء میں ہیکلیوٹ

---

[1] Ruy Gonzalez de Clavijo

[2] Clements Markham

سوسائٹی نے شائع کیا تھا۔ کلاویجو ایک ایلچی محمد القاضی کی معیت میں جسے تیمور نے ہسپانیہ بھیجا تھا۔ اشبیلیہ سے جہاز پر روانہ ہوا۔ اس سفارت میں اسکے ساتھ گومز دو سالازار[1] اور ایک پادری فرے ایلونزو پائز سانٹا ماریا[2] نام شریکِ سفر تھے۔ قسطنطنیہ، طرابزون، ارزروم، خوی، تبریز، طہران اور مشہد کے رستے سفر کرتے ہوئے ہسپانوی ایلچی ۳۱ راگست ۱۴۰۴ء کو "سلطانِ بابل کے قاصد" کی معیت میں سمرقند پہنچا اور تیمور نے انکو روز دوشنبہ ۸ ستمبر کو باریاب کیا۔ اس وقت "ایک خوبصورت محل کے داخلے کے سامنے ایک شاندار دروازے میں بیٹھا تھا۔ اور زمین ہی پر نشست جمائی تھی۔ سامنے ایک فوارہ تھا جس کا پانی بہت بلند اُچھلتا تھا۔ اور فوارے کے حوض میں کچھ سُرخ سیب رکھے تھے۔ شہنشاہ چارزانو ہوکر ریشمی زردوز غالیچوں پر گاؤتکیوں کے بیچ میں بیٹھا تھا۔ ایک ریشمی جُبّہ پہن رکھا تھا۔ سر پر ایک بلند ریشمی کلاہ تھی۔ جس کی چوٹی پر ایک خاص قسم کا یاقوت تھا اور اس کے گرداگرد بیش بہا جواہر تھے۔" بوجہ کمزوریٔ بصارت سفیر اسکے بہت قریب لائے گئے کہ ان کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ عُمر اتنی ہوگئی تھی۔ کہ پلکیں بالکل نیچے ڈھلک آئی تھیں۔ سفیروں سے بہ لطف و عنایت پیش آیا۔ اور پُوچھا "میرے فرزند بادشاہ کا کیا حال ہے؟ صحت تو اچھی ہے؟" پھر امرا سے مخاطب ہوا جو چاروں طرف ایستادہ تھے اور کہا "دیکھو

---

[1] Gomez de Salazar

[2] Fray Alonzo Paez de Santa Maria

میرے فرزند شاہِ ہسپانیہ کے سفیر آئے ہیں جو فرنگیوں کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور دُنیا کے پرلے سرے پر رہتا ہے۔ فرنگی واقعی بڑے جلیل القدر لوگ ہیں۔ مَیں اپنے فرزند شاہِ ہسپانیہ کے حق میں دُعائے خیر کہونگا یہی بہت تھا کہ وہ تم لوگوں کو خط دیکر میرے پاس بھیج دیتا اور تحائف رہنے دیتا۔ مجھے اس کی تندرستی اور اقبالمندی کی خبر سُن کر ہی بڑی تسلّی ہوئی ہے ؟؟

تیمور کے دربار اُسکی دعوتوں اور اُس کے "عدل" کا حال کلاویجو کے قلم سے

اس باریابی کے بعد ہسپانوی ایلچیوں کی بہت سی دعوتوں میں ضیافت ہوئی جن کی مفصّل کیفیت کلاویجو نے بیان کی ہے اور اُس نے کئی مرتبہ تیمور کو دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شراب اور گوشت جس مقدار میں صرف ہوتے اُسے اور اُن لوگوں کی متواتر بدمستی کو دیکھ کر یہ فرنگی بہت حیران ہوئے۔ کلاویجو لکھتا ہے :۔ میخواری کا یہ عالم تھا کہ کچھ لوگ اُس کے " (یعنی تیمور کی بیگم کانیو کے) " سامنے مدہوش ہو ہو کر گر گئے۔ اسکو وہ بڑا عیش خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مخمور انسان نہ ہوں تو دُنیا میں کوئی لذت نہیں ہوسکتی :۔ ایک اَور موقع پر (۹ اکتوبر ۱۴۰۴ء کو) انہیں تیمور کی "عدل گستری" کا تماشا بھی دکھایا گیا :۔ جس جگہ سوداگروں نے اپنے خیمے گاڑ رکھے تھے وہاں اس نے پھانسی کے بہت سے تختے لگانے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ اس تقریب میں مَیں خُوب سمجھتا ہوں

کہ کیونکر بعضوں کے ساتھ رحم اور مہربانی سے کام لوں اور دُوسروں کیساتھ سختی کروں"۔ اسی وقت کھڑے کھڑے اس نے وہاں علاوہ چند دُکانداروں کے جنہوں نے گوشت اصل قیمت سے زیادہ نرخ پر بیچا تھا۔ اور چند جفت سازوں کے، بُہت سے اعلےٰ صفات اشخاص کو پھانسی دلوادی۔ کلاویجو اضافہ کرتا ہے" دستور یہ ہے کہ جب کسی بڑے آدمی کو مارتے ہیں تو پھانسی دیتے ہیں لیکن کمینے طبقے کے لوگوں کا سر کاٹتے ہیں"۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دستور ازمنۂ وسطیٰ کے انگلستانی رواج کا معکوس ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایلچیوں نے تیمور کو یکم نومبر ۱۴۰۴ء کے بعد پھر نہ دیکھا۔ اس روز صُبح "وُہ اپنے خیمے سے باہر نہ نکلا کیونکہ اسکی طبیعت ناساز تھی"۔ "میرزاؤں" یا درباری دبیروں نے انہیں رُخصت ہونے کا حکم دیا۔ لیکن انہوں نے اس میں تأمّل کیا تا آنکہ تیمور سے ذاتی طور پر رخصت ہولیں۔ اور اپنے بادشاہ کے نام پیام وسلام حاصل کرلیں۔ تاہم بالآخر انہیں مجبور کیا گیا کہ مزید باریابی کے بغیر ہی کُوچ کریں۔ کیونکہ تیمور جیسا کہ اُن کو یقین دلایا گیا ایسا بیمار تھا۔ کہ جان کا خطرہ درپیش تھا۔ غرض ۱۸ر نومبر کو یہ لوگ "سلطانِ بابل کے ایلچی" اور "ترکیہ کے سفیروں" کے ساتھ شہر سے روانہ ہوئے۔ شہر کے باہر ایک باغ تھا۔ تین دن اس میں بسر کئے۔ پھر ۲۱ر نومبر ۱۴۰۴ء کو وطن کی راہ پکڑی۔ ۲۸ر فروری ۱۴۰۵ء کو تبریز پہنچے۔ وہاں اور قراباغ میں عمر شیخ میرزا کے پڑاؤ پر رُکنے سے اُن کو چھ مہینے دیر ہوگئی کہ ۲۲ر اگست سے پہلے تبریز

سے وطن کی جانب روانہ نہ ہو سکے۔ ارمن سے گزرے جہاں کے لوگوں کی بابت کلاویجو لکھتا ہے کہ "ارمن کے عیسائی بڑے بُرے لوگ ہیں۔ وہ سفیروں کو آگے نہ جانے دیتے تھے۔ جب تک اُنہوں نے اپنے املاک کا کچھ حصّہ ان کی نذر نہ کیا۔" اسکے بعد ۱۷ر ستمبر کو طرابزون پہنچے۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۴۰۵ء کو قسطنطنیہ، ۳ر جنوری ۱۴۰۶ء کو جنیوا، اور تقریبًا تین سال کی غیر حاضری کے بعد اسی سال یکم مارچ کو اپنے وطن ہسپانیہ میں سان لوکار[1] کے مقام پر پہنچ گئے۔

لیکن اس سفارت کے مذکورات ایرانی مؤرخوں کے ہاں بہت کم ملتے ہیں گو شرف الدین علی یزدی نے اس کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے[2] "اس اثنا میں ممالکِ افرنگ کے فرمان دہ کا ایک ایلچی پہنچا۔ جس نے طرح طرح کے فاخر ہدیات اور تحائف اور چند قسم کے تبرکات اور نذرانے پیشکش گزرانے لہذا ان جملہ "کچھ پردے تھے جو ایسی نقش و نگار اور تصویروں سے آراستہ تھے کہ مانی اُن کو دیکھتا تو اپنی مصوری پر شرمسار ہوتا۔" ان کی مصنف نے خاص طور پر تعریف کی ہے۔ اگلے صفحے پر اُس نے تیمور کی مرتبہ ایک دعوت پر ہسپانویوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور یہ مصرع اضافہ کیا ہے ع کہ خس نیز در بحر یابد گذر، اور کچھ صفحے آگے چل کر[3] اُن کی رخصت کا مذکور کیا ہے۔

اب تک تیمور بظاہر اپنی عارضی علالت سے شفایاب ہو چکا تھا۔

---

[1] San Lucar ؛ [2] ظفرنامہ جلد دوم ص ۵۹۸ ؛ [3] ایضاً ص ۶۲۳ ؛

اس گھریلو زندگی سے اُکتا گیا تھا اور نئی قسمت آزمائیوں کا مشتاق تھا۔ چنانچہ

تیمور چین کے خلاف لشکر کشی کرنے کی تیاری کرتا ہے

اس نے چین کے خلاف ایک فوج کشی کا تہیہ کیا تاکہ کافروں کے مندر تباہ کرے۔ دینِ برحق کی اشاعت کرے اور ضمناً اپنے تئیں اور اپنی فوج کو اس وسیع، قدیم اور دولت مند ملک کے متاعِ غنیمت سے مالدار بنائے۔ مہم کے لئے اور اپنی غیر حاضری میں اپنی وسیع سلطنت کے ضبط و نسق کے لئے تمام ضروری انتظامات کر چکنے کے بعد ۲۷ر نومبر ۱۴۰۴ء کو اُس نے سمرقند سے مشرق کی جانب کوچ کیا۔ جاڑا غیر معمولی طور پر شدید تھا۔ اور لشکر نے سردی کی بہت کچھ تکلیفیں اُٹھا کر منجمد دریائے سیحون کو عبور کیا۔ اور ۱۴ر جنوری ۱۴۰۵ء کو اُترار جا اُترا۔ ایک

تیمور کی بیماری اور وفات بتاریخ ۱۸ر فروری ۱۴۰۵ء

مہینے بعد تیمور بیمار پڑا اور گو مولانا فضل اللہ تبریزی نے اس کا علاج کیا جو اپنے زمانے کا حاذق ترین طبیب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بیماری بڑھتی گئی اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ حتیٰ کہ بالآخر ۱۸ر فروری ۱۴۰۵ء کو بیماری کے پہلے حملے کے ایک ہفتہ بعد جان جواب دے گئی اور موت نے آغوش میں لے لیا۔ اس وقت اس کی عمر اکہتر برس (قمری) تھی۔ اور چھتیس برس حکومت کر چکا تھا۔ اخیر دم تک حواس بجا تھے۔ اور اپنے پوتے پیر محمد جہانگیر کو ولی عہد و قائمقام نامزد کر کے اس نے اپنی وصیتیں ایک گفتار میں ظاہر کیں۔ جو

مکمل طور سے شرف الدین نے بیان کی ہیں[1]۔ مرتے ہوئے کلمۂ شہادت اس کی زبان پر تھا۔

تیمور کی سیرت کے مختلف نظریے

تیمور کی سیرت کو لوگوں نے مختلف طرح سے جانچا ہے۔ ایک وہ ہیں جن کی نظر اس کے فوجی کارنامے دیکھ کر خیرہ ہوتی ہے۔ اور دوسرے وہ ہیں جو اس کی فطرت میں سنگدلی اور انسانی زندگی کی انتہائی بے وقعتی دیکھ کر اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کسی فیصلے پر پہنچنے میں ایک تعیین بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آیا ہم مرجعِ استناد "تزکات" کو جن پر بہت بحث ہو چکی ہے اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ تیمور کے اپنے فلسفۂ سلطنت کی حامل ہیں، اصلی قرار دیتے ہیں یا جعلی۔ چنانچہ گبن باب ۵۵ کے ایک حاشیۂ زیریں میں کہتے ہیں[2] "میں تیمور کی دلپسند میانہ روی کا مذکور سننے کی توقع نہ رکھتا تھا۔ تاہم میں بعض جوشیلے قارئین کے فراخ حوصلہ جوش اور "تزکات" کے مرتب[3] کے ہاں اس سے بھی زیادہ گرمجوشی کو معاف کر سکتا ہوں"۔ گو اسی حاشیے کے اوپر متن میں خاصی سختی سے اس نے تیمور پر نکتہ چینی کی ہے اور اعتراف کیا ہے کہ "آخر میں شاید ہمیں یہی

---

[1] ظفر نامہ جلد دوم ص ۶۵۰-۷؛ [2] جلد ہفتم ص ۷۳-۴؛ (مترجم)

[3] مرتب سے مراد ڈاکٹر وائٹ ہیں جنہوں نے حسبِ مذکور "تزکات" کی ایک طبع شائع کی ہے۔ اس طبع میں انہوں نے جو دیباچہ لکھا ہے اس کے صٓ پر انہوں نے تیمور کی ستائش کرتے ہوئے اُسے "دلپسند اعتدال" کے وصف سے منسوب کیا ہے۔ گبن نے لطیف پیرائے میں اس سے اختلاف ظاہر کیا ہے؛ (مترجم)

کہنا پڑے گا کہ مغول شہنشاہ نوعِ بشر کے لئے ایک آفت تھا نہ کہ محسن"۔ سر جون میلکم کے نیچے تلے مشاہدات ہم اوپر نقل کر آئے ہیں[1]۔ مسٹر کلیمنٹس آر۔ مارکھم نے کہا ہے[2] کہ ہر چند تیمور کی فتوحات نسلِ آدم کے لئے بہت مصیبت کا سامان ہوئیں تاہم "وہ اس طرح کا بے درد ظالم نہ تھا جیسے عرب شاہ اور اسکے دوسرے بدخواہوں نے اُسے پیش کیا ہے"۔ اور "اس بات کی شہادت موجود ہے کہ محض ہوسِ ملک گیری سے بلند تر مقاصد اُس کے پیشِ نظر تھے۔ پھر اضافہ کیا ہے[3] کہ گو "تیمور کا نام اکثر چنگیز خان کے ساتھ ضم کیا جاتا ہے لیکن مؤخر الذکر محض ایک اکھڑ وحشی تھا۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ تیمور اسکے برخلاف اپنے زمانے اور اپنے مُلک کی تمام معلومات میں اچھی دستگاہ رکھتا تھا۔ جہاں تک تیمور کے واقعاتِ زندگی کا تعلق ہے وہاں تک اختلافِ رائے بہت کم ہے۔ اسکے قتلِ عام اور کلہ مینار اس کے شاگردوں یعنی شرف الدین علی یزدی اور نظامی شامی نے بھی قلمبند کئے ہیں اور اس کے بدگو ابن عرب شاہ نے بھی۔ فرق اتنا ہے کہ جہاں اُنہوں نے بے تکلف ان صفات کو "صفاتِ جلالیہ یا قہریہ" کہا ہے وہاں ابن عربشاہ اُن کو خبثِ شیطانی کے نتائج سے تعبیر کرنے پر مائل ہے اور یہ طرزِ خیال مجھے زیادہ معقول اور فطری معلوم ہوتی ہے۔ رہیں "ترکات" جو دہشت

---

[1] دیکھو اوپر ص ۲۶۹ ؛ [2] تاریخ ایران (History of Persia.) صفحہ ۲۱۹ ؛

[3] ایضاً ص ۲۲۰، نیز کلاویجو کی "سفارت بہ بارگاہِ تیموری" کے شروع میں ملحقہ "تیمور کی سوانح حیات بطورِ تمہید"۔ صفحہ iii ؛

انگیزی" کی پالیسی کا نیم فلسفیانہ اصول پیش کرتی ہیں۔ سو مَیں اس معاملے میں ریو کی مدلّل رائے کی طرف مائل ہوں کہ وُہ جعلی ہیں ؎

تیمور کا یہ مختصر تذکرہ ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اُن بعض مراسلات کا ذکر کیا جائے جو عثمانی سلطان بایزید اور تیمور کے درمیان اور بایزید اور بعض دُوسرے اشخاص کے درمیان صادر ہوئے۔ اُنکے متن سرکاری کاغذات کے ایک اہم مجموعہ معروف بہ "منشآت فریدون بے" میں محفوظ ہیں جس کی ایک عُمدہ طبع جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ (فروری ۱۸۵۸ء) میں قسطنطنیہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس تالیف کا مؤلّف احمد فریدون معروف بہ توقیعی اواسط قرنِ دہم ہجری (قرن سیزدھم عیسوی) میں اپنی تصنیف و تالیف کرتا رہا۔ علاوہ منشآت کے جو ۹۸۲ھ (۵-۱۵۷۴ء) کی تالیف ہے۔ اس نے نزہت الاخبار کے عنوان سے ایک تاریخ بھی رقم کی۔ منشآت کی جلد اوّل پیغمبرِ اسلام کے عہد (قرن ہفتم عیسوی) سے لیکر سولھویں صدی کے وسط تک کے منشآت پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ۶۲۶ بڑی تقطیع کے صفحات ہیں۔ صفحات ۱۱۸ تا ۱۴۲ پر وہ خطوط درج ہیں جو تیمور نے لکھے یا اُس کو یا اس کے متعلق لکھے گئے۔ ذیل میں ملاحظہ ہو:-

تیمور کے متعلق مراسلات کی فہرست

(۱) قرا یوسف کا خط سلطان بایزید کے نام۔ بزبان فارسی، تاریخ ندارد، راقم نے تیمور کے حملوں کا شکوہ کیا ہے جس کی توصیف وہ "مُسعِرِ آتشِ

ؕ فہرست مخطوطاتِ فارسی، ص۱۷۸؛

شر و مصیبت و مہیج سلسلۂ فتنہ و جسارت تیمورِ مقہور (أبَادَهُ اللهُ وَأَهْلَكَهُ)
کے الفاظ کے ساتھ کرتا ہے۔ بایزید سے امداد طلب کی ہے (صفحہ ۱۱۸ تا صفحہ ۱۱۹)

(۲) اوپر کے خط کے جواب میں بایزید کا خط یہ بھی فارسی میں ہے اور اس پر بھی تاریخ درج نہیں (صفحہ ۱۱۹)؛

(۳) تیمور کا خط بایزید کے نام، بزبانِ عربی، تاریخ درج نہیں ہے۔ نہایت متحکمانہ الفاظ میں مطالبہ کیا ہے کہ قرا یوسف اور سلطان احمد کو ہرگز پناہ نہ دی جائے۔ عثمانی سلطان کی نافرمانی کے خلاف متنبہ کیا ہے (صفحہ ۱۲۰ تا صفحہ ۱۲۱)؛

(۴) بایزید کا خط اوپر کے خط کے جواب میں۔ یہ بھی عربی میں ہے اور تاریخ اس پر بھی غائب ہے، (حمد کے بعد) یوں شروع ہوتا ہے "اے بھوکے کتے تیمور!" نہایت متمردانہ لہجے میں حملہ آور کی تحقیر کرتے ہوئے اُسے دعوت دی ہے کہ تجھ میں ہمت ہے تو آگے بڑھ، (صفحہ ۱۲۱)؛

(۵) سلطان احمد جلائرِ بغداد کا خط سلطان بایزید کے نام بزبانِ فارسی۔ غیر مؤرخہ۔ راقم بیان کرتا ہے کہ کیونکر وہ تیمور کی فتح بغداد و عراقین کے بعد حسبِ ہدایتِ بایزید ہٹ کر ملطیہ اور سیواس کی طرف چلا آیا کہ قرا یوسف کے پہنچنے کا انتظار کرے اور پھر کس طرح دونوں نے مل کر ازبکوں پر جو تیموری لشکر کے ہراول میں تھے حملہ کیا۔ انہیں شکستِ فاش دی اور ہلاک کیا۔ لیکن دونوں کو یقین کے ساتھ انتظار تھا کہ تیمور کو جب اس تباہی

۱؎ منشآت بہ سبب نایابی کے میری رسائی میں نہیں ہے۔ اس لئے میں خط کے اصل الفاظ نقل نہیں کر سکا۔ پروفیسر براؤن کے انگریزی ترجمے سے ترجمہ کر کے دے رہا ہوں، (مترجم)؛

کی خبر پہنچے گی تو پوری فوج کا حملہ ہوگا؛ (ص ۱۲۴ تا ص ۱۲۵)

(۶) اوپر کے خط کے جواب میں بایزید کا خط۔ اس میں اطلاع دی ہے کہ سلطان احمد کی خبر پہنچنے کے باعث اُس نے "تکفور" یا بازنتینی شہنشاہ کے ساتھ مصالحت کر لی ہے اور توقات کی طرف اقدام کیا ہے کہ تیموری حملے کی روک تھام کرے، (ص ۱۲۵)، مؤرخہ شعبان ۷۹۸ھ (مئی ۱۳۹۶ء)؛

(۷) بایزید کے نام تیمور کا دُوسرا خط، بزبان فارسی و غیر مؤرّخہ "سلامِ عتاب آمیز" کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس میں راقم نے اپنے چالیس سالہ دورۂ فتوحات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ کیونکر اب وہ بیواس کی طرف بڑھا ہے۔ اپنے مخالفوں کو ملطیہ اور ارسنوف کی تسخیر میں ناکام رہنے کا طعنہ دیتا ہے۔ بااین ہمہ اب بھی وہ صلح کرنیکو تیار ہے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے مناقشات "فرنگی کافروں" کو دست درازی کے منصوبے پورے کرنے کا تازہ موقع بہم پہنچائیں۔ آخر میں وہ اپنے تئیں ایلخانی خاندان کا فرد بتاتا ہے اور اپنی سلسلہ جنبانیٔ صلح کا جواب شتاب و مصالحت آمیز طلب کرتا ہے (ص ۱۲۶ تا ص ۱۲۷)؛

(۸) بایزید کی طرف سے اوپر کے خط کا جواب، یہ بھی فارسی میں ہے اور غیر مؤرّخہ ہے۔ راقم نے تُرکوں کی سپاہیانہ دلاوری کی ڈینگیں ماری ہیں۔ تیمور کو یاد دلاتا ہے کہ کیونکر اسکے مورث نے تین شہسواروں کے ساتھ دس ہزار "تاتاری اور مغولی کافروں" کو شکست فاش دی۔ اسی طرح اپنے اسلاف کے دوسرے شاندار کارنامے سُناتا ہے۔ محافظِ مومنین ہونے کا دعوٰی کرتا

ہے۔ اور لکھتا ہے کہ "اب تک آلِ عثمان کے کسی فرد نے اپنے غنیم کو خوشامد کے ذریعے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ مکر و فریب کا دامن پکڑا ہے" (ص۱۲۷ تا ص۱۲۸)؛

(۹) بایزید کے نام تیمور کا تیسرا خط، بزبانِ فارسی، تاریخ ندارد، قاضی فریدالدین اور ایک شخص نجاشی نام کے ذریعے فرستادہ ایک خط کی رسید دی ہے، اور دوستانے اور اتحاد کی خواہش ظاہر کی ہے۔ تیمور اپنی مہمِ شام کی طرف ایما کرتا ہے۔ سلاطینِ مصر کے اپنے آپ کو "سلطان الحرمین" کہنے پر معترض ہوتا ہے۔ اور سلطان احمد جلائر کے واپس بغداد چلے جانے کی شکایت کرتا ہے؛ (ص۱۲۸ تا ص۱۳۱)؛

(۱۰) اوپر کے خط کا جواب منجانب بایزید، بزبانِ فارسی، سابقہ خطوط کی نسبت یہ خط زیادہ شایستہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ لیکن راقم سلطان احمد جلایر اور قرا یوسف کی تحویل سے قطعی انکار کرتا ہے جو بقول اسکے عثمانیوں کی روایاتِ مہمان نوازی کے بالکل منافی ہے، وہ مصر میں خلفائے عباسی کی اولاد کے استمرار کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تیمور کو دعوت دیتا ہے۔ کہ اگر تمہاری نیتیں واقعی آمادۂ صلح ہیں تو سیواس کو چھوڑ دو (ص۱۳۱ تا ص۱۳۲)؛

(۱۱) بایزید کے نام تیمور کا چوتھا خط۔ اس میں اپنی راسخ العقیدگی اور مذہب اہلسنت کی پیروی پر اظہارِ فخر کرتا ہے۔ سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف کے اعمال پر ملامت کرتا ہے اور بایزید سے مطالبہ کرتا ہے کہ عثمانی علاقے سے اُن کو نکال دے اور خود معذرت کرے (ص۱۳۲ تا ص۱۳۴)

(۱۲) بایزید کا خط اوپر کے خط کے جواب میں، (صـ۱۳۴ تا صـ۱۳۵)؛

(۱۳) شاہ شجاعِ مظفری حکمرانِ شیراز کے بھتیجے شاہ منصور کے خطوط بایزید کے نام، بزبانِ فارسی، ذوالقعدہ سن ۸۰۲ھ (جون-جولائی سن ۱۴۰۰ء) کے بعد لکھے گئے۔ ان میں "ملاعنۂ چغتائی" کی شرانگیزی" اور "گنہگار و سرکش" تیمور کی فریب کاری اور عیاری کا تذکرہ ہے، (صـ۱۳۵ تا صـ۱۳۹)؛

(۱۴) بایزید کا خط اوپر کے خط کے جواب میں تیمور کو گالیاں دیتا ہے فارس اور شیراز میں اس نے جو غارتگریاں کی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ گو میں فی الوقت قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں لیکن میں تیاری کر رہا ہوں کہ تیمور پر حملہ کرنے کے لئے اسے ترک کردوں؛ (صـ۱۳۹ تا صـ۱۴۰)؛

(۱۵) بایزید کے نام تیمور کا پانچواں خط، مراغہ سے فارسی میں لکھا گیا۔ لیکن تاریخ اس پر درج نہیں۔ اپنی تسخیرِ بغداد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایک شعر نقل کرنے کے بعد جس کا مفہوم یہ ہے کہ سارے جہان کو حاصل کرنے کی خاطر ایک چیونٹی کو آزار پہنچانا بھی مناسب نہیں ہے۔ اشاروں کے پردے میں دھمکیاں دیتا ہے کہ اب بھی اگر تم میرے مطالبات پر کان نہیں دھروگے تو میں کیا کچھ کروں گا، (صـ۱۴۰ تا صـ۱۴۲)؛

فریدون بے کی محفوظ کردہ خط کتابت مابین تیمور و بایزید یہاں ختم ہو جاتی ہے؛

صرف یہ بات بیان کرنی باقی ہے کہ تیمور کی میت ۱۹ر فروری سن ۱۴۰۵ء

کو منجمد دریائے خجند کے پار پہنچائی گئی۔ اور اس کے چار روز بعد سمرقند میں دفن کی گئی۔ اور چین کی مہم اُن لوگوں کی خوش قسمتی سے بالآخر ترک ہی کر دی گئی ۞

بابِ پنجم

عہدِ تیموری کے شعراء اور مصنّفین

اس تعجب خیز لیکن مسلّم حقیقت کی طرف پہلے توجہ دلائی جاچکی ہے کہ کم سے کم ایران میں عُمدہ ترین شاعری بالعموم زبردست آشوب اور ابتری کے ایّام نے پیدا کی۔ بخلاف اسکے

ضروری نہیں کہ مُستحکم حکومت اچھّی شاعری کیلئے مساعد ہو

جو دور نسبتہً اقبالمندی کے گزرے ہیں اور جن میں خاکِ ایران ایک مضبوط اور استوار حکومت کے سایہ تلے رہی ہے ان میں شاعری کا میدان عموماً غیر معمولی طور پر بنجر ہے[1]۔ ذرا مقابلتہً جدید تر زمانوں میں آئیے تو ایران آپکو کبھی اتنا مستحکم، متحد اور بافروغ نظر نہیں آئیگا جتنا صفویوں کے زیرِ حکومت

---

[1] اوپر صد ۲۳۵ سے مقابلہ کیجئے ؂

(یعنی ۱۵۰۲ء تا ۱۷۳۶ء) اور بالخصوص سولھویں صدی کے دوران میں تھا۔ صرف فوجی قوّت، قومی اتحاد اور تجارت ہی پر موقوف نہیں۔ بلکہ فنون (بالخصوص فنِ عمارت اور مصوّری) اور علوم (بالخصوص دینیات) میں بھی یہ عہد خاص طور پر شاندار تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے ایک شاعر بھی بمشکل آپکو ملے گا جو زبردست طبّاعی یا عالمگیر شُہرت کا مالک ہو۔ اس حقیقت کے اسباب پر ہم اُس وقت بحث کرینگے جب عصرِ مذکور پر آئینگے۔ اس کے برعکس پچھلے باب سے بخوبی آشکار ہوگیا ہوگا۔ کہ یہ دور جس کے ادبی پہلوؤں سے اب ہمارا سابقہ ہے بدنظمی، مصائب اور خونریزی کا باب ہے۔ اس کے باوجود ستّر برس کا کوئی اَور ایسا زمانہ (۱۳۳۵ء تا ۱۴۰۵ء) پیش کرنا مشکل ہوگا جس میں اتنی کثیر تعداد نادرالطبع شاعروں کی نمودار ہوئی ہو۔ آسمانِ جوہر و ہنر پر ایک کہکشاں تھی جس کے کئی تابندہ ستاروں میں حافظ بزرگ کی حیثیت محض درخشندہ ترین ستارے کی ہے۔ غالبًا بہت سے چھوٹے چھوٹے درباروں کا قائم ہونا، ہر تاجدار کی یہ آرزو کہ دُوسروں کے مقابلے پر آئے اور بازی لے جائے۔ یہ حالات شاعرانہ استعداد کی نشوونما کے لئے مساعد ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک شاعر کو اگر ایک شاہی سرپرست کے ہاں قدرومنزلت نصیب نہیں ہوتی تو وُہ باآسانی کسی دُوسرے کو ڈھونڈ سکتا ہے جو اس کی زمزمہ سنجی سے زیادہ متأثّر ہو۔ دُوسری صُورت میں جہاں ایک ہی پایۂ تخت ہو ایک ہی دربار ہو وہاں ایک شخص بےنیلِ مرام رہے تو اغلب ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہمت پست ہوجائے۔ یا

کم سے کم اتنا ہو کہ وہ اپنے متصلہ حلقے سے باہر غیر معروف رہے۔ یہ ضرور نہیں کہ اس کی بے مرادی کا سبب اس کی بے ہُنری ہو۔ حالات کی عدم موافقت، بدنصیبی اور حاسدوں کی ریشہ دوانیاں زیادہ کام کرتی رہی ہیں۔

مغولی طاقت کے خاتمے سے لے کر تیمور کے طلوع تک ایران کی طوائف الملوکی

اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو جُوں ہی مغولی اقتدار ٹوٹا اُس وقت سے لیکر تیموری یورش تک ایرانی ہرجائی شاعروں کے لئے ایک خاطر خواہ بازار بن گیا۔ شمال مشرق میں شاہانِ کُرت تھے جن کا پایۂ تخت ہرات تھا؛ سبزوار اور اس کے نواح میں سربداروں کے شاہی خاندان کا (جسے شاہی کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے) تسلط تھا؛ فرمانروایانِ ایلخانی شیخ حسنِ بزرگ، اس کا بیٹا سلطان اویس اور اُن کے اخلاف ایک عجیب بیضوی شکل کی سلطنت پر حکمران تھے۔ جس کا شمالی پایۂ تخت تبریز تھا اور جنوبی پایۂ تخت بغداد؛ ادھر جنوبی ایران آلِ مظفر کے شہزادوں میں بٹا ہوا تھا جو اکثر ایک دُوسرے سے آزاد بلکہ باہم صف آرا بھی رہتے تھے۔ انکے پایۂ تخت شیراز، اصفہان، یزد اور کرمان تھے۔ ان مختصر ریاستوں کی کوئی واضح سرحدیں نہ تھیں۔ حکومتوں کے ان سیّال اور دائم الانتقال گھروندوں کا کوئی نقشہ تیار نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ یوں کہیئے کہ اگر ہم اس دور کے ایران کا سیاسی جغرافیہ پھر سے تعمیر کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی سات آٹھ مرکزوں کا تصور کرنا پڑیگا۔ جہاں سے اتنے ہی چھوٹے چھوٹے جنگجو تاجداروں کے

اثر و رسُوخ کی شعاعیں ہمیشہ بدلتی رہنے والی قوّت کے ساتھ پھیل رہی تھیں۔ اور یہ لوگ اپنی مبارزانہ سرگرمیوں کے ساتھ اکثر ایک لطیف ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔

اس دور کے شعراء میں کم سے کم کوئی دس شاعر ذکر کے مستحق ہیں۔ اس

اِس عصر کے شاعروں کی تعداد اور اُن کی فضیلت

حق کی بنا کہیں تو ان کی بدیہی ندرت اور حُسنِ کلام ہے اور کہیں وہ شہرت جو اُنہیں اپنے وطن میں نصیب ہوئی۔ یہ دو چیزیں باہم لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ لیکن دونوں میں سے کوئی ایک ہو میرے نزدیک وہ شاعر کو احترام آمیز ذکر کا سزاوار بناتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک غیر اہلِ زبان ناقد کو اپنے فیصلوں پہ کچھ عدم اعتماد بھی واجب ہے۔ اُسے یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ خواہ وہ کتنا ہی زور لگالے اُسے یہ اُمّید کم ہی ہوسکتی ہے کہ وہ باریک بین اور تمیز کرنیوالا ذوق اُسے حاصل ہوجائیگا جو اہلِ زبان کے ایک تربیت یافتہ ناقد کو میسّر آتا ہے۔ اور اُسے یہ یاد

غیر مُلکی ناقد کی نظر میں شاعروں کو پرکھنے کے معیار کیا ہونے چاہیئں

رکھنا چاہیئے کہ صرف یہی بات کہ ایک شاعر صدیوں تک اہلِ وطن میں مشہور رہا اُسے کم سے کم ایک تعظیم آمیز التفات کا حقدار بناتی ہے۔ غزلیہ شاعروں میں یہ بات خواجو کرمانی، عماد کرمانی اور کمال خجندی جیسے شعراء پر صادق آتی ہے جن کے بارے میں پڑھنے والا اس خیال پر مائل ہوسکتا ہے کہ یہ تینوں

محض حافظِ لاثانی کے مدھم عکس ہیں اور ان میں کوئی نمایاں جدت نہیں پائی جاتی لیکن یہ کبھی بھولنا نہیں چاہئے کہ ان میں پہلا شاعر خواجہ حافظ سے ۲۷ برس پہلے فوت ہوا۔ اور دوسرا ۱۸ برس پہلے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ اُنہوں نے خواجہ کے بلند تر کمالات کے لئے رستہ صاف کر دیا ہو۔ رہا تیسرا شاعر جو اُن کا معاصر تھا۔ سو اس کی فضیلت کی تصدیق کسی حد تک حافظ نے خود شعرِ ذیل میں کی ہے ؎

چون غزلہای تر و دلکشِ حافظ شنود
گر کمالیش بود شعر نگوید نخجند

دُوسری طرف عبید زاکانی اور بُسحق (ابو اسحاق) کے سے شاعر ایسی ندرت کے مالک ہیں کہ اپنے ملک میں ان کی قدر ہوئی یا نہیں لیکن فارسی ادبیات کا ایک متعلّم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا ؎

پس میری تجویز یہ ہے کہ اس باب میں شعرائے ذیل پر بحسابِ ترتیبِ زمان بحث کروں اور ان کی اضافی فوقیت کا کماحقّہٗ، اندازہ ناظرین پر چھوڑ دُوں کہ وہ اُن کے حقیقی محاسن دیکھ کر جسے چاہیں افضل قرار دیں۔ لیکن یہ زمانوی ترتیب صرف قریباً قریباً صحیح سمجھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اکثر حالتوں میں

اکثر فارسی تذکرہ نویسانِ شعراء کی غیر ثقتی

صرف تاریخِ وفات محفوظ ہے۔ (اور وہ بھی اکثر غیر متیقّن طور پر)، تذکرۂ دولت شاہ، آتشکدہ، ہفت اقلیم اور اسی قسم کی اور مشہور تصانیف میں چند شعراء کے متعدد ترجمے دئیے ہیں لیکن اُن کے

حالاتِ زندگی اور شمائل کے متعلق مستند اطلاعات کی قلّت ہماری تحقیق کی راہ میں یقیناً ایک بہت حوصلہ شکن پہلو ہے۔ اکثر حکایتیں جو ان کتابوں میں درج ہیں یا ادنیٰ ہیں یا جعلی۔ صرف کچھ معلومات ان شاعروں کے اپنے کلام سے چُنی جاسکتی ہیں لیکن یہاں آکر پھر اکثر یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ اُن کی تصانیف

دیوانوں کی محققانہ ایڈیشنوں کی کمی

کی بالکل صحیح تو درکنار کوئی قریب قریب محققانہ طبع بھی نہیں ملتی۔ چنانچہ بالآخر ہار تھک کر ہمیں یہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اکثر شاعروں کے حالات ہم واقعی بہت کم جانتے ہیں۔ عموماً یہ لوگ مفلس ہوتے تھے۔ معاصرین میں اکثر ان کی حیثیت بہت معمولی ہوتی تھی۔ اسلئے معاصر مؤرخوں نے اُنہیں بالکل نظرانداز کیا ہے۔ آئندہ نسلوں نے جب ان کی قدر پہچانی تو عموماً جو کچھ اُن سے بن آیا یہی تھا کہ چند کم و بیش ادنیٰ اور معمولی حکایتیں جوڑ کر اُن سے منسوب کردیں۔ اور کئی حالتوں میں صاف ظاہر ہے کہ یہ حکایتیں اُن کے کلام کی عبارات کی تشریح یا تمثیل کے لئے گھڑی گئی ہیں۔ البتہ ایک نادر قلمی کتاب "مجملِ" فصیحی خوافی[1] کے حق میں

---

[1] جہاں تک مجھے معلوم ہے یورپ میں اس تصنیف کے صرف تین نسخے موجود ہیں۔ ایک سینٹ پیٹرزبرگ (St. Petersburg) میں ہے جس کی کیفیت آنجہانی بیرن وکٹر روزن (Baron Victor Rosen) نے اپنی فہرست بہ عنوان "مجموعاتِ علمی" (Collections Scientifiques) جلد سوم (مخطوطاتِ فارسی ۲۷ء، صفحات ۱۱۱ تا ۱۱۳) میں، اور ڈورن (DORN) نے انجمنِ سلطانیِ علوم سینٹ پیٹرزبرگ کے مجلّہ شعبۂ تاریخ ولسانیات

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہمیں استثنیٰ سے کام لینا پڑیگا۔ وقائع کی یہ کتاب کوئی ایک ہزار صفحات پر حاوی ہے۔ ۸۴۵ھ (۲-۱۴۴۱ء) میں مرتب ہوئی۔ اس میں بہت سی مفید تفصیلات ایسی مہیا ہیں جو اَور کہیں نہیں ملتیں۔ خاصکر ان امور میں جن کا تعلق صوبہ خراسان سے بالعموم اور شہر ہرات سے بالخصوص ہے؛

اس عہد کے وہ شاعر جن پر میں بحث کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں مندرجہ ذیل ہیں:-

دس شاعر جن پر اس باب میں بحث ہوگی

(۱) ابنِ یمین (سن وفات ۷۴۵ھ = ۱۳۴۵ء از روئے تذکرہ دولتشاہ[1] یا ۷۶۹ھ = ۱۳۶۸ء زیادہ مستند کتاب "مجمل" کی رُو سے) سربدار خاندان سے وابستہ تھا؛

(۲) خواجو کرمانی (وفات ۷۵۳ھ = ۱۳۵۲ء یا از روئے تذکرہ دولت شاہ ۷۴۲ھ = ۲-۱۳۴۱ء)؛

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ): جلد دوم (Bulletin de la classe historico-philologique de l'Academic Imperiale des Sciences de St. Petersbourg میں بیان کی ہے۔ دُوسرا نسخہ سابقًا آنجہانی کرنل ریورٹی (Reverty کا مملوکہ تھا۔ اور اب اُمانتِ یادگار گِب" کے قبضے میں ہے۔ اس میں ایک وسیع رخنہ ہے یعنی ۸۱۸ھ تا ۸۴۰ھ کے حالات اس میں سے غائب ہیں۔ تیسرا جدید لیکن مکمل نسخہ سر البرٹ ہاوٹم شنڈلر کی ملک تھا۔ اور اب میرے پاس ہے۔ نیز دیکھئے اوپر ص۲۲۲، حاشیۂ زیریں ۲؛

[1] ملاحظہ ہوں سطور ۱۲ و ۱۳ ص۲۷۶، میری اڈیشن؛

(۳) عبید زاکانی۔ سب سے بڑا ہجو گو اور ہزلیہ تحریف نگار۔ (وفات ۷۷۲ھ = ۱۳۷۱ء) ۔

(۴) عماد کرمانی، (وفات ۷۷۳ھ = ۱۳۷۲ء) ۔

(۵) سلمان ساوجی، (وفات ۷۷۹ھ = ۱۳۷۸ء) مادحِ سلطان اویس ۔

(۶) حافظِ شیرازی، (وفات ۷۹۱ھ = ۱۳۸۹ء) ۔

(۷) کمال خجندی، (وفات ۷۹۳ھ = ۱۳۹۱ء یا ۸۰۳ھ = ۱۴۰۰ء) ۔

(۸) مغربی۔ صوفی شاعر (وفات ۸۰۹ھ = ۱۴۰۷ء) ۔

(۹) بُسحٰق (ابو اسحٰق) شیرازی معروف بہ اطعمہ یعنی طعامیات کا شاعر (وفات ۸۱۴ھ = ۱۴۱۶ء) ۔

(۱۰) نظام الدین محمود قاری یزدی معروف بہ البسہ یعنی لباسیات کا شاعر

ان شاعروں میں اب ہر ایک کو الگ الگ لیکر میں اس کا مفصّل تذکرہ لکھتا ہوں :۔

(۱) ابنِ یمین[1]

(امیر محمود ابنِ امیر یمین الدّین طغرائی)

گو اس شاعر اور اس کے باپ یمین الدین کے مذکورات ہفت اقلیم،

---

[1] جو صاحبان ابنِ یمین کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں ان کی توجہ آقائے رشید یاسمی کی تالیف "احوال ابن یمین" (مطبوعہ طہران، ۱۳۰۳ھ شمسی مطابق ۱۹۲۵ء) کی طرف دلائی جاتی ہے ؛ (مترجم) ۔

دولت[1] شاہ، آتشکدہ[2]، مجمع الفصحاء[3] اور دُوسرے تذکروں میں ایراد ہوئے ہیں لیکن اس کی بابت چند باتیں جو ہمیں معلوم ہیں بیشتر فصیحی کی نادر "مجمل" سے ماخوذ ہیں۔ اس تصنیف میں ابنِ یمین کا ذکر دو بار آیا ہے۔ پہلی بار ۷۴۳ھ (۳-۱۳۴۲ء) کے ذیل میں اور دُوسری بار ۷۶۹ھ (۸-۱۳۶۷ء) کے ذیل میں جو اس کا سنِ وفات ہے ؛

پہلی جگہ جہاں ذکر آیا ہے وہاں کی عبارت جہاں تک ابنِ یمین سے متعلق ہے درجِ ذیل ہے :-

مجملِ فصیحی میں ابنِ یمین کا مذکور

"زاوہ اور خواف کے مابین خواجہ وجیہ الدین مسعودِ سربدار اور شیخ حسن جُوری کے ساتھ ملک معزّ الدین ابو الحسین محمدِ کرت کی جنگ اور ۱۳ر صفر ۷۴۳ھ (= ۱۸ر جولائی ۱۳۴۲ء) کو خواجہ وجیہ الدین مسعود کے آدمیوں کے ہاتھوں شیخ حسنِ جُوری کی ہلاکت ؛

"آنجہانی امیر فخر الحق والدین محمود ابنِ یمین المستوفی فریومذی کے دیوان کا تلف ہو جانا کہ یہ جنگِ مذکور کی لُوٹ مار میں جاتا رہا۔ قطعہ یہ ہے (جس میں ابنِ یمین اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے) :-

بچنگالِ غارت گران اوفتاد وزان پس کسی زونشانی نداد

---

[1] راقم کی ایڈیشن ص ۲۷۲، ص ۲۷۵ تا ص ۲۷۷ اور ص ۳۵۹ ؛

[2] طبع سنگی بمبئی ۱۲۷۷ھ ص ۷ ؛

[3] طبعِ سنگی طہران جلد دوم ص ۲ تا ص ۵ ؛

امیر موصوف فخر الدین محمود (ابنِ یمین) نے ملک معزّ الدین ابو الحسینِ کُرت کو سبزوار سے ذیل کا قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

گر بدستان بستد از دستم فلک دیوانِ من
آنکہ او می ساخت دیوانِ شکرِ یزدان بامنست[1]

ور ربود از من زمانہ سلکِ دُرِّ شاہوار
لیکن از دردش نیندیشم چو درمان بامنست

ور ز شاخِ گلبنِ فضلم گُلے بر بُود باد
گلشنِ پُر لالہ و نسرین و ریحان بامنست

ور تہی شد یک صدف از لؤلوء لالا مرا
پُر ز گوہر خاطری چون بحرِ عمّان بامنست

قطرۂ چند از رشاشِ کلکم ار گم شد چہ شد
خاطرِ فیاضِ ہمچون ابرِ نیسان بامنست

آبِ شعرِ عذبِ من چون خاک اگر برباد رفت
سہل باشد چشمہ سارِ آبِ حیوان بامنست

گرچہ آمد دل بدرد از گشتنِ دیوان تلف
زآن چہ غم دارم چو طبعِ گوہر افشان بامنست

در ثنای شاہِ عالم ہمچو صیتِ عدلِ او
منتشر شد در جہان طبعِ ثنا خوان بامنست

---

[1] یعنی میری طبعِ رسا؛

گرچہ دیوانِ دگر ترتیب دانم کرد لیک
حاصلِ عمرم ہبا شد اندہِ آن با منست
بی عنایت گر بود گردُونِ دُون با من چہ باک
چون عنایت ہای شاہنشاہِ دوران با منست
خسرو عادل معزّ الدین کہ گوید قدرِ اُو
کز جلالت آنچہ می گنجد در امکان منست
معظمِ چاکر نوازی ہا کہ اندر کُلّ حال
شہریار عہد را از جملہ اقران با منست
آن بود کز لُطفِ او گوید مرا آزادہٴ
شاد باش ابنِ یمین کاجزای دیوان با منست
عمر شد در کامرانی تا ابد باد و بُود
وردِ من چاکر دعای شاہ تا جان با منست

"باوجودیکہ دیوان کی تلاش میں ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن دیوان کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ حتیٰ کہ اُس نے ماہرین کی بیاضوں اور شائقین کی یادداشتوں سے اپنا دیوان از سرِ نو مرتّب کیا۔ اور اس میں وُہ کلام بھی اضافہ کیا جو اس حادثے کے بعد تصنیف کیا گیا۔

کاشعار پراگندہ چو ہفت اورنگم[1]
مانندہٴ پروین بنظام آید باز"

---

[1] "ہفت اورنگ" یعنی دُبِ اکبر جسے فارسی میں "ہفت برادران" بھی کہا جاتا ہے۔ اور عرب "بنات النعش" کہتے ہیں۔

یہاں آکر مجمل میں ابنِ یمین کا پہلا مذکور ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں چودہ اشعار کا جو قطعہ منقول ہے شاعری کے لحاظ سے قابلِ ذکر نہ سہی لیکن جو معلومات بہم پہنچاتا ہے اُن کے باعث دلچسپ ہے۔

ابنِ یمین کی تاریخِ وفات مجمل میں ابنِ یمین کا دُوسرا اندراج بہت مختصر ہے اور اس میں صرف اس کی تاریخِ وفات ۸ر جمادی الثانی ۷۶۹ھ (۳۰ر جنوری ۱۳۶۸ء) مندرج کی گئی ہے اور اس کے آگے یہ تاریخ ذیل کے قطعے میں محفوظ ہے:

بود از تاریخِ ہجرت ہفت صد با شصت و نُہ
روزِ شنبہ ہشتمِ ماہِ جمادی الآخرین
گفت رضوان حُور را برخیز و استقبال کُن
خیمہ بر صحرائے جنّت برزند ابنِ یمین

اس کے بعد ذیل کی رُباعی[1] درج ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شاعر نے وفات سے ذرا پہلے کہی:

منگر کہ دلِ ابن یمین پُر خُون شد
بنگر کہ ازین جہانِ فانی چُون شد
مصحف بکف و چشم برہ روی بدوست
با پیکِ اجل خندہ زنان بیرون شد

---

[1] یہ رُباعی بہت خفیف اختلافات کے ساتھ دولت شاہ کے ہاں بھی درج ہے۔ ملاحظہ ہو راقم کی ایڈیشن ص ۲۷۶، سطور ۱۵ تا ۱۸؛

دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں شاعر کے والد اور خود شاعر دونوں پر ایک مقالہ لکھا ہے (بالترتیب ۵/۲۷۵ و ۲۷۷، طبقۂ پنجم) لیکن ضروری یا قابلِ اعتبار اطلاعات بہت کم فراہم کرتا ہے۔ گو اس نے (ہمارے شاعر

ابنِ یمین اور اُس کے والد کے متعلق دولتشاہ کی اطلاعات

کے والد) امیر یمین الدین فریومدی کا چودہ اشعار کا ایک نفیس قطعہ نقل کیا ہے اور اس کا سالِ وفات ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) لکھا ہے۔ بقول اسکے امیر یمین الدین ترکی الاصل تھا۔ مغول سلطان خدا بندہ کے عہد میں اُس نے فریومد آکر زمین واملاک خریدیں اور یہاں سکونت کی۔ یہیں بیٹا پیدا ہؤا۔ امیر یمین الدین کو خواجہ علاؤ الدین محمد کی سرپرستی و عنایت نصیب رہی کہ روزگارِ سلطان ابوسعید میں خراسان کا صاحب دیوان تھا اور ۷۳۷ھ (۷-۱۳۳۶ء) میں استرآباد کے پاس سربداروں کے ہاتھوں مقتول ہؤا۔ خود ابنِ یمین کی بابت دولت شاہ ہمیں کچھ نہیں بتاتا۔ بس اتنا کہا ہے کہ سربداروں کا مدحگر تھا۔ جو مشتبہ ہے۔ اور یہ کہ ۷۴۵ھ (۵-۱۳۴۴ء) میں اُس نے وفات پائی جو یقینی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس نے اس قحطِ اطلاع کی تلافی یُوں کی ہے کہ اصل موضوع سے ہٹ کر دس صفحے سربداروں کے ادنیٰ خاندان کی تاریخ پر لکھ ڈالے ہیں۔ جو پچاس سال حکمران رہا اور تیمور نے بالآخر ۷۸۸ھ (۱۳۸۶ء) میں اس کا خاتمہ کر ڈالا۔ ہفت اقلیم، آتشکدہ اور مجمع الفصحا عملاً کوئی مزید اطلاع بہم نہیں پہنچاتیں۔ صرف

اخیر الذکر تصنیف میں اتنا بیان ہؤا ہے کہ ابنِ یمین طغا تیمور کا ثنا گر تھا جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے ابنِ یمین کا دیوان تلف ہوچکا ہے۔ اس لئے یہ تعین ناممکن ہے کہ اس کے مربّی کون کون تھے۔ اور اس کے قصائد کا خاص مخاطب کون ہے ؂

ابنِ یمین کا پسماندہ کلام

ابنِ یمین کا محفوظ کلام اس کے مقطّعات پر شامل ہے۔ جن میں اکثر قطعے فلسفیانہ اخلاقی یا صوفیانہ مضامین کے ہیں۔ ۱۸۶۵ء میں کلکتہ سے ان کی ایک طبع شائع ہوئی تھی[1]۔ اور میرے پاس اس کا ایک دلکش اور احتیاط سے لکھا ہؤا نسخہ بھی ہے۔ جس کی تاریخِ کتابت ۵ رجب ۸۸۱ھ (۲۴ اکتوبر ۱۴۷۶ء) ہے۔ شیلختا وسہرٹ[2] کے قلم سے کئی قطعات کا جرمن ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے[3] ؂

ارتقائے رُوح پر ذیل کے لطیف اشعار ابنِ یمین کے بہترین اور مشہور ترین اشعار میں سے ہیں ؎

زدم از کتمِ عدم خیمہ بصحرائے وجود　　وز جمادی بنباتی سفری کردم و رفت

---

[1] ۱۳۱۸ھ شمسی ۱۹۴۰ء میں "دیوانِ قطعات و رباعیاتِ ابنِ یمین" کی ایک عمدہ طبع با تصحیح و مقدمہ آقای سعید نفیسی چاپخانۂ شرکتِ مطبوعات (طہران) سے تیار ہوکر شائع ہوئی۔ ایک غیر مؤرخہ سنگی طبع مطبع دار الاقبال بھوپال سے شائع ہوئی ہے؛ (مترجم)

[2] Schlechta Wssehrd

[3] "قطعاتِ ابنِ یمین" (Ibn Jemin's Bruchstucke) وی اینا (Vienna) ۱۸۵۲ء۔ تعدادِ صفحات ۱۹۱، اس میں ۱۶۴ قطعات کا ترجمہ شامل ہے؛

بعد از نیم کشش طبع بحیوانی بود | چون رسیدم بوی ازوی گزری کردم ورفت
بعد از آن در صدفِ سینۂ انسان بصفا | قطرۂ هستیٔ خود را گہری کردم ورفت
با ملائک پس از آن صومعۂ قدسی را | گرد برگشتم و نیکو نظری کردم و رفت

بعد از آن رہ سوی او بُردم و بی ابنِ یمین
ہمہ او گشتم و ترکِ دگری کردم و رفت

ارتقائے رُوح پر مثنوی رُومی کا ایک متوازی قطعہ

لیکن یہی خیالات ایسی ہی خوبی کیساتھ تصوف کے عظیم شاعر مولانا جلال الدین رُومی نے مثنوی کے ایک مشہور قطعے میں ادا کئے ہیں۔ مولانائے روم ابنِ یمین سے ایک صدی پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان کے زیر بحث اشعار یہ ہیں ؎

از جمادی مُردم و نامی شدم | مُردم از نامی بحیوان سر زدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم | پس چہ ترسم کی ز مُردن کم شدم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر | تا بر آرم با ملائک بال و پر
از ملک ہم بایدم جستن ز جو | کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ
پس عدم گردم عدم چون ارغنون | گویدم کانا الیہ راجعون[1]

---

[1] ٹینی سن (Tannyson) کی نظم (Locksley Hall) کے ان مصرعوں کیساتھ مقابلہ کیجئے:-

"Love took up the harp of life, and smote on all the chords with might;
Smote the chord of Self, that, trembling pass'd in music out of sight."

ابنِ یمین کا ایک اَور قطعہ

از برای دو چیز جوید و بس | مردِ عاقل جہانِ پُرفن را
یا از و سر بلند گردد دوست | یا کند پایمال دُشمن را
وآنکہ میجوید و نمی داند | کہ غرض چیست مال جُستن را
چیدہ باشد بمکنت خوشہ | دادہ زآن پس بباد خرمن را
غیرِ جان کندن و زخستن چیست | حاصلی ناشناسِ کودن را

ذیل کے قطعے کا تخیل مانوی[1] اور مالطوسی[2] قنوطیت کا صحیح نمونہ ہے

دانی چہ موجبست کہ فرزند از پدر | منّت نگیرد ارچہ فراوان دہد عطا
یعنی درین جہان کہ محلِ حوادث است | در محنتِ وجود تو افگندۂ مرا

اگلا قطعہ بھی ایک ایسے مسلک فکر کی نمائندگی کرتا ہے جو ابنِ یمین اور اس کے دبستان کے شاعروں کے ہاں مشترک ہے

خدائی کہ بنیاد ہستیت داد | بروزِ اُلست اندر افگند خشت

---

[1] مانی نے تیسری صدی عیسوی میں مانوی مذہب کی بنا ڈالی۔ اس کی رُو سے کائنات اور مادّے کا وجود میں آنا ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ اور اسکے وجود میں آنے کا سبب یہ ہوا کہ ذراتِ نُور ذراتِ ظلمت کیساتھ آمیزاں ہو گئے۔ اس مذہب کے نزدیک توالد و تناسل گویا اس آمیزش کو جاری رکھنا ہے۔ لہٰذا تاہل مستحسن نہیں؛ (مترجم) [2] مالطوس T. R. Malthus (المتوفی ۱۸۳۵ء) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ آبادی کا حد سے زیادہ تیزی سے بڑھنا تمدن کیلئے ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔ اسلئے ضبطِ نفس سے کام لے کر اسے روکنا چاہیئے؛ (مترجم)

گِلِ پیکرت را چہل بامداد | بدستِ خود از راہِ حکمت سرشت[1]
قلم را بفرمود تا بر سرت | ہمہ بودنیہا یکایک نوشت[2]
نزیبد کہ گوید ترا روزِ حشر | کہ این کارِ خوبست و آن کارِ زشت
ندارد طمع رُستنِ شاخِ عود | ہر آنکس کہ بیخ شترِ خار کشت
چو از خطِ فرمانش بیرون نیند | چہ اصحابِ مسجد چہ اہلِ کنشت
خرد را شگفت آید از عدلِ او | کہ آنرا دہد دوزخ این را بہشت

ولہٗ

مرد باید کہ ہر کجا باشد | عزتِ خویشتن نگہ دارد
خودپسندی و ابلہی نکند | ہر چہ کبر و منیست بگذارد
بطریقی رود کہ مردم را | سرِ موئی ز خود نیازارد
ہمہ کس را ز خویش بہ داند | ہیچ کس را حقیر نشمارد
سر و زر در طلب نہد آنگہ | تا مگر دوستی بدست آرد

ولہٗ ایضاً

کُنجی کہ درو گنجشِ اغیار نباشد | بر کس ز تو و بر تو ز کس بار نباشد

---

[1] احادیث میں درج ہے "خمّر اللہ تعالیٰ طینۃ آدم علیہ السلام اربعین یوماً" یعنی اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی مٹی کو چالیس روز گوندھتے رہے۔ دیکھو طبری جلد اول ص ۹۱؛

[2] ایک اور حدیث (طبری جلد اول ص ۲۹) کی رو سے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے "اِنّ اوّل ما خلق اللہ القلم فقال لہ اکتب فجری فی تلک الساعۃ بما ہو کائن"۔ "پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی قلم تھا۔ اللہ نے اس سے کہا "لکھ"۔ قلم اسی وقت وہ باتیں لکھنے لگا جو ہونیوالی تھیں"؛

رودی و سرودی و حریفی دو سه یاری باید که عدو بیشتر از چار نباشد
رودی و شرابی و کبابی و ربابی شرط است که ساقی بجز از یار نباشد
عقلست که تمیز کند نیک و بد از ہم او نیز درین کار بانکار نباشد
این دوست اگر دست دہد ابنِ یمین را
با ہیچ کسی در دو جہان کار نباشد

قطعۂ ذیل دراصل عربی کے چند مشہور اشعار کا آزاد ترجمہ ہے - جو قابوس ابن وشمگیر والئ طبرستان عہدِ حکومت ۹۷۶ء تا ۱۰۱۲ء) کی طرف منسوب ہیں اور الف لیلہ کی "حکایت التاجر والجنی" میں منقول ہیں[1] :-

ای دوستان بکامِ دلم نیست روزگار آری زمانہ دشمنِ اہلِ ہنر بود
سہلست اگر جفا کشم از دورِ بیوفا زحمت نصیبِ مردمِ والا گہر بود
بر آسمان ستارہ بود بیشمار لیک رنج کسوف بر دلِ شمس و قمر بود
رسمیست در زمانہ کہ ہر کم بضاعتی ز اہلِ ہنر بمرتبہ ہا بیشتر بود
دریا صفت کہ منصبِ خاشاک اندرو
بالای عقدِ گوہر و سلکِ دُرَر بود

---

[1] ملاحظہ ہو طبع میکناٹن (W. H. MacNaghten)، کلکتہ ۱۸۳۹ء - جلد اول ص ۱۱ - سطور ۱ تا ۸؛

(۲) خواجو کرمانی

(کمال الدین ابو العطا محمود ابن علی ابن محمود)

خواجو کرمانی گو تمام مشہور تذکروں مثلاً دولت شاہ[1]، ہفت اقلیم[2]، آتشکدہ[2] مجمع الفصحاء[3] وغیرہ میں خواجو کرمانی کے مذکورات موجود ہیں۔ مگر سب کے سب غیر معمولی طور پر تشنہ اور مفصل اطلاعات سے خالی ہیں۔ اور جہاں کہیں کوئی تفصیلی اطلاع دی گئی ہے اکثر استدلال سے غلط ثابت ہوتی ہے۔ واقعی جس بے احتیاطی سے یہ کتابیں تالیف اور نقل کی گئی ہیں بے حد افسوس ناک ہے۔ میں صرف ایک مثال لیتا ہوں۔ شاعر لغت نویس اور تاریخ نگار کی حیثیتوں سے رضا قلی خان کے کمالات کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ مجمع الفصحاء میں بیان کرتا ہے کہ خواجو سلطان ابو سعید خان کا مدحگر تھا۔ جس کا زمانۂ حکومت ۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ (مطابق ۱۳۱۶ء تا ۱۳۳۵ء) ہے۔ اور اسکے فوراً بعد اس کا سال وفات ۵۰۳ھ (۱۰-۱۱۰۹ء) درج کرتا ہے کہ بے احتیاطی کے سبب غلطی سے ۷۵۳ھ کی بجائے لکھا گیا ہے۔ دولت شاہ نے اس کا سنِ وفات ۷۴۲ھ (۲-۱۳۴۱ء) دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ کرمان کے ایک

---

[1] راقم کی ایڈیشن ص ۲۴۹ تا ص ۲۵۳؛

[2] طبع سنگی (بمبئی ۱۲۷۷ھ) ص ۱۰۹ تا ص ۱۱۰؛

[3] طبع سنگی (طہران)۔ جلد دوم ص ۱۵ تا ص ۱۸؛

عالی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی عمر کا صرف بہت تھوڑا سا عرصہ وہاں بسر کیا۔ گو چند اشعار میں جو اسی صفحے[1] پر نقل ہیں اور ظاہر ہے کہ بغداد میں کہے گئے اشتیاق و اُلفت کے ساتھ وطن کو یاد کرتا ہے

خوشا بادِ عنبر نسیمِ سحر — کہ بر خاک کرمانش باشد گذر
خوشا وقتِ آن مرغِ دستان سرای — کہ دارد در آن بوم ماوا و جای
زمن تا چہ آمد کہ چرخِ بلند — از آن خاکِ پاکم بغربت فگند
ببغداد بہرِ چہ سازم وطن — کہ ناید بجز دجلہ در چشمِ من[2]

ہفت اقلیم کی رُو سے خواجو نے اپنی سیاحتوں کے دوران میں بہت سے معاصر شعراء اور اُدباء سے آشنائی پیدا کی اور فاضل و مقدس شیخ رکن الدین علاؤ الدولہ سمنانی کا مُرید ہو گیا۔ دولت شاہ کے پاس سیرت کے اصل موضوع (خواجو) کے بارے میں معلومات قلیل تھیں اس لئے اُن کی تلافی یوں کرنی چاہی ہے کہ اسکے مرشدِ موصوف کے احوال کا خاکہ دیدیا ہے۔ ریو[3] کچھ اشعار نقل کرتا ہے جن میں ایک غیر معروف معاصر شاعر حید شیرازی نے خواجو پر شدید حملہ کیا ہے اور سرقے کا الزام دیتے ہوئے ایک ہجو

---

[1] طبع مذکور۔ ص ۲۴۹، س ۱۸ تا س ۲۱؛

[2] اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "دجلہ کے سوا آنکھوں میں کچھ نہیں آتا"۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنکھوں میں آنسو آتے ہیں تو کبھی دریا سے کم نہیں ہوتے۔ اور یہ بھی کہ بغداد میں بجز دجلہ کے کچھ نظر نہیں آتا؛

[3] فہرستِ مخطوطاتِ فارسی در عجائب خانۂ برطانوی ص ۶۲۳؛

میں اُسے "دُزدِ کابلی از شہر کرمان" کہا ہے۔ ایک اَور ہجو میں کہتا ہے ؎

مبر در پیشِ شاعر نامِ خواجو   کہ اُو دُزدیست از دیوانِ سعدی

چو نتواند کہ با من شعر گوید   چرا گوید سخن در شانِ سعدی

مجملِ فصیحی میں مجھے خواجو کا کوئی ذکر نہیں مل سکا۔ لیکن حمد اللہ مستوفی قزوینی

چیدہ تذکروں میں خواجو کے مذکورات

نے اپنی تاریخ گزیدہ میں جو ۷۳۰ھ (۱۳۳۰ء) میں مکمل ہوئی اس پر ایک مختصر مقالہ لکھا ہے[1]۔ اور اس کی ایک غزل نقل کی ہے جس سے ظاہر ہے کہ حینِ حیات ہی میں وہ کل ایران میں مشہور ہو چکا تھا۔ فرقۂ شیعہ کی مایۂ افتخار شخصیتوں کے جدید العہد لیکن وسیع تذکرے یعنی مجالس المومنین میں بھی خواجو کا ذکر آیا ہے لیکن اس شاعر کے معاملے میں سوائے دولت شاہ کا بیان نقل کرنے کے اس میں اَور کچھ نہیں کیا گیا ؛

خواجو کی زندگی اور تصانیف پر فون اردمان کا ناقدانہ تبصرہ

یہ بات قاعدۂ کلّیہ قرار دی جا سکتی ہے کہ فارسی شعراء کی سوانح لکھنے کا واحد تسلّی بخش طریقہ یہ ہے کہ وہ تمام اخبار آپس میں جمع اور مطابق کی جائیں جو شاعروں

---

[1] صفحہ ۸۱۸ طبع عکسی منشورہ در سلسلۂ یادگارِ گب (سلسلہ نمبر ۱۴ جلد اوّل)، نیز "تراجم شعرائے فارسی..... مشمولۂ تاریخ گزیدہ" پر میرا ایک مقالہ ملاحظہ ہو جو میں نے مجلّۂ انجمنِ ہمایونی ایشیائی بابت اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء و جنوری سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع کیا تھا یہی مقالہ الگ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا ہے۔ اسکے صفحات ۲۰-۲۹ ملاحظہ ہوں ؛

کی اپنی مصنفات سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ اور ان تصانیف کا مطالعہ اس غرض کے لئے پرانے اور صحیح نسخوں میں کیا جائے۔ کیونکہ چاپ سنگی کی بعض جدید اشاعتوں پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ اس کلیے سے چند متقدم شعرا مستثنیٰ کئے جا سکیں جو مغولی حملے سے پہلے ہو گزرے ہیں جبکہ اس یورش کے اثرات کے ساتھ ابھی ایران میں تاریخی تنقید کا علمی جوہر تباہ نہ ہوا تھا۔ متقدمین میں کئی شاعروں کے معاملے میں یہ طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً فردوسی، نظامی، انوری، خاقانی وغیرہ، خواجو اس لحاظ سے اپنے بہت سے معاصروں سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ کیونکہ آج سے کافی عرصہ پہلے ۱۸۴۸ء میں ڈاکٹر فرانٹس فون اردمان نے اس کا ایک مختصر احوال نامہ شائع کیا[1]۔ اس میں انھوں نے دولت شاہ کا مقالہ نقل اور ترجمہ کرنے کے بعد خمسۂ خواجو کی مختصر کیفیت بیان کی ہے اور چند مفید اطلاعات اضافہ کی ہیں جو خمسہ اور اس کے دیوان سے ماخوذ ہیں۔ میں یہاں ان اطلاعات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جس کے ساتھ میں نے ریو[2] کی مہیا کردہ مزید تفصیلات بھی شامل کر دی ہیں ۞

مثنوی "نوروز و گل" میں خود اپنے بیان کی رو سے شاعر ۱۵ شوال ۶۷۹ھ کو پیدا ہوا۔ اپنے دورۂ شاعری کی ابتدا میں اس نے اپنے تئیں کسی مظفری سلطان کے دربار واقع یزد سے وابستہ کیا۔ غالباً یہ سلطان

---

[1] مجلۂ انجمنِ شرقیِ آلمانی Z. D. M. G. بابت ۱۸۴۸ء، جلد دوم ص ۲۰۵ تا ۲۱۵؛

[2] فہرستِ مخطوطاتِ فارسی در عجائب خانۂ برطانوی ص ۲۰۵ تا ۲۱۵؛

مبارز الدین محمد بانیٔ خاندان ہے۔ آگے چل کر شیراز میں شیخ ابو اسحٰق (عہد ۷۴۲ھ تا ۷۵۴ھ (۱۳۴۱ء تا ۱۳۵۳ء) کے دربار کو اُس نے اپنا مرجع بنایا اور جیسا کہ فون اردمان کے دیئے ہوئے بعض قصائد کی مخاطبت سے ظاہر ہوتا ہے وہ شیروان شاہ اور قزل ارسلان سلطانِ عراق کے درباروں میں آتا جاتا رہا۔ اس کے علاوہ اوپر جو نظم نقل کی جا چکی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ اس نے کچھ زمانہ بغداد میں بھی بسر کیا۔ غرض ایسا معلوم ہے کہ وہ ایران کے بیشتر حصّے میں پھرتا پھراتا رہا۔ اور اپنے بعض معاصروں کی طرح لازماً کسی ایک خاندان کے دربار کا شاعر نہیں سمجھا جا سکتا۔

خواجو کا محفوظ کلام

خواجو کا کلام خمسہ اور ایک دیوان پر مشتمل ہے[1]۔ خمسہ پانچ عاشقانہ مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ کیمبرج میں اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں۔ البتہ عجائب خانۂ برطانوی میں اس کا ایک نفیس نسخہ نوشتہ ۷۹۸ھ (۱۳۹۶ء) موجود ہے[2]۔ دیوان میں قصائد (بعض مذہبی لیکن اکثر مدحیہ)، غزلیات، مقطعات، رباعیات، وغیرہ شامل ہیں۔ میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں۔ ایک تو خاصا جدید العہد

---

[1] پروفیسر تاج محمد خان صاحب نے کلیاتِ خواجو کی تدوین کی ہے اور انہیں ۱۹۲۹ء سے بأقساط اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر رہے ہیں۔ خمسہ مکمل ہو چکا ہے دیوان کے کچھ حصص باقی ہیں۔ انہوں نے اسی سلسلے میں خواجو کے حالاتِ زندگی اور اسکی تصانیف پر ایک مفید تبصرہ بھی کیا ہے۔ (مترجم)

[2] Add. 18,113 اس کے متعلق ریو کے مشاہدات ان صفحات پر دیکھیے جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔

ہے اور دوسرا "درویش حافظِ شیرازی" کے ہاتھ کا لکھا ہؤا ہے۔ اس کی تاریخِ کتابت ۸۹۹ھ (۴-۱۴۹۳ء) ہے۔ کاتب لامحالہ خواجہ حافظ نہیں ہیں کہ اس سے ایک صدی قبل فوت ہوئے) یہ نسخہ بیس سال ہوئے مَیں نے فیئٹ ہیوز لائبریری[1] کی فروخت میں خریدا تھا۔ اس کے ایک سابق مالک نے اس کے مشمولہ اشعار کی تعداد شمار کر کے تقریبًا چار ہزار بتائی ہے؛

پانچ مثنویاں جو مل کر خمسہ بنتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

خمسۂ خواجو

(۱) نوروز و گُل۔ اس کے موضوعات ڈاکٹر فون ارد مان نے مختصراً بیان کئے ہیں اور اسکے ابیات کی تعداد ۲۶۱۵ بتائی ہے؛

(۲) ہمای و ہمایوں۔ بظاہر یا سلطان ابوسعید (۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ مطابق ۱۳۱۶ء تا ۱۳۳۵ء) کے نام معنون ہے یا اس کے وزیر غیاث الدین محمد کے نام۔ اس میں ۳۲۰۳ ابیات ہیں جیسا کہ ریو نے ثابت کیا ہے۔ یہ مثنوی بہ ۷۳۲ھ (۲-۱۳۳۱ء) بغداد میں لکھی گئی؛

(۳) کمال نامہ، ۷۴۴ھ میں تصنیف ہوئی۔ شیخ ابو اسحٰق امیر فارس کے نام معنون ہے جو اس سے صرف دو سال قبل تخت پر بیٹھا تھا؛

(۴) روضۃ الانوار[2]۔ تصوّف کی مثنوی ہے۔ پچھلی مثنوی سے

---

[1] Fiott-Hughe's Library

[2] مطبع مجلس۔ طہران سے ۱۳۰۶ھ شمسی مطابق ۱۹۲۷ء میں چھپ کر نشر ہوئی؛ (مترجم)

ایک سال پہلے یعنی ۷۴۳ھ (۳-۱۳۴۲ء) میں شیخ ابو اسحٰق ابراہیم کے مزار پر بیٹھ کر لکھی گئی جو فارس میں گازرون کے سب سے بڑے ولی تھے!

(۵) تصوّف کی ایک اَور مثنوی جس کا نام مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں پورا خمسہ ظاہر ہے کہ نظامی گنجوی کے مشہور خمسہ کے تتبّع میں لکھا گیا ہے اور ۷۴۴ھ (۴-۱۳۴۳ء) میں مکمل ہوا!

خواجو کو معاصرین کے مقابلے پر جو ناموری حاصل ہے۔ اسکے باوجود میں اس کی غزلوں میں کوئی جاذبِ توجہ حسن یا نمایاں خوبی نہیں دیکھ سکا۔ میں نے اس کی کوئی ستّر غزلیں پڑھی ہیں۔ غزلِ ذیل ان کا خاصا مناسب نمونہ ہے ؎

بگذر ز ما که خاطر ما در وفای تُست　　دل بر امیدِ وعده و جان در وفای تُست
سهلست اگر رضای تو ترک رضای ما　　مقصودِ ما ز دُنیی و عُقبی رضای تُست
زین بیش چو سر فدای قفای تو کرده ایم　　ما را مران ز پیش که دل در قفای تُست
گردن ببند می نهم و سر ببندگی　　خواهی ببخش و خواه بکش رای رای تُست
آزاد گشت از همه آنکو غلام تُست　　بیگانه شد ز خویش کسی کاشنای تُست
ای در دلم عزیز تر از جان که در تنست　　جانی که در تنست مرا از برای تُست
این خسته دل که دعوی عشق تو می کند　　سوگند آتشش بقد دلربای تُست

خواجو که رفت در سر جور و جفای تو
جانش هنوز بر سرِ مهر و وفای تُست

غزلوں اور مذکورہ بالا مثنویوں کے علاوہ خواجو کے ہاں کئی ترکیب بند،

ایک دو قطعے اور چند رُباعیاں ہیں ان میں وہ رُباعی بھی شامل ہے جس میں فاختہ کے "کُو کو" پکارنے کا مضمون ہے۔ اور عموماً عمر خیام کی طرف منسوب کی جاتی ہے[۱]۔

ذیل کا مستزاد رعنائی سے خالی نہیں ؎

کس نیست کہ گوید ز من آن ترک خطا را — گر رفت خطائی[۲]
باز آی کہ داریم توقع بتو ما را — با وعدہ وفائی
منداز بنامِ منِ دل سوختہ فلفل — بر آتشِ رُخسار[۳]
کافتادم از آن دانۂ مشکین تو یارا — در دامِ بلائی
امروز منم چون خم ابروی تو در شہر — مانند ہلالی[۴]

---

[۱] آن قصر کہ بر چرخ ہمی زد پہلو — بر درگہ او شہان نہادندی رو
دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ — آواز ہمی داد کہ کو کو کو کو (مترجم)

[۲] خطا بمعنی گناہ اور خطا بمعنی ختن کی لفظی رعایت ایک مقبول صنعت ہے۔ جیسے مثلاً اس مشہور مصرعے میں :

ترکِ تُرکانِ خطا نبود صواب

ترکانِ خطا ایران میں اپنی ملاحت اور خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں ؛

[۳] سپند (حرمل) اور فلفل (کالی مرچ) نظر بد کو دُور رکھنے کے لئے بطورِ افسوں جلائے جاتے ہیں حسین کے سُرخ رُخسار پر خال ہو تو فارسی شاعر اسے "سپند یا فلفل بر آتش" سے تشبیہ دیتے ہیں ؛

[۴] یعنی الم و یاس سے خمیدہ ہو گیا ہوں ؛

تا دیده ام آن صورتِ انگشت نما را — انگشت نمائی
باز آی که سر در قدمت بازم و جان را — در پای سمندت
چون می ندهد دست من بی سر و پا را — جز نعل بہائی[1]
در شہرِ شما قاعدہ باشد کہ نپرسند — احوالِ غریبان
آخر چہ زیان مملکتِ حُسنِ شما را — از بی سر و پای
تا چند مخالف زنی ای مطرب خوشگوی — از پردۂ عشاق
بنواز زمانی من بی برگ و نوا را — از بانگ نوائی
زین بیش نہان چند توان داشتن آخر — در دل غمِ ہجران
دانم کہ سرایت کند این درد نگارا — یک روز بجائی
در ظلمت اسکندرم از حسرتِ لعلت[2] — مانندۂ خواجو
لیکن چہ کنم چون نبود مُلکتِ دارا — در خوردِ گدائی

اوپر کے چند نمونے شاید یہ دکھانے کو کافی ہیں کہ خواجو کا کلام گو دل آویز اور خوش آیند ہے۔ لیکن کسی نمایاں امتیاز یا افضلیت سے خالی ہے۔

---

[1] "نعل بہا" اس زر و مال کو کہتے ہیں جو غنیم کو لوٹ مار سے باز رکھنے کے لئے ادا کیا جاتا ہے؛

[2] ظلمات میں سکندر کی تلاشِ آبِ حیات کی تلمیح ہے؛

(۳) عبید زاکانی

(نظام الدین عبید اللہ)

عبید زاکانی عبید زاکانی ہزلیہ تحریف[1] اور ہجو گوئی میں شاید ایران کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر شاعر ہے۔ گو بیشتر فارسی، عربی اور ترکی ہجو نویسوں کی طرح اس کی زبان بھی اکثر اتنی فحش ہے کہ اس کی نگارشات کے بہت بڑے حصے کو ناقابل ترجمہ بنا دیتی ہے۔ لیکن اس کی اخلاق الاشراف جہاں اس عیب سے اتنی مکدر نہیں طنز کا ایک لطیف پارہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بعض سنجیدہ نظمیں جن سے تذکرہ نگاروں نے حد درجہ بے اعتنائی برتی ہے حیرت انگیز دلکشی کی حامل ہیں۔ حسب معمول اس کی زندگی کے حالات بھی سوائے چند باتوں کے کچھ معلوم نہیں اصلاً قزوین کا باشندہ تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر سے اسے کوئی دلبستگی نہ تھی۔ کیونکہ برابر وہ اس کے باشندوں کے حمق کی پھبتیاں اُڑاتا رہتا ہے۔ شیخ ابو اسحٰق انجو (مقتول ۷۴۷ھ = ۷-۱۳۴۶ء) کے عہد میں وہ شیراز میں مقیم رہا۔ جیسا کہ اس کی کئی نظموں سے ظاہر ہے۔ قزوین کے برعکس اس شہر سے اس کو بڑی الفت تھی۔ اس نے سنجیدہ نگاری ترک کر کے ہزلگوئی اختیار کی جو اس زمانے کے زعماء کے مذاق کو زیادہ راس تھی۔ تاہم جیسا کہ اس کی بہت سی نظموں اور اس کی موت کے متعلق ایک حکایت سے پتہ چلتا

---

[1] Parody

ہے۔ تنگدستی اور قرض نے اسے بہت پریشان کئے رکھا۔ بالآخر ۷۷۲ھ (۱۳۷۱ء) میں فوت ہوگیا۔ ایک اور مشہور حکایت[1] میں عبید زاکانی اور اسکے ہمعصر سلمان ساوجی کے درمیان پرخاش اور پھر صلح ہونے کا واقعہ بیان ہؤا ہے[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغداد یا تبریز یا دونوں شہروں میں وہ سلطان اویس کی سرپرستی سے متمتّع ہؤا۔ دولت شاہ نے اس کے لئے ایک طویل مقالہ وقف کیا ہے[3] لیکن چنداں اطلاع بخش نہیں۔ اسی کا اکثر حصّہ ہفت اقلیم میں نقل کر دیا گیا ہے۔ گو وہاں کلام کے انتخابات زیادہ دئے ہیں۔ آتش کدہ میں عبید کا مذکور بہت ناقص اور ناکافی ہے۔ مجملِ فصیحی اور جدید مجمع الفصحاء میں اس کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ اس کی ہجویہ مثنوی "موش وگربہ" چوب کاری کی انوکھی تصویروں کیساتھ بمبئی سے بچاپ سنگی شائع ہوچکی ہے[4]۔ اس پر تاریخِ اشاعت درج نہیں[5]۔ اس کی ہزلیات کا ایک انتخاب

---

[1] ملاحظہ ہو سر گور آؤسلے کی کتاب "تذکرہ ہائے شعرائے فارسی" ص۱۲۵ تا ص۱۲۸؛ [2] آؤسلے کا ماخذ علی ابن الواعظ الکاشفی کی تالیف "لطائف الطّوائف" ہے۔ اردو خواں یہ حکایت باختلافِ روایت مولانا شبلی کی شعر العجم (جلد دوم۔ ص۲۰۱ بعد) میں دیکھ سکتے ہیں شبلی کا ماخذ دولتشاہ کا تذکرہ ہے؛ (مترجم)

[3] راقم کی ایڈیشن ص۲۸۸ تا ص۲۹۲؛ [4] اس کا ایک سستا سا انگریزی ترجمہ بھی چوبکاری کی ان ہی تصویروں کے ساتھ چھپا ہے جس کی ایک کاپی میں نے لانڈڈنو (Llandudno) ریلوے جنگشن کے بک سٹال سے خریدی؛ [5] مثنوی موش وگربہ کی ایک عمدہ باتصویر طبع شرکتِ کاویانی (برلن) سے ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۳ء) میں تیار ہوکر شائع ہوئی ہے۔ طبع بمبئی کے متن اور اس کے متن میں اختلافات ہیں؛ (مترجم)

سنہ ۱۳۰۳ھ (۶-۱۸۸۵ء) میں مطبعِ ابو الضیا توفیق بے قسطنطنیہ سے چھپ کر شائع ہوا[1]۔ اس[2] کے شروع میں ایک فارسی دیباچہ ملحق ہے۔ جو غالباً مرحوم میرزا حبیب اصفہانی کے قلم سے ہے اور اس کے آگے ایک اور دیباچہ موسیو فیرتے[3] کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ ان دو دیباچوں میں اکثر وہ باتیں آ گئی ہیں جو عبید زاکانی کے متعلق کہی جاتی ہیں۔ اس لئے میں صرف چند غیر مناسب عبارات کو حذف کرتے ہوئے ان کا ترجمہ[4] یہاں پیش کرتا ہوں۔

مقدمہ

شاعرِ اظرف یعنی عبید زاکانی اصلاً قریۂ زاکان متصل قزوین کا رہنے والا تھا[5]۔ آٹھویں صدی ہجری[6] کی برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھا۔ صاحبِ ہنر

---

[1] اسکے صفحات کی تعداد ۱۲۸ ہے؛ [2] عبید کی ہزلیات کا ایک انتخاب بہ عنوان "منتخب لطائف" مطبعۂ شرکتِ کاویانی (برلن) سے سنہ ۱۳۴۳ھ (۵-۱۹۲۴ء) میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے مشتملات اشاعتِ قسطنطنیہ کے مشتملات کے ساتھ قریب قریب منطبق ہیں (مترجم)؛ [3] M. FERTE

[4] ظاہر ہے کہ پروفیسر براؤن نے دیباچے کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے۔ میں نے انگریزی ترجمے سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور اصل فارسی عبارت کی مدد حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ ہزلیاتِ عبید کی طبع قسطنطنیہ (جس میں یہ فارسی دیباچہ شامل ہے) ہندوستان بھر میں دستیاب نہیں ہو سکی (مترجم)

[5] حمد اللہ المستوفی قزوینی نے اپنی تاریخ گزیدہ (سلسلۂ یادگارِ گب ۱۴، جلد اول ص ۸۴۵-۶) میں زاکانیوں کا ذکر قزوین کے ممتاز قبائل یا خاندانوں میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ لوگ اصلاً عرب کے قبیلہ بنو خفاجہ کی اولاد ہیں۔ اس نے زاکانیوں کے نام آنحضرت صلعم کے ایک منشور کا اصل متن نقل کیا ہے۔ اس مقالے کے آخر میں وہ شاعر کا تذکرہ بدیں الفاظ کرتا ہے "وازیشان صاحبِ معظم خواجہ نظام الدین

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

وفضیلت تھا۔ اسلوب اور ذوقِ سلیم کے ارباب میں سے تھا۔ بعض لوگ اسے ہزل نویسوں میں شمار کرتے ہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ گو اس کے کلام میں لطائف، ہزلیات اور ہجو واقع ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا درجہ محض ہجوگویوں کے رُتبے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس لئے کہ متقدمین میں اپنی رعنائیِ کلام اور ظرافت کے سبب وہ ممتاز ہے۔ اور ان دو پہلوؤں پر کوئی دُوسرا اس کا پاسنگ نہیں۔ خاص طور پر اس کو اس چیز میں کمال حاصل تھا کہ دُوسرے شعراء کے سنجیدہ اشعار کو اپنی نظموں میں تضمین کرتا اور اُن کو مُضحک معانی کا جامہ پہنا دیتا۔ اپنے اس کارنامے کو سرانجام دیتے ہوئے اُس نے شعر کی کوئی صنف ایسی نہ چھوڑی جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ دُوسری طرف اس کی اپنی متین نظمیں روانیٔ الفاظ، شیرینی اور ندرت کے اعتبار سے بے نظیر اور لطافت ونزاکت کے لحاظ سے بے بدل ہیں۔

"عبید زاکانی نے شاہ ابواسحٰق کے عہد میں شیراز میں تعلیم پائی۔ اور اپنے زمانے کے فاضل ترین علماء اور ادباء میں شمار ہونے لگا۔ اس نے ہر فن میں کامل دستگاہ حاصل کی اور پھر رسائل وکتب تالیف کرنے لگا۔ بعد کو واپس قزوین چلا آیا۔ یہاں منصب قضا پر فائز ہوًا۔ اور چند نوجوان رئیس زادوں کا اتالیق اور اُستاد منتخب ہوًا۔ تُرکوں نے ایران میں اُن دنوں کوئی ممنوع اور قبیح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۹) عبید اللہ اشعار خوب دارد و رسایل بنظیر" تاریخ گزیدہ سنہ ۷۳۰ھ (سنہ ۱۳۳۰ع) میں لکھی گئی۔ اور چونکہ عبید زاکانی اس وقت اپنے شہر قزوین میں صاحبِ شہرت ہو چکا تھا۔ پس اس کی تاریخ پیدائش سنہ ۷۰۰ھ (سنہ ۱۳۰۰ع) سے بعد کی نہیں ہو سکتی؛ ؎ چودھویں صدی عیسوی؛

فعل ناکردہ نہ چھوڑا تھا۔ اُن کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط ہونے کے سبب ایرانیوں کی فطرت اور سیرت اس قدر متغیر اور فاسد ہو گئی تھی کہ عبید زاکانی نے جب اس پر غور کیا تو اس کو سخت نفرت ہوئی۔ اور اس نے لوگوں کو اصل صورتِ حالات سے پوری طرح واقف اور ہر طرح خبردار کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ پس اپنے زمانے اور اس کے لوگوں کے اخلاقِ فاسدہ کی تمثیل کے طور پر اس نے ایک رسالہ 'اخلاق الاشراف' تصنیف کیا۔ اس رسالے کا مقصد محض ہزل نہ تھا بلکہ ایک ہجو جو متین و شدید طنز اور حکیمانہ تنبیہات پر مشتمل ہو۔ اسی طرح قزوین کے سربرآوردہ اشخاص (جن میں ہر ایک حماقت اور جہالت کا مجسمہ تھا) کے پیمانۂ عقل اور درجۂ علمیت کی تصویر کھینچنے کے لئے اس نے اپنے رسالۂ دلکشا، میں بہت سی حکایات ایسی شامل کیں جن میں ہر ایک اربابِ تمیز کے لئے ایک سبق رکھتی ہے۔ اس کا رسالۂ صد پند اور اس کی تعریفات اسکے کمالات، تجربہ، علم و فضل اور دنیوی حکمت کے مبلغ کا کافی ثبوت ہیں۔ مزید براں وہ لوگ بھی جو اسے محض ایک ہزلی ہجاگو کہتے ہیں تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے علم معانی و بیان پر ایک رسالہ لکھا جو اس نے بادشاہ کے حضور میں پیش کرنا چاہا۔ لیکن درباریوں اور مصاحبوں نے اس سے کہا کہ بادشاہ کو اس قسم کی خرافات کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر اس نے ایک عمدہ قصیدہ لکھا جو اس نے بادشاہ کو سُنانا چاہا لیکن اُنھوں نے اسے بتایا کہ جہاں پناہ کو پسند نہیں کہ شعراء دروغ، مبالغہ اور ملال انگیز خوشامد سے ان کو بے وقوف بنائیں۔ عبید نے کہا "اچھا یہ

بات ہے تو میں بھی بے غیرتی کی راہ پکڑتا ہوں۔ کہ اس کے ذریعے بادشاہ کی مصاحبتِ خاص تک رسائی پاؤں اور اس کے درباریوں اور مقربوں میں شامل ہو جاؤں اور چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ بے دھڑک انتہائی بے شرمی کے اقوال اور پرلے درجے کے ناشائستہ اور حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے ہزل زبان پر لانے لگا۔ اور اس طریقے سے اس نے بیشمار عطیّے اور ہدیے حاصل کئے اور کسی شخص کو جرأت نہ تھی کہ اس کا مخالف یا مقابل بنے۔

"کہا جاتا ہے کہ جب عبید کو مجلسِ شاہی میں باریاب ہونے سے ناامیدی ہوگئی تھی تو اُس نے ذیل کی رباعی فی البدیہہ کہی :-

در علم و ہنر مشو چو من صاحبِ فن
تا نزدِ عزیزان نشوی خوار چو من
خواہی کہ شوی پسندِ اربابِ زمن
گنگ آور و کُنگری کُن و کِنگر زن[1]

---

[1] فرہنگِ ناصری میں گنگ کے معنی "امرد قوی جثہ" بتائے گئے ہیں اور سند کیلئے سعدی کی خبیثات کا حوالہ دیا گیا ہے (طبع کلکتہ ۱۷۹۵ء۔ جلد دوم ورق ۲۷۰ ب۔ سطر نمبر ۴) اسی فرہنگ کی رُو سے کُنگر ایک ایسے چم چچڑ بھک منگے کو کہتے ہیں جو گھر کے باہر ناقابلِ برداشت غل مچاتا رہے۔ حتّٰی کہ صاحب خانہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اسے بھیک دے دے؛ کنگر اس کتاب کی رو سے ایک ہندوستانی سازِ موسیقی کا نام دیتا ہے؛

"اُس کے ایک آشنا نے جب یہ رُباعی سُنی تو تعجب کا اظہار کیا کہ ایسا قابل اور لائق شخص علم و فضل اور تہذیب کو خیرباد کہہ کر ہزلیات اور خسائس میں مشغول ہو جائے۔ عبید زاکانی نے اسے ذیل کا قطعہ لکھ کر بھیجا:-

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلبِ علم
کاندر طلبِ راتبِ ہر روزہ بمانی
رَو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا دادِ خود از مہتر و کہتر بستانی[1]

"کہا جاتا ہے کہ ایک معاصر شاعر سلمان ساوجی نے عبید زاکانی کی ہجو میں ذیل کے اشعار کہے درحالیکہ سلمان اور عبید کی کبھی ملاقات نہ ہوتی تھی:-

جہنمیٔ ہجاگو عبیدِ زاکانی مقرر است ببیدولتی و بیدینی
اگرچہ نیست ز قزوین و روستازادہ است ولیک میشود اندر حدیث قزوینی[2]

"اس قطعے میں نکتہ یہ ہے کہ ایران کے بذلہ سنج اہلِ قزوین کو احمق فرض کرتے ہیں جس طرح وہ اہلِ خراسان کو گدھے، اہلِ طوس کو گائیں، اہلِ

[1] اسکے بعد چند بہت فحش اشعار جہان خاتون نام کی ایک خاتون پر ہیں جس کے ساتھ شاہ ابو اسحٰق کے ایک وزیر خواجہ امین الدین نے شادی کرنی چاہی تھی۔ یہ خاتون شاعرہ بھی تھی۔ میرے پاس اس کے کلام کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اور اب تک اس کا صرف یہی ایک نسخہ میری طرف سے گزرا ہے؛

[2] اہلِ قزوین ایران کے احمق ترین لوگ مشہور ہیں گو یہ بڑی بے انصافی ہے؛

بخارا کو ریچھ اور ماورار النّہر کوں کو مشہدی (یعنی رافضی) کہتے ہیں اور یہ تمام نسبتیں تحقیری قسم کی ہیں ؂

"عبید نے جب یہ اشعار سُنے تو فوراً بغداد کو روانہ ہؤا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ سلمان بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دجلہ کے کنارے فروکش ہے۔ اور عیش و تفریح اور صحبت علمار و فضلار میں مشغول ہے۔ جب عبید کسی طریقے سے داخلِ حلقہ ہونے میں کامیاب ہوا تو سلمان نے اسی وقت یہ مصرع دجلہ کی توصیف میں موزوں کیا تھا ع

دجلہ را امسال رفتاری عجب مستانہ ایست

اور اپنے مصاحبوں کو دوسرا مصرع لگانے کی فرمائش کی تھی۔ عبید نے فوراً ذیل کا تکمیلی مصرع لگا دیا ع

پای در زنجیرو کف برلب مگر دیوانہ ایست[1]

"سلمان بہت خوش ہؤا۔ پوچھا کہ کہاں سے آنا ہؤا۔ عبید نے کہا قزوین سے، دورانِ گفتگو میں سلمان نے اس سے پوچھا کہ کیا لوگ قزوین میں میرا نام جانتے ہیں یا کیا میرے کوئی اشعار وہاں معروف ہیں۔ عبید نے جواب دیا یہ قطعہ بہت مشہور ہے ؂

---

[1] یہ واقعہ کہ سلمان نے دجلہ کی توصیف کا مصرع کہہ کر مصرعِ ثانی کی فرمائش کی۔ دولتشاہ کی روایت میں عبید سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی رُو سے مصرعِ ثانی ناصر بخاری ایک شاعر نے لگایا تھا۔ ملاحظہ ہو دولت شاہ طبع براؤن صلاً۲۷ (مترجم)؛

من خراباتیم و بادہ پرست — در خرابات مغاں عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش — می برندم چو قدح دست بدست

" ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سلمان اگرچہ بڑا فاضل آدمی ہے۔ اور یہ اشعار بجا طور پر اس کی طرف منسوب کیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں اغلباً یہ اس کی بیوی کے کہے ہوئے ہیں[1] "

سلمان نے اس کی لطیف کلامی سے جان لیا۔ کہ ہو نہ ہو یہ خود عبید ہے چنانچہ اس نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی ہجو کی معافی مانگی اور جب تک عبید بغداد میں رہا حسب توفیق اس کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ عبید اکثر اس سے کہا کرتا تھا " بخت نے تمہاری مساعدت کی کہ تم نے اس قدر جلد مجھ سے صلح کر لی اور میری زبان کے شر سے محفوظ ہو گئے "

اس کے آگے ایک ذیل کے طور پر وہ مختصر مقدمہ ہے۔ جو موسیو فیرتے کی طرف منسوب ہے۔ اس میں موصوف نے مشرقی اور بالخصوص فارسی ادب کے لئے اپنے انہاک کا ذکر کیا ہے۔ اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کی تمنا ظاہر کی ہے۔ اور عبید زاکانی کی تصانیف کی قدر دانی کا اظہار کیا ہے کہ ان کا ایک نسخہ موصوف کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اس نسخے سے اس نے وہ انتخابات کئے جو کتاب میں شامل ہیں۔ یہ انتخاب نسخے کے کل مشتملات کا تین چوتھائی ہیں۔ ان میں ذیل کی چیزیں شامل ہیں:۔

---

[1] اس میں اشارہ صاف طور پر اس بات کی طرف ہے کہ اس کی بیوی آزاد اور بُرے چال چلن کی عورت ہے؛

(۱) اخلاق الاشراف (نثر) - تاریخِ تصنیف سنہ ۷۴۰ھ (سنہ ۱۳۴۰ء)؛

(۲) ریش نامہ - نظم و نثر دونوں کی ملاوٹ ہے؛

(۳) رسالۂ صد پند، تاریخِ تصنیف سنہ ۷۵۰ھ (سنہ ۱۳۵۰ء) نثر؛

(۴) تعریفات یا دہ فصل، (نثر)؛

(۵) متفرق نظمیں، اکثر فحش ہیں، ان میں ہزلیہ تحریفیں بھی شامل ہیں؛

(۶) رسالۂ دلگشا، دو حصوں میں تقسیم ہے - ایک میں عربی اور دُوسرے میں فارسی حکایات اور ہزلیات ہیں؛

اس کے مقابلے پر اس انتخاب میں عبید کی تمام متین نظمیں اور قصائد اور اُن کے علاوہ عشاق نامہ[1]، فال نامہ وغیرہ نظر انداز کیے گئے ہیں، مَیں نے عجائب خانۂ برطانوی میں اس شاعر کی مصنّفات کے تین نسخوں کا جائزہ لیا ہے[2]۔

آخری نسخے میں کلام کا انتخاب سب سے بڑا ہے - اس میں شیخ ابو اسحٰق، سلطان اویس، رکن الدین عماد الملک وغیرہ کی مدح کے قصائد شامل ہیں - نفیس ترین قصائد میں سے ایک درجِ ذیل ہے ؎

افتاد باز م در سر ہوائی　　دل باز دارد میلی بجائی

او شہریاری من خاکساری　　او پادشاہی من بے نوائی

ابرو کمانے نازک میانی　　نامہربانی شنگی دغائی

---

[1] یہ مثنوی "نشریات مؤسسۂ خاور" میں مطبعۂ "سپہر" طہران سے بہ ۱۳۱۴ھ (شمسی سنہ ۱۹۳۶ء) چھپ کر شائع ہوئی (مترجم)؛

[2] Or. 2947, Or. 5738, Or. 6303

زین دلنوازی زین سرونازی — زین جو فروشی گندم نمائی
بی او ببخشد خورشید نوری — بی او ندارد عالم صفائی
هر جا که لعلش در خنده آید — شکّر نیارد آنجا بهای
هر جای دارد دل با خیالش — خوش گفت و گوئی خوش ماجرائی
گوئی بیایم جای طبیبی — باشد که سازم دل را دوائی
دارد شکایت هر کس ز دشمن — ما را شکایت از آشنائی

چشم عبید از سیرش نبیند
دیگر نبیند چشمش بلائی

عبید زاکانی کی تصانیف کا ایک اَور عُمدہ نسخہ[1] پیرس کے قومی کتب خانے کا مقبوضہ ہے۔ یہ نسخہ محرم ۸۳۴ھ (ستمبر اکتوبر ۱۴۳۰ء) میں لکھا گیا۔ ۱۱۱ اوراق پر مشتمل ہے۔ متین و رکیک نظموں کے علاوہ اس میں عشاق نامہ (نظم اور جُزوی طور پر مقامی بولی میں)، اخلاق الاشراف، ریش نامہ اور دہ فصل شامل ہیں۔ سنجیدہ نظموں کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ ان میں متواتر فارس اور اس کے صدر مقام شیراز کی طرف اشارے ملتے ہیں اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے وطن قزوین کے مقابلے پر شاعر کو فارس و شیراز کے ساتھ کہیں زیادہ اُلفت تھی۔ چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

(ورق ۱۳ اب) سه

بیمنِ معدلتِ پادشاہِ بندہ نواز — بہشت روی زمین است خطّۂ شیراز

---

[1] Suppl. Persan 824

اسی طرح کہتا ہے (ورق ۲۳ ل) ؎

شد ملکِ پارس باز بتائید کردگار
خوشتر ز صحنِ جنت و خرم تر از بہار

ایضاً (ورق ۲۸ ل) ؎

رسید رایتِ منصور شاہ بندہ نواز بخرمی و سعادت بخطۂ شیراز
جہانگشای جوان بخت شیخ ابو اسحٰق خدایگانِ مخالف کُشِ موافق ساز

ذیل کے شعر میں بھی یہی مضمون ہے (ورق ۳۵ ب) یہ شدت سے ہم کو شیخ سعدی کے ایک مشہور شعر کی یاد دلاتا ہے اور غالباً اس کا ماخذ وہی شعر ہے ؎

نسیم بادِ مصلّے و آبِ رکن آباد غریب را وطنِ خویش می برد از یاد

شعرِ ذیل شیراز سے شاعر کی دلبستگی کی مزید شہادت بہم پہنچاتا ہے۔ یہ ایک نظم میں آیا ہے۔ جس میں عبید نے اس شہر کو الوداع کہی ہے ؎

رفتم از خطۂ شیراز و بجان در خطرم وکزین رفتنِ ناچار چہ خونین جگرم

جس طرح ہم خواجہ حافظ کے ہاں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح عبید کے دیوان

---

[۱] شیخ سعدی کا وہ شعر درجِ ذیل ہے:

خوشا تفرج نوروز خاصہ در شیراز کہ بر کند دل مرد مسافر از وطنش

یہ شعر طیباتِ سعدی میں سے ہے؛

[۲] عبید کے شعر کا مصرعِ اوّل خواجہ حافظ کے اس مشہور شعر میں بھی بعینہٖ اسی شکل میں ملتا ہے:

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر نسیمِ بادِ مصلّے و آبِ رُکنا باد

(مترجم)

میں بھی ہم کو خلیج فارس کی بندرگاہ ہرمز کی طرف ایک تحقیر آمیز اشارہ ملتا ہے

در ہرمزم افتادہ چنین با غم و درد
از صحبتِ دوستان و مخدومان فرد

سنجیدہ نظموں میں ایک (ورق ۳۰ ب) صاحب دیوان عمید الملک کی مدح میں ہے۔ ہجویات میں دو ہجویں (ورق ۵۴ ب اور ورق ۵۵ الف) کمال الدین حسین اور شہاب الدین حیدر کی ہیں[1]۔ کتاب کے شروع میں جو مذہبی نظمیں ہیں اُن میں ایک نظم ہے (ورق ۱ الف) جس میں حمد، نعت اور خلفائے راشدین کی مدح ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عبید سُنّی تھا۔ لیکن اس کی ناشائستہ ہزلیات کے علاوہ ذیل کا قطعہ کافی طور پر مظہر ہے کہ زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کرنے کا نہ اُسے دعوی تھا اور نہ وہ اسکا آرزومند تھا ۔

خدایا دارم از لطفِ تو اُمّید ۔۔۔ کہ ملکِ عیشِ من معمور داری
بگردانی قضاء زُہد از من ۔۔۔ بلاء توبہ از من دُور داری

عبید کی ہزلیات کو لیجئے۔ طبع قسطنطنیہ میں تقریبًا تمامتر یہی نظمیں شامل کی گئی ہیں جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ تقریبًا بلا استثنٰے سب کی سب ترجمے کے لئے نامناسب ہیں۔ اور تمام ایرانی شرفا آج اُنہیں نفرت اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مزید برآں ان میں نکتے کی بات صرف یہ ہے کہ بڑی اُستادی سے متقدم یا معاصر شعرار کے سنجیدہ اشعار

---

[1] میں ان اشخاص کی تعیین نہیں کرسکا؛

تحریف کر کے انہیں پست معانی کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ چنانچہ اس طرح مُردہ ضمیر عبید زاکانی نے ان شاعروں کو موردِ استہزا کیا اور اپنی فحش گوئی کے لئے ان سے مواد فراہم کرایا ہے۔ ان نظموں میں سے جو فحش سے خالی ہیں اور قابلِ اعتراض نہیں ذیل کی نظم پیش کی جاسکتی ہے ؎

پیش ازین از ملک ہر سالی مرا　　خُردہٗ از ہر کناری آمدی
در وثاقم نانِ خشک و تَرّہٗ　　درمیان بودی چو یاری آمدی
گہ گہے ہم بادہٗ حاضر شدی　　گر ندیمی و نگارے آمدی
نیست در دستم کنون از خشک و تر　　ز آنچہ وقتی در شماری آمدی

غیر من در خانہ ام چیزی نماند
وآن نماندی گر بکارے آمدی

یہ بات کہ شاعر کے نصیب میں افلاس اور قرض داخلِ معمول تھے۔ اور اشعار سے بھی ظاہر ہے مثلاً[1] ؎

مردم بعیش خوشدل و من مبتلائی قرض
ہر کس بکار و باری و من در بلای قرض
فرضِ خدا و قرضِ خلایق بگردنم
آیا ادائے فرض کنم یا ادای قرض
خرجم فزون ز عادت و قرضم برون ز حد
فکر از برای خرج کنم یا برائے قرض

---

[1] طبع قسطنطنیہ۔ ص ۲-۶۱؛

از هیچ خط نتالم غیر از سجلِّ دَین
وز هیچ کس نترسم غیر از گوای قرض

در شهر قرض دارم و اندر محلّه قرض
در کوچه قرض دارم و اندر سرای قرض

از صبح تا بشام در اندیشه مانده ام
تا خود کجا بیابم ناگه رجای قرض

مردم ز دستِ قرض گریزان و من همی
خواهم پس از نماز و دعا از خدای قرض[1]

عرضم چو آبروئے گدایان بباد رفت
از بسکه خواستم ز در هر گدای قرض

گر خواجه تربیت نکند پیشِ پادشاه
مسکین عبید چون کند آخر ادای قرض

خواجه علاءِ دنیا و دین آنکه جز کفش
هرگز کسی نداد بگیتی سزای قرض

اسی مضمون کی اَور نظمیں آپ کو طبعِ قسطنطنیہ کے صفحہ ۵ (سطور ۱۸ تا ۲۳) اور صفحہ ۶۱ (سطور ۱۶ تا ۲۰) پر ملیں گی۔ وہ مشہور قصّہ کہ عبید نے بسترِ مرگ پر اپنے بچّوں کے ساتھ ایک عملی مذاق کیا سچ ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک

---

[1] یعنی اَور لوگ تو مقروض ہونے سے ڈرتے ہیں۔ اور مَیں دُعا کرتا ہوں کہ مجھ کو قرض حاصل کرنے کا موقع ملے؛

نہیں کہ اس کے مزاج اور حالات دونوں سے یکساں موافقت رکھتا ہے!

ایک طبیب پر ذیل کا ہجائیہ قطعہ نقل کرنے کے قابل ہے ؎

در عمرِ خود این طبیبک ہرزہ مقال — بیمار ندید تا نکشتش درحال
دیشب ملک آلموت درآمد گفتش — یک روز بخز آنچہ فروشی ہمہ سال

"موش وگربہ" ۱۷۴ اشعار کی ایک چھوٹی سی مثنوی ہے۔ اس کی طبعِ بمبئی چوب کاری کی متعدد انوکھی تصویروں سے مصوّر بھی ہے صرف

لہ براؤن مرحوم نے اس حکایت کے لئے اپنی کتاب "ایرانیوں میں ایک سال" کا حوالہ دیا ہے۔ اُردو خوانوں کے لئے اس کتاب میں سے قصّے کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:-

بسترِ مرگ پر عبید نے اپنے دو بیٹوں اور ایک دختر کو سرہانے بٹھا کر نہایت احتیاط سے یہ راز بتایا کہ تمہارے لئے فلاں خزانہ چھوڑ چلا ہوں۔ اس کو میری تجہیز و تکفین کے بعد فلاں ساعت سے پہلے ہرگز نہ نکالنا۔ اور دوسرے بھائی بہنوں کو یہ راز نہ بتانا۔ یہ کہا اور آخری سانس لیا۔ وصیّت کے مطابق جب تینوں بوقتِ مقررہ مقامِ معیّن پر پہنچے تو اُن کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ باقی بھائی بہن بھی وہاں اسی غرض کے لئے پہلے سے حاضر تھے۔ غرض کھدائی ہوئی تو واقعی ایک بڑا پارسل نکلا۔ اسے نکال کر کھولنا شروع کیا گیا۔ اس کے باہر باہر حفاظت کے لئے ایک تہ گھاس پھونس کی تھی۔ اس کے اندر سے ایک صندوقچہ نکلا اُسے کھولا تو کچھ رُوئی نظر آئی۔ اسکے بیچ میں سے ایک کاغذ کا پرزہ نکلا۔ انہیں اب بھی امید تھی کہ شاید کاغذی تحریر سے کچھ سُراغ ملے۔ اسے روشنی میں لاکر پڑھا تو یہ شعر لکھا تھا ؎

خدای داند و من دانم و تو ہم دانی — کہ یک فلوس ندارد عبید زاکانی (مترجم)

اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں پُرخور تیز نگاہ اور "شیر شکار" بلّی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس کی آنکھیں کہربا کی سی، پلکیں تیز اور بچھو کے سے پاؤں ہیں، پیشانی عقاب کی سی ہے۔ پیٹ طبل جیسا اور سینہ قاقم کا سا ہے۔ ابرو کمان کی طرح ہیں اور دانت تیز ؎

از قضای فلک یکی گربہ   بود چون اژدہا بکرمانا
گربۂ دور بین و شیر شکار   کہربا چشم و تیز مژگانا
پای کژدم عقاب پیشانی   بود پر مکر و پر ز دستانا
شکمش طبل و سینہ اش قاقم[1]   ابروش قوس و تیز دندانا

بلّی کو بھوک لگتی ہے۔ ایک میکدے میں جاتی ہے۔ اور ایک خُم کی آڑ میں گھات لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اتنے میں ایک چوہا نکلتا ہے اور جست کر کے ایک خم کے دہانے پر جا بیٹھتا ہے۔ اور شراب پینے لگتا ہے۔ حتّٰی کہ مخمور ہو کر اس میں نخوت اور جسارت پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے خوفناک دشمن کے قرب سے بے خبر اپنی دلاوری کی ڈینگیں مارنے لگتا ہے اور کہتا ہے "کہاں ہے بلّی کہ میں اس کا سر کاٹوں اور بازار میں لے جاؤں؟ احسان کے روز بخشش کے وقت میں سو بلّیوں کے سر تقسیم کروں گا! اگر بلّی میرے سامنے میدان میں آئے تو میرے نزدیک گویا وہ کُتّا ہے"! ؎

گفت کو گربہ تا سرش بکنم   سرِ او را برم میدانا
سرِ صد گربہ را بہ بخشم من   گاہِ بخشش بروزِ احسانا

---

[1] طبع برلن میں "سینہ اش چو سپر" ہے؛ (مترجم)

گربہ در پیش من چو سگ باشد   گر شود رُوبرو بمیدانا

یکایک بلّی اس پر جھپٹتی ہے اسے دبوچ لیتی ہے اور کہتی ہے۔" ہاں بے چُوہے! اب جان بچاکر کہاں جائیگا؟" ؎

ناگہاں جست و موش را بگرفت
گفت موشک کجا بری جانا

چوہے کے حواس اب اچھی طرح ٹھکانے ہوتے ہیں اور گڑگڑا کر التجا کرتا ہے" میں تمہارا غلام ہوں: میرے یہ گناہ معاف کردو! اگر مَیں نے گندگی کھائی (یعنی مہمل بکا) تو مَیں مست تھا اور مست گندگی بہت کھاتے ہیں! میں تمہارا غلام ہوں، تمہارا حلقہ بگوش غلام ہوں......" ؎

موش گفتا کہ من غلام توام   عفو کن بر من این گناہانہ
مست بُودم اگر گُہی خوردم   گُہہ فراوان خورند مستانہ
من غلامم غلامِ حلقہ بگوش   طوق بر گردنم غلامانہ

بلّی چُوہے کی ان عاجزانہ التجاؤں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اور اسے مار کر ہڑپ کر جاتی ہے۔ پھر مسجد کا رُخ کرتی ہے کہ وہاں نماز ادا کرے اور اپنی موش خوری سے توبہ کرے ؎

گربہ آن موش را بکشت وبخورد   سوی مسجد بشد خرامانہ
دست و رو را بشست و مسح کشید   وردِ حق را بخواند و دیانا
بار الٰہا کہ توبہ کردم من   ندرمِ موش را بدندانا
گربہ میکرد توبہ در مسجد   یا کریم و قدیم و سُبحانا

کارِ من توبہ است و استغفار   اے خداوندگار رحمانا
بہرِ این خونِ ناحق ای خلّاق   من تصدق دہم دو من نانا
تو ببخشی گناہم اے غفّار   از گنہ گشتہ ام پشیمانا
درِ مکر و فریب باز نمود   تا بحدّی کہ گشت گریانا

ایک اور چوہا جو منبر کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا بلّی کے یہ روحانی کلمات سُنتا ہے تو جھٹ بلّی کی توبہ کا مژدہ دُوسرے چُوہوں کو سُنانے بھاگتا ہے۔ اور ایک شعر میں یہ خوشخبری ادا کرتا ہے جو ضرب المثل بن چکا ہے اور خواجہ حافظ کے ہاں اس کی تلمیح[1] ملتی ہے ؎

مژدگانی کہ گربہ عابد شد
زاہد و مومن و مُسلمانا

اس پر چُوہے فیصلہ کرتے ہیں کہ اپنی خاطر جمعی اور خوشی کا اظہار کرنے کے لئے بلّی کے پاس سات چوہوں کا ایک وفد بھیجیں اور شراب، کباب مٹھائی، جوزات، پھل اور شربت کے مناسب تحائف لیتے جائیں۔ بلّی انہیں پاس آنے کو کہتی ہے اور پھر ان میں سے پانچ کو پکڑ لیتی ہے ایک کو مُونھہ میں اور باقی چار اپنے پنجوں میں۔ پسماندگان نکل بھاگتے ہیں اور بلّی کی غیر متغیر فطرت کی بُری خبر دُوسرے چُوہوں کو پہنچاتے ہیں ہفتہ بھر اپنے ہلاک شدہ رفقار کا ماتم کر چکنے کے بعد چُوہے ۳۳۰۰۰۰ کی تعداد میں اپنے بادشاہ کے زیرِ کمان بلّیوں سے جنگ کرنے نکلتے ہیں۔ ایک

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران جلد دوم ص۳۷۔ صنعتِ تلمیح کا بیان؛

خُونریز لڑائی کے بعد بلّیوں کو شکست ہوتی ہے۔ سرغنہ بلّی گرفتار ہو کر چوہوں کے بادشاہ کے حضور میں پیش کی جاتی ہے وہ اسے بطورِ سزا پھانسی دینے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن آخر بلّی گرفتار کنندوں سے پنجے چھڑا کہ چوہوں کے بادشاہ کو مار ڈالتی ہے اور اس کے لشکریوں میں بُہت کو قتل کرتی ہے۔ اور باقی کھنڈ جاتے ہیں۔ مثنوی اس شعر پر آکر ختم ہوتی ہے ؎

ہست این قصۂ عجیب و غریب
یادگارِ عبید زاکانا

اب عبید زاکانی کی نثریہ تصانیف کی طرف آئیے۔ سب سے پہلے

عبید زاکانی کی "اخلاق الاشراف"

ہم اس کی "اخلاق الاشراف" کو لیتے ہیں جو اس کے اپنے زمانے کے اخلاق کی ایک بڑی تلخ ہجو ہے اور سنہ ۷۴۰ھ (سنہ ۱۳۴۰ع) میں تصنیف ہوئی۔ ایک تمہید اور سات ابواب پر شامل ہے۔ ہر ایک باب حسبِ ترتیبِ ذیل ایک اخلاقی حُسن سے بحث کرتا ہے:- (۱) حکمت؛ (۲) شجاعت؛ (۳) عفّت؛ (۴) عدالت؛ (۵) سخا؛ (۶) حلم و وفا؛ (۷) حیا و رحمت وغیرہ؛

ہر باب میں مصنّف پہلے زیرِ بحث خلقِ جمیل کے "مذہبِ منسوخ" یعنی متروک تصوّر کو لیتا ہے۔ اور پھر "مذہب مختار" یعنی معاصر لوگوں کے اختیار کردہ تصوّر سے بحث کرتا ہے۔ معاصرین کو اُن کے نت نئے انکشافات پر طنز کے پیرائے میں آفرین کہتا ہے۔ مثلاً اُن کی اس اختراع پر کہ قدما

جو ہم کو سکھاتے تھے کہ شجاعت فضیلت ہے یہ غلط ہے۔ شجاعت دراصل کوئی فضیلت نہیں یہ تو بڑی خطرناک اور نقصان دہ خصلت ہے۔ اپنی کتاب کے مدعا کے متعلق وہ دیباچے میں یُوں رقمطراز ہے[1]:-

"وچنانکہ اطبّا ہمت بر ازالت امراض بدن وحفظِ صحت آن مصروف گردانیده اند، انبیا نیز نظر ہمّت بر دفع آفات وامراض روح گماشته اند تا اورا از ورطات مہلکہ وگرداب جہل ونقصان بساحل نجات وکمال رسانند، مردِ خردمند چون بنظرِ دقیق تأمّل نماید بروی روشن شود که مقصود از ارسال مقلّدان امانتِ رسالت تہذیبِ اخلاق وتطہیرِ سِیَرِ بندگانست واین معنی برلفظ شاعر بدین سیاق طاری ؎

گر نبی آید وگرنہ ، تو نکو سیرت باش
کہ بدوزخ نرود مردمِ پاکیزہ سِیَر

خود حضرتِ رسالت نقاب از چہرۂ عروس این معنی برانداختہ وجمال این تلویح را بر سریر این تشریح جلوه داده که (بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ) و قوانینِ این قسم را که علم اخلاق وحکمت عملی خوانند علمارِ سلف در مطولات که فہم قصیرِ این فقیر از ادراک شمۂ از آن قاصر است استکمال خلق را بوجۂ احسن وطریقِ امین در قید کتابت کشیده اند، واز وقت وزمان مبارک آدم صفی تا بدین روزگار اشراف بنی آدم بمشقتِ بسیار وریاضت

[1] یہاں اور آئندہ صفحات پر عبید کی جو تحریریں منقول ہیں پروفیسر براؤن نے (باستثنای اشعار) ان سب کا انگریزی ترجمہ دیا ہے اصل متن نقل نہیں کیا۔ میں نے "منتخب لطائف" مطبوعہ چاپخانۂ کاویانی (برلن) سے اصل متن نقل کر دیا ہے (مترجم)۔

بکمال در کسب فضائل اربعه که آن (حکمت) و (شجاعت) و (عفت) و (عدالت) است سعی بلیغ بتقدیم رسانیده اند، و آنرا سبب سعادت دُنیا و نجات عقبیٰ شمرده گفته اند؛ بیت

بهر مذہب که باشی باش نیکو کار بخشنده
که کفر و نیک خوئی به ز اسلام و بداخلاقی

اکنون درین روزگار که زبدۂ دهور و خلاصۂ قرونست چون مزاج اکابر لطیف شد و بزرگان صاحب ذہن بلند رای پیدا گشتند فکر صافی و اندیشۂ شافی بر کلیات امور معاش و معاد گماشتند سنن اوضاع سابق در چشم تمیز ایشان خوار و بیمایه نمود، و نیز بواسطۂ کرور زمان و مرور اوان اکثر آن قواعد اندراس پذیرفته است احیای آن اخلاق و اوضاع بر خاطر خطیر و ضمیر منیر اینجماعت گران آمد لاجرم مردوار پای ہمت بر سر آن اخلاق و اوضاع نهادند و از بهر معاش و معاد خود این طرق که اکنون درمیان بزرگان و اعیان متداول است چنانچه این مختصر بر شرح شمۂ از آن مقصور است پیش گرفتند و بنیاد کارهای دینی و دنیوی بر آن مبنی و مستحکم گردانیدند - در معنی باز است و سلسلۂ سخن دراز در غرض شروع کنیم ؛

مدّتی شد که این ضعیف (عبید زاکانی) را در خاطر اختلاجی می بود که مختصری مبنی بر بعضی اخلاق قدما که آنرا خلق اکنون (منسوخ) میخوانند و شمۂ از اخلاق و اوضاع اکابر این روزگار که این را (مختار) میدانند بتحریر رساند تا موجب فائدۂ طالبان این علم و مبتدیان این راه باشد - درین تاریخ که سال ہجرت

ہفت صد و چہل رسید عجالۃ آن وقت را این مختصر کہ بہ (اخلاق الاشراف) موسوم ست در قلم آورد و آنرا بر ہفت باب قرار داد ہر باب مشتمل بر دو مذہب یکی مذہب منسوخ کہ قدما بر آن نہج زندگانی کردہ اند و یکی مذہب مختار کہ اکنون بزرگان ما اختراع نمودہ اند و بنای امور معاش و معاد بر آن نہادہ ہر چند کہ حد این مختصر بہزل منتہی می شود اما بیت

آنکس کہ ز شہر آشنائیست
داند کہ متاعِ ما کجائیست

مامول این ضعیف در سعی این مختصر آنکہ بیت

مگر صاحبدلی روزی بجائی
کند در کار این مسکین دُعائی"

ان تمہیدی الفاظ کے بعد مصنف اوپر کے شمار کردہ سات فضائل میں ہر ایک پر باری باری بحث کرتا ہے اور اسے اسی شکل میں بیان کیا ہے جس میں وہ زیادہ شرح وبسط کے ساتھ اخلاق کے مشہور رسالوں مثلاً متقدم "اخلاقِ ناصری" یا متأخر "اخلاقِ جلالی" اور "اخلاقِ محسنی" میں پیش کیا گیا ہے۔ اسکے بعد معاصرین کے "مذہبِ مختار" کو لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں پہلا باب پیش کیا جاتا ہے کہ اس میں اکثر ابواب کی نسبت ہزل کا عنصر کم ہے:-

باب اوّل در حکمت

(مذہبِ منسوخ)

حکما در حد حکمت فرموده اند (الحکمة استکمال النفس الانسانیة فی قوتها العلمیة والعملیة - امّا العلمیة فانها تعلم حقائق الاشیاء کما هی - وامّا العملیة فانها تحصیل ملکة نفسانیة بها تقدر علی اصدار الافعال الجمیلة والاحتراز عن الافعال القبیحة وتسمی خلقاً)، یعنی در نفس ناطقه دو قوّة مرکوزست وکمال وتکمیل آن منوط، یکی قوت نظری ویکی قوت عملی، قوتِ نظری آنست که شوق او بسوی ادراک معارف ونیل علوم باشد تا بر مقتضای از شوق کسب استطاعت معرفت اشیاء چنانچه حق اوست حاصل کند، بعد از آن بمعرفت مطلوب حقیقی وغرض کلی که انتهای جملهٔ موجوداست (تعالی وتقدس) مشرف می شود تا بدلالت آن معرفت بعالم توحید بل مقام اتحاد رسد ودلِ او ساکن ومطمئن گردد که (أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ[1]) وغبار شبهت وزنگ شک از چهرهٔ ضمیر وآئینهٔ خاطر او ستره گردد چنانچه شاعر گفته ع

بهر کجا که در آمد یقین گمان برخاست

وقوتِ عملی آن باشد که قوی وافعال خود را مرتب ومنظوم گرداند - چنانکه با یکدیگر مطابق وموافق شوند تا بواسطهٔ آن مساوات اخلاق او مرضی گردد، هر گاه این علم وعمل بدین درجه در شخص جمع آید اورا انسان کامل وخلیفهٔ خدا[2]

---

[1] سورهٔ رعد - آیت ۲۸؛ [2] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں؛

توان گفت، و مرتبۂ او اعلیٰ مراتب نوع انسان باشد، چنانکہ حق تعالیٰ فرمودند (یُؤتی الحکمۃ من یشاء و من یُؤتَ الحکمۃ فقد اُوتیَ خیراً کثیراً) و رُوح او بعد فراق بدن بنعیم مقیم و سعادت ابد و قبول فیض خداوند مستعد گردد ع

وین کار دولتست کنون تا کہ را رسد

تا اینجا مذہب قدما و حکماست"۔

اس کے فوراً بعد مصنّف "مذہب مختار" کی گفتار چھیڑ دیتا ہے:۔

"(مذہبِ مُختار)

چون بزرگان و زیرکان خوردہ دان کہ اکنون روی زمین بذاتِ شریف ایشان مشرفست در تکمیل رُوح انسانی و مرجع و معاد آن تأمل نمودند و سنن و آرای اکابر سابق پیش چشم بداشتند خدمتشانرا بدین معتقدات انکاری تمام حاصل آمد، میفرمایند کہ برما کشف شد کہ رُوح ناطقہ اعتباری ندارد و بقای آن ببقای بدن متعلقست و فنای آن بفنای جسم موقوف۔ و میفرمایند کہ آنچہ انبیاء فرمودہ اند کہ اورا کمالی و نقصانی ہست و بعد فراق بدن بذات خود قائم و باقی خواہد بود محالست و حشر و نشر امری باطل، حیات عبارت از اعتدال ترکیب بدن باشد چون بدن متلاشی شد آن شخص ابداً ناچیز و باطل

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ ۱؎) اس میں خدائے تعالیٰ کے قول کی طرف اشارہ ہے کہ جب اُس نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرمایا: اِنّی جاعلٌ فی الارض خلیفۃً (قرآنِ کریم سورۃ البقرہ۔ آیت ۲۸)

۱؎ قرآنِ کریم ۔ سورۃ البقرہ ۔ آیت ۲۷۲ ؎

گشت آنچه عبارت از لذاتِ بہشت وعقاب دوزخست ہم درین جہان می توان بود چنانکه شاعر گفته بیت

آنرا که داده اند ہمینجاش داده اند
وآنرا که نیست وعده بفرداش[1] داده اند

لاجرم از حشر ونشر وعقاب وعذاب وقرب وبعد ورضا وسخط وکمال ونقصان فراغتی تمام دارند ونتیجۂ این معتقد آنست که ہمه روزه عمر در کسب شہوات ونیل لذات مصروف فرموده میگویند۔ رباعی:

ای آنکه نتیجۂ چہار وہفتی[2] وز ہفت وچہار دایم اندر تفتی
می خور که ہزار بار بیشت گفتم باز آمدنت نیست چو رفتی رفتی

واکثر این رُباعی در صندوقۂ گور پدران می نویسند۔ رُباعی:

زین سقف برون رواق ودہلیزی نیست
جز با من وتو عقلی وتمیزی نیست
ناچیز که وہم کرده کاین چیزی ہست
خوش بگذر ازین خیال کاین چیزی نیست

وبسبب این عقیده است که قصد خون ومال وعرض خلق پیشِ ایشان خوار وبے مایه می نماید۔ بیت

براو یک جُرعه مے ہمرنگِ آذر گرامی تر ز صد خونِ برادر

---

[1] فردا سے مراد آخرت ہے؛

[2] چار عنصر (اُمّہاتِ سفلی) اور سات سیارے (آبارِ علوی)؛

الحق زہی بزرگانِ صاحب توفیق کہ آنچہ چندین ہزار سال با وجود تصفیۂ عقل و روح محجوب ماند بے زحمتی بر ایشان کشف شد۔"

غرض اسی طرح عبیدِ زاکانی دوسرے فضائل سے بحث کرتا ہے۔ چنانچہ دوسرے باب میں جس کا موضوع "شجاعت" ہے وہ اس فضیلت کے "مذہب مختار" کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

عبیدِ زاکانی کا مقالہ دربابِ شجاعت

اصحابنا می فرمایند کہ شخصی کہ بر قضیۂ ہولناک اقدام نماید و با دیگری با محاربہ و مجادلہ در آید از دو حال خالی نباشد۔ یا خصم غالب شود و یکشد یا بالعکس۔ اگر خصم را بکشد خونِ ناحق در گردن گرفتہ باشد و بتبعیت آن لاشک عاجلاً و آجلاً بدو ملحق گردد۔ و اگر خصم غالب شود آنکس را راہ دوزخ مقرر است۔ چگونہ عاقل بہ حرکتی کہ احد طرفین آن بدین نوع باشد اقدام نماید۔ کدام دلیل روشن تر ازین کہ ہر جا عروسی یا سماعی یا جمعیتی باشد مشتمل بر لوت و حلوا و خلعت و زر مخنثان و حیزان و چنگیان و مسخرگان را انجام طلب کنند و ہر جا کہ تیر و نیزہ باید خورد ابلہی را یاد دہند کہ تو مردی و پہلوانی و لشکر شکنی و گرد دلاوری و اورا برابر تیغہا دارند تا چون آن بدبخت را در مصاف بکشند حیزکان و مخنثان شہر شماتت کنان کون جنبانند و گویند:

تیر و تبر و نیزہ نمی آرم خورد
لوت و مے و مطربم نکو می سازد"

تیسرا باب جو عفت سے متعلق ہے پیش کرنے کے قابل نہیں، البتہ

چوتھے باب میں "عدالت" یعنی عدل کا "مذہبِ مختار" نقل کرنے کے قابل ہے :-

علیمد کا مقالہ عدل کے باب میں

"اما مذہب اصحابنا آنکہ این سیرت اسوۂ سِیَر است و عدالت مستلزم خلل بسیار - و آنرا بدلائل واضح روشن گردانیدہ اند و میگویند بنای کار سلطنت و فرماندہی و کدخدائی بر سیاستست - تا از کسی نترسند فرمان آنکس نبرند و ہمہ یکسان باشند و بنای کارہا خلل پذیرد و نظام امور گسستہ شود آنکس کہ حاشا عدل ورزد و کسی را نزند و نکشد و مصادرہ نکند و خود را مست نسازد و بر زیردستان اظہار عربدہ و غضب نکند مردم از او نترسند و رعیت فرمان ملوک نبرند - فرزندان و غلامان سخن پدران و مخدومان نشنوند - مصالح بلاد و عباد متلاشی گردد و از بہر این معنی گفتہ اند : ع

پادشاہان از پی یک مصلحت صد خون کنند

میفرمایند (العدالۃ تورث الفلاکۃ) خود کدام دلیل واضحتر ازینکہ پادشاہانِ عجم چون ضحاک تازی و یزدجرد بزہ کار کہ اکنون صدر جہنم بدیشان مشرفست و دیگر متأخران کہ از عقب رسیدند تا ظلم میکردند دولت ایشان در ترقی بود و ملک معمور، چون بزمان کسری انوشیروان رسید او از رکاکت رأی و تدبیر وزرای ناقص عقل شیوۂ عدل اختیار کرد، در اندک زمانی کنگرہ ہای ایوانش بیفتاد و آتشکدہ ہا کہ معبد ایشان بود بیکبار بمرد و اثر شان از روی زمین محو شد - امیر المؤمنین مشید قواعد دین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالٰی[1]

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں ؛

عنه که بعدل موصوف بود خشت میزد و نانِ جو میخورد گویند خرقه اش هفده من بود
معاویه ببرکت ظلم ملک از دست امام علی کرم الله وجهه بدر برد، بخت النصر تا
دوازده هزار پیغمبر را در بیت المقدس بگناه نکشت و چند هزار پیغمبر را اسیر نکرد
دستورداری نفرمود و دولت او عروج نکرد و در دو جهان سرفراز نشد، چنگیز خان
که امروز بکوری اعدا در درک اسفل مقتدی و پیشوای مغولان اولین و آخر
نیست تا هزاران هزار بیگناه را بتیغ بیدریغ از پای در نیاورد پادشاهی روی
زمین براو مقرر نگشت ؛

حکایت

در تواریخ مغول وارد است که هلاکو خان را چون بغداد مسخر شد جمعی را
که از شمشیر باز مانده بودند بفرمود تا حاضر گردند- حال هر قومی باز پرسید چون
براحوال مجموع واقف گشت، گفت از محترفه ناگزیر است ایشانرا رخصت
داد تا بر سرِ کارِ خود رفتند- تجار را مایه فرمود دادن تا از بهرِ او بازرگانی
کنند، جهودانرا فرمود که قومی مظلومند بجزیه از ایشان قانع شد، مخنثان را
بحرمهای خود فرستاد- قضاة و مشایخ و صوفیان و حاجیان و واعظان و معرفان
و گدایان و قلندران و کشتی گیران و شاعران و قصه خوانان را جدا کرد و فرمود
اینان در آفرینش زیادتند و نعمت خدای بزیان می برند، حکم فرمود تا همه را
در شط غرق کردند و روی زمین را از خبث ایشان پاک کرد، لاجرم قرب نود

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) [۱] یہ علامتیں منجملہ ان علامات کے تھیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے- کہ یہ
عربوں کے حملے اور سلطنتِ ساسانی کے تنزل کی خبر لائیں ؛

سال پادشاہی در خاندان او قرار گرفت و ہر روز دولت ایشان در تزاید بود، ابوسعید بیچارہ را چون دغدغۂ عدالت در خاطر افتاد و خود را بشعار عدل موسوم گردانید در اندک مدتی دولتش سپری شد و خاندان ہلاکو خان و مساعی او در سر نیت ابوسعید رفت آری بیت

چو خیرہ شود مرد را روزگار
ہمہ ان کند کش نیاید بکار[1]

رحمت بر این بزرگان صاحب توفیق باد کہ خلق را از ظلمت ضلالت عدالت بنور ہدایت ارشاد فرمودند!"

ریش نامہ ریش نامہ عبید زاکانی اور ڈاڑھی کے درمیان ایک طُرفہ خیالی مکالمہ ہے۔ ڈارھی کو حُسنِ شباب کا فنا کنندہ قرار دیا گیا ہے؛

رسالۂ "صد پند" رسالۂ "صد پند" ۷۵۰ھ (۱۳۵۰ع) میں تصنیف ہوا۔ اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں سو نصیحتیں ہیں بعض سنجیدہ ہیں" مثلاً اے عزیزان عمر غنیمت شمرید"۔ "عیش امروز بفردا میندازید"۔ "حاضر وقت باشید کہ عمر دوبارہ نخواہد بود"۔ اور بعض طنزیہ اور ہزلیہ ہیں۔ مثلاً "تا توانید سخن حق می گوید تا بر دلہا گراں مشوید و مردم بے سبب از شما نرنجند"۔ "سخن شیخان باور مکنید تا گمراہ نشوید و بدوزخ

[1] پروفیسر براؤن کے ماخذ (طبع قسطنطنیہ) میں یہ شعر محذوف معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ انکے ہاں شاملِ عبارت نہیں؛ (مترجم)

نروید"۔ "در کوچہ کہ منارہ باشد وثاق میگرید تا از دردِ سر مؤذنان بدآواز ایمن باشید"۔ "ہزل خوار مدارید، و ہزالان را چشم حقارت منگرید"۔

عبید کی "تعریفات"

"تعریفات" یا "دہ فصل" بھی پچھلی تصنیف یعنی "صد پند" کی طرح صرف چند صفحوں کا رسالہ ہے۔ اس میں سے چند نمونے اس کی نوعیت کا تصوّر دلانے کے لئے کافی ہوں گے :۔

(فصلِ اوّل در دنیا و ما فیہا)

الدنیا : آنجا کہ ہیچ آفریدہ دروی نیاساید ،

العاقل : آنکہ بدنیا و اہلِ او نپردازد ،

الکامل : آنکہ از غم و شادی منفعل نشود ،

الفکر : آنچہ مردم را بیفائدہ بیمار کند ،

الدانشمند : آنکہ عقلِ معاش ندارد ،

الجاہل : دولت یار ؛

(فصل دوم در ترکان و اصحاب ایشان)

الیأجوج والمأجوج : قوم ترکان کہ بولایتی متوجّہ شوند۔

الزبانیہ : پیشرو ایشان ،

القحط : نتیجۂ ایشان ،

العسس : آنکہ شب راہ زند و روز از بازاریان اُجرت خواہد ؛

(فصل سوم در قاضی و متعلّقات آن)

القاضی: آنکه همه اورا نفرین کنند،

الوکیل: آنکه حق باطل گرداند،

الرشوة: کارسازِ بیچارگان۔

السعید: آنکه هرگز روی قاضی نبیند،

الخطیب: خر،

: ؎

الشاعر: طامع خودپسند؛

(فصل چهارم در مشایخ و ما یتعلّق بهم)

الشیخ: ابلیس،

الشیاطین: اتباع او،

الصوفی: مفتخوار،

الحاجی: آنکه دروغ بکعبه خورد؛

(فصل پنجم در خواجگان و عاداتِ ایشان)

اللاف والوقاحة: مایۂ ایشان،

؎ "The Prelector ; An ass's tail"

میرے ماخذ (انتخاب مطبوعہ برلن) میں یہ تعریف غائب ہے (مترجم)؛

الهیچ : وجود شان ،

المجوف : تواضعشان ،

الگزاف والسفہ : سخنشان ،

اللوم والحرص والبخل والحسد } : اخلاقشان ،

الابلہ : آنکہ برایشان امید خیر دارد ،

(فصل ششم در ارباب پیشہ واصحاب مناصب)

البازاری : آنکہ از خدا نترسد ،

العطار : آنکہ ہمہ را بیمار خواہد ،

الطبیب : جلّاد ،

الکذاب : المنجم ،

الکشتی گیر : تنبل ،

الدلال : [1]

الصدیک : آنچہ از مزروعات بمالک نرسد ،

الشکایۃ : آنچہ بمالک نرسد ،

---

[1] انتخاب مطبوعہ برلن میں اس کی تعریف "حرامی باز" لکھی ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنے ماخذ سے ذیل کی تعریف نقل کی ہے :

The chartered thief of the market-place ! (مترجم)

(فصلِ هفتم در شراب و ملحقات آن)

الشراب : مایۂ آشوب ،

النرد و الشاهد و الشمع و النقل : آلات آن ،

الچنگ و العود و المزمر : ساز آن ،

الشوربا و الکباب : اغذیۂ آن ،

الچمن و البستان : موضعِ آن ؛

هادم اللذات : رمضان ،

لیلة القدر : شبِ عید ؛

(فصلِ هشتم در بنگ و متعلقات آن)

البنگ : آنچه صوفیانرا بوجد آورد ،

المرصّع و الکریم الطرفین : آنکه بنگ و شراب باهم خورد ،

المحروم : آنکه از این دو هیچکیپ نخورد ؛

(فصل نهم در کدخدائی و ملحقات آن)

المجرّد : آنکه بریشِ دنیا خندد ،

الشقی : کدخدا ،

ذوالقرنین : آنکه دو زن دارد ،

اشقی الاشقیاء : آنکه بیشتر دارد ،

الباطل : عمرِ کدخدائی ،

الضایع : روزگارِ او ،

التلف : مالِ او ،

الپریشان : خاطرِ او ،

التلخ : عیش او ،

الماتمسرا : خانۂ او ،

العدو خانگی : فرزند ،

البداختر : آنکہ بدختر گرفتار باشد ،

الخصم : برادر ،

الخویشاوند : دشمنِ جان ،

الفرج بعد الشدہ : لفظِ سہ طلاق ،

(فصلِ دہم در حقیقتِ مردان و زنان)

الخاتون : آنکہ معشوق بسیار دارد ،

الکدبانو : آنکہ بسیار ندارد ،

المستور : آنکہ بیک عاشق قانع باشد ،

الـــہ

لـہ "The Maiden : A name denoting what does not exist."

انتخابِ مطبوعہ برلن میں یہ تعریف غائب ہے (مترجم) ؛

عبید کا "رسالۂ دلگشا" رسالۂ دلگشا، عربی اور فارسی حکایات و لطائف کا ایک مجموعہ ہے جن میں اکثر از قسمِ ہزل ہیں۔ اس کے شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے۔ دونوں حصّوں کے کچھ نمونے یہاں شامل ہیں:۔

(حکایاتِ عربیہ)

(۳) خرج (جحی) مرۃ الی الکناسۃ لیشتری حمارا فاستقبل رجل قال له: الی این؟ قال: الی الکناسۃ لاشتری حمارا۔ قال: قل انشاء الله۔ قال: لیس ھذا موضع انشاء الله۔ الحمار فی السوق والدراھم فی کفی۔ فلما دخل السوق ضربت علیه الطرار و سرق منه الدراھم۔ فلما رجع استقبله الرجل فقال: مِن این؟ قال: من السوق انشاء الله۔ سُرِقت دراھمی انشاء الله۔ ولم اشتری الحمار انشاء الله وانا رجعت خائبا خاسراً الی البیت انشاء الله۔

(۳) لقی رجل رجلا وھو علی حمار سؤ فقال: الی این یا فلان؟ قال: الحق صلوۃ الجمعۃ۔ فقال له: ویحک الیوم الثلاثا قال: طوبیٰ لی ان اوصلنی حماری الجامع یوم السبت؛

(۳) جاء رجل الی ایاس بن معاویۃ فقال: لو اکلت التمراءَ یضرّنی؟ قال: لا۔ قال: لو اکلت الشونیز مع الخبز ما یلزم؟ قال: لا یلزم شیئ۔ قال: لو شربت قدرا

من الماء؟ قال: ما تمنع؟ قال: شراب التمر اخلاط منها فکیف یکون حرامها؟ قال ایاس: لو رمیتك بالتراب أیوجع؟ قال: لوصب علیك قدرا من الماء أینکسر عضو منك؟ قال: لا- قال: لو فعلت من الماء والتراب لبنا فجففت فی الشمس وضربت به راسك کیف یکون؟ قال: یهلك- قال: ذالك مثل هذا؛

(حکایاتِ فارسی)

(ح) شیعۀ در مسجد رفت نام صحابه دید بر دیوار نوشته شده است- خواست که خیو بر نام ابوبکر و عمر بیاندازد بر نام علی افتاد- سخت برنجید گفت: تو که پہلوی اینان نشینی سزای تو این باشد؛

(ح) شخصی دعوی خدائی میکرد- اورا پیش خلیفه بردند- اورا گفت پارسال اینجا یکی دعوی پیغمبری می کرد اورا بکشتند- گفت نیک کرده اند که اورا من نفرستاده بودم؛

(ح) جحی در کودکی چند روز مزدور خیاطی بود- روزی استادش کاسۀ عسل بدکان برد- خواست که به کاری رود- جحی را گفت درین کاسه زهر است زنہان تا نخوری که ہلاک شوی- گفت مرا با آن چه کار است! چون استاد برفت جحی وصلۀ جامۀ بصراف داد و پارۀ نانِ فرونی[1] بستد و با آن عسل تمام بخورد- استاد باز آمد وصله طلبید- جحی گفت مرا مزان تا راست بگویم

---

[1] غالباً "فرانی" مراد ہے جو عربی میں شیرمال کو کہتے ہیں (مترجم)؛

حال آنکه من غافل شدم طرار وصله بر بود۔ من نرسیدم که تو بیائی و مرا بزنی گفتم زہر بخورم تا تو باز آئی من مردہ باشم۔ آن زہر کہ در کاسہ بود تمام بخوردم و ہنوز زندہ ام باقی تو دانی؛

(ح) قزوینی با سپری بزرگ بجنگ ملاحدہ[1] رفتہ بود۔ از قلعہ سنگی بزرگ برسرش زدند و بشکستند۔ برنجید و گفت: ای مردک کوری سپری بدین بزرگی نمی بینی سنگ بر سر من میزنی!

(ح) قزوینی را پسر در چاہ افتاد، گفت جان بابا مرو تا من بروم رسن بیاورم و ترا بیرون کشم؛

(ح)[2] سلطان محمود پیری ضعیف را دید کہ پشتوارہ خارمی کشد بروحمش آمد۔ گفت ای پیر دو سہ دینار زر میخواہی یا درازگوشی یا دو سہ گوسفند یا باغی کہ بتو دہم تا ازین زحمت خلاص یابی۔ پیر گفت: زر بدہ تا در میان بندم و بر درازگوش بنشینم و گوسفندان در پیش گیرم و بباغ روم و بدولت تو باقی عمر آنجا بیاسایم سلطان را خوش آمد و فرمود چنان کردند؛

(ح) شخصی با دوستی گفت: مرا چشم درد میکند تدبیر چہ باشد؟ گفت: مرا

---

[1] حشیشیین جن کا سب سے بڑا قلعہ "الموت" قزوین کے متصل واقع تھا؛

[2] پروفیسر براؤن نے اس حکایت سے پہلے ایک حکایت نقل کی ہے جو میرے ماخذ میں نہیں ہے۔ وہ یہ ہے: ایک مؤذن بھاگتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اذان دے رہا تھا۔ لوگوں نے پوچھا۔ بھاگتے کیوں ہو؟ کہنے لگا سب کہتے ہیں کہ میری آواز دُور سے بہت بھلی لگتی ہے۔ میں اپنی آواز سے دُور بھاگ رہا ہوں کہ دیکھوں آیا یہ سچ ہے یا نہیں (مترجم)؛

پارسال دندان درد میکرد بر کندم؛

(ح) کلی از حمام بیرون آمد کلاهش دزدیده بودند با حمامی ماجرا میکرد۔ حمامی گفت تو اینجا آمدی کلاه نداشتی۔ گفت ای مسلمانان! این سراز آن سرہاست کہ بی کلاہ براہ توان برد؟

(ح) از قزوینی پرسیدند کہ امیرالمومنین علیؑ را شناسی؟ گفت شناسم گفتند چندم خلیفہ بود۔ گفت من خلیفہ ندانم۔ آنست کہ حسینؓ اورا در دشتِ کربلا شہید کردہ است[۱]؛

(ح) لولئی با پسر خود ماجرا میکرد کہ تو ہیچ کاری نمی کنی و عمر در بطالت بسر میبری۔ چند با تو بگویم کہ معلق زدن بیاموز۔ سگ از چنبر جہانیدن و رسنبازی تعلم کن تا از عمر خود برخوردار شوی۔ اگر از من نمی شنوی بخدا ترا در مدرسہ اندازم تا آن علم مردہ ریگ ایشان بیاموزی و دانشمند شوی و تا زندہ باشی در مذلت و فلاکت و ادبار بمانی و یک جو از ہیچ جا حاصل نتوانی کرد؛

(ح) قزوینی تابستان از بغداد میامد۔ گفتند آنجا چہ میکردی۔ گفت عرق؛

"رسالۂ دلکشا" کے ساتھ جس میں سے اوپر کی چند حکایات لی گئی ہیں عبید زاکانی کی تصانیف کی مطبوعہ ایڈیشن ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے آگے صرف

---

[۱] اس حکایت سے قزوینیوں کی حماقت اور جہالت دکھانا مقصود ہے۔ زمخشری نے اس سے ملتی جلتی ایک حکایت دی ہے جو چہار مقالہ (سلسلۂ یادگار گب ۱۱؎) کے دیباچہ انگریزی (صفحہ کا تاکب) میں منقول ہے؛

دو خط اس طبع میں اور شامل ہیں کہ ناقابلِ فہم سوقیت کے نمونے ہیں۔ اور لسانی اغلاط سے پُر ہیں۔ ان کا ازغام شیخ شہاب الدین قلندر اور مولینا جلال الدین بن حسام ہروی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن لاشک ان دونوں کو معرضِ تضحیک میں لانے کے لئے عبید نے خود لکھے ہیں؛

عبید زاکانی کیلئے اتنی جگہ وقف کرنے کے اسباب

فارسی ادبیات کے بہت سے متعلم یہ کہینگے کہ میں نے اس کتاب میں عبید کو جتنی جگہ دی ہے اُتنی کا وہ حقدار نہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ پھکڑ اور تمسخر پیشہ سہی لیکن اس کی زوردار اپج اور بے باکیٔ کلام ایسی صفات ہیں کہ جتنی توجہ اسے یہاں دی گئی ہے اس سے زیادہ کا اسے مستحق بناتی ہیں۔ اس کی "اخلاق الاشراف" اس باعث قابلِ قدر ہے کہ اس زمانے کے فاسد اخلاق پر روشنی ڈالتی ہے۔ عبید کے ترجمہ نگار کا یہ خیال قرینِ قیاس ضرور ہے کہ یہ کتاب مصنّف نے سنجیدہ مقصد کے ساتھ لکھی کہ اس کے ذریعے ابنائے وطن کی آنکھیں کھولے اور انہیں دکھائے کہ مغولی تسلّط کے دور میں ایران کی عوامی اور خانگی زندگی کس اندوہناک پستی کے گڑھے میں جا گری ہے۔ متقدمین میں اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے عبید اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ گو اپنے پیشرو سوزنی اور اپنے دو جانشینوں سے کسی قدر مشابہت رکھتا ہے۔ ان جانشینوں میں ایک ابو اسحٰق (بسحٰق) شیرازی ہے کہ طبخ کا شاعر اور تحریف نگار[1] تھا۔ اور دوسرا محمود قاری یزدی

---

[1] Paredist.

کہ لباسیات کا شاعر ہے۔ متاخرین میں عبید کی تصانیف کا مرتب میرزا حبیب اصفہانی ہزلیات کے میدان میں عبید کا ہمقدم ہے۔ بلکہ اس سے آگے نکل گیا ہے۔ وہ انیسویں صدی کے آخر میں قسطنطنیہ میں فوت ہوا ٭

عماد الدین فقیہہ کرمانی

عماد کرمانی اس شاعر کو جو شہرت نصیب ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ خواجہ حافظ کا حریف تھا۔ اور کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے ایک کینہ آمیز غزل[1] اور خصوصًا شعرِ ذیل میں اس پر چوٹ کی ہے ؎

ای کبکِ خوش خرام کجا میروی بأیست

غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

قصّہ یوں ہے کہ عماد شاہ شجاع مظفری کا متقرّب تھا۔ اور ادھر خواجہ حافظ کسی

---

[1] ملاحظہ ہو دیوانِ حافظ، طبع روزن زوائگ شواناؤ (Rosenzweig- Schwanau) جلد اول ص ۷-۳۱۶، لیکن وہاں اس شعر کے نیچے جو حاشیہ ہے اس میں اس کی تلمیح کی شرح اَور کی گئی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو اوپر ص ۳۵۵، حاشیۂ ذیلی [1]؛

[2] اہلِ انتقاد اب اس قصّے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسکے سلسلے میں خوانندگانِ عماد پر قبلہ والدی ڈاکٹر محمد اقبال صاحب مدظلہٗ کا مقالہ کل ہند اورینٹل کانفرنس (۱۹۲۸ء) کی روداد میں ملاحظہ فرمائیں۔ خواجہ حافظ نے البتہ عماد کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں جو قبلہ والدی مدظلہٗ نے یکجا کرکے اورینٹل کالج میگزین بابت ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء میں شائع کی ہیں؛ (مترجم)؛ [3] دیکھیے حبیب السیر جلد سوم، جزو دوم ص ۳۷ اور ہفت اقلیم؛

طرح بھی اس کے منظور نظر نہ تھے۔ عماد جیسا کہ اس کے لقب فقیہہ سے ظاہر ہے فقہ کا عالم تھا۔ اُس نے ایک پالتو بلّی سدھا رکھی تھی۔ کہ جب وہ نماز پڑھتا تو بلی رکوع و سجود میں اس کی نقل کرتی۔ شاہ مسخرہ بازی کے اس فن کو ایک معجزہ سمجھتا تھا۔ اور خواجہ حافظ اسے محض ریاکاری کا تماشا جانتے تھے؛

عماد کے مذکورات تذکرۂ دولت[1] شاہ، بہارستانِ جامی (بابِ ہفتم)، آتشکدہ[2] حبیب السیر (حسب مذکور) اور دیگر تذکروں میں ملتے ہیں۔ لیکن ان میں اسکے حالاتِ زندگی یقیناً بہت قلیل پائے جاتے ہیں[3]۔ کہا جاتا ہے کہ کرمان میں اس کی بڑی تعظیم ہوتی تھی۔ اور وہاں اس نے ایک مدرسہ یا زاویہ بنا رکھا تھا۔ جامی لکھتے ہیں "جو لوگ اس کی خانقاہ پر آتے انہیں اپنے اشعار سنایا کرتا اور ان سے تنقید و اصلاح کی درخواست کرتا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی شاعری کل اہلِ کرمان کی شاعری ہے"۔ دولت شاہ نے شیخ آذری صاحب 'جواہر الاسرار' کی رائے نقل کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"..... فضلا بر آنند کہ در سخن متقدمان و متأخران احیاناً حشوی واقع شدہ والا سخن خواجہ عماد فقیہہ کہ اکابر اتفاق کردہ اند کہ در آن سخن اصلا فتوری

---

[1] راقم کی ایڈیشن۔ ص ۶-۲۵۴؛ [2] ص ۱۱۱؛

[3] عماد کی زندگی کے حالات جہاں تک اس کے کلیات سے اخذ کئے جا سکتے ہیں قبلہ والدی ڈاکٹر محمد اقبال صاحب مدظلہٗ نے ایک مقالے میں جمع کئے ہیں۔ سب سے زیادہ اطلاعات آپکو مثنوی صفا نامہ (جس کا دوسرا نام مونس الابرار ہے) میں ملی ہیں۔ یہ مقالہ پانچویں کل ہند اورنٹیل کانفرنس (دسمبر ۱۹۲۸ء) کی روئداد میں چھپا ہے۔ اس میں علاوہ سوانحعمری کے کلام کا تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے؛ (مترجم)

واقع نیست نہ در لفظ و نہ در معنی ......"۔

عماد کی محفوظ تالیفات[1] میں ایک دیوان ہے جس کے نسخے عام نہیں ہیں[2]۔ اور کم از کم پانچ مثنویاں ہیں۔ ان میں زمانے کے اعتبار سے سب سے پہلی "محبت نامۂ صاحبدلان" ہے۔ جو ۷۲۲ھ (۱۳۲۲ء) میں لکھی گئی۔ اور سب سے آخری "مونس الابرار" ہے کہ ۷۶۶ھ (۱۳۶۴ء) میں تصنیف[3] ہوئی۔ بقول دولت شاہ عماد نے ۷۷۳ھ (۲-۱۳۷۱ء) میں ظاہراً خاصی لمبی عمر پاکر وفات کی۔ اس تذکرہ نگار نے اس کی دو غزلیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک درجِ ذیل ہے[4]۔

بیچارہ خستۂ کہ ز دار الشفاء دین	قارورہ می برد بحکیمان رہ نشین
از راہ و رنج و محنت و بیماریش چہ غم	آنرا کہ خضر یار و مسیحا بود قرین

---

[1] پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں کلیاتِ عماد کا ایک نادر قلمی نسخہ محفوظ ہے جو سابقاً پروفیسر سراج الدین آذر صاحب کے ذاتی کتاب خانے کی زینت تھا۔ یہ نسخہ غیر مؤرخہ ہے۔ تاہم اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نویں صدی ہجری کے اوائل کا نوشتہ ہے۔ غالباً یہ نسخہ دنیا بھر میں کلیات عماد کا قدیم ترین محفوظ نسخہ ہے (مترجم)؛

[2] ملاحظہ ہو کتاب خانۂ بانکی پور کے مخطوطات کی اعلیٰ فہرست جو سرڈینی سن روس کے زیرِ نگرانی مولوی عبدالمقتدر صاحب نے تیار کی اور ۱۹۰۸ء میں کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوئی، (شعرائے فارسی" فردوسی تا حافظ۔ ص ۹-۲۱۸)؛ [3] قبلہ والدی ڈاکٹر محمد اقبال صاحب مدظلہ نے یہ مثنوی مرتب کر کے اورینٹل کالج میگزین (بابت نومبر ۱۹۲۸ء بعد) میں باقساط شائع کی ہے (مترجم)

[4] دولت شاہ۔ میری ایڈیشن۔ ص ۲۵۴، س ۱۴ تا ص ۲۵۵، س ۴؛

بر لوح جان نوشتہ ام از گفتۂ پدر — روزِ ازل کہ تربت او باد عنبرین

کای طفل اگر بصحبت افتادۂ رسی — شوخی مکن بچشم حقارت درو مبین

بر شیر از آن شدند بزرگانِ دین سوار — کآہستہ تر ز مور گذشتند بر زمین

گر در جہان دلی ز تو خرم نمی شود — باری چنان مکن کہ شود خاطری حزین

یاری بجز خدا نتوان خواستن عماد

یا مستعان عونک ایاک نستعین

---

(۵) سلمان ساوجی[1]

(جمال الدین محمد سلمان ابن علاؤ الدین محمد)

سلمان ساوجی سلمان ساوجی کا ذکر اوپر عبید زاکانی کے سلسلے میں آچکا ہے یہ ایک اور شاعر ہے جسے خواجہ حافظ نے اپنے ایک قطعے میں فضیلت کی سند دی ہے وہ قطعہ یہ ہے ؎

سرآمدِ فضلای زمانہ دانی کیست

ز راہِ صدق و یقین نی ز راہِ کذب و گمان

شہنشہِ فضلا پادشاہِ ملکِ سخن

جمالِ ملت و دین خواجۂ جہان سلمان

---

[1] سلمان کے تفصیلی مطالعہ کیلئے شائقین پروفیسر رشید یاسمی کی تالیف "تتبع و انتقادِ احوال و آثارِ سلمان ساوجی" (مطبوعہ کتاب خانۂ شرق طہران و غیر مؤرخہ) کی طرف رجوع فرمائیں ؛ (مترجم)

سلمان لازماً درباری شاعر اور قصیدہ گو تھا۔ اور اپنی عمر کے بیشتر حصے میں وہ ایلخانی یا جلائرُ خاندان سے وابستہ رہا۔ اور اس میں اسکے خاص مربّی شیخ حسن بزرگ بانیٔ سلسلہ، اس کی حرم دلشاد خاتون اور ان کا بیٹا سلطان اویس تھے۔ ان تذکرہ نویسوں کے ہاں جن کے حوالے اس باب میں مسلسل دیئے گئے ہیں سلمان کے مذکورات موجود ہیں[1]۔ لیکن انکے علاوہ سلمان کے دو اعلےٰ ترجموں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے جو دونوں ہندوستانی فاضلوں نے ترتیب دیئے ہیں۔ ان میں ایک انگریزی میں ہے اور دُوسرا اُردو میں۔ پہلا "فہرست کتابخانۂ بانکی پور ...... فردوسی تا حافظ" میں (ص ۲۱۹ تا ص ۲۲۵) مولوی عبد المقتدر صاحب نے لکھا ہے کہ فارسی تذکرہ نگاروں کی مہیا کردہ معلومات کا ایک بہت عُمدہ ناقدانہ خلاصہ بہم پہنچاتا ہے دوسرا مولانا شبلی نعمانی کی کتاب شعر العجم میں شامل[2] ہے۔ یہ کتاب فارسی کے کوئی بیس ایک ممتاز شعراء پر تبصروں کا ایک قابلِ تعریف مجموعہ ہے۔ سنہ ۵-۱۳۲۴ھ (۷-۱۹۰۶ء) میں علی گڑھ بچھاپ سنگی شائع ہوئی؛

اس بات کا ثبوت کہ سلمان ۷۰۰ھ (۱۳۰۰ء) میں یا اسکے لگ بھگ پیدا ہوُا جیسا کہ مولوی عبد المقتدر صاحب نے جتایا ہے اس کی مثنوی فراق نامہ

---

[1] ملاحظہ ہو دولت شاہ (طبعِ راقم)، ص ۲۵۷ تا ص ۲۶۳؛ آتش کدہ (طبع سنگی ۱۲۷۷ھ) ص ۲۰۸ تا ص ۲۱۱؛ حبیب السیر (طبع سنگی، بمبئی ۱۸۵۷ء) جلد سوم۔ جزو اول، ص ۱۳۰، ص ۱۳۵، ص ۱۳۷؛ بہارستانِ جامی، روضۂ ہفتم وغیرہ؛

[2] سلمان کا تذکرہ اس کتاب کی دوسری جلد میں ہے ص ۱۹۷ تا ص ۲۱۱؛

کے ایک شعر سے ملتا ہے جو ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) میں تالیف ہوئی۔ اس میں شاعر کہتا ہے کہ میری عمر اکسٹھ سال ہو چکی ہے فاضل موصوف نے اس بات کے ثبوت

سلمان کی سوانحعمری کیلئے مواد

میں بھی معقول دلائل پیش کی ہیں کہ اس کی وفات بروز دوشنبہ ۱۲ر صفر ۷۷۸ھ (یکیم جولائی ۱۳۷۶ء) کو واقع ہوئی۔ اُس نے دو مثنویاں تصنیف کیں۔ ایک تو یہی فراق نامہ جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ اور ایک اَور جس کا عنوان "جمشید و خورشید" ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غزلیں، کچھ رُباعیات اور مقطعات لکھے لیکن اس کا اصل مایہ الامتیاز قصیدہ گوئی ہے۔ اور جیسا کہ جامی کہتے ہیں اکثر وہ سابق الزمان استادوں پر اس میں سبقت لے گیا ہے۔ اس کی غزلیات کے بارے میں جامی لکھتے ہیں کہ وُہ بھی خوشگوار اور

سلمان کی غزلیہ شاعری پر مولانا جامی کی تنقید

بڑی خوش ترکیب ہیں۔ لیکن چونکہ چاشنیٔ عشق و محبت سے کہ غزل کا جوہر ہے خالی ہیں اس لئے ارباب ذوق ان کو بہت اعلیٰ نہیں سمجھتے"۔ کلیاتِ سلمان کی طبع سنگی (بمبئی) میں قصائد شروع کے ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہیں غزلیں صفحات ۱۳۶ تا ۲۳۰ پر اور رباعیات آخری چھ صفحوں پر؛

جیسا کہ مولوی عبدالمقتدر نے لکھا ہے بظاہر سلمان کی سب سے ابتدائی نظمیں سلطان ابوسعید اور اس کے وزیر مقتدر خواجہ غیاث الدین محمد کے مرثیے ہیں۔ سابق الذکر نومبر۔ دسمبر ۱۳۳۵ء میں فوت ہؤا اور مؤخّر الذکر ۲۱ر رمضان ۷۳۶ھ (۳ر مئی ۱۳۳۶ء) کو قتل کیا گیا۔ اسی سال شیخ حسنِ بزرگ نے

ایلخانی خاندان قائم کیا اور بغداد کو سلطنت کا پایۂ تخت ٹھہرایا۔ سلمان نے اس تاجدار کی فیاضی کی شہرت سُنی اور غالباً اپنے سابق سرپرست خواجہ غیاث الدین کی بے رحمانہ ہلاکت کے فوراً بعد بغداد کا قصد کیا۔ اور دربار میں پہنچا۔ دولت شاہ اور دُوسرے مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے سلمان نے اشعار ذیل کے ذریعے شیخ حسن کو اپنی طرف ملتفت کیا۔ امیر اس وقت تیراندازی کا کمال دکھارہا تھا کہ سلمان نے یہ اشعار فی البدیہہ کہے[1]:

چو در بار چاچی[2] کمان رفت شاہ تو گفتی کہ در بُرج قوس است ماہ
دو زاغ کمان با عقاب سہ پر[3] بدیدم بیک گوشہ آوردہ سر[4]
نہادند سر بر سر دوش شاہ ندانم چہ گفتند در گوش شاہ
چو از شصت بکشاد خسرو گرہ برآمد ز ہر گوشہ آواز دہ
شہا تیر در بند تدبیر تُست سعادت دوان در پی تیر تُست
بعہدت زکس نالۂ بر نخاست بغیر از کمان گر بنالد رواست

کہ در عہد سلطان صاحب قران
نکرد دست کس زور جز بر کمان

لیکن تذکرہ نگاروں کے کہنے کے مطابق سلمان کو ایلخانی دربار میں جو سرفرازیاں

---

[1] منقول از دولت شاہ۔ ص ۲۵۷۔ س ۱۵ تا ۲۱؛

[2] چاچ یا شاش آجکل کے تاشقند کا نام تھا۔ یہاں کی کمانیں مشہور تھیں؛

[3] کمان کے دونوں گوشے "زاغ" کہلاتے ہیں۔ "عقاب سہ پر" سے مراد تیر ہے؛

[4] اس میں استعارۃً مراد یہ ہے کہ کمان پوری کھینچی گئی؛

نصیب ہوئیں ان کے لئے وہ خاص طور پر قابل اور جمیل ملکہ دلشاد خاتون اور خوش طبع سلطان اویس کا مرہون منت تھا۔ اس خاندان کے متعلق کہتا ہے ؎

من از یُمنِ اقبال این خاندان گرفتم جہان را بتیغِ زبان
من از خاوران تا درِ باختر زخورشیدم امروز مشہور تر

شیخ اویس ۷۵۶ھ (۱۳۵۶ء) میں تخت پر بیٹھا۔ اور تقریباً بیس سال بر سرِ حکومت رہا۔ سلمان نے اس کی شان میں بہت سے قصائد کہے ہیں۔[۱] اسکے علاوہ ان حکایات سے جو دولت شاہ نے دی ہیں اور آؤسلے نے اپنے "تذکرۂ شعرائے فارسی" میں[۲] اسکے ہاں سے نقل کی ہیں پتہ چلتا ہے کہ سلطان اور سلمان کا آپس میں کیسا گہرا تعلق تھا۔ بقول دولت شاہ سلطان کے حُسن و جمال کا یہ عالم تھا۔ کہ جب اس کی سواری نکلتی تو اہلِ بغداد رستوں میں ہجوم کر کے آتے کہ دیدۂ حیران کے ساتھ اس چہرے کا نظارہ کریں جسے دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یوسف کے افسانوی حُسن نے پھر سے جنم لیا ہے۔ جب بے وقت موت اسکے سرہانے آکھڑی ہوئی تو کہتے ہیں کہ اُس نے ذیل کے نفیس اشعار کہے ؎

زدار الملک جان روزی بشہرستان تن رفتم
غریبی بودم اینجا چند روزے باوطن رفتم
غلام خواجۂ بودند گریزان گشتہ از خواجہ
در آخر پیش او شرمندہ با تیغ وکفن رفتم[۲]

---

[۱] ص ۱۷۱ ببعد؛ [۲] نوٹ سامنے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

الا ای ہمنشینانِ من محـرومم ازین دُنیـا
شمارا عیش خوش بادا درین خانہ کہ من رفتـم

جیسا کہ اکثر قصیدہ نویسوں کے ہاں پایا جاتا ہے سلمان کے کئی قصائد میں ہمیں خاص خاص تاریخی واقعات کی تلمیحات ملتی ہیں۔ اس لئے ان قصائد کی تاریخِ تصنیف معین کی جا سکتی ہے۔ مولوی عبد المقتدر نے حبیب السیر سے ایسے دس قصائد کی فہرست ان کی شانِ نزول اور تاریخ تصنیف کیساتھ دی ہے[1]۔ ان میں سابق ترین قصیدہ ۷۳۹ھ (۱۳۳۸ء) میں شیخ حسن بزرگ کے بغداد کو رجعت کرنے کے موقع پر لکھا گیا۔ اس کا مطلع یہ ہے[2]

وقتِ صبحست ولبِ دجلہ و انفاسِ بہار
ای لبپر کَشتیٔ مے تا نشطِ بغداد بیار

اخیر کے دو قصیدے ۷۷۶ھ (۱۳۷۵ء) میں تصنیف ہوئے۔ شاہ شجاع نے آذربائجان میں میدان مارا۔ اس فتح کی شان میں کہے گئے ہیں[3]۔ ان میں دوسرا قصیدہ شاہ کو بیحد پسند آیا۔ اس کا مطلع یہ ہے[4]

(حاشیہ صفحہ ۳۸۴) ایک مفرور غلام جب پشیمان ہو کر یہ دکھانا چاہے کہ میں غیر مشروط تسلیم واطاعت اور انتہائی سزا پانے کے لئے حاضر ہوں تو وہ اپنے آقا کے پاس تیغ و کفن لیکر جاتا ہے۔ تیغ اس اظہار کیلئے کہ میں کشتنی ہوں مجھے قتل کر دو اور کفن اپنی تکفین کیلئے؛ [1] فہرست کتابخانہ بانکی پور ص ۳-۲۲۲؛

[2] یہ قصیدہ آپ کو کلیاتِ سلمان کی طبع سنگی کے ص ۸۷-۸۸ پر ملے گا؛

[3] حبیب السیر۔ جلد سوم۔ جزو دوم ص ۳۵؛

[4] ملاحظہ ہو طبع سنگی ص ۸-۵۷؛

سخن بوصفِ رُخش چون زخاطرم سرزد
زمطلعِ سخنم آفتاب سر بر زد

یہی وہ قصیدہ ہے جسے سُن کر شاہ شجاع نے کہا تھا[1] " ما آوازۂ سہ کس از مشاہیر این ولایت راشنیدہ بودیم وایشان را مختلف الاحوال مشاہدہ فرمودیم، سلمان ازانچہ در وصفِ او می گفتند زیادہ بود و یوسف شاہ خوانندہ مساوی و خواجہ شیخ کجالی متناقص"۔

لیکن سلمان کے مشہور ترین قصیدوں میں سے ایک وہ ہے جو اُس نے شیخ اویس کی وفات کی یادگار میں لکھا۔ کہ جمادی الثانی ۷۷۶ھ (نومبر ۱۳۷۴ء) میں واقع ہوئی۔ شروع یوں ہوتا ہے[2] :-

ای فلک آہستہ رو کاری نہ آسان کردۂ ملکِ ایران را بمرگِ شاہ ویران کردۂ
آسمانی را فرود آوردۂ از اوجِ خویش بہ زمین افگندۂ با خاک یکسان کردۂ
نیست کاری مختصر گر با حقیقت میروی قصدِ خون ومال و عرض ہر مسلماں کردۂ

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے سلمان غالباً ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) میں فوت ہوُا۔ ابھی یہ بھی بیان ہوُا ہے کہ شاہ شجاع کی فتح والے دو قصیدے اس نے ۷۷۰ھ میں لکھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اپنی طویل عُمر کے آخر تک اُس نے شعر وسخن کا مشغلہ جاری رکھا۔ دولت شاہ نے یہ جو بیان کیا ہے[3] کہ اس نے عزلت گزینی اختیار کی واقعاً درست نہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ اُس نے اپنی ایک

---

[1] حبیب السیر۔ جلد سوم۔ جزو دوم۔ ص ۳۵ (مترجم)؛ [2] معلوم ہوتا ہے کہ طبعِ سنگی میں یہ قصیدہ شامل نہیں ہے؛ [3] طبع راقم ص ۲۶۱ س ۲۱؛

نظم میں استعفا کی خواہش ظاہر کی۔ یہ نظم مولوی شبلی نعمانی نے اپنی شعر العجم میں نقل کی ہے (جلد دوم ص ۱۹۸ تا ص ۲۰۱) اس میں وہ اپنے سرپرستِ شاہی سے کہتا ہے کہ تقریباً چالیس سال میں نے حضور کی مدح و ثنا شرق و غرب میں پھیلائی ہے اب میں بڈھا، کمزور، لنگڑا اور ضعیف البصارت ہو چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دربار سے رخصت پاؤں اور بقیۃ العمر شاہ کے لئے دعا کرنے میں صرف کروں مدت تک ملکِ شعرار کا مالک رہا ہوں اب تمنا ہے کہ فقرار کا خادم ہو جاؤں مجھے یقین ہے کہ شاہ میرا وظیفہ برقرار رکھے گا۔ لیکن اس بات کی طمع رکھتا ہوں کہ وجہ معاش اور وظیفے کی رقم معین ہو جائے۔ آخر میں کہا ہے کہ مجھ پر بہت سا قرض ہو گیا ہے۔ اس کے ادا کرنے کی میں استطاعت نہیں رکھتا۔ شاہ سے التجا ہے کہ یہ حساب چکا دے۔ کہتے ہیں کہ شاہ نے جواب میں شاعر کی منظوم عرضداشت پر دو شعر لکھے۔ پہلے میں اس نے فرمان جاری کیا ہے۔ کہ جو تنخواہ سلمان کے نام مقرر رہی ہے برقرار رہے اور دوسرے میں رَے کے پاس ایرین کے گاؤں کی جاگیر اُسکے نام کر دی ہے ؏

مولوی شبلی نعمانی نے سلمان کا تذکرہ ختم کرتے ہوئے مختلف اصنافِ سخن میں اسکے کمال کا تخمینہ پیش کیا ہے۔ جو تمامتر تحسین پر مبنی ہے۔ اس کی استادی خاص طور پر قصیدوں میں نمایاں ہے۔ اس کے قصائد کی خصوصیت زبان کی صفائی اور روانی اور اس کے علاوہ ترکیبوں کی چستی ہے کہ سابق شعرا کے ہاں نہیں ملتی اور خاص متوسطین کا انداز ہے۔ سلمان ان دو گروہوں کے درمیان تغیری دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ شبلی نے اپنے بیان کی تمثیل میں

ذیل کے نمونے دئے ہیں ؎

خندۂ زد دہنت تنگ شکر پیدا کرد — سخنی گفت، لبت لؤلؤی تر پیدا کرد
بود نایافت میانِ تو ولیکن کمرت — چست بر بست میان را و بزر پیدا کرد
پردہ از چہرہ بر انداز کہ آن زلفِ سیاہ — در سپیدی عذار تو اثر پیدا کرد

بادِ نوروز[1] نسیمِ گلِ رعنا آورد — گردِ مشکِ ختن از دامنِ صحرا آورد
شاخ را باغ بنقشِ دُمِ طاؤس نگاشت — غنچہ را باد بشکلِ سرِ ببغا آورد
لالہ از دامنِ کوہ آتشِ موسیٰ بنمود — شاخ بیرون ز گریبان یدِ بیضا آورد[2]
از پیِ خسروِ گل بلبلِ شیریں گُفتار — نغمۂ باربد[3] و صوتِ نکیسا آورد
سرو را بادِ صبا منصب بالا بخشید — لالہ را لطف ہوا خلعتِ والا آورد

اس کے بعد شبلی نے دقیق اور نازک مضمون آفرینی میں کہ متوسطین اور

---

[1] ایرانی نوروز ۲۱ر مارچ کو ہوتا ہے جبکہ دن اور رات برابر ہوتے ہیں؛

[2] سفید شگوفوں کی طرف اشارہ ہے خیام کی اس رباعی کے ساتھ مقابلہ کیجئے:۔

اکنون کہ جہان را بخوشی دست رسیست
ہر زندہ دلی را سوی صحرا ہوسیست
بر ہر شاخی طلوع موسے دستیست
در ہر نفسے خروش عیسے نفسیست (مترجم)

[3] باربد خسرو پرویز ساسانی کا مشہور درباری گویا تھا۔ اور نکیسا اس کا بربط نواز تھا؛

متاخرین کا کارنامۂ فخر ہے سلمان کی استادی کی مثالیں دی ہیں ذیل کے نمونے کافی ہوں گے :-

در دُرجِ دُرِ عقیقِ لبت نقدِ جان نہاد
جنسِ لطیف بود بجائے نہان نہادؔ[1]

قفلی ز لعل بر درِ آن درج زد لبت
خالت ز عنبر آمد و مُہری بر آن نہاد

باریک تر ز مو کمرت را دقیقۂ
ناگاہ در دل آمد و اسمش میان نہاد

بعد ازین از گرہِ زلفِ معنان کن تسبیح
پس ازین از خمِ ابروی بُتان کن محراب

خوش برآ ہمچو حباب از مئے گلگون ومنہ
ہیچ بُنیاد برین گنبدِ گردان چو حباب

مدّتی گردشِ این دائرہ مارا از ہم ہمچو پرکار جُدا کرد وبہم باز آورد

غنچہ را پیشِ دہانِ تو صبا خندان یافت آنچنان بر دہنش زد کہ دہن پُر خون شد

---

[1] مراد یہ ہے کہ عاشق کی جان معشوق کے دہن میں ہے جسے وہ چمکدار دانتوں کی نسبت سے "دُرجِ دُر" کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے اور تنگی کے سبب "جائی نہان" کے ساتھ!

پا ازین دائرہ[1] بیرون ننہم یک سرِ مُو   گر سراپای چو پرکار کنندم بدو نیم

ایک اور اُستادی کی بات جو مولوی شبلی نے سلمان کے ہاں دیکھی ہے یہ ہے کہ مشکل قافیوں اور ردیفوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہاں طویل قصیدے موجود ہیں جن میں پاؔی، رَو، بر سر وغیرہم ردیفیں لیکن ان میں الفاظ اور خیالات کی صاف اور قدرتی روانی پورے طور سے قائم ہے ؛

اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے شاعر کے قطعات کو لیا ہے جیسا کہ اس صنفِ کلام کا معمول ہے۔ سلمان کے قطعات بھی اس کی زندگی کے مختلف واقعات سے متعلق ہیں۔ اور غزلیات اور قصائد کی نسبت ان میں اس کے ذاتی معاملات کے اشارے زیادہ پائے جاتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ بمبئی کی طبع سنگی میں یہ قطعات نہیں ہیں ؛

ایک مرتبہ بادشاہ نے سلمان کو ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا عطا کیا۔ اسے پسند نہ آیا۔ اس نے چاہا کہ وہ واپس دے کر کسی دُوسرے رنگ کا گھوڑا لے۔ لیکن

---

[1] میرے دوست محمد اقبال صاحب نے میری توجہ خواجہ حافظ کے مندرجۂ ذیل متوازی شعر کی طرف دلائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مُراد سبزۂ خط کے دائرے سے ہے جو رخسار پر بن گیا ہے ؎

ہر کرا با خطِ سبزت سرِ سودا باشد
پای ازین دائرہ بیرون ننہد تا باشد

ملاحظہ ہو دیوانِ حافظ۔ طبع روزن زوائگ شتواناؤ۔ جلد اول۔ صفحہ ۵۱ ؛

معلوم ہوتا ہے کہ داروغۂ اصطبل اس پر راضی نہ ہُوا - اس پر شاعر نے مربی کو یہ قطعہ لکھا ؎

شاہا مرا بہ اسپی موعود کردہ بودی — در قول پادشاہان قیلی دگر نباشد
اسپی سیاہ و پیرم دادند و من بر آنم — کاندر جہان سیاہی زآن پیر تر نباشد
آن اسپ باز دادم تا دیگرے ستانم — بر صورتی کہ کس را زین سر خبر نباشد
اسپ سیہ بدادم رنگِ دگر ندادند — آری پس از سیاہی رنگِ دگر نباشد[1]

سلمان نے ایک اَور قطعہ میں اس بدنصیب گھوڑے کی ہجو کی ؎

شاہا امید بود کہ خواہم بدولتت — بر مرکبی بلند و جوان و روان نشست
اسپیم پیر و کاہل و کوتہ ہمی دہند — اسپی نہ آنچنان کہ توانم بر آن نشست
چون کلک مرکبی سیہ و شست و لاغرست — جہلِ مرکبست بر اسپی چنان نشست
از بندہ مہترست بہ سی سال راستی — گستاخی است بر زبرِ مہتران نشست

ایک اور قطعے میں سلمان نے دربار سے غیر حاضر رہنے کی معذرت کی - کہ میری آنکھوں میں آشوب ہے - اور گو آستانِ شہی کی مٹی سُرمہ ہے لیکن چشم بد کا شاہ سے دُور رکھنا ضروری ہے ؎

خسروا خاکِ درگہِ تو مراست — از غبارِ زرور نیکوتر
لیک در عین حالتی کہ مراست — غیبتم از حضور نیکوتر
حال چشم بد است دُور از تو — چشمِ بد از تو دُور نیکوتر

ایسے ہی ایک اور موقع پر غیر حاضری کے لئے دردِ پا کا عذر پیش کرتا

---

[1] یہ فارسی کی ایک مشہور کہاوت ہے؛

ہے۔ غالباً نقرس ہے جس کی طرف اس نے اور نظموں میں اشارہ کیا ہے۔ لطیف پیرائے میں کہتا ہے کہ دردِ پا اس بات سے مانع آتا ہے کہ شاہ کیلئے دردِ سر کا باعث بنوں۔ دردِ سر فارسی محاورے میں مصیبت اور جھنجھٹ کو کہتے ہیں۔

شعر العجم میں سلمان کے کمالات کا خلاصہ

آخر میں شبلی نعمانی نے سلمان کی اختراعات اور خصوصاً اسکے صنعتِ ایہام کو خوبی سے برتنے کا ذکر کیا ہے۔ مجموعی نتیجہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلمان بلند پایہ قصیدہ گویوں کی صف میں کھڑا کئے جانے کا مستحق ہے طباع باکمال اور کسی حد تک صاحبِ ندرت شاعر ہے۔ لیکن اس میں وہ گرمیٔ تخیل، آتشِ جذبہ اور زورِ یقین نہیں جن سے ایک شاعر عظیم بنتا ہے۔ اور اس کا شہرہ اس کے اپنے عہد اور ملک کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔

---

(۶) خواجہ حافظِ شیرازی

(شمس الدین محمد حافظ)

ہم نے اس باب کے آغاز میں تعمیماً کہا تھا کہ اس دَور کے شعراء کے حالات میں ثقہ اطلاعات کا غیر معمولی قحط ہے۔ یہ بات بالخصوص شاعرِ لافانی ولاثانی خواجہ حافظ شیرازی کے معاملے پر صادق آتی ہے کہ ان میں بلکہ کُل شعرائے ایران میں ممتاز ترین اور مشہور ترین ہیں اور اُنکے شیدائیوں نے انہیں لسان الغیب

اور "ترجمان الاسرار" کے لقب دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی وفات کے بعد شعراء کے جتنے متعدد تذکرے تالیف ہوئے ہیں سب میں ان کے مذکورات آتے ہیں۔ یہ سلسلہ دولت شاہ سے شروع ہوتا ہے۔ جس نے اپنا تذکرہ حافظ کی وفات کے صرف ایک صدی بعد لکھا۔ اور رضا قلی خان کی ریاض العارفین اور مجمع الفصحاء جیسی جدید تالیفات تک آتا ہے۔ لیکن ان تذکروں میں قابل وثوق سوانحی تفصیلات بہت کم ہیں اور بیشتر ان حکایتوں پر محتوی ہیں جو انکی غزلوں کے بعض اشعار سے متعلق ہیں اور غالباً اگر سب نہیں تو اکثر حکایتیں ان اشعار کی تشریح و تمثیل کے لئے گھڑی گئی ہیں۔ خواجہ حافظ کا واحد معاصر مذکور جس سے میں واقف ہوں اُن کے دوست اور اُن کے دیوان کے جامع و مرتب محمد گل اندام کے دیباچے میں آیا ہے۔ اس نے نہایت طوالت کیسا تھ ان کی طبع بینظیر اور ان کے ہمہ گیر تاثرات کی توصیف کی ہے اور لکھا ہے کہ حین حیات ہی میں نہ صرف فارس سے لیکر خراسان اور آذربائیجان تک انکی سخنوری کی شہرت پھیلی۔ بلکہ ہندوستان، ترکستان اور عراقین میں بھی اس کا چرچا ہوا۔ اسکے بعد لکھتا ہے[1]:-

ولی محافظت درس قرآن و ملازمت شغل سلطان و تحشیہ کشاف[2] و مصباح[3]

---

[1] براؤن مرحوم نے عبارت کا انگریزی ترجمہ دیا ہے۔ میں نے اصل متن نقل کر دیا ہے؛ (مترجم)

[2] الزمخشری کی مشہور تفسیر قرآن؛

[3] اس نام کی کتابیں بہت سی ہیں۔ غالباً یہاں المطرزی (المتوفی ۶۱۰ھ = ۱۲۱۳ء) کی عربی صرف سے مراد ہے؛

ومطالعۂ مطالع[1] ومفتاح[2] وتحصیل قوانین ادب وتجسّس دواوین عرب از جمع ابیات وغزلیاتش مانع آمدی واز تدوین اثبات ابیاتش وازع گشتی مسوّدِ این اوراق عفی اللہ عنہ ماسبق اقل انام محمد گلندام در درسگاہ مولانا وسیدنا استاد البشر قوام الملّت والدین عبداللہ اعلے اللہ تعالےٰ درجاتہٗ فی اعلیٰ علّیین بکرات ومرات کہ بمذاکرہ رفتی درا ثنای محاورہ گفتی کہ این فوائد فرائد را ہمہ در یک عقدمی باید کشید واین غرر دُرر را در یک سلک می باید پیوست تا قلادہ جیدّ وجود اہلِ زمان شود وتمیمۂ وشاح عروسان دوران گردد وآنجناب حوالت رفع این ترفیع بناراستی روزگار کردی ونقص اہل عصر را عذر آوردی تا در تاریخ ۷۹۱ھ .... ودیعت حیات بموکّلانِ قضا وقدر سپرد"۔

خواجہ حافظ کی حیات کے مذکورات

سر گور آؤسلے کی دلپذیر کتاب "تذکرہ شعرائے فارسی"[3] میں خواجہ حافظ پر جو مقالہ ہے اس میں اکثر وہ حکایات ہیں جو اُن کے دیوان کے اشعار سے متعلق ہیں اور جن کے متعلق میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں علاوہ برآن جن زمانوں میں حافظ نے زندگی بسر کی اُنکا اور حافظ کی شاعری کی مجموعی خصوصیات کا ایک قابلِ ستائش محاسبہ آپ کو مس گرٹروڈ لوتھین بیل کی کتاب "انتخاب دیوانِ حافظ"[4] کے

---

[1] غالبًا البیضاوی (المتوفی ۶۸۳ھ = ۱۲۸۴ء) کی مطالع الانظار سے مراد ہے؛

[2] غالبًا السکاکی (المتوفی ۶۲۶ھ = ۱۲۲۹ء) کی مفتاح العلوم سے مراد ہے؛

[3] ص ۲۳ تا ص ۴۲؛ [4] Poems from the Diwan of Hafiz by Miss Gertrude Lowthian Bell (لندن ۱۸۹۷ء)؛

مقدمے میں ملے گا۔ کلام حافظ کو انگریزی خواتوں کے لئے قابلِ رسائی بنانے کی یہ کتاب یقیناً ایک اُستادانہ کوشش ہے۔ مگر مجموعی حیثیت سے حافظ پر

حافظ پر شبلی کا محققانہ مطالعہ

بہترین اور جامع ترین تبصرہ جو میرے علم میں ہے شبلی نعمانی کی اُردو کتاب موسوم بہ شعر العجم[1] میں درج ہے جو فارسی شاعری پر[2] ایک تصنیف ہے۔ اور اس باب میں اوپر بار بار اس کے حوالے آ چکے ہیں۔ میرے خیال میں میں اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ اس تذکرے کے کم سے کم اس حصّے کا ملخص پیش کر دُوں جو شاعر کی زندگی سے بحث کرتا ہے۔ اور اس کے ذاتی حالات اور معاصرین کے ساتھ تعلّقات کی چند ایسی اطلاعات بہم پہنچاتا ہے جو اسکے اپنے کلام سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ان فارسی تذکراتی ماخذ کا بھی ذکر کر دوں جن کے فاضل مصنّف نے حوالے دئے ہیں۔ ازانجملہ اُنہوں نے خاص طور پر خواندمیر کی مشہور "حبیب السیر" اور عبد النبی فخر الزمان کے تذکرہ

حافظ کی فارسی سوانح عمریاں

"میخانہ"[3] (مؤلفہ در ۱۰۳۶ھ = ۷-۱۶۲۶ء بعہدِ جہانگیر) کا ذکر کیا ہے۔ مؤخر الذکر کا سرِ دست میرے پاس کوئی نسخہ نہیں۔ فارسی تذکرے جن کی طرف مَیں نے رجوع کیا ہے نہایت ناکافی نتائج بہم پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ مولانا شبلی نے

---

[1] جلد دوم ص ۲۱۲ تا ص ۲۹۷؛ [2] جلد سوم جزو دوم - ص ۳۷ - طبع سنگی بمبئی ۱۸۵۷ء؛

[3] محترمی مولوی محمد شفیع صاحب (سابق پرنسپل اورینٹل کالج) نے صحیح و مرتب کرکے ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع کیا۔ (مترجم)؛

جتا یا ہے۔ تذکرہ نگار بالعموم ایک دُوسرے سے نقل کرتے چلے آتے ہیں اور اکثر ایسے بیانات دیتے ہیں جو نہ صرف کسی ثقہ شہادت پر مبنی نہیں ہوتے۔ بلکہ باہم متناقض ہوتے ہیں۔ وہ تذکرے یہ ہیں:۔ تذکرۃ الشعراء دولت شاہ؛ بہارستان جامیؔ[1]؛ نفحات الانس جامیؔ[2]؛ آتشکدہ از لطف علی بیگ (جو بیشتر دولت شاہ کی تقلید کرتا ہے)؛ ہفت اقلیم اور مجمع الفصحاء[3]۔ آخری تذکرہ خاصی جدید تالیف ہے۔ اس میں بہت سی نئی اطلاعات دی گئی ہیں جن کا مستند ہونا مشکوک ہے۔ مثلاً یہ کہ حافظ کا اصل وطن توی سرکان تھا اور یہ کہ اُنھوں نے قرآن کی ایک تفسیر لکھی۔

خواجہ حافظ کا نسب اور بچپن کا زمانہ

شبلی نعمانی صاحب نے اپنا مواد نہایت سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ شاعر کے نسب اور اس کی تعلیم کے حال سے شروع کیا ہے جو متذکرہ بالا "میخانہ" سے ماخوذ ہے۔ گو اس ماخذ کو بظاہر شبلی نے چنداں قابلِ اعتبار نہیں سمجھا۔ شبلی کے بیان کے مطابق خواجہ حافظ کے والد بہاء الدین نے اتابکان فارس کے عہد میں اصفہان سے شیراز کو ہجرت کی اور وہاں تجارت کے ذریعے خوب مالدار ہو گئے۔ لیکن اپنے کاروبار کو ابتری اور بیوی اور کمسن بچے کو تنگ دستی کے حال میں چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ غرض بچے کو پسینہ بہا کر

---

[1] طبع قسطنطنیہ (۱۲۹۴ھ = ۱۸۷۷ء) ص ۹۰؛

[2] طبع نساؤلیس (Nassau Less) کلکتہ ۱۸۵۹ء۔ ص ۱۵؛

[3] جلد دوم۔ ص ۱۱؛

روزی کمانی پڑی۔ با ایں ہمہ اتنا وقت اور وسائل حافظ کو میسر آئے کہ پاس کے ایک مکتب میں حاضر رہ سکے۔ یہاں اُنھوں نے معقول تعلیم پائی اور قرآن حفظ کیا اسی نسبت سے آگے چل کر حافظ تخلّص کیا۔ جلد ہی شعر کہنے اور سُنانے لگے۔ لیکن کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ تا آنکہ باباکوہی کے مزار پر جو شیراز کے شمال میں ایک پہاڑی پر واقع ہے خواب میں حضرت علیؑ اُن کے پاس آئے اور ایک پر اسرار بہشتی لقمہ کھانے کو دیا اور کہا کہ جاؤ اب سے شاعری کا ملکہ اور تمام علوم کی چابیاں تمہاری ہوگئیں *

خواجہ حافظ کے مربیّ

اس کے بعد شبلی مختلف سلاطین و امرار کو معرضِ شمار میں لائے ہیں جن کی تربیت و سرپرستی خواجہ حافظؒ کو نصیب ہوئی۔ ان میں پہلا مربی شاہ (یا شیخ) ابواسحٰق انجو ابن محمود اِنجوؔ[1] تھا جو غازان خان کی طرف سے فارس کا حکمران ہو کر آیا تھا۔ خود شاعر تھا۔ اور

شیخ ابواسحٰق اِنجوؔ

شاعر دوست تھا۔ بے فکرا اور عیش پرست تھا۔ ملکی معاملات میں اس کی لاپروائی کا یہ عالم تھا کہ بالآخر جب مظفرّی لشکروں نے

---

[1] فارس نامہ کی رُو سے اسے ارپا نے ۷۳۶ھ (۶-۱۳۳۵ء) میں قتل کر دیا۔ اور خود ارپا کو ابواسحٰق کے بیٹے مسعود انجو نے مار ڈالا۔ اسی ماخذ کی رو سے ابواسحٰق نے ۷۴۳ھ (۳-۱۳۴۲ء) میں شیراز پر قبضہ کر لیا۔ ۷۵۳ھ (۳-۱۳۵۲ء) میں مبارز الدین محمد بن مظفرؔ نے اس کا محاصرہ کیا۔ اپنے صغیر سن فرزند علی سہل کی وفات کے بعد ابواسحٰق اصفہان کی جانب دھکیلا گیا۔ بالآخر ۷۵۸ھ (۱۳۵۷ء) میں حریف کے ہاتھوں گرفتار ہو کر قتل ہوا *

نے شیراز کا محاصرہ کیا۔ اور اسکے مقرّبِ خاص شیخ امین الدّین نے دشمن کی طرف توجہ کرنیکو کہا۔ تو اُس نے جواب میں اسی قدر کہا کہ شاہ مظفّر بھی عجب احمق ہے بہار کا پُرکیف زمانہ یوں خراب کرتا ہے۔ ساتھ ہی یہ شعر پڑھا اور پھر لہو لعب میں مشغول ہوگیا ؎

بیا تا یک امشب تماشا کُنیم
چو فردا شود کارِ فردا کنیم

شیراز میں ابو اسحٰق کے مختصر مگر خوشگوار عہدِ حکومت کو یاد کرتے ہوئے حافظ کہتے ہیں ؎

راستی خاتمِ فیروزۂ بو اسحاقی　　خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

ابو اسحٰق کے دربار کے پانچ رتن

ذیل کے اشعار جو دربارِ شیخ ابو اسحٰق کے پانچ خاص رتنوں کی یادگار قائم کرتے ہیں اسی زمانے میں لکھے گئے ؎

بعہدِ سلطنتِ شاہ شیخ ابو اسحاق　　بپنج شخص عجب ملکِ فارس بود آباد
نخست پادشہی ہمچو او ولایت بخش　　کہ گوئی فضل ربود او بعدل و بخشش وداد
دوم بقیۂ ابدالؔ شیخ امین الدّین　　کہ بود داخل اقطابؔ و مجمعِ اوتادؔ

ؔ ابدال (جمع بدل)، اقطاب (جمع قطب) اور اوتاد (جمع وتد۔ خیمے کی کھونٹیاں) رجال الغیب کی تین قسمیں ہیں جن کے متعلق صوفیوں کا نظریہ ہے کہ یہ نظام عالم اور بہبودی خلق کی نگرانی کرتے ہیں۔ اُن کی تعداد و وظائف و مناصب پر الشریف الجرجانی کی "تعریفات" میں بحث کی گئی ہے۔ الجرجانی کو شاہ شجاع نے شیراز میں معلمی کا عہدہ تفویض کیا تھا۔ خواجہ حافظ سے ضرور آشنائی رکھتا ہوگا۔ ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) میں فوت ہوا۔

سوم چو قاضیِ عادل اصیلِ ملّت و دین | کہ قاضیٔ بہ از و آسمان ندارد یاد
دگر چو قاضیٔ فاضل عضدؔ[1] کہ در تصنیف | بنای شرحِ مواقف بنامِ شاہ نہاد
دگر کریم چو حاجی قوامؔ[2] دریا دل | کہ او بجود چو حاتم ہمی صلا در داد
نظیرِ خویش نہ بگذاشتند و بگذشتند | خدای عزّ و جلّ جملہ را بیامرزاد

مبارز الدّین ابنِ مظفّر

مبارز الدّین ابنِ مظفّر ۷۵۴ھ سے ۷۵۹ھ (۱۳۵۳ء سے ۱۳۵۷ء) تک فارس پر حکمران رہا۔ مزاج میں اپنے نشاط پرور پیشرو اور مغلوب ابو اسحٰق سے بہت مختلف تھا۔ درشت، سخت گیر اور متقشّف تھا۔ شیراز پر قبضہ کرتے ہی اُس نے تمام شراب خانے بند کرا دئے اور جہاں تک ہو سکا میخواری کا انسداد کیا۔ حافظ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی۔ من جملہ اور غزلوں کے ذیل کی غزلوں میں ان خشک ایام کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز ست | ببانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز ست

---

[1] عضد الدین عبد الرحمٰن بن احمد الایجی نے علم دین، اخلاق، فلسفہ وغیرہ پر متعدد کتابیں تصنیف کیں ان میں "مواقف فی علم الکلام" سب سے زیادہ مشہور ہے اور الجرجانی (جس کا ذکر پچھلے حاشیے میں آیا ہے) نے اس کی ایک شرح لکھی ہے۔ قاضی عضد نے ۷۵۶ھ (۱۳۵۵ء) میں وفات کی ملاحظہ ہو بروکلمن (تاریخ ادبیاتِ عرب) جلد دوم۔ ص ۹ - ۲۰۸ ؛

[2] حافظ نے حاجی قوام کی تعریف علاوہ اَور اشعار کے شعر ذیل میں بھی کی ہے ؎

دریای اخضر فلک و کشتیٔ ہلال | ہستند غرقِ نعمتِ حاجی قوامِ ما

فارس نامۂ ناصری کی رُو سے حاجی قوام نے ۷۵۳ھ (۱۳۵۲ء) میں وفات پائی ؛

در آستین مرقع پیالہ پنہاں کُن | کہ ہمچو چشمِ صُراحی زمانہ خونریز ست
زرنگِ بادہ بشوئید خرقہ ہا از اشک | کہ موسمِ ورع و روزگارِ پرہیز ست

بود در ہا کہ در میکدہ ہا بکشایند | گرہ از کارِ فروبستۂ ما بکشایند
گیسوئے[1] چنگ ببُرید بمرگ مئے ناب | تا ہمہ مغبچہ ہا زلف دوتا بکشایند
نامۂ تعزیتِ دخترِ رز[2] بنویسید | تا حریفان ہمہ خون از مژہ ہا بکشایند
درِ مے خانہ ببستند خدایا مپسند | کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
اگر از بہر دل زاہد خود بین بستند | کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
اگر از بہرِ دلِ زاہدِ خود بین بستند | دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشایند

شاہ شجاع مے خانے پھر سے کھولنے کی اجازت دیتا ہے

شاہ شجاع نے جو اپنے باپ مبارز الدین کا جانشین ہوُا اور جس نے باپ کی عائد کردہ جابرانہ پابندیاں اُٹھا دیں اسی مضمون پر ذیل کی رُباعی کہی ؎

در مجلسِ دہر است سازِ ہستی پست است
نہ چنگ بقانون و نہ دف بردست است
رندان ہمہ ترکِ مے پرستی کردند
جز محتسب شہر کہ بی مے مست است

---

[1] تار یا تانت کا استعارہ ہے؛
[2] شراب کو عرب بھی "بِنتُ العِنَبْ" کہتے ہیں؛

شراب خانوں کے پھر سے کھل جانے پر حافظ نے اشعارِ ذیل میں جوشِ مسرت کا اظہار کیا ہے ؎

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش | کہ دورِ شاہِ شجاع است می دلیر بنوش
شد آنکہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند | ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
ببانگِ چنگ بگوئیم آن حکایت ہا | کہ از شنیدنِ آن دیگِ سینہ میزد جوش

رموزِ مملکت خویش خسروان دانند
گدای گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

ایک اَور غزل میں کہتے ہیں ؎

قسم بحشمت وجاہ وجلالِ شاہ شجاع | کہ نیست باکسم از بہرِ مال و جاہ نزاع
ببین کہ رقص کنان می رود بنالۂ چنگ | کسی کہ اذن نمی داد استماع سماع

اسی طرح ایک اَور غزل میں فرماتے ہیں ؎

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر
جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد منّاع
عمرِ خسرو طلب ار نفع جہان می طلبی
کہ وجودیست عطا بخش و کریمی نفّاع
مظہرِ لطفِ ازل روشنئ چشم امل
جامعِ علم و عمل جانِ جہان شاہِ شجاع

باوجود اس کے کہ ان اشعار میں اور ان کے علاوہ دُوسرے اشعار میں شاہ شجاع کی مدح کی گئی ہے

شاہِ شجاع خواجہ صاحب سے صاف نہیں

کہا جاتا ہے کہ شاہ و شاعر کے باہمی تعلقات کُچھ کشیدہ تھے۔ شاہ شجاع کرمانی شاعر عمادِ فقیہہ کا بڑا معتقد تھا۔ عماد نے ایک بلّی اس طرح سدھا رکھی تھی۔ کہ جب نماز پڑھتا تو بلّی بھی نماز پڑھنے کے انداز سے جُھکتی اور سر اُٹھاتی۔ شاہ اس کارنامے کو تقریباً مُعجزہ سمجھتا تھا۔ لیکن خواجہ صاحب اسے بازی گر کا کرتب جانتے تھے۔ اس پر اُنہوں نے کہا ؎

صوفی بجلوہ آمد و آغازِ ناز کرد
بُنیادِ مکر با فلکِ حقّہ باز کرد
ای کبکِ خوش خرام کہ خوش میروی بناز
غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد[۱]

کہتے ہیں کہ عماد کے حق میں استہزار سے کام لینا ہی شاہ شجاع کی ناراضی کا ابتدائی سبب ہوُا۔ لیکن شاہ خود بھی شاعری کے میدان میں خواجہ صاحب کا کُچھ ایسا کامیاب حریف نہ تھا۔ اور اس حسد نے ناراضی کو اَور تیز کیا۔

خواجہ صاحب نے عماد کی تحقیر کی

ایک موقعہ پر شاہ نے اُن کی غزل پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں کئی پہلو ہوتے ہیں اور متلوّن ہوتی ہے۔ اور کسی واحد تحریک کی پیداوار نہیں ہوتی۔ ابھی تصوف

---

[۱] اس تلمیح کی تشریح اوپر ص ۳۵۵ پر اَور طرح کی گئی ہے۔ اس کا مقابلہ ص ۳۷۷ سے بھی کیجئے۔ دیوان کی طبع روزن زوایک شوانا ؤ میں اس شعر کا جو متن دیا گیا ہے (جلد اول ص ۳۱۶، ردیف د۔ غزل ۳) مندرجۂ بالا یعنی مولانا شبلی کے اختیار کردہ متن سے مختلف ہے۔

میں کہہ رہے ہیں ابھی رندانہ اور عشقیہ کہنے لگے۔ ابھی متانت اور رُوحانیت کے عالم میں ہیں تو ذرا دیر میں غیر سنجیدہ اور نفسانی دنیا میں آ گئے۔ یا اس سے بھی بدتر کوئی راہ لی۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ بجا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میری غزلیں زبان زدِ خلائق ہیں اور سب ان کی تعریف کرتے ہیں۔ بخلاف اسکے مَیں بعض ایسے شاعروں کا نام لے سکتا ہوں جن کا کلام شہر کے دروازے سے باہر بھی نہیں نکل پاتا"۔

شاہ شجاع اس جواب پر بہت برہم ہوا۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ خواجہ صاحب کا شعر ذیل اس کے ہاتھ لگا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اب شاعر اس کی گرفت میں آجائے گا ؎

گر مسلمانی از آنست کہ حافظ دارد
وای اگر از پسِ امروز بود فردائی

خواجہ صاحب کو جب خبردار کیا گیا کہ یہ شعر بدعت اور لاادریت[۱] کے الزام کی بنا ٹھہرایا جائے گا۔ تو وہ نہایت اضطراب کی حالت میں مولانا زین الدین ابوبکر تائبادی کے پاس گئے جو اُن دنوں شیراز میں مقیم تھے۔ ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے صلاح دی

حافظ خوش تدبیری سے اپنے تئیں بدعت کے الزام سی چھڑاتے ہیں

کہ جن الفاظ پر مواخذہ ہُوا ہے اُنکے اوپر ایک اَور شعر لگا دو کہ یہ کسی دُوسرے

---

[۱] Agnosticism — یہ اعتقاد کہ خدا یا دُوسری غیر مادی اشیاء (حیات بعدِ موت قیامت وغیرہ) کی حقیقت کے متعلق ہمیں کچھ علم نہ تو ہے اور نہ غالباً کبھی ہو۔ (مترجم)

کا مقولہ بن جائیں۔ "نقلِ کفر کفر نباشد" کے مصداق الزام تم پر نہیں رہے گا۔
اس پر حافظ نے ذیل کا شعر اس کے اوپر لگا دیا ؎

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت
بر درِ میکدۂ بادف و نی ترسائی

جب بے دینی کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے یہ شعر دوسرے کے ساتھ ملا کر پیش کر دیا۔ اور کہا کہ میں ایک عیسائی کے اظہار کردہ عقائد کا ذمہ دار نہیں ہوں[1]۔

شاہ شجاع نے ۷۸۵ھ (۸۴-۱۳۸۳ء) یا ۷۸۶ھ[2] میں انتقال کیا۔

شاہ منصور

اس کا بیٹا زین العابدین جانشین ہوا۔ لیکن ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں اسکے چچا زاد بھائی شاہ منصور نے اسے معزول کر کے قید کر دیا۔ حافظ نے اس کی ظفر یابی کی شان میں غزل کہی۔ اس کا مطلع یہ ہے:-

بیا کہ رایتِ منصور پادشاہ رسید
نوید فتح و ظفر تا بمہر و ماہ رسید

معزول سلطان زین العابدین نے (جو بعد میں اندھا کرا دیا گیا) اپنے عہد میں تیمور کی بالادستی تسلیم کی تھی اور تیمور کے ایلچی قطب الدین کے مطابق پر فاتح کا نام خطبے اور سکے میں داخل کیا تھا۔ تیمور خود ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں زین العابدین کی معزولی سے کچھ عرصہ پہلے شیراز میں داخل ہوا۔ تیمور اور

---

[1] یہ حکایت حبیب السیر میں دی ہے۔ جلد سوم۔ جزو دوم۔ ص۳۷ بعد؛

[2] ۷۸۶ھ کی تاریخ مجمل فصیحی کے دیئے ہوئے مادّے "حیف از شاہ شجاع" سے نکلتی ہے؛

تیمور اور خواجہ حافظ کی ادّعائی ملاقات

خواجہ حافظ کی وہ غیر مصدقہ ملاقات جسے دولت[1] شاہ اور اس کے مقلدین نے شیراز میں فاتح کے دوسرے داخلے (۷۹۵ھ = ۱۳۹۳ء) سے وابستہ کیا ہے اگر سرے سے ہوئی تو اسی ۷۸۹ھ میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ دوسری بار تیمور جب شیراز میں داخل ہوا ہے تو خواجہ صاحب کو وفات کئے تین یا چار سال ہو چکے تھے۔ یہ قصہ جو مشہور زیادہ ہے اور مستند کم اوپر ص۲۸۱ پر دیا جا چکا ہے۔ دولت شاہ اپنے مشہور عدمِ تحقیق سے کام لیتے ہوئے پہلے اس مفروضہ ملاقات کی تاریخ ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء)

خواجہ حافظ کی تاریخِ وفات

دیتا ہے۔ اور پھر بیان کرتا ہے کہ حافظ ۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں (گویا ملاقات سے ایک سال قبل) فوت ہوئے۔ اور پھر طرّہ یہ کہ انتقال کی یہ تاریخ بجائے خود صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خواجہ حافظ نے ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں یا ممکن ہے اس سے اگلے سال وفات پائی۔ ان میں سابق الذکر تاریخ اس مادے سے نکلتی ہے جو اُنکے لوحِ مزار پر کندہ ہے:-

تاریخ

چراغ اہلِ معنی خواجہ حافظ — کہ شمعی بود از نورِ تجلّی
چو در خاکِ مصلّی ساخت منزل — بجو تارِ یخش از خاکِ مصلّی

یہی تاریخ محمد گلندام مرتب دیوانِ حافظ نے دی ہے۔ دوسری تاریخ یعنی

---

[1] طبع راقم ص ۳۰۵-۶ ملاحظہ ہو؛

۷۹۲ھ جامی نے اپنی نفحات الانس میں۔ خواندمیر نے حبیب السیر میں۔ اور فصیحی خوافی نے اپنی "مجمل" تاریخ و تراجم میں دی ہے۔

جیتے جی خواجہ حافظ کی شُہرت

خواجہ صاحب نے حینِ حیات ہی میں جو شُہرت پائی اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

بشعرِ حافظِ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

ایک اَور جگہ اپنی ایک تازہ غزل[1] کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

شکّر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند   زین قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ میرود
طیّ مکان ببین و زمان در سلوکِ شعر   کین طفل یکشبہ رہِ یکسالہ می رود

خواجہ صاحب کے روابط صرف شیراز کے مظفری سلاطین کیساتھ ہی نہیں بلکہ کئی اَور ہمعصر فرمانرواؤں کے ساتھ قائم ہوئے۔ بغداد کا ایلخانی حکمران سلطان احمد ابن اویس جلائر صاحبِ فضل و کمال تھا۔ خود شاعر مصوّر اور فنونِ لطیفہ کا ماہر تھا۔ برابر اس کوشش میں لگا رہا کہ حافظ کو دربار میں آنے پر راغب کرے۔ لیکن شاعر وطن کے گیت گاتا ہے ؎

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیمِ بادِ مصلّیٰ و آبِ رُکنا باد

تاہم اُنھوں نے اس سلطان کی مدح کے اشعار کہے۔ منجملہ اُن کے ذیل کے

[1] دیوانِ حافظ طبع روزن زوایک شوا ناؤ۔ جلد اوّل صـ۴۱۶؛

اشعار بھی ہیں :-

أَحْمَدُ اللهَ علیٰ معدلۃ السلطان ۔۔۔ احمدِ شیخ اُوَیسِ حسن الیخانی
خان بن خان و شہنشاہِ شہنشاہ نژاد ۔۔۔ آنکہ می زیبد اگر جانِ جہانش خوانی
از گلِ فارسیم غنچۂ عیشی نشگفت ۔۔۔ حبّذا دجلۂ بغداد و مےِ رُوحانی
بر شکن کاکلِ ترکانہ کہ در طالعِ تُست ۔۔۔ دولت خسروی و منصبِ چنگیز خانی

گو خواجہ صاحب نے بغداد کا سفر کبھی اختیار نہیں کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اُن کو اس کا ارمان رہتا تھا ؎

رہ نبُردیم بمقصود خود اندر شیراز
خرّم آن روز کہ حافظ رہِ بغداد کُند

خواجہ حافظ کو ہندوستان آنیکی دعوتیں

ہندوستان کے دو بادشاہوں نے بھی اُنکو اپنے درباروں میں آنے کی ترغیب دلائی۔ ان میں ایک سلطان محمود شاہ بہمنی دکن کا فرمانروا تھا۔ اور شعراء کا فیاض مربّی تھا۔ اُس نے اپنے مقرّبِ خاص میر فضل اللہ کے وسیلے سے اُن کو اپنے دارالسلطنت آنے کی دعوت دی اور سفر کے مصارف بھیجے۔ اُنھوں نے رقم کا ایک معتدبہ حصّہ شیراز سے روانہ ہونے سے پہلے ہی صرف کر ڈالا۔ خلیج فارس کو جاتے ہوئے مقام لار میں پہنچے تو ایک مفلوک الحال دوست سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے پاس جو کچھ باقی تھا اُسے دے ڈالا۔ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی دو ایرانی تاجر ہندوستان آرہے تھے۔ لطفِ صُحبت کے خیال سے اُن کے مصارف

کے کفیل ہوئے۔ ان کے ہمراہ خواجہ صاحب بندرگاہِ ہرمز تک گئے۔ وہاں ایک جہاز منتظر کھڑا تھا کہ ان کو ہندوستان لے چلے۔ لیکن ابھی جہاز پر سوار ہو رہے تھے کہ ایک طوفانِ باد اُٹھا۔ اسے دیکھ کر ایسی شدید وحشت ہوئی کہ ارادہ ترک کرکے شیراز کو واپس ہو گئے۔ اور محمود شاہ کو وہ غزل لکھ بھیجی جو یوں شروع ہوتی ہے ؎

دمی با غم بسر بُردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمے بفروش دلقِ ما کزین بہتر نمی ارزد
شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جان درو درجست
کلاہِ دلکش است اما بترکِ سر نمی ارزد
بکوی مے فروشانش بجامی در نمی گیرند
زہے سجّادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
بس آسان می نمود اوّل غمِ دریا ببوی سود
غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد[1]

شبلی نعمانی ایک حکایت کے راوی ہیں جس کی رو سے ایک اور ہندوستانی فرمانروا سلطان غیاث الدین ابنِ سلطان سکندر شاہ بنگالہ نے حافظ کے ساتھ مراسلت کی[2]۔ حسب روایت بہ شبلی یہ سلطان ۷۶۸ھ میں تخت پر بیٹھا تھا۔

---

[1] یہ حکایت ہندوستان کے مؤرخ محمد قاسم فرشتہ استرآبادی کی سند پر مبنی ہے۔ جس نے اپنی تاریخ ۱۰۱۵ھ (۷-۱۶۰۶ء) میں تالیف کی؛

[2] حاشیہ سامنے کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں؛

خواجہ حافظ نے اس کو غزل لکھ کر بھیجی۔ اسکے ابتدائی اشعار یہ ہیں ؎

ساقی حدیثِ سرو و گل و لالہ میرود — وین بحث با ثلاثہء غسالہ[1] می رود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاثِ دین

غافل مشو کہ کارِ تو از نالہ مے رود

معاصر سلاطین سے خواجہ حافظ کے تعلقات بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اُن کے ذاتی حالات کو لیتے ہیں جن کے متعلق ہماری معلومات اور قیاسات بہت قلیل ہیں۔ اس روایت کے

خواجہ حافظ کے خانگی حالات

حق میں کہ وُہ شاخِ نبات نام ایک دوشیزہ کے عشق میں مُبتلا ہو گئے اور بالآخر اس سے شادی کر لی کوئی وزنی

(حاشیہ صفحہ ۴۰۸) کتابخانۂ بانکی پور کی اعلیٰ فہرست مرتبہ مولوی عبدالمقتدر (شعرائے فارسی: فردوسی تا حافظ: ص ۴-۲۵۳) کی رو سے اس حکایت میں دعوت دینے والا سلطان وہی ہے جو پچھلی حکایت میں ہے۔ یعنی محمود شاہ بہمنی (۷۸۰ھ تا ۷۹۹ھ مطابق ۱۳۷۸ء تا ۱۳۹۶ء)، اس میں حکایت مختلف اور زیادہ مفصل صورت اختیار کرتی ہے؛

[1] عموماً اس سے مراد شراب کے وہ تین گھونٹ لئے جاتے ہیں جو کثرت میخواری کے پیدا کیے ہوئے دردِ سر اور خمار کو توڑنے کے لئے پیے جائیں۔ مولوی عبدالمقتدر نے لکھا ہے کہ ثلاثہء غسالہ میں سلطان کی تین کنیزوں کی طرف اشارہ ہے جن کے نام سرو، گل اور لالہ تھے۔ اور ان وجوہات سے جو مولوی صاحب موصوف نے دی ہیں انکو مجموعی طور پر "ثلاثہء غسالہ" کہا گیا ہے ؎

شہادت موجود نہیں ہے۔ اور نہ اس قسم کی خانگی اطلاعات کی ہمیں فارسی تذکرہ نگاروں سے توقع ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ تمام ازدواجی معاملوں پر خاموش رہتے ہیں۔ اغلب یہی ہے کہ انھوں نے شادی کی اور بہت سی اولاد ہوئی کہتے ہیں کہ اس غزل میں جس کا مطلع درج ذیل ہے۔ اُنہوں نے رفیقۂ حیات کی موت کی طرف اشارہ کیا ہے[1] ؎

آن یار کزو خانۂ ما جای پری بود
سر تا قدمش چون پری از عیب بری بود

لیکن غزل میں کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ اشارہ بیوی کی طرف ہے۔ البتہ ذیل کے شعروں میں ایک فرزند کی مرگ کی طرف واضح تر اشارہ ہے ؎

دلا دیدی کہ آن فرزانہ فرزند ۔۔۔ چہ دید اندر خمِ این طاقِ رنگین
بجای لوحِ سیمین در کنارش ۔۔۔ فلک بر سر نہادش لوحِ سنگین

ذیل کے قطعے[2] کے متعلق بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اسی یا کسی دُوسرے فرزند کی وفات سے متعلق ہے۔ اس میں اس سانحے کی تاریخ ۶ ربیع الاوّل ۷۶۴ھ (مطابق ۲۴ دسمبر ۱۳۶۲ء) دی گئی ہے ؎

صباحِ جمعہ بُد و ساد سِ ربیعِ نخُست ۔۔۔ کہ از دلم رُخِ آن ماہ روی شد زائل
بسالِ ہفصد و شصت و چہار از ہجرت ۔۔۔ چو آب گشت بمن حل حکایتِ مشکل

---

[1] دیوان طبع روزن زوایک شوانائو۔ جلد اوّل۔ ص ۸-۵۹۶ - نیز حاشیہ بر ص ۸۱۹؛

[2] ایضاً۔ جلد سوم ص ۲۸۰؛

دریغ و درد و تأسف کجا دہد سودی   کنون کہ عمر ببازیچہ رفت بی حاصل

ایک تذکرۂ شعرا موسوم بہ "خزانۂ عامرہ" کی رُو سے جو در ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میر غلام علی خان آزاد نے ہندوستان میں تصنیف کیا۔ خواجہ صاحب کا ایک فرزند شاہ نعمان ہندوستان آیا۔ بُرہان پور میں فوت ہُوا اور اسیر گڑھ میں اس کی قبر ہے۔

خواجہ حافظ کی علمی استعداد

خواجہ صاحب کی علمی تحصیل پر آئیے۔ ان کا دوزبانی کلام ہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ان کی عربی علمیت اچھی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ اُن کے دیوان کے مرتّب محمد گلندام کے بیانات[۱] بھی اس پر دال ہیں۔ حافظ خود کہتے ہیں ؎

ز حافظانِ جہان کس چو بندہ جمع نکرد   لطائفِ حکما با کتابِ قرآنی

حفظِ قرآن کا ثبوت اس شعر سے ملتا ہے ؎

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ

بقرآنی کہ اندر سینہ داری

حافظ شاہی انعام واکرام سے بے نیاز نہیں ہیں

مولانا شبلی نے یہ بات جتائی ہے کہ یہ دعوی جو اکثر کیا جاتا ہے۔ کہ حافظ سلاطین و امرار کی عنایات سے مستغنی رہے۔ اُنکے کلام سے تصدیق نہیں پاتا۔ اُنکے کلام میں ضمنی طور پر اُنکے عہد کے بیشتر

[۱] ملاحظہ ہو اوپر ص ۴-۳۹۴؛

فرمانرواؤں کی مدح آجاتی ہے۔ ان میں شاہ شجاع، شیخ ابو اسحٰق، سلطان محمود شاہ منصور اور یزد اور ہرمز کے بادشاہ شامل ہیں ؎

شاہ ہرموزم ندید و بی سخن صد لطف کرد

شاہِ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

کار شاہان این چنین باشد تو ای حافظ مرنج

داورِ روزی رسان توفیق و نصرت شان دہاد

شاہِ یزد کے صلہ نہ دینے کی طرف دوبارہ ایک بڑی مشہور اور دلآویز غزل میں اشارہ کیا ہے[1] ؎

عُمرتان باد و مراد ای ساقیانِ بزمِ جم[2] | گرچہ جام ما نشد پُر می بدورانِ شما

ای صبا با ساکنانِ شہرِ یزد از ما بگو | کای سرِ حق ناشناسان گوی چوگانِ شما

گرچہ دُوریم از بساطِ قرب ہمت دُور نیست | بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

خواجہ حافظ اور دُوسرے قصیدہ گویوں میں کیا فرق ہے

مولوی شبلی نعمانی نے خوب لکھا ہے کہ حافظ اور بیشتر فارسی قصیدہ گویوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں انوری، ظہیر فاریابی اور سلمان ساوجی جیسے عالی مرتبت شاعروں نے بھی روپیہ بٹورنے کے لئے ذلیل اور کمینے طریقے اختیار کرنے میں تامّل نہ کیا۔ وہاں

---

[1] طبیع روزن زوایک شوانادُ۔ جلد اوّل۔ صا۲ تا صک ؛

[2] رزمیاتِ ایران میں جم یعنی جمشید کی شخصیت وہی کچھ ہے جو اوستا میں اساطیری "یم" کی ہے یہاں شاہ یزد کی بزم کی طرف اشارہ ہے ؛

بخلاف اُنکے خواجہ حافظ نے کبھی ایسی روش اختیار نہ کی۔ یا اگر قصیدے کا صِلہ نہ ملا تو کبھی ہجو کی طرف رجُوع نہیں کیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خواجہ حافظ کو شیراز سے کس قدر لگاؤ ہے۔ اور وہ آبِ رُکنا باد اور گلگشت مصلیّ کے گُن گاتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے ؎

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رُکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

ایک اَور جگہ فرماتے ہیں ؎

فرق است ز آبِ خضر کہ ظلمات جای اوست
تا آبِ ما کہ منبعش اللہ اکبر[۱] است

گو خواجہ حافظ کے بیشتر نغمے بہار، گُل، بلبل، شراب، شباب اور حسن کی شان میں ہیں اور کہیں کہیں 'حسن قدیم' کی تعریف میں کہ تمام خوش نما اور دلکش چیزوں میں اسی کی ہلکی سی جھلک ہے لیکن کبھی کبھی وُہ ضمناً مختلف اربابِ سیاست اور فضلا کا ذکر کر جاتے ہیں جن کی عنایت اور سرپرستی ان کو نصیب رہی[۲]۔ اوپر جن بادشاہان و سلاطین کا ذکر آچکا ہے انکے

---

[۱] "تنگ اللہ اکبر" اس گھاٹی کا نام ہے جہاں سے شمال کی طرف سے آنے والے مسافر کے سامنے شیراز کا منظر پہلی بار آتا ہے۔ ملاحظہ ہو ہرمین بکنل کے ترجمۂ کلام حافظ صفحہ ۷ کی پلیٹ ؛

[۲] یہ اشعار جن میں مربیوں کا ذکر ہے مولوی شبلی صاحب نے شعر العجم جلد دوم کے صفحہ ۲۳۲ پر دئے ہیں ؛

علاوہ ان مربّیوں میں حاجی قوام، قوام الدین حسنؓ، خواجہ جلال الدین، شاہ یحییٰ نصرت الدین اور دُوسرے لوگ شامل ہیں۔ گو خواجہ حافظ نے مثنویاں رباعیات اور قصائد لکھے[1]۔ لیکن ان کا خاص مابہ الامتیاز غزل ہے۔ بعد میں آنے والے کئی عالی مرتبہ شاعروں نے اس صنف کلام میں[2] خواجہ صاحب کی بے مثل اُستادی پر آمنّا کہی ہے۔ مثلاً صائب، سلیم، عُرفی وغیرہ۔ لیکن کسی نے سرگور آؤسلے[3] سے بہتر اس کو ادا نہیں کیا۔ وُہ لکھتے ہیں:۔

خواجہ حافظ کی معجز طبعی پر سرجارج آؤسلے کے الفاظ

"ان کے ہاں طرزِ ادا صاف، بے ساختہ اور خوش آہنگ ہے۔ اور بیک وقت انکی زبردست فضیلت، پُختہ علمیت، کائنات کے ظاہر و باطن کی گہری معرفت اور ان سب سے بڑھ کر الفاظ کی ایک عجیب جاذبیت ہم پر آشکار کرتی ہے۔ جس کا جواب کسی دُوسرے شاعر کے ہاں نہیں ملتا"۔

لیکن حافظ کے بہترین تخمینے کے لئے ہم مس گرٹروڈ لوتھین بیل

---

[1] ملاحظہ ہو مس گرٹروڈ لوتھین بیل (Miss Gertrude Lowthian Bell) کے انتخاب کلام حافظ (Poems from the Diwan of Hafiz) کا دیباچہ۔ صفحہ کب تا کج؛

[2] مولانا شبلی کی متذکرہ بالا تصنیف کا صفحہ ۲۳۴ ملاحظہ ہو؛

[3] "تذکرہ شعرائے فارسی" (Biographical Notices of Persian Poets) لندن، ۱۸۴۶ء) صـ ۲۳؛

کے رہینِ منّت ہیں۔ یہ تخمینہ ناقدانہ بھی ہے ہمدردانہ بھی اور گہری نظر کا حامل ہے۔ خصوصاً اُنھوں نے نہایت بصیرت افروز انداز میں خواجہ حافظ کا مقابلہ اور موازنہ اُن کے عُمر میں بڑے ہمعصر دانتے سے کیا ہے۔ دانتے کے کلام کی خصوصیات بیان کر چکنے کے بعد وہ لکھتی ہیں[1]:-

حافظ اور دانتے کے بارے میں مس گرٹروُڈ لوتھین بیل کے خیالات

"برخلاف اسکے حافظ کے لئے امروزی مثالیں کچھ قدر و وقعت نہیں رکھتیں۔ معاصر تاریخ اس کے لئے ایک ایسی ادنیٰ اور چھوٹی داستان ہے کہ اس کے افکار میں جگہ نہیں پا سکتی۔ جس شہر سے اس کو غالباً ویسی ہی پُر جوش محبت تھی جیسی دانتے کو فلورنس سے۔ وہ شہر اس کے عہدِ حیات میں پانچ یا چھ دفعہ محصور یا فتح ہوُا۔ اُسکے فرمانروا اس سے بھی جلدی جلدی بدلتے رہے۔ ایک فاتح آیا اُس نے شہر کو خون کا دریا کر دیا۔ دُوسرا آیا تو اُس نے عیش و نشاط کا بازار گرم کیا۔ تیسرے کی باری آئی تو زہدِ خشک کی جابرانہ عملداری کا دور شروع ہوُا۔ یکے بعد دیگرے حافظ نے سلاطین و حُکّام کو برسرِ اقتدار آتے اور پھر اُن کو صفحۂ ہستی سے یوں مٹتے دیکھا "جیسے صحرا پر برف"[2]۔ عبرتناک سانحے عظیم الشان جشن

---

[1] "انتخاب کلامِ حافظ" از مس بیل۔ ص ۸۱ تا ۹۰؛

[2] خیام کی اس رُباعی سے اقتباس کیا ہے:-

دنیا ہمہ سر سبز بز خواستہ گیر	صد گنج بزر و گہر آراستہ گیر
پس بر سرِ آن گنج چو بر صحرا برف	روزی دو سہ بنشستہ و برخاستہ گیر

(مترجم)

سلطنتوں کے تنزّل، جنگ و جدل کے معرکے سب حافظ کی نظر سے گزرے ہونگے۔ اسکے کانوں نے سُنے ہوں گے۔ لیکن اسکے کلام میں ان واقعات کی صدائے بازگشت کہاں ہے؟ تقریباً بالکل نہیں۔ کہیں کہیں کوئی چلتی سی تلمیح ہے جسے شارحینِ کرام کسی سیاسی واقعے سے متعلق کرتے ہیں۔ کہیں ایک بادشاہ کی شان میں اور پھر دُوسرے کی شان میں مبالغہ آمیز مدح سرائی کسی ظفریابی کی تجلیل، کسی سپہ سالار کی شجاعت و مردانگی کی تقریظ —— بس صرف وہی کچھ پایا جاتا ہے جو ایک خوددار درباری شاعر اپنے اُوپر واجب پاتا ہے۔ اس سے زیادہ حافظ کے ہاں کچھ نہیں۔

"مگر ہم میں سے بعض محسوس کرینگے کہ حافظ کے ہاں جو شانِ استغنا ظاہر ہے اس کے فلسفے کو ایک ایسی خصوصیت بخشتی ہے جو دانتے کے فلسفے میں نہیں۔ اطالوی شاعر اپنے فلسفے کی حدود میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کا نظریۂ کائنات لازماً اسکے اپنے عصر کا ہے۔ اور جو کچھ اس کی نظر میں شدت سے حقیقت کا حامل تھا۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے محض ایک دلکش یا مہیب عکس ہے۔ حافظ نے جو تصویر کھینچی ہے ایک وسیع تر منظر پیش کرتی ہے۔ گو ممکن ہے اس میں قریبی پیش منظر ایسا واضح نہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کی عین باطن جسے نگاہ کی ایک عجیب تیزی ودیعت ہوئی تھی خیال کی ان دُنیاؤں میں جا داخل ہوئی جن کا آباد کرنا دراصل ہم متاخرّین کا حصہ تھا۔ حافظ نے اپنے زمانے اور اس میں فرد کی زندگی کا بہت مبہم عکس پیش کیا ہے مگر ہم اسے معاف کر دینگے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وُہ

ہمارے لئے ایسے ایسے گہرے معانی مرتّب کر رہا ہے جیسا کہ اس تنبیہ میں ہے۔ کہ کوئی مطرب ایسا نہیں ہے جس کے نغموں پر مست و ہوشیار دونوں رقص کرنے لگیں ''۔

غزل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور اس کے میدان میں وسعت پیدا کرنیکا

غزل پر خواجہ حافظ کے احسان

سہرا بقول شبلی خواجہ حافظ اور ان سے اتر کر انکے معاصران سلمان اور خواجو کے سر ہے۔ اساتذۂ متقدمین مثلاً سعدیؒ۔ امیر خسروؒ اور حسن دہلوی کے ہاں غزل کا تقریباً مستقل موضوع عشق تھا۔ خواجو نے اور مضامین کی بھی نغمہ سنجی کی مثلاً بے ثباتیٔ دُنیا۔ اور سلمان نے صنائع لفظی، نادر تشبیہات اور استعاروں میں امتیاز پیدا کیا۔ خواجہ صاحب نے سب کے محاسن کو یکجا کر لیا۔ اور ان میں مزید ایک ایسی دلکشی اضافہ کی جو انہی کا حصّہ ہے۔ اور اکثر انہیں اس بات میں مزا آتا ہے کہ ان شاعروں کے دیوانوں سے ایک شعر یا مصراع لیا۔ اور اس میں اصلاح کر کے اس کے حُسن کو دوبالا کر دیا۔ اپنی ''تاریخ ادبیات ایران کی دُوسری جلد[1] میں نے شیخ سعدیؒ کے

حافظ اور خواجو کے ہاں متوازی اشعار اور غزلیں

سلسلے میں کچھ مثالیں دی تھیں جن میں خواجہ حافظ نے سعدی کے کچھ مصرعے تضمین کئے ہیں[2]۔ مولانا شبلی نعمانی نے کچھ اَور مثالیں

[1] ص ۵۲۶-۹ ؛ [2] فہرست کتاب خانۂ بانکی پور (فردوسی تا حافظ) کے صفحہ ۲۵۵ پر اس بارے میں مولوی عبدالمقتدر صاحب کے ملاحظات کی طرف رجوع کیجئے ؛

نکالی ہیں۔ جہاں خواجہ صاحب نے سلمان اور خواجو کے جواب میں غزلیں کہی ہیں۔ سلمان اور حافظ کے ہاں اس طرح کے متوازی اشعار کی مثالیں اُنھوں نے یہ دی ہیں:۔

خواجُو	حافظ
خرقہ رہنِ خانۂ خمار دارد پیرِ ما	دوش از مسجد سوی میخانہ آمد پیرِ ما
ای ہمہ یاران مریدِ پیرِ ساغر گیرِ ما	چیست یارانِ طریقت بعد ازین تدبیرِ ما
گر شدیم از بادہ بدنامِ جہان تدبیر چیست	در خراباتِ مغان ما نیز ہمدستان شویم
ہمچنین رفت است از روزِ ازل تقدیرِ ما	کاینچنین رفتست از روزِ ازل تقدیرِ ما
ما دلِ دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم	عقل اگر داند کہ دل در بندِ زلفش چون خوش است
ای بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیرِ ما	عاقلان دیوانہ گردند از پی زنجیرِ ما
از خدنگِ آہِ عالم سوزِ ما غافل مشو	تیرِ آہِ ما ز گردُوں بگذرد حافظ خموش
کز کمانِ نرم زخمش سخت باشد تیرِ ما	رحم کن بر جانِ خود پرہیز کن از تیرِ ما

(۲)

خواجُو	حافظ
ایا صبا خبری کن مرا ازآن کہ تُو دانی	نسیمِ صبحِ سعادت بر آن نشان کہ تُو دانی
بدان زمین گذری کن بدان زمان کہ تُو دانی	گذر بکوی فلان کن در آن زمان کہ تُو دانی
چو مُرغ در طیران آیی و چو آن اوج رسیدی	تو پیکِ حضرتِ شاہی مراد و دیدہ براہست
نزول ساز در آن آشیان چنان کہ تو دانی	بمردمی نہ بفرمان چنان بران کہ تو دانی
چنان مرو کہ غباری بدو رسد ز گذارت	بگو کہ جانِ ضعیفم ز دستِ رفت خدا را
بدان طرف چو رسیدی چنان بدان کہ تُو دانی	ز لعلِ رُوح فزایت بخش از آنکہ تو دانی

	من این دو حرف نوشتم چنانکه غیر ندانست
	تو ہم زروی کرامت بخوان چنانکہ تو دانی

(۳)

دل درین پیرہ زنِ عشوہ گرِ دہر مبند	مجو درستیِ عہد از جہانِ بے بُنیاد
کین عروسیست کہ در عقد بسی داماد است	کہ این عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

(۴)

منزلِ از یار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت	ہمہ کس طالبِ یارند چہ ہشیار و چہ مست
سجدۂ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت	ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

(۵)

کی برکنم دل از رُخِ جانان کہ مہرِ او	عشقِ تو در وجُودم و مہرِ تو در دلم
با شیر در دل آمد و با جان بدر شود	با شیر در بدن شد و با جان بدر شود

حافظ اور سلمان کے ہاں متوازیات

شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ وہ حافظ اور خواجو کی ہم طرح غزلوں کی اَور مثالیں دے سکتے تھے لیکن ان کے نزدیک یہ چند مثالیں کافی ہیں۔ ہر ایک مثال میں اُنھوں نے مقابل اشعار کی ترجیح و تفضیل پر بحث کی ہے۔ اور گو سب میں نہیں لیکن اکثر میں حافظ کا پلّہ بھاری بتایا ہے۔ اس کے بعد وہ اسی طرح حافظ اور سلمان کا مقابلہ کرتے ہیں :۔

(۱)

سلمان	حافظ
آوازهٔ جمالت تا در جهان فتاده	عید است و موسمِ گل ساقی بیار باده
خلقی بجستجویت سر در جهان نهاده	هنگامِ گل که دیدست بی می قدح نهاده
سودای زهد خشکم بر باد داده حاصل	گل رفت ای حریفان غافل چرا نشینید
مطرب بزن ترانه ساقی بیار باده	بی بانگِ رود و چنگی بی یار و جام و باده
ماییم بسته دل را در لعلِ دلگشایت	زین زهد و پارسائی بگرفت خاطرِ من
آن لب بخنده بگشا تا دل شود گشاده	ساقی پیاله‌ده تا دل شود گشاده
سودائیانِ زلفت گرد تو حلقه بسته	در مجلسِ صبوحی دانی چه خوش نماید
شوریدگانِ مویت در یکدگر فتاده	عکسِ عذارِ ساقی بر جامِ مے فتاده

(۲)

رندی و عاشقی و قلاشی	عاشق و رند و نظر بازم و میگویم فاش
هیچ شک نیست که در ما همه هست	تا بدانی که بچندین هنر آراسته‌ام

(۳)

درونِ صافی از اهلِ صلاح و زهد مجوی	رازِ درونِ پرده ز رندانِ مست پرس
که این نشانهٔ رندانِ دُردی‌آشام است	کین حال نیست زاهدِ عالی مقام را

(۴)

مکن ملامتِ رندان دگر بہ بدنامی	گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلان
کہ ہرچہ پیشِ تو ننگ است نزدِ ما نام است	ما نمی خواہیم ننگ و نام را

(۵)

حافظ	سلمان
جلوہ بر من مفروش ای ملک الحج کہ تو خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم	غرض از کعبہ و بتخانہ توئی سلمان را چکنم خانۂ بی خانہ خدا باید رفت

(۶)

حافظ	سلمان
فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم بندۂ عشقم و از ہر دو جہان آزادم	من از آن روز کہ در بندِ توام آزادم پادشاہم چو بدستِ تو اسیر افتادم

(۷)

حافظ	سلمان
یا رب این بارکہ توان گفت کہ آن نوشین لب کشت مارا و دمِ عیسی مریم با اوست	ای گنج نوش دارو درختگان نظر کن مرہم بدست و مارا مجروح میگزاری

مولانا شبلی نے 'حافظ و سلمان' اور 'حافظ و خواجو' کی متوازیات کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ لیکن اوپر جو نمونے نقل کیئے گئے ہیں۔ اس متوازیت کے ثابت کرنیکو کافی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کسی یوروپی مستشرق کی نظر اس موازات پر نہیں پڑی۔ ایک اور دلچسپ بات دیکھنے کی ہے جس کی طرف راقم کی "تاریخ ادبیاتِ ایران" کی جلد دوم میں اشارہ کیا جا چکا ہے (ص ۸۲ تا ص ۸۹) وہ یہ کہ مشرق کے اکثر ادبی نقّادوں کا رُجحان ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جب دو شاعروں کا مقابلہ کرتے ہیں تو اُنکے خیالات اور معانی کے اختلاف میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے جتنی طرزِ ادا کے فرق میں کہ اُنھوں نے ایک ہی مضمون کو کیونکر باندھا ہے۔ پھر چونکہ خود شعراء میں بھی

یہی میلان پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم مثال کے طور پر حافظ جیسے بڑے شاعر کو دیکھتے ہیں کہ وہ بڑی عمر کے معاصرین مثلاً سلمان اور خواجو کے ہاں سے ایک شعر یا پوری غزل لیتے ہیں۔ اور اس کی بندشوں اور ترکیبوں کا رُوپ بدلکر اس کو زیادہ دلفریب بنانے کی کوشش کرتے ہیں گو اس کی زمین اور اس کا مجموعی مفہوم و مضمون وہی رہنے دیتے ہیں۔ اس طور پر دوسروں کے کلام کو اپنا لینا سراسر جائز سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے سرقے میں شمار نہیں کرتے۔ کیونکہ تصریف کرنے والے شاعر کا مقصد یہ دکھانا ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے متقدم یا معاصر کے کلام پر اصلاح کر سکتا ہے۔ البتّہ یہ تتّبع اس ہزلیہ تحریف[1] سے بالکل مختلف ہے جس میں عبید زاکانی اور بُسحٰق نے طبع آزمائی کی ہے وہاں غرض یہ نہیں ہوتی کہ فوقیت حاصل ہو بلکہ یہ ہنسی اُڑائی جائے ؛

کلامِ حافظ کے شرح نویس کلامِ حافظ کی شرحوں کی تعداد نہ صرف فارسی میں بلکہ ترکی اور شاید اردو میں بھی خاصی ہے۔ مگر جتنی شرحوں کا مَیں نے جائزہ لیا ہے ان میں بہت کم ایسی ہیں جو چنداں ناقدانہ یا بصیرت افروز ہوں۔ ترکی میں تین مشہور شرحیں سروری، شمعی اور سُودی کی ہیں۔ ان میں آخری آپکو سب سے زیادہ آسانی سے مل سکتی ہے[2]۔ اور یہی سب میں زیادہ مفید بھی ہے۔ کیونکہ مصنّف نے نہایت دانائی سے کام لیتے ہوئے اپنے تئیں صرف لفظی مطلب کی

---

[1] Parody ؛

[2] (حاشیہ سامنے کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں ؛

تشریح تک محدود رکھا ہے اور مجازی تعبیر اور" اندرونی مطلب کی تلاش سے باز
رکھا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ان کی غزلوں کا کنایتی یا صوفیانہ
مطلب لینا پڑیگا۔ مگر بعض دوسری غزلوں کا مطلب وہی ہے جو صاف طور پر
کہا گیا ہے۔ اور ان میں جس حسن اور جس شراب کا تذکرہ ہے وہ حسن ربانی
اور شراب مجازی نہیں ہیں۔ شاہ شجاع نے جس بات پر اعتراض کیا کہ روحانی
اور مادی مطالب یوں خلط ملط کردئے جاتے ہیں۔ یہ بات اُن لوگوں کے
لئے کچھ تعجب خیز نہ ہوگی جو اہلِ ایران کی سیرت، نفسیات اور اُنکے تصور
کائنات کو سمجھتے ہیں۔ وہاں خاصی کثرت سے آپکو ایسے اشخاص ملینگے جو
یوم واحد کے عرصے میں اپنے قول و فعل میں یکے بعد دیگرے مقدس مسلمان،

(حاشیہ صفحہ ۴۲۲) سودی کی تالیف میں سے پہلی اسّی غزلوں کی شرح دیوان کی طبع بردک ہاؤس
{Brockhaus لائپزگ (Leipzig)، ۱۸۵۴-۶ء} میں داخل ہے۔ پوری شرح مع
متن اور ایک اور ترکی شرح کے ۱۸۷۰ء کے قریب قسطنطنیہ سے شائع ہوئی۔ انگریزی خواں جو
سودی کے مناہج شرح سے واقفیت حاصل کرنا چاہے ڈبلیو۔ ایچ۔ لو (W. H. Lowe) کی
تالیف "حافظ کی بارہ غزلوں کا لفظی انگریزی ترجمہ مع اجزائے متعلقہ از شرح سودی، جن کا ترجمہ
انگریزی میں پہلی مرتبہ ہوا ہے" (Twelve Odes of Hafiz done literally
into English together with the corresponding portion of
the Turkish commentary of Sudi, for the first time translated.
کیمبرج ۱۸۷۷ء صفحہ ۸۰) کی طرف رجوع کریں۔ نیز ملاحظہ ہو لفٹنٹ کرنل ولبرفورس کلارک
Lt.-Col. H. Wilberforce Clarke کا منثور انگریزی ترجمہ (دو جلدیں، لندن ۱۸۹۱ء)؛

رندِ غافل، پرلے درجے کے دہریے، صوفیِ وجودی[1] حتیٰ کہ خدا کے اوتار بن کر آپ کے سامنے آئینگے[2]۔ حافظ کے پڑھنے والوں میں جو شخص از خود اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کہ کون سا شعر لفظی معنوں میں ہے اور کون سا مجازی میں وہ شاید ہی ایسے شارح سے کچھ حاصل کر سکے جو برابر یہی کہے جاتا ہے کہ شراب سے مراد وجدان ہے میکدے سے خانقاہ، پیرِ مغاں سے مُرشد وغیرہ وغیرہ انگریزی خوانوں کے لئے جو اس اصول کے ماتحت دیوان حافظ کا مطالعہ کرنا چاہیں لفٹنٹ کرنل ولبر فورس کلارک کا مکمل نثریہ ترجمہ" مع حواشی مفصّلہ و شرحِ جامع[3]" تجویز کیا جاتا ہے۔ ایران کے صوفی یا متصوّف شعراء کے ہاں جو عشقیہ اور رندانہ اصطلاحات و الفاظ آتے ہیں اُن کے مجازی اور کنایتی معانی کے لئے بیشتر گلشنِ راز محمود شبستری کی اعلیٰ طبع مع ترجمۂ مشرح مرتبہ ونفیلڈ[4] سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ آنجہانی پروفیسر پامر[5] کی مختصر تصنیف "تصوّفِ مشرق[6]" بھی مفید مطلب پائی جائے گی۔ تصوّف کے اصل

---

[1] صوفی جو وحدتِ وجود کے مذہب کا پیرو ہو؛ (مترجم)

[2] مَیں نے اپنی کتاب "ایرانیوں میں ایک سال؛ A year amongst the Persians. کے باب بعنوان " درزمرۂ قلندران" Amongst the Qalandars میں اس قسم کے ایرانی کی سیرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے؛ [3] ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر۲، صفحہ ۴۲۲ اوپر؛

[4] E. H. Whinfield

[5] E. H. Palmer

[6] Oriental Mysticism

و آغاز۔ اصول و عقائد اور اس کی عام نوعیت کی بحث کے لئے میں ناظرین کی توجہ اپنی "تاریخ ادبیاتِ ایران" کی جلد اول (باب ہشتم ص ۴۱۶ تا ص ۴۴۷) کی طرف دلاتا ہوں ÷

لطیفۂ غیبیہ از محمد دارابی

حافظ پر ایک چھوٹا سا رسالہ موسوم بہ لطیفۂ غیبیہ بھی اس قابل ہے۔ کہ اس کا مختصر ذکر کیا جائے۔ اس کی طرف پہلی بار میری توجہ مسٹر سڈنی چرچل[1] نے دلائی۔ جو سابقاً طہران میں سفارتِ برطانیہ کے معتمدِ امورِ شرقیہ[2] تھے۔ بالخصوص اس لئے یہ کتاب قابلِ ذکر ہے کہ حافظ کے کلام پر اُن کے بعض ہموطنوں نے جو اعتراضات کئے ہیں اُنکو اس کتاب میں باضابطہ ترتیب دیکر اُن کی تردید کی گئی ہے۔ یہ کتابچہ محمد بن محمد دارابی کی تصنیف ہے۔ جس کے حالاتِ زندگی اور عہد پر مجھے کچھ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں[3]۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۲۷

---

[1] Sidney Churchill

[2] Oriental Secretary of the British Legation at Tihran

[3] لطیفۂ غیبیہ کی ایک طبع چاپخانۂ موسوی شیراز سے نشر ہوئی ہے۔ اسکے شروع میں ناشرِ کتاب احمد عبد الحی مرتضوی تبریزی کے قلم سے ایک دیباچہ ہے جس میں اس نے سید قطب الدین محمد تبریزی کی کتاب فصل الخطاب میں سے محمد دارابی کا مذکور (بزبانِ عربی) نقل کیا ہے اور ساتھ ہی اس مذکور کا فارسی ترجمہ بھی کر دیا ہے جو میں ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ سید قطب الدین لکھتے ہیں: "وفضلائی کہ مرا با ایشان ملاقات واقع شدہ و با من در یکعصر بودند، اول ایشان است عالم فاضل متبحر کامل استاد و شیخ اجازۂ من از طریق روایت ائمۂ معصومین صلوات اللہ و سلامہ علیہم اجمعین جامع علوم عقلیہ و نقلیہ و حاوی

(باقی حاشیہ ص ۴۲۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

صفحات پر شامل ہے۔ ۱۳۰۴ھ (۷-۱۸۸۶ء) میں طہران سے بچاپ سنگی شائع ہوئی اور زیادہ تر مختلف اشعار کی تشریح پر مشتمل ہے۔ تین اعتراضات جن کے ابطال کی اس میں کوشش کی گئی ہے مطابق ذیل صفحہ ۵ پر بیان کئے گئے ہیں :-

معترضین کے خلاف خواجہ حافظ کی حمایت

(۱) ان کے بعض اشعار بے معنی ہیں۔ اور اگر ان میں کچھ مطلب ہے تو بہت دُور از کار اور مبہم ہے ذیل کی مثال دی گئی ہے ؎

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۵) مسایل اصولیہ و فروعیہ علامہ زمان و دانشمند دوران (مولی شاہ محمد دارابی) قدس اللہ روحہ (داراب بر وزنِ فاراب قصبہ از قصباتِ فارس است) و این جناب درعصرِ خویش استادِ کل فضلای شیراز بود۔ رسالہ معراج الکمال از مصنفات بذریعۂ آنجناب بخط خودش در نزدِ من موجود است و آن کتاب مشتمل است بر تحقیق معنی شیخ وارشاد و مرید و استرشاد "

راقمِ دیباچہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سید قطب الدین محمد سلطان حسین صفوی کے معاصر تھے۔ اور ۱۱۷۳ھ میں نجف اشرف میں رحلت فرما ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دارابی کا زمانہ بارھویں صدی ہجری ہے۔ پھر خود سید قطب الدین کی تحریر سے ثابت ہے کہ دارابی وفات پا چکا ہے۔ لہذا اس کا سنِ وفات سید قطب الدین کی تاریخ وفات (۱۱۷۳ھ) سے پہلے کا ہے۔ سید قطب الدین کا شیخِ اجازت ہوتے ہوئے قیاساً دارابی اپنے مُرید و شاگرد سے عمر میں کافی بڑا ہوگا :- (مترجم)

ماجرا کم کن و باز آ کہ مرا مردمِ چشم
خرقہ از سر بدر آورد و بشکرانہ بسوخت[1]

(۲) ان کے بعض اشعار کا مضمون صریحاً مادی اور دُنیوی ہے اور ان میں نفسانی لذات کا ذکر ایسے طور پر کیا گیا ہے کہ وہ مجازی معنوں میں نہیں لئے جا سکتے۔ مثلاً ؎

دلِ من در ہوای روی فرخ | بود آشفتہ ہمچون موی فرخ
ہزار آفرین بر مےِ سُرخ باد | کہ از رُوئے ما رنگ زردی ببرُد

(۳) ان کے بہت سے اشعار سے اشعری (سُنّی) عقائد کی بُو آتی ہے جنہیں علمائے امامیہ (شیعہ) باطل و مردُود سمجھتے ہیں مثلاً ؎

درکوی نیکنامی مارا گذر ندادند | گر تُو نمی پسندی تغییر کن قضارا[2]

این جان عاریت کہ بحافظ سپرد دوست
روزی رُخش ببینم و تسلیم وی کنم[3]

---

[1] سودی نے اس شعر کی جو تشریح کی ہے اسکے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ ص۴۶۹، دیوانِ حافظ طبع روزن زوایک شواناؤ۔ جلد اوّل۔ غزل ۲۶، ردیف ت۔ یہ تشریح کچھ ایسی قائل کرنیوالی نہیں اس میں جس رواج کا ذکر ہے اس کی طرف مجھے آج تک کسی اَور جگہ کوئی اشارہ نہیں ملا؛

[2] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذہب قضا و قدر کو جو یورپ میں عموماً اسلام کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے شیعہ مسلمان قبول نہیں کرتے؛

[3] رؤیتہ اللہ کا عقیدہ میرے خیال میں خاص طور سے حنبلی فرقے سے تعلق رکھتا ہے لیکن شیعہ اس کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں؛

اگرچہ دیوانِ حافظ کے نسخوں میں متن کے مختلفات اسی کثرت سے پائے جاتے ہیں جو بالعموم فارسی کتب کے متنوں میں معمولاً نظر آتی ہے لیکن آج ہمارے پاس اس دیوان کا ایک معیّن اور عموماً مسلّم متن موجود ہے۔ جس کے لئے میرے خیال میں ہم ترکی شرح نویس سُودی کے رہینِ منّت ہیں۔ اس متن کو بروک ہاؤس[1] اور روزن زوائِک شوانا ؤ[2] کی مطبوعہ اشاعتوں نے یورپ میں رائج و مقبول کیا ہے۔ چنانچہ بالعموم حافظ کی غزلوں کا حوالہ

فارسی دواوین کی تدوین میں تُرک ہندوستانیوں سے بہتر کیوں ہیں

مؤخّر الذکر طبع کے نمبر شمار سے دیا جاتا ہے۔ فارسی شعراء کے کلام مثلاً مثنوی مولانائے رُوم، دیوانِ حافظ وغیرہ کی تدوین کا جو کام تُرکوں نے کیا ہے ہندوستانیوں کے کام کی نسبت زیادہ صحیح اور قابلِ اعتماد ہے۔ ہندوستانی مدوّن اکثر خود جعلی اشعار تصنیف کر کے ان کے کلام میں داخل کر دیتے ہیں اور اشعار بھی ایسے کہ ایرانی انہیں کہتے ہوئے شرمائے۔ اور تُرک تو خیر سرے سے شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ بات یہ ہے کہ ایرانی مدوّن کے پاس اتنا سمجھ لینے کو کافی ذوق ہوتا ہے کہ ایسے اشعار کہنا جن کے متعلق یہ گمان ہو سکے کہ یہ اُسی استاد کے سمجھ لئے جائیںگے میرے بس کی بات نہیں۔ ترکی فاضل اس کام میں عموماً محتاط اور محنت کش ہوتا ہے لیکن فارسی اشعار کہنے کی صلاحیت

---

[1] Brockhaus

[2] Rosenzweig- Schwannau

بالکل نہیں رکھتا۔ ہندوستانی مدوّن کے لئے فارسی شعر کہنا کسی حد تک آسان ہوتا ہے لیکن اس میں ناقدانہ مذاق کو دخل نہیں ہوتا *

کلامِ حافظ کے ترجمے دیوانِ حافظ کے اس "مستند متن" میں (جسے تمام بہترین اور قدیم ترین نسخوں کے ایک تازہ اور با احتیاط مقابلے کے بعد بہتر بنایا جاسکتا ہے) ۶۹۳ جُدا جُدا نظمیں ہیں۔ ان میں ۵۷۳ غزلیں، ۴۲ قطعے، ۶۹ رُباعیاں، ۶ مثنویاں، ۲ قصیدے اور ایک مخمس شامل ہیں۔ ان تمام نظموں کا منظوم جرمن ترجمہ روزن زوائنگ شوانا ؤ اور انگریزی نثریہ ترجمہ ولبر فورس کلارک نے کیا ہے۔ منفرد غزلوں یا غزلوں کے مجموعات کے بھی نثریہ یا منظوم ترجمے انگریزی، جرمن، لاطینی، فرانسیسی وغیرہ میں موجود ہیں۔ انگریزی منظوم ترجموں میں سب سے زیادہ مکمل اور بیش بہا ترجمہ ہرمین بکنل[۲] کا ہے۔ یہ مترجم ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوا۔ سینٹ بارتھولمیو کے ہسپتال[۳] میں اس نے طب کی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۵۴ء میں ایم۔ آر۔ سی۔ ایس[۴]۔

---

[۱] ان میں سے چیدہ چیدہ ترجموں کی فہرست کیلئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر ایتھے (Dr. H. Ethe) کی "فہرست مخطوطاتِ فارسی در دیوانِ ہند" (Catalogue of the Persian MSS in the India Office) ۱۲۴۶ (Col. 720) اور فہرست کتابخانۂ بانکی پور (فردوسی تا حافظ ص ۲۵۶-۷؛ [۲] "حافظ شیراز: کلام کے انتخابات کا ترجمہ فارسی سے، از ہرمین بکنل" (ٹریوبنر اینڈ کمپنی۔ لندن ۱۸۷۵ء) صفحہ ۱۶ Hafiz of Shiraz: Selections from his Poems, translated from the Persian by Herman Bicknell (Trubner and Co., Londan.) P. XVI ،

[۳] St. Bartholomew's Hospital ؛ [۴] M. R. C. S. ؛

کی سند لی۔ فوج کی طبّی ملازمت[1] میں داخل ہوا۔ ہندوستانی غدر کے واقعات میں سے گزرا۔ یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں اُس نے دُور دراز سفر کئے ۱۸۶۲ء میں 'عبدالوحید' نام رکھ کر مکّے کی زیارت کی۔ پھر کچھ وقت شیراز میں بسر کیا کہ وہاں رہ کر دیوانِ حافظ کے بعض مشکوک مقامات کو حل کرے اور ذاتی طور پر ان جگھوں سے واقفیت پیدا کرے جن کا شاعر نے ذکر کیا ہے۔ اس کی وفات ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ اس کی تالیف کو اسی سال اسکے بھائی[2] نے محبّت آمیز احتیاط کے ساتھ نشر کیا۔ اس میں پیش لفظ، تمہید ضمیمہ اور اشاریات کے علاوہ ۱۸۹ غزلوں، ۴۲ قطعوں، کل چھ میں سے دو مثنویوں اور مخمس کا کہیں مکمل اور کہیں جزوی ترجمہ شامل ہے*

یورپ کی مختلف زبانوں میں حافظ کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں ان میں سے کئی ایسے ہیں جو اصل فارسی سے نہیں بلکہ مینِنسکی[3]، ٹامس ہائیڈ[4] اور ریوسکی[5] کے لاطینی ترجموں سے کئے گئے ہیں۔ یہ تینوں ترجمے علی الترتیب ۱۶۸۰ء۔ ۱۷۶۷ء اور ۱۷۷۱ء میں شائع ہوئے تھے۔ پھر سر ولیم جونز[6] کے دو ترجمے ہیں جن میں سے ایک فرانسیسی میں ہے جو ۱۷۹۹ء میں شائع ہوا اور دُوسرا انگریزی میں جو ۱۷۹۲ء کی اشاعت ہے۔ جرمن میں بے شمار ترجمے

---

[1] Army Medical Service ؛ [2] A. S. Bicknell ؛

[3] Meninski ؛ [4] Thomas Hyde ؛

[5] Revisky ؛

[6] Sir William Jones ؛

ہوئے جن میں سب سے پہلا وال[1] کا ۱۷۹۱ء اور آخری بوڈن شٹیٹ[2] کا ۱۸۷۷ء میں نکلا۔ ان کے بعد انگریزی میں پین[3]۔ جسٹن میکارتھی[4] اور ولبر فورس کلارک نے ترجمے کیے۔ لیکن ان تمام ترجموں کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ البتہ انگریزی کے منظوم ترجموں میں سے تین کا کچھ تذکرہ کروں گا جو مجھے سب سے زیادہ قابلِ توجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے پُرانا ہرمین بکنل کا ہے جو ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا۔ اور اوپر مَیں اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ زمانوی لحاظ سے اگلا ترجمہ مس گرٹروڈ لوتھین بیل[5] کا ہے۔ لندن سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ اسکے شروع میں مترجمہ نے شاعر کے حالاتِ زندگی عہد اور اسکی سیرت پر ایک قابلِ ستائش مقدمہ لکھا ہے اور اس کے بعد ۴۳ غزلوں کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ گو قدرے آزاد ہے۔ مگر میری رائے میں فنِ شاعری کے اعتبار سے باقی ترجموں سے کہیں زیادہ استادانہ ہے اور جہاں تک حافظ کے اصل جذبے اور اُن کی شاعری کی رُوح کی ترجمانی کا تعلق ہے اس ترجمے سے زیادہ سچا کوئی دُوسرا ترجمہ نہیں ہے۔ تیسرے مترجم مسٹر والٹر لیف[6] نے ۱۸۹۸ء میں اپنے ۲۸ "تراجم از دیوانِ حافظ[7]" شائع کیے۔ ان میں

---

[1] Wahl؛ [2] Bodenstedt؛

[3] [4] Justin McCarthy؛

[5] Miss Gertrude Lowthian Bell؛

[6] Walter Leaf؛

[7] Versions from Hafiz؛

کوشش یہ کی گئی ہے کہ اصل نظموں کی ساخت اور مفہوم دونوں برقرار رہیں۔ ان پابندیوں کے ساتھ جس قدر کامیابی ممکن ہے وُہ غالبًا موصوف کو حاصل ہوئی ہے۔ دُوسرے شعراء کے معاملے میں جو اتنے مشہور نہیں ہیں مَیں نے اُنکے اشعار کے اپنے ترجمے پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ مگر یہاں ان تین ترجموں کی موجودگی نے مُجھ کو اس فرض سے سبکدوش کر دیا ہے۔ اپنی اپنی جگہ یہ تینوں ترجمے خُوب ہیں۔ والٹرلیف کے ہاں اصل غزلوں کی ساخت اور بحر و قافیہ کا تصوّر اعلےٰ طریقے سے بہم پہنچایا گیا ہے۔ ہرمین بکنل کے ترجمے مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ اور اکثر ترجموں میں اور بالخصوص قطعاتِ تاریخ میں بڑی خوش فکری اور اختراعی قابلیّت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مس بیل کا ترجمہ تو بجائے خود بلند پایہ اور سچّی شاعری ہے۔ اگر ایک فِٹز جیرلڈ[1] کی رباعیاتِ خیام کو چھوڑ دیں تو اغلب ہے کہ انگریزی زبان میں یہ بہترین اور سب سے زیادہ سچے طور پر شاعرانہ ترجمہ ہے جو کسی فارسی شاعر کے کلام کا کیا گیا ہے۔ کیونکہ گو سر ولیم جونز[2] کے بعض منظوم ترجمے خاصے عمدہ ہیں تاہم وہ شعر کے رُتبے تک نہیں پہنچتے۔ مزید برآں اسد رجہ آزاد ہیں کہ ان کو ترجمہ بھی نہیں کہا جا سکتا ؏

موازنے کی غرض سے مَیں نے ایک اَور جگہ خواجہ حافظ کی ایک غزل کے پانچ مختلف انگریزی ترجمے پیش کیے تھے۔ یہ غزل ان کی مشہور ترین غزلوں

---

[1] Fitz Gerald ؛ [2] Sir William Jones ؛

[3] حاشیہ سامنے کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں ؛

میں سے ہے۔اس کا مطلع یہ ہے ؎

اگر آن تُرکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بُخارا را[۱]

انگریزی میں اس کا ترجمہ سر ولیم جونز، ہرمین بکنل، مس بیل، والٹر لیف اور راقم نے کیا ہے۔مجھ کو خواجہ حافظ کی کسی دُوسری غزل کے اتنے منظوم ترجمے نہیں مل سکے۔کیونکہ گو جن غزلوں کو مس بیل نے لیا ہے ان میں سے کئی بکنل کے ہاں بھی شامل ہیں۔لیکن ادھر والٹر لیف کی شائع کردہ اٹھائیس[۲۸] غزلوں میں مس بیل کے انتخاب کی صرف تین چار غزلیں ہی داخل ہیں۔مس بیل کے ترجموں میں ایک خرابی یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کی ترتیب نہیں پائی جاتی نہ اصل غزل کے افتتاحی الفاظ کی کوئی علامت دی گئی ہے۔اور نہ روزن زوائک شواناؤ کے متن ہی سے جسے اس نے اختیار کیا ہے غزل کے نمبر کا حوالہ دیا ہے۔میں نے اصل غزلوں کی تعیین میں خاصی زحمت اٹھائی اور سوائے نو دس کے باقی سب میں کامیاب ہو گیا۔لیکن اتنا کچھ کر چکنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ میرے دوست مسٹر گائی لوسٹرینج کے پاس

(حاشیہ ۲ صفحہ ۴۲۳) ادبیاتِ ایران پر اپنے ایک خطبے میں جو ۲۶ را پریل ۱۹۱۲ء کو انجمن ایران (Persia Society) میں دیا گیا اور انجمن کے اہتمام سے جون ہوگ (John Hogg, 13, Peter-noster Row, London, E. C.) نے شائع کیا۔ قیمت ایک شلنگ؛

[۱] ملاحظہ ہو طبع روزن زوائک شواناؤ۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۴ (غزل ۸۔ ردیف الف)؛

[۲] Mr. G. le Strange؛

مس بیل کی کتاب کی ایک کاپی ہے جسکے حاشیوں پر کسی نے نوٹ لکھ رکھے ہیں۔اس میں سوائے ایک غزل نمبر ۱۵ کے مجھے اپنے مطلب کے تمام حوالے مل گئے۔یہ حوالہ غلط دیا ہؤا تھا۔اور مَیں اب تک اس کی تعیین نہیں کر سکا[1]۔

خواجہ حافظ کا مزار

خواجہ حافظ کی قبر ایک خوشنما باغ میں ہے۔جو شیراز کے پاس واقع ہے اور ان ہی کے نام پر 'حافظیہ' کہلاتا ہے۔تیمور کے پڑپوتے ابوالقاسم بابر[2] نے ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) میں جب شیراز فتح کیا تو اس مزار پر آرائش[3] کا بہت کچھ کام کرایا۔یہ کام اس نے مولانا محمد معمائی کے سپرد کیا تھا[3]۔آگے چل کر کریم خان زند نے کہ ایران کے بہترین حکمرانوں میں ہو گزرا ہے اس کی مزید تزئین کرائی[4]۔موجودہ لوحِ مزار جو نہایت نفیس سنگِ سفید کی ایک سل ہے اسی کا عطیہ ہے۔حافظیہ کا بڑا احترام ہوتا ہے۔باہر سے آنیوالے لوگ بکثرت

---

[1] یہاں پروفیسر براؤن نے انگریزی خوان شایقین کی سہولت کیلئے ہرمین بکنل اور مس بیل کی مترجمہ غزلیات کے حوالوں کی ایک مقابلتی Comparative جدول دی ہے جو اردو خوانوں کے مطلب کی نہیں اسلئے مَیں نے حذف کردی ہے۔اس جدول کے فوراً بعد اُنہوں نے ان دونوں کے ترجموں کے چند نمونے پیش کئے ہیں؛ (مترجم)؛ [2] بابر اعظم بانیٔ خاندانِ مغلیہ کا ذکر نہیں وہ تیمور کے پڑپوتے کا پوتا تھا۔اور تیمور کے بیٹے عمر شیخ کی اولاد میں سے تھا۔ابوالقاسم بابر تیمور کے دوسرے بیٹے شاہ رُخ کی اولاد میں سے ہے؛

[3] دولت شاہ میری ایڈیشن۔صفحہ ۳۰۸؛

[4] دیکھو سر جان میلکم (Sir John Malcolm) کی تاریخ ایران جلد دوم۔صفحہ ۱۴۷؛

اس کی زیارت کو آتے ہیں۔ شاعر کی قبر کے چاروں طرف بہت سے ایسے لوگوں کی قبریں ہیں جنہوں نے اس کی نُورانی خاک کا قُرب چاہا ہے۔ چنانچہ خود اس کی کہی ہوئی بات سچّی نکلی ؎

برسرِ تربتِ ما چون گُزری ہمّت خواہ
کہ زیارتگہِ رندانِ جہان خواہد شد

دیوانِ حافظ سے فال لینا دُوسرے شعرار کا ذکر شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ دیوانِ حافظ سے فال لینے کے رواج کے بارے میں کُچھ کہا جائے۔ یہ رواج ایران میں بحد عام ہے۔ وہاں صرف ایک اَور کتاب جو اس مطلب کے لئے استعمال میں لاتے ہیں (اور وہ بھی اس کے مقابلے میں بہت شاذ و نادر) وہ خود قرآن ہے بعینہٖ جیسے قدیم روما کے لوگ ورجل کے دیوان کو اس کام میں لاتے تھے۔ سابقاً کہا جا چکا ہے۔ کہ خواجہ حافظ کو اکثر لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے ہموطنوں میں یہ عقیدہ عام ہے۔ کہ اگر کسی کام کا طرزِ عمل اختیار کرنے میں شبہات ہوں تو مناسب دُعائیں پڑھ کر دیوان کو اٹکل سے کھولنے سے مفید ہدایات مل سکتی ہیں۔ اس میں پہلے جس شعر پہ نظر پڑ جائے یا تو اُس کو لیتے ہیں یا کُھلے ہوئے صفحے کی آخری غزل اور اس کے ساتھ اس سے اگلی غزل کا پہلا شعر[1]۔ ایک خاص طرح کی

---

[1] پروفیسر براؤن کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ کھلے ہوئے صفحے پر جو آخری غزل ہو اُس سے اگلی غزل کا پہلا شعر لیا جاتا ہے (مترجم)۔

جدولیں بھی اس کام میں لائی جاتی ہیں جنہیں فالنامے کہتے ہیں۔ فالنامے میں چند مربع شکل کے خانے ہوتے ہیں جن کی تعداد ہمیشہ سات یا نو وغیرہ اعداد کے اضعاف میں سے ہوتی ہے۔ ہر خانے میں ایک حرف ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک جدول دیوان کی اکثر مشرقی اشاعتوں کے شروع میں لگی ہوتی ہے[1]۔ اور اس کے ساتھ اسکے استعمال کی ہدایات درج ہوتی ہیں[2]۔ یہ جدولیں گو دیکھنے میں بڑی پُر اسرار اور مرعُوب کرنے والی ہوتی ہیں مگر ان کی مدد سے جو جواب نکلتے ہیں ان کی تعداد بڑی محدود ہوتی ہے یعنی اگر مربعوں کی تعداد سات کے اضعاف میں سے ہو تو سات مُختلف جوابات ممکن ہیں۔ اور اگر نو کے اضعاف میں سے ہو تو نو۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ جیسا کہ پروفیسر لین نے مصریوں کے ہاں اسی قسم کے مربّعوں کے استعمال کا ذکر کرتے ہوئے بجا مشاہدہ کیا ہے۔ اہلِ مشرق میں یہ عقیدہ عام ہے کہ شبہ کی حالت میں کام سے رُک جانا اصُولاً بہتر ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ان فالناموں میں جو ممکن جوابات پہلے فراہم کر لئے جاتے ہیں اکثر و بیشتر صریحاً اقدامِ عمل کی مخالفت اور عدمِ حمایت میں اور بہت کم اسکے حق میں ہوتے ہیں ؛

---

[1] ان جدولوں کا نمونہ آپ کو فہرست کتابخانۂ بانکی پور (فردوسی تا حافظ) کے ص ۲۳۳ پر ملے گا ؛

[2] اردو خوان ان جدولوں کا نمونہ "حیاتِ حافظ" مصنفہ مولانا اسلم جیراجپوری (مطبوعہ علیگڑھ ۱۳۳۷ھ) کے ص ۱۴۱ پر دیکھ سکتے ہیں ؛ (مترجم) ؛

ایک فالنامے کا تجزیہ

آخری حاشیۂ زیریں میں جس جدول کا حوالہ ہے اس میں ۱۵ × ۱۵ = ۲۲۵ خانے ہیں۔ اور ہر ایک میں ایک حرف ہے۔ پچیس پچیس حروف کے نو مصرعے لئے گئے ہیں (۹ × ۲۵ بھی = ۲۲۵) پہلے خانے میں پہلے مصرعے کا پہلا حرف درج ہے دُوسرے خانے میں دُوسرے مصرعے کا پہلا حرف۔ اسی طرح نویں خانے تک چلتے ہیں جس میں نویں مصرعے کا پہلا حرف لکھا ہے۔ اس کے بعد اسی طور پر ہر مصرعے کے دُوسرے حرف کی باری آتی ہے۔ پہلے مصرعے کا دُوسرا حرف دسویں خانے میں۔ دُوسرے مصرعے کا دُوسرا حرف گیارھویں خانے میں غرض اسی طرح یہ حروف چلے جاتے ہیں حتّٰی کہ آخری (نویں) شعر کا آخری (پچیسواں) حرف ۲۲۵ ویں خانے میں رکھا گیا ہے۔ اور جدول مکمّل ہو گئی ہے۔ اب اس سے کام لینے کا طریقہ یہ ہے کہ اٹکل سے ان ۲۲۵ خانوں میں سے کسی ایک پر اُنگلی رکھ دیتے ہیں۔ اس خانے میں جو حرف ہوتا ہے اُسے الگ لکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے آگے ہر نویں خانے کا حرف لکھتے جاتے ہیں حتّٰی کہ گھوم کر پھر وہیں آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ اور باقی چوبیس حروف حاصل ہو جاتے ہیں۔ ان پچیس حروف میں سے اگر صحیح حرف دیکھ کر پڑھنا شروع کریں تو کسی غزل کا پہلا مصرع نکل آتا ہے جو فوراً دیوان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ زیرِ بحث جدول میں ذیل کے نو مصرعے بطور جواب نکلتے ہیں۔ جن میں ہر ایک کے ساتھ میں نے اس کا دُوسرا مصرع بھی شعر کو مکمّل کرنے کیلئے لگا دِیا

ہے (گو وہ جدول میں نہیں ہے) اس کے علاوہ میں نے طبع روزن زوائک شوانائو سے ہر غزل کا حوالہ بھی مطلع کے اوپر دے دیا ہے:

(۱) ۱۷/۱۷ ردیف ش - طبعِ روزن زوائک شوانائو - جلد دوم ص۱۲۱:-

ما آزموده ایم درین شهر بخت خویش
بیرون کشید باید ازین ورطه رختِ خویش

یہ شعر اس شخص کے لئے جواب مہیا کرے گا جو متأمل ہے کہ آیا اپنی جائے اقامت سے ہجرت کرے یا نہ کرے *

---

(۲) ۶۲/۶۲ ردیف م - طبعِ روزن زوائک شوانائو - جلد دوم ص۳۶۴:-

مرحبا طائرِ فرخ پی فرخنده پیام
خیر مقدم چه خبر یار کجا راه کدام

---

(۳) ۵۷/۵۷ ردیف م - طبع روزن زوائک شوانائو - جلد دوم ص۳۵۲:-

گر ازین منزلِ غُربت بسوی خانه روم
دگر آنجا که روم عاقل و فرزانه روم

یہ شعر اس پردیسی یا مُسافر کے لئے جواب مہیا کریگا جو اس تذبذب میں ہو کہ گھر جانا اسکے حق میں اچھا ہوگا یا بُرا *

---

(۴) ۱/۱ ردیف ف - طبعِ روزن زوائک شوانائو - جلد دوم ص۱۶۰:-

طالع اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشم زہی طرب ور بکُشد زہی شرف

---

(۵) غ ۴ - ردیف س - طبعِ روزن زوائنک شوانا ؤ - جلد دوم ص ۱۲ :-

روی بنما و وجودِ خودم از یاد ببر
خرمنِ سوختگان را ہمہ گو باد ببر

---

(۶) غ ۸۰ - ردیف د طبع روزن زوائنک شوانا ؤ - جلد اول ص ۵۰۸ :-

گفتم غمِ تو دارم گفتا غمت سر آید
گُفتم کہ ماہ من شو گفتا اگر بر آید

---

(۷) غ ۱۹ ردیف ش - طبع روزن زوائنک شوانا ؤ - جلد دوم ص ۱۲۸ :-

یارب آن نو گلِ خندان کہ سپردی بمنش
من سپارم بتو از چشمِ حسودِ چمنش

---

(۸) غ ۸ ردیف ز - طبع روزن زوائنک شوانا ؤ - جلد دوم ص ۶۴ :-

بر نیامد از تمنّای لبت کامم ہنوز
بر امیدِ جامِ لعلت دُردی آشامم ہنوز

---

(۹) ۲۴ ردیف م۔ طبع روزن زوائک شواناؤ جلد دوم ص ۲۷ :-

خیز تا از درِ مے خانہ کشادی طلبیم
در رہِ دوست نشینیم و مرادی طلبیم

آپ دیکھیں گے کہ ان مبہم فالوں میں جو جواب نکلتے ہیں نہ صرف یہ

دیوانِ حافظ سے نکالی ہوئی برجستہ فالوں کی مثالیں

کہ نو تک محدود ہوتے ہیں بلکہ اکثر غیر واضح قسم کے ہوتے ہیں۔ دُوسرے طریقے سے جو دیوان کو اٹکل سے کھولنے کا ہے بے شک بہت فراواں اور دلچسپ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ برجستہ جوابات کی بہت سی حیرت انگیز مثالیں ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ جن میں فال خواہ غلط ثابت ہوئی یا درست لیکن برمحل ضرور نکلی۔ ان میں سے چھ مثالیں[1] متذکرۂ سابق مختصر رسالہ موسوم بہ 'لطیفۂ غیبیہ[2]' کے آخر میں درج ہیں (ص ۱۲۲ تا ۱۲۷)؛

ان میں سب سے پہلی مثال شاہ اسمٰعیلِ اعظم بانیٔ خاندانِ صفویہ سے متعلق ہے جس نے شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا اور اپنی اس کوشش میں اس قدر سرگرمی سے کام لیا کہ جتنے اشخاص کا تدین مشتبہ تھا یا جن کے سُنی میلانات سب کو معلوم تھے ان سب کی قبریں تباہ کرنے کا

---

[1] لطیفۂ غیبیہ کی طبع جدید (شیراز) میں کل آٹھ مثالیں ہیں (ص ۱۶۲ تا ص ۱۶۸) مترجم؛

[2] دیکھو اوپر ص ۴۲۵؛

حکم دے دیا۔ ایک روز ملا مگس نامی ایک جاہل اور متعصب ملا کے ہمراہ اُس نے مزارِ حافظ کی زیارت کی۔ مُلا مگس نے وہاں بُہت زور دیا کہ یہ قبر تباہ کرادی جائے اور خواجہ حافظ پر الزام (جیسا کہ اُن کے بعض معاصرین نے ان پر لگایا تھا) یہ لگایا کہ وہ صحیح الایمان نہ تھے۔ اور اوباشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس پر شاہ نے ارادہ ظاہر کیا کہ دیوانِ حافظ میں فال دیکھی جائے۔ دیوان کھولا گیا تو یہ شعر نکلا ؎

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم

یعنی غلامِ شاہم و سوگند میخورم

یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ شاہ نے اس کو مرحوم کی اطاعت شعاری کے اظہار پر محمول کیا۔ اس پر خوش ہوکر اُس نے پھر کتاب کو اٹکل سے کھولا تو ذیل کا شعر سامنے آیا جس میں روئے سخن پہلے کی نسبت اَور بھی زیادہ صاف طور پر شاہ کے رفیق ملا صاحب کی طرف تھا ؎

ای مگس حضرتِ سیمرغ[1] نہ جولانگہِ تُست

عرضِ خود می بری و زحمتِ ما میداری

قیاس یہی ہے کہ اسکے بعد مُلا صاحب نے مدۃ العمر کسی کو مُنہ نہ دکھایا ہوگا۔

---

[1] ایک فرضی بہت بڑا اور دانا اور تقریبًا یا بالکل لافانی پرندہ جس کے متعلق اس کے عربی مترادف عنقا کی طرح یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس کا مسکن کوہِ قاف یا کوہِ البرز ہے۔ شاہنامۂ فردوسی کی روایت میں سام اور زال (علی الترتیب رُستم کے دادا اور باپ) کی داستان میں یہ پرندہ بہت بڑا حصہ لیتا ہے۔

خواجہ صاحب پر معاصرین کے الزام لگانے کا قصّہ جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے لطیفۂ غیبیہ میں درج نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب خواجہ حافظ فوت ہوئے تو بعض بدخواہ مسلمانوں کے قبرستان میں اُنکے دفن کیئے جانے پر معترض ہوئے۔ اس قضیّے کا فیصلہ کرنے کے لئے جب اُن کے دیوان سے فال لی گئی تو ذیل کا نہایت برجستہ شعر نکلا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہست میرود بہشت

لطیفۂ غیبیہ میں دُوسری مثال اسی خاندان کے ایک دُوسرے فرمانروا شاہ طہماسپ[1] کے بارے میں ہے۔ ایک روز وہ اپنی انگوٹھی سے کھیل رہا تھا جسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ انگوٹھی ہاتھ سے گر پڑی۔ اس کے آدمیوں نے اس کی تلاش میں تکیوں اور قالینوں کے نیچے کوئی جگہ نہ چھوڑی مگر انگوٹھی نہ ملی۔ دیوان میں فال دیکھی تو یہ شعر تھا ؎

دلی کہ غیب نمایست و جامِ جم دارد
ز خاتمی کہ دمی گم شود چہ غم دارد[2]

شاہ نے شعر کی اس برمحل عدم تائید پر استعجاب کرتے ہوئے اپنے

---

[1] اس نام کے دو صفوی بادشاہ ہوئے ہیں۔ ایک کا زمانہ ۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء ہے اور دُوسرے کا ۱۷۲۲ء تا ۱۷۳۱ء؛

[2] (حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)؛

ہاتھ گھٹنوں پر مارے تو فوراً اپنی قبا کے ایک شگاف میں انگوٹھی محسوس کی جہاں وہ اتفاق سے پھسل کر داخل ہو گئی تھی ؛

تیسری حکایت بھی ایک صفوی بادشاہ ہی سے متعلق ہے یعنی شاہ عباس ثانی (۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۷ء)۔ وہ متأمل تھا کہ ولایتِ آذربائیجان کے خلاف (جس کا صدر مقام تبریز ہے) لشکر کشی کرے یا نہ کرے۔ اس سلسلے میں فال دیکھی تو یہ نکلی[1] ؎

عراق و فارس گرفتی بشعرِ خود حافظؔ
بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

شاہ نے مہم کے حق میں فیصلہ کر لیا جو بالکل کامیاب رہی ؛

چوتھی حکایت بھی اسی بادشاہ کے بارے میں ہے۔ اس کا ایک

(حاشیہ صفحہ ۴۴۲) اصل حوالہ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی اس انگشتری کا ہے جس پر کھُدے ہوئے اسمِ اعظم کے ذریعے وہ پرندوں۔ جنگلی جانوروں۔ مچھلیوں۔ ہواؤں۔ انسانوں اور جنّوں پر حکومت کرتے تھے۔ اور جو کچھ عرصے کیلئے جن صخر نے چرا لی تھی۔ ایرانی اکثر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا افسانوی بادشاہ جمشید یا جم (اوستا کا یِم) اور حضرت سلیمانؑ ایک ہی شخص ہے اور "جامِ جہاں نما" کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں ؛

[1] یہ قصہ زیادہ جگہوں پر نادر شاہ کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو فہرست کتاب خانۂ بانکی پور (فارسی شاعری : فردوسی تا حافظ)۔ ص ۲۳۵ ؛

ملازم سیاوُش نام تھا۔ اسکے ہم خدمت حسد اور بُغض کے سبب اسکو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ برابر وہ بادشاہ کو یقین دلانے میں لگے رہتے کہ یہ کشتنی ہے۔ دیوانِ حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا ؎

شاہ ترکانِ سخن مدعیان میشنود
شرمی از مظلمۂ خونِ سیاوشش باد[1]

پانچویں مثال مصنّف لطیفۂ غیبیہ کے اپنے تجربے کی ہے۔ ۱۰۵۲ھ (۴۳-۱۶۴۲ء) میں وہ احمد آباد وارد ہُوا کہ ان دنوں گجرات کا پایۂ تخت تھا۔ وہاں اُس نے شہر کے ایک معزّز شخص کنعان بیگ سے آشنائی پیدا کی کنعان بیگ کا ایک بھائی یوسف بیگ لشکرِ گجرات کا سپاہی تھا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل نواحیٔ احمد آباد میں اس لشکر کی ایک دشمن فوج سے جنگ ہوئی تھی۔ لڑائی کے بعد جب موجودات لی گئی تو یوسف بیگ لاپتہ نکلا۔ اسکے بھائی کو جب اطلاع ملی تو بیحد مضطرب ہوُا۔ لیکن لسان الغیب کے دیوان سے ذیل کی فال نکلی تو اُس کی بے چینی ہلکی ہو گئی۔ اور جلد ہی بھائی کے بخیریت واپس آجانے پر بالکل دُور ہو گئی ؎

یُوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور
کُلبۂ احزان شود رُوزی گلستان غم مخور

---

[1] ملاحظہ ہو دیوانِ حافظ۔ طبع روزن رد ایک شوانا وٗ۔ جلد اول صفحہ ۹۲۰۔ نیز حاشیہ بر صفحہ ۸۲۳ جس میں مشارالیہ قدیم داستان کی تلمیح سمجھائی گئی ہے؛

چھٹی اور آخری مثال ایک شخص فتح علی سلطان پسر امام قلی خان کے بارے میں ہے۔ یہ نوجوان غیر معمولی حُسن و جمال کا مالک تھا اور مصنّف کا ہمعصر تھا۔ خواجہ صاحب کے عُرس کے روز جو ماہِ رجب کے آخر میں ہوتا ہے شراب کی گرمی سے آتش بر رخسار ایک سبز زرافشاں قبا پہنے وُہ اُنکے مزار کی زیارت کو آیا۔ وہاں اُس نے اُن کے دیوان سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا ؎

سرمست با قبای زرافشان چو بگذری
یک بوسہ نذرِ حافظِ پشمینہ پوش[1] کُن

فتح علی ازرہِ تعجب پکار اُٹھا "ایک بوسہ بھلا کیا شے ہے! مَیں دو کا وعدہ کرتا ہوں"۔ ایک ہفتہ گُزر گیا۔ دوبارہ مزار پر پہنچا۔ اور پھر فال دیکھی۔ اب کے یہ شعر تھا ؎

گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوست بدہم
وعدہ از حد بشد و ما نہ دو دیدیم و نہ یک

اس پر وُہ نوجوان پھر چلاّ اُٹھا "دو بوسوں کی بھلا کیا بات ہے! میں تین کا وعدہ کرتا ہوں"۔ پھر وہاں سے بغیر اپنا وعدہ پُورا کیئے رُخصت ہو گیا اور ایک ہفتے تک واپس نہ آیا۔ پھر آیا۔ فال دیکھی تو جواب یہ نکلا ؎

سہ بوسہ کز دو لبت کردۂ حوالتِ من — اگر ادا نکنی قرضدارِ من باشی

---

[1] پشمینہ پوش عربی لفظ صوفی کا فارسی مترادف ہے۔ ملاحظہ ہو راقم کی تاریخ ادبیاتِ ایران جلد اول۔ ص ۴۱۷؛

فتح علی جہاں بیٹھا تھا وہاں سے اُچھل پڑا۔ اور پیاپے شاعر کے سنگِ مزار کے بوسے لینے لگا ؎

مغل شہنشاہ جہانگیر نے دیوانِ حافظ سے فالیں نکالی ہیں اور انکی کیفیت دیوان کے ایک نسخے کے حاشیوں پر اپنے ہاتھ سے درج کی ہے یہ نسخہ اب بانکی پور کے کتابخانے میں موجود ہے۔ آپ یہ مثالیں فہرست کتابخانۂ بانکی پور (فارسی شاعری: فردوسی تا حافظ) میں دیکھ سکتے ہیں (ص ۲۳۱ تا ص ۲۵۲)؎

کمال خجندی

(کمال الدّین ابنِ مسعود)

کمال خجندی

اس شاعر کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں تاہم چونکہ اسکے کلام نے خواجہ حافظ سے خراجِ تحسین وصُول کیا اس لیے اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ جامؔی کہتے[1] ہیں کہ یہ بہت بڑا ولی تھا۔ اور اگر بہ تکلّف شعروسخن کا مشغلہ رکھتا تھا تو اس غرض سے کہ اس کی خدارسیدگی اور رُوحانی کمالات پوشیدہ رہیں۔ اور ظاہر باطن کا مغلوب نہ ہو جائے اور ایسا نہ ہو کہ فنا فی اللہ ہونے کے زبردست میلان سے دبکر عبودیّت کی شان کا احساس جاتا رہے۔ اس دعوے کی تائید میں وہ

---

[1] نفحات الانس ص ۳-۷۱۲؛

کمال کا مندرجہ ذیل شعر نقل کرتے ہیں ؎

این تکلفہای من در شعرِ من
کَلِّمِینِی یا حُمَیرا ی من است[1]

کمال کے مرشد خواجہ عبید اللہ نام ایک بزرگ تھے جو کچھ عرصہ شاش[2] میں مقیم رہے۔ خجند کی طرح یہ جگہ بھی ماوراء النہر میں واقع ہے۔ اپنی عمر کے ایک نامعلوم لیکن غالباً خاصے ابتدائی زمانے میں کمال نے اپنی سکونت تبریز میں منتقل کر لی۔ یہاں اپنا گھر بنایا جس سے اسکو بڑی اُلفت ہو گئی۔ جلائر سلطان حسین ابن اویس (۷۷۶ھ تا ۷۸۴ھ = ۱۳۷۴ء تا ۱۳۸۲ء) نے اسے بڑے لُطف و عنایت سے نوازا اور اسے ایک خانقاہ یا رباط بنوادی۔ جامی کہتے ہیں کہ کمال کی وفات کے بعد جب لوگ اس کی خلوت گاہ میں داخل ہوئے تو اس میں کوئی ساز و سامان نہ پایا۔ بس ایک بوریا تھا۔ کہ بیٹھنے اور سونے کے کام آتا تھا۔ اور ایک پتھر تھا جس سے تکیے کا کام لیا جاتا تھا۔ تبریز میں جہاں اس کی بزرگی اور تقدس کا بڑا چرچا تھا

کمال کی زندگی کے کچھ حالات

---

[1] آنحضرت صلعم کی عادت تھی کہ جب آپ پر وحی نازل ہونے کے بعد شدید تھکن کی کیفیت طاری ہوتی۔ تو آپ اُمّ المومنین حضرتِ عائشہؓ کو کلمینی یا حمیرا کہکر اپنے پاس بُلاتے؛

[2] یا چاچ۔ آجکل کا تاشقند اور قدیم بناکت یا فناکت۔ او پر ص۱۹۵ اور ص۱۸۲ کے ساتھ مقابلہ کیجئے؛

وہ شیخ زین الدین خوافی کا مُرید ہوگیا[1]۔

۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں خانِ قپچاق توقتامش نے تبریز پر چڑھائی کی۔ اور تیمور اور اس زمانے کے دُوسرے فاتحین کے دستور کے مطابق کمال کو دُوسرے فضلاء اور مشائخ کے ساتھ اپنے دارالسلطنت سرائی لے گیا۔ یہاں کمال چار سال رہا[2]۔ اسکے بعد تبریز لوٹ آیا اور یہیں اس کا انتقال ہوا[3]۔ اکثر اسناد کی رُو سے اس کی وفات کی تاریخ ۸۰۳ھ (۱-۱۴۰۰ء) ہے۔ دولت شاہ نے وفات کی تاریخ ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) لکھی ہے۔ جسے ریو نے دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ اصل تاریخِ وفات سے بہت پہلے کی ہے۔ ایک اَور بھی متأخر تاریخ یعنی ۸۰۸ھ (۶-۱۴۰۵ء) مجالس العشّاق میں دی گئی ہے۔ شاعر کی قبر پر ذیل کا شعر کندہ کیا گیا تھا ؎

کمال از کعبہ رفتی بر درِ یار
ہزارت آفرین مردانہ رفتی

تبریز کی دُوسری اقامت کے دوران میں کمال کو تیمور کے بیٹے میراں شاہ کی سرپرستی حاصل ہوئی جو ان دنوں آذربائیجان کا عامل تھا روایت ہے کہ اُس نے یا اُس کے سپاہیوں نے کمال کے باغ سے کچھ پھل

---

[1] ملاحظہ ہو جامی کی نفحات ص ۵۶۹ تا ص ۵۷۲؛ اور ابنِ عرب شاہ کی عجائب المقدور (طبع کلکتہ ۱۸۱۸ء) کا ص ۳۴؛

[2] دیکھو ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی۔ ص ۳-۶۳۲؛

[3] صرف آتشکدہ میں لکھا ہے کہ اس نے یزد میں وفات پائی؛

توڑ کر کھائے۔ اس کے عوض اس نے کمال کو ایک ہزار دینار دئے۔ کہ ان سے شاعر اپنا قرض ادا کرے ⁂

جہاں تک مجھے معلوم ہے کمال خجندی کا دیوان اب تک کہیں شائع نہیں ہوُا اور اس کے قلمی نسخے بھی عام نہیں ملتے۔ گو فارسی کُتب کے اکثر بڑے بڑے مجموعوں میں مل جاتے ہیں۔ میرے پاس اس کا ایک غیر مؤرّخہ لیکن خوشخط اور خاصا پُرانا نسخہ ہے۔ ذیل کے انتخابات اسی میں سے کئے گئے ہیں:۔

(۱)

کمال از ہر مژہ اشکت مگر ہمرنگِ سلمان شد
کہ از اشعارِ مردم برد معنی ہایِ رنگین را

(۲)

شانہ زد باد زلفِ یارِ مرا — أَصْلَحَ اللّٰہُ شَأْنَہٗ أَبَدًا
تا ببالا تو راست چون الفی[۱] — ما چو لامیم درمیانِ بلا
چشمِ تر بر لبِ تو اولئے تر — کہ بمرطوب بہ بود حلوا
شد چنان پُر ز دردِ تو دلِ ریش — کہ نگنجد درو خیالِ دوا
دل مرنجان بدردِ دوست کمال — فَوْقُہٗ مَآءُ الْحَیٰوۃِ فِیہِ شِفَا

---

[۱] ایک سیدھے اور خوب صورت جسم کو حرف الف (ا) سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور غم یا عمر کے سبب خمیدہ جسم کو لام (ل) سے۔ لام لفظ بلا کا وسطی حرف ہے؛

(۳)

دشوار کشد نقش دو ابروی تو نقاش
آسان نتوانند کشیدن دو کمان را

(۴)

این چه مجلس چه بهشت این چه مقامست اینجا
عمرِ باقی لبِ ساقی لبِ جامست اینجا
دولتی کز همه بگریخت ازین در نگذشت
شادیٔ کز همه بگریخت غلامست اینجا
چون در آئی بطرب خانهٔ ما با غمِ دل
همه گویند مخور غم که حرامست اینجا
ما ببام فلکیم از برِ ما گر بروی
برو آهسته که بام و لبِ بامست اینجا
نیست در مجلسِ ما پیشگه و صفِّ نعالِ[۱]
شاه و درویش ندانند کدامست اینجا
صفتِ عود همه گرم رو و سوخته ایم
بجز از زاهدِ افسرده که خامست اینجا
چند پرسی چه مقامست کمال این که ترا
این مقام که نه منزل نه مقامست اینجا

---

[۱] کمرے کا زیریں فرش جس پہ نوکر چاکر کھڑے رہتے ہیں اور اہلِ مجلس مرتفع بساط پر چڑھنے سے پہلے اپنی جوتیاں اتار کر رکھتے ہیں؛

(۵)

مهِ من عید شد مُبارک باد   عیدیِ عاشقان چه خواهی داد
عیدیِ ما وعیدِ ما رُخِ تُست   عیدما بی رُخِ تو عید مباد
گُفته‌ٔ پرسم از تو عیدِ دگر   آه کین وعده هم بعید اُفتاد
جانم از غم رهان چو عید رسید   عید زندانیان کنند آزاد
عید شد بگذر از وعید کمالؔ
عید سازند خاطرِ همه شاد

(۶)

آفرین بر عبارتِ تو کمال   خود ترا اختیارِ تحسین نیست
میوهٔ کز خجند مے آرند   این چنین آبدار وشیرین نیست

(۷)

دردِ تو به از دواست ای دوست   اندوه تو جان فزاست ای دوست
دریوزه گرِ تو از درِ تو   جُز درد و بلا نخواست ای دوست
باآنکه زمفلسی ندارم   چیزی که ترا سزاست ای دوست
پیشِ تو نهم دو چشمِ روشن   گویم نظر صفاست ای دوست
گُفتی کُشمت ولے روا نیست   گر دوست کُشد رواست ای دوست
دل هرچه بوصف قامتت گفت   آورد خدای راست ای دوست
کردم بقدِ تو این غزل راست
بنویس کمال راست ای دوست

جہاں تک مجھے معلوم ہے کمال واحد شاعر ہے جس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حتی الامکان اپنی غزلوں کے اشعار کی تعداد یکساں یعنی سات رکھے خود ذیل کے دو قطعوں میں وضاحت سے اس التزام کا اظہار کرتا ہے ؎

(۸)

مرا ہست اکثر غزل ہفت بیت | چو گفتارِ سلمان نرفتہ زیاد
چو حافظ ہمی خواندش در عراق | بلند و روان ہمچو سَبْعٌ شِدَادْ[1]
بہ بنیاد ہر ہفت چون آسمان | کزین جنس بیتی ندارد عماد

(۹)

ہفت بیت آمد غزلہای کمال | پنج گنج[2] از لطفِ آن عُشرِ عشیر
ہفت بیتہای یاران نیز ہست | ہر یکی پاک و روان و دلپذیر
لیک از آن ہر ہفتشان حک کردنی است | چار بیت از اوّل و سہ از اخیر

(۱۰)

چو دیوانِ کمال افتد بدستت | نویس از شعرِ او چندانکہ خواہی
خیالاتِ غریب و لفظ وحشش | اگر خواہی کہ دریابی کماہی
ز ہر لفظش روان بگذر چو خامہ | بہر حرفی فرو رو چون سیاہی

---

[1] سورۂ یوسف (آیت ۴۸) میں سات سختی کے سالوں کو "سبعٌ شداد" کہا گیا ہے۔ سورۃ النبا (آیت ۱۲) میں یہی لفظ سات آسمانوں کے لئے آئے ہیں۔ اس شعر میں سات آسمانوں سے ہی مراد ہے؛

[2] خمسۂ نظامی گنجوی کو اس نام سے یاد کیا جاتا ہے؛

دو کمالند در جهان مشهور یکی از اصفہان[1] یکی زخجند
این یکے در غزل عدیم المثل وآن دگر در قصیدہ بی مانند
فی المثل درمیانِ این دو کمال نیست فرقے مگر بموئی چند

(۱۲)

بکی شعر سلمان زمن بندہ خواست کہ در دفترم زان سخن ہیچ نیست
بدو دادم آن گفتہ ہای جواب کزان سان دُری درعدن ہیچ نیست
من از بہرِ تو می نوشتم ولے سخن ہای او پیشِ من ہیچ نیست

(۱۳)

بما آن صوفیٔ بہریدہ بینی بغیر از عجز و مسکینی ندارد
نشاید جُرمِ خود بینی بروبست کہ آن بیچارہ خود بینی ندارد

دو یا تین قطعے حافظ نامی ایک شخص سے خطاب کیے گئے ہیں جو خواجہ حافظ نہیں بلکہ اس نام کا کوئی مطرب یا بربط نواز معلوم ہوتا ہے۔ ذیل کے شعر میں البتہ تقریبًا یقینی طور پر ایک معاصر شاعر عصار تبریزی[2] کیطرف اشارہ ہے

---

[1] کمال الدین اصفہانی المعروف بہ خلاق المعانی کا کچھ حال آپکو راقم کی تاریخِ ادبیاتِ ایران کی دُوسری جلد میں ملے گا۔ (ص ۵۴۰ تا ص ۵۴۲)؛

[2] اس شاعر کا کچھ حال آپ کو آؤسلے کے تذکرہ شعرائے فارسی میں (ص ۲۰۱ تا ص ۲۲۶) ملے گا اور کچھ فلائشر (Fleiscer) کے ایک مقالے میں جو مجلۂ انجمن مشرقی آلمانی کی جلد ۱۵ (Z. D. M. G. XV.) میں چھپا ہے۔ ص ۳۸۹ تا ص ۳۹۶۔ عصار کی تاریخ وفات باختلافِ روایت ۷۷۹ھ اور ۷۸۴ھ (۳-۱۳۸۲ء اور ۸-۱۳۷۷ء) دی گئی ہے!

(۱۴)

عاقبت عصّار مسکین مُرد و رفت　　خونِ دیوانہا بگردن بُرد[1] و رفت

قطعۂ ذیل میں جس کا ریونے حوالہ دیا ہے[2] ایک تاریخی واقعہ یعنی حملۂ توقتامش کی تلمیح ہے ؎

(۱۵)

گفت فرہاد ما بمیر ولی　　کہ رشیدیہ[3] را کنیم آباد

زر بتبریزیان باجر و سنگ　　بدہیم از برای این بنیاد

بود مسکین بشغل کوہ کنی　　کہ زمورانِ کوہ و دشت زیاد

لشکرِ پادشاہ توقتمیش　　آمد و ہاتف این ندا در داد

لعلِ شیرین نصیب خسرو شد　　سنگِ بیہودہ می کَنَد فرہاد

ذیل کے قطعے میں ہمام تبریزی کی طرف اشارہ ہے جو شیخ سعدی کا معاصر تھا۔ اس میں ہمام کا ایک مصرع تضمین کیا گیا ہے ؎

(۱۶)

گفتم از مصرِ معانی بفرستم بتو باز　　نکتۂ چند کہ آید بدہانت چو شکر

باز ترسیدم ازین نکتہ کہ گوئی چو ہمام　　"شکر از مصر بتبریز میارید دگر"

---

[1] میں ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھا۔ ان سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ عصار قتل کیا گیا؛

[2] فہرست مخطوطاتِ فارسی ص ۶۳۲ ؛

[3] "رشیدیہ شہر تبریز کا وہ حصہ تھا جو سب سے پہلے زبردست وزیر اور مؤرخ رشید الدین فضل اللہ نے تعمیر کرایا تھا۔ دیکھو اوپر ص ۵-۱۱۴ ؛

دیگر قطعات میں نظامی اور سعدی کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔ ایک قطعہ معجری سمرقندی نام ایک شاعر سے خطاب کیا گیا ہے۔ اور ذیل کا قطعہ ایک اور شاعر معاذی سے جو قیاساً کمال کا حریفِ معاصر ہے ؎

(۱۷)

دعای من این است در ہر نمازی
بخلوت کہ یا ملجای یا معاذی
نگہ دار اصحابِ ذوق و طرب را
ز چنگ معاطی و شعرِ معاذی

(۱۸)

شعر ذیل میں مضمون قدرے نادر اور عمدہ ہے ؎

چیست قہقہۂ شیشہای می دانی
بر ریشِ محتسبِ شہر می کنند خندہ

بمقابلہ غزلوں کے کمال کے قطعات یہاں غیر متناسب حد تک زیادہ نقل کیے گئے ہیں۔ مگر اس کی ایک وجہ ہے جیسا کہ اکثر فارسی شاعروں کے ہاں ہوتا ہے کمال کی غزلوں کی نسبت اسکے قطعات میں ذاتیات کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اور ان میں معاصر واقعات اور اشخاص کے اشارے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہر چند مکمل تر معلومات کے فقدان کے سبب یہ اشارے اکثر مبہم ہیں ٭

(۸) مغربی

(محمد شیریں مغربی تبریزی)

مغربی مغربی ایران کے ان شاعروں میں سے ہے جن کی شاعری میں سرتاپا ہمہ اوست کا عقیدہ کارفرما ہے۔ اس کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ گو اکثر تذکروں میں اس کے مذکور ملتے ہیں۔[۱] اکثر تذکرہ نگاروں نے یہی بیان کیا ہے کہ اس کی وفات ۸۰۹ھ (۷-۱۴۰۶ء) میں بہ شہر تبریز واقع ہوئی۔ اس وقت اُس کی عُمر ساٹھ سال تھی۔ اس لحاظ سے یقیناً ۷۵۰ھ (۵۰-۱۳۴۹ء) کے قریب پیدا ہوا ہوگا۔ عہدِ جدید کا فاضل مؤرخ رضا قلی خان بیان کرتا ہے کہ مغربی (اصفہان کے قریب) قریۂ نائین میں پیدا ہوا۔ اور فارس میں اصطہبانات کے مقام پر دفن ہوا۔ اس کے تخلّص مغربی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے مغرب (شمال مغربی افریقہ) کی سیاحت کی۔ وہاں ایک شیخ نے اسے خرقہ پہنایا جو اپنے نسبِ رُوحانی کا سلسلہ مغرب کے نامور صوفی شیخ محی الدین ابن العربی سے ملاتا تھا۔ شیخ ابن العربی وہ بزرگ ہیں جن کے خیالات آج بھی ایران میں اثرِ عظیم رکھتے ہیں اور جن کے ایرانی پیروؤں

---

[۱] نفحات الانس۔ صفحہ ۷۱۲؛ آتشکدہ و ہفت اقلیم، در ذیل تبریز؛ حبیب السیر۔ جلد سوم جزو سوم صفحہ ۹۱؛ مجمع الفصحاء۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳؛ ریاض العارفین ص ۵-۱۴۴۔ دولت شاہ کے تذکرۃ الشعراء میں مغربی کا کوئی ذکر نہیں؛

میں عراقی، اوحدالدین، مغربی، حتّٰی کہ متأخر مولانا جامی جیسے شاعر شامل ہیں۔ ان شاعروں کے ہاں وحدتِ وجود کا عقیدہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے رضا قلی خاں نے اپنی کتاب مجمع الفصحا، میں مغربی کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت بجا کہا ہے :۔

" مذہبش وحدتِ وجود و مشربش لذتِ شہود[1] و بجز یک معنی در ہمہ گفتارش نتوان یافت، ترجیعات و غزلیاتش ہمہ مشحون بحقایقِ توحید ست[2]"

مولانا جامی اور دُوسرے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مغربی پچھلے شاعر کمال خجندی سے آشنائی رکھتا تھا۔ یہ بات خاصی قرینِ قیاس ہے کیونکہ دونوں ہمعصر تھے۔ اور دونوں نے کم سے کم اپنی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ تبریز میں بسر کیا۔ منقول ہے کہ ایک موقع پر اُس نے کمال کے شعر ذیل میں یہ عیب نکالا کہ اس میں صاف طور پر مادّی جمال و دلفریبی مطلوب ہے اور کسی مجازی اور باطنی تعبیر کی گنجائش نہیں[3] ؎

چشم اگر اینست و ابرو این و ناز و شیوہ این
الوداع ای زہد و تقویٰ الفراق ای عقل و دین

کمال نے جب یہ سُنا تو مغربی سے ملاقات کی استدعا کی۔ چنانچہ جب صحبت

---

[1] شہود سے ظاہری دنیا کی حسین چیزوں میں حُسنِ ربّانی کا مشاہدہ کرنا مراد ہے؛

[2] توحید ظاہری اس اعلان کو کہتے ہیں کہ خدا صرف ایک ہے۔ توحید باطنی اس یقینِ کُلّی کا نام ہے کہ صرف ایک ہی ذات ہے جو واقعی موجود ہے ؛

[3] نفحات الانس صفحہ ۷۱۴ ؛

ہوئی تو کمال نے کہا" (فارسی لفظ) چشم (عربی لفظ) عین (کا مرادف) ہے[1] - اور کنایتی زبان میں عینِ قدیم کو کہ خود ذات ہے اس لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں - اسی طرح (فارسی لفظ) ابرو (عربی لفظ) حاجب (کا مترادف) ہے[2] چنانچہ اس کو صفات کا کہ حجابِ ذات ہیں کنایہ سمجھا جا سکتا ہے۔" مغربی نے جب یہ تشریح سُنی تو معذرت کی اور اپنا اعتراض واپس لے لیا۔ اگر ریو کے کہنے[3] کے مطابق یہ بات درست ہے کہ کمالؔ نے میراں شاہ پسر تیمور والیٔ آذر بائجان کا التفات مغربی سے چھین لیا۔ تو ممکن ہے کہ دونو شاعروں کے تعلّقات بہت مُخلصانہ اور صمیمانہ نہ ہوں *

چونکہ مغربؔی کے جو کچھ حالات ہم جانتے ہیں سب اوپر کی عبارت میں آگئے ہیں اسلئے اب ہم اس کے کلام کو لیتے ہیں - اس کا دیوان مُختصر سا ہے - بیشتر غزلیات پر مشتمل ہے - انکے علاوہ چند ترجیع بند اور کچھ رباعیات ہیں - چاپ سنگی کیساتھ ایران سے کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے[4] - میرے پاس اس کا ایک عمدہ اور خوشخط نسخہ بھی ہے - لیکن اس پر تاریخِ کتابت درج

---

[1] دونوں کے معنی آنکھ کے ہیں لیکن عربی میں 'عین' ایک چیز کے کامل و صحیح بدل یا کسی چیز کی ذات کو بھی کہتے ہیں؛

[2] دونوں کے معنی 'بھَوں' کے ہیں - لیکن عربی میں حاجب کے معنی نقاب یا پردے کے بھی ہیں؛

[3] فہرستِ مخطوطاتِ فارسی ص ۶۳۳؛

[4] میرے پاس اس کی دو ایڈیشنیں ہیں - ایک کی تاریخ اشاعت ۱۲۸۰ھ (۶۴-۱۸۶۳ء) ہے اور دُوسری کی ۱۲۸۷ھ (۷۱-۱۸۷۰ء) کا؛

نہیں۔ طبع سنگی چھوٹی تقطیع کے ۱۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے پر سترہ ۱۷ اشعار ہیں۔ کل اشعار کی تعداد ۲۳۰۰ کے قریب ہوگی۔ غزلیں جہاں تک مَیں نے ان کا جائزہ لیا ہے تمامتر متصوّفانہ ہیں۔ اور ان میں شاعر کی زندگی یا اس کے زمانے کے واقعات کی طرف کوئی اشارے نہیں پائے جاتے۔ غزلیاتِ ذیل اس کی غزلوں کے صحیح نمونے ہیں ؎

(۱)

خورشیدِ رُخت چو گشت پیدا ذرّاتِ دو کَون شد ہویدا
مہرِ رُخِ تو چو سایہ انداخت زان سایہ پدید گشت اشیا
ہر ذرّہ ز نورِ مہرِ رویت خورشید صفت شد آشکارا
ہم ذرّہ بمہر گشتہ موجود ہم مہر بذرّہ گشت پیدا
دریای وجود موج زن شد موجی بفگند سوی صحرا
آن موج فرو شد و برآمد در کسوت و صورتے دلآرا
بر رُستہ بنفشہ معانی چون خطِّ خوشِ نگارِ رعنا
بشگفتہ شقایقِ حقایق بنمودہ ہزار سروِ بالا
این جملہ چہ بود عینِ آن موج وآن موج چہ بود عینِ دریا
ہر جزو کہ ہست عینِ کل است پس کل باشد سراسر اجزا
اجزا چہ بود مظاہرِ کلّ اشیا رچہ بود ظلالِ اسما
اسما چہ بود ظہورِ خورشید خورشیدِ جمالِ ذاتِ والا
صحرا چہ بود زمینِ امکان کآنست کتاب حق تعالیٰ

ای مغربی این حدیث بگذار
سِرِّ دو جہان مکن ہویدا

(۲)

اے جملہ جہان در رُخِ جان بخش تو پیدا
وی روے تو در آئینۂ کون ہویدا
تا شاہدِ حسنِ تو در آئینہ نظر کرد
عکسِ رُخِ خود دید بشد والہ و شیدا
ہر لحظہ رُخت داد جمالِ رُخِ خود را
بر دیدۂ خود جلوہ بصد کسوتِ زیبا
از دیدۂ عشّاق برون کرد نگاہی
تا حُسنِ خود از روی بُتان کرد تماشا[1]
رویت ز پی جلوہ گری آئینۂ ساخت
آن آئینہ را نام نہاد آدم و حوّا
حُسنِ رُخ خود را بہمہ روے در[2] او دید
زآن روی شد او[2] آئینۂ جملۂ اسما

---

[1] ذیل کی مشہور رباعی (جو عمر خیام کی طرف منسوب کی جاتی ہے) میں بھی یہی مضمون باندھا گیا ہے ؎

بُت گُفت بہ بُت پرست کای عابدِ ما دانی زچہ روی گشتہ ساجدِ ما
بر ما بجمالِ خود تجلّی کردست آن شخص کہ زتُست ناظرای شاہدِ ما

[2] دونوں جگہ حضرت آدم سے مُراد ہے؛

ای حسنِ تو بر دیدهٔ خود کرده تجلّی
در دیدهٔ خود دیده عیان چهرهٔ خود را
چون ناظر و منظور توئی غیرِ تو کس نیست
پس از چه سبب گشت پدید این همه غوغا
ای مغربی آفاق پُر از ولوله گردد
سلطان جمالم چو زند خیمه بصحرا

(۳)

ای مرکز و مدارِ وجود و محیط بود … وی همچو قطب ثابت و چون چرخ بی ثبات
گر سوی تُو سلام فرستم توئی سلام … ور بر تو من صلات فرستم توئی صلات
کس چون دهد ترا بتو آخر بگو مرا … ای تو ترا مزکّی و ای تو ترا زکات
یا اشمل المظاهر یا اکمل الظهور … یا برزخ البرازخ یا جامع الشّتات
یا اجمل الجمال و یا املح الملاح … یا الطف اللّطایف یا نکتة النّکات
هم درد و هم دوائی و هم حزن و هم فرح … هم قُفل و هم کلیدی و هم حبس و هم نجات
هم گنج و هم طلسمی و هم جسم و هم روان … هم اسم و هم مُسمّی هم ذات و هم صفات
هم مغربی و مغرب و هم مشرقی و شرق
هم عرش و فرش و عنصر و افلاک و هم جهات

(۴)

ای از دو جهان نهان عیان کیست … وی عینِ عیان پس این نهان کیست
آن کس که بصد هزار صُورت … هر لحظه همی شود عیان کیست

وآن کس که بصد ہزار جلوه　　بنمود جمال ہر زمان کیست
گوئی که نهانم از ہر دو عالم　　پیدا شده در یکان یکان کیست
گفتی که ہمیشه من خموشم　　گویا شده پس بہر زبان کیست
گفتی که ز جسم و جان برونم　　پوشیده لباسِ جسم و جان کیست
گفتی که نه اینم و نه آنم　　پس آنکه بود ہم این ہم آن کیست
ای آنکه گرفتۂ کرانه　　باللہ تو بگو درین میان کیست
آن کس که ہمی کند تجلّی　　از حُسن و جمالِ دلبران کیست
وآن کس که نمودِ حُسنِ خود را　　وآشوب فگنده در جہان کیست
ای آنکه تو مارنده در گمانی　　ناکرده یقین که در گمان کیست

از دیدۂ مغربی نہان شو
وز دیدۂ او ببین عیان کیست

(۵)

غزل ذیل کے افتتاحی اشعار میں عیسائی عقاید کا پرتو نظر آتا ہے۔

آن کس که نہان بود زما آمد و ما شد
وآن کس که زما بود وشما ما وشما شد
سلطانِ سرِ تختِ شہی کرد تنزّل
با آنکه جُز او ہیچ شہی نیست گدا شد
آن کس که ز فقر و ز غنا ہست منزّه
در کسوتِ فقر از پیِ اظہارِ غنا شد

هرگز که شنیده است ازین طرفه که یک کس
هم خانهٔ خویش آمد و هم خانه خدا شد
آن گوهرِ پاکیزه و آن دُرِّ یگانه
چون جوش بر آورد زمین گشت و سما شد
در کسوتِ چونی و چرائی نتوان گفت
کآن دلبر بی چون و چرا چون و چرا شد
بنمود رُخ ابروی وی از ابروے خوبان
تا بر صفتِ ماهِ نو انگشت نما شد
در گلشن عالم چو سہی سرو چو لاله
هم سرخ کلاه آمد و هم سبز قبا شد
آن مهرِ سپهرِ ازلی کرد تجلّی
تا مغربی و مشرقی و شمس و ضیا شد

(۶)

طریقِ مدرسه و رسمِ خانقاه مپرس
ز راه و رسم گذر کن طریق و راه مپرس
طریقِ فقر و فنا پیش گیر و خوش می باش
ز پس نظر مکن و غیرِ پیش گاه مپرس
ز تنگنای جسد چون برون نهی قدمی
بجز حظیرهٔ قدسی و پادشاه مپرس

زاہلِ فقر و فنا پُرس ذوقِ فقر و فنا
از آنکہ ہست گرفتارِ مال و جاہ مپرس
چو چترِ شاہ عیان گشت طرّۂ تو برخاست
تو شاہ را دگر از لشکر و سپاہ مپرس
چو پا بصدق نہادی و ترکِ سر کردی
اگر کلاہ ربایندت از کلاہ مپرس
چو نیست حالِ من ای دوست بر تو پوشیدہ
دگر چگونگیٔ حالم از گواہ مپرس
گناہِ ہستیٔ او محو کن چو محو توئی
گناہِ ہستیٔ او دیگر از گناہ مپرس
چو مغربی بر تو ای دوست عذر خواہ آمد
بلطف درگذر از جرمِ عذر خواہ مپرس

(۷)

از خانقہ و صومعہ و مدرسہ رَستیم — در کوی مغان با می و معشوق نشستیم
سجّادہ و تسبیح بیکسوی فگندیم — در خدمتِ ترسابچہ زنّار[1] بستیم
در مصطبہ ہا خرقۂ سالوس دریدیم — در میکدہ ہا توبۂ سالوس شکستیم
از دانۂ تسبیح شمردن برہیدیم — وز دامِ صلاح و ورع و زہد بجستیم
در کوی مغان نیست شدیم از ہمہ ہستی — چون نیست شدیم از ہمہ ہستی ہمہ ہستیم

---

[1] زرتشتیوں کے ہاں یہی چیز کُشتی یا گستی کہلاتی ہے؛

زین پس مطلب ہیچ زما دانش و فرہنگ ای عاقلِ ہشیار کہ ما عاشق و مستیم
المنۃ للّٰہ کہ ازین نفس پرستی رستیم بکلّی و کنون بادہ پرستیم
ما مست و خرابیم و طلبگارِ شرابیم با آنکہ چو ما مست و خرابست خوشستیم

تا مغربی از مجلسِ ما رخت بدر برد
او بود حجابِ رہِ ما رفت برستیم

(۸)

قطرۂ از قعرِ دریا دم مزن ذرۂ از مہرِ والا دم مزن
مردِ امروزی ہم از امروز گوی از پری و دی و فردا دم مزن
چون نمی دانی زمین و آسمان بیش ازین از زیر و بالا دم مزن
چون اصولِ طبع موسیقیت نیست از تنا وزنا و تانا دم مزن
در گذر از نفی و اثبات ای پسر ہیچ از الّا و از لا دم مزن
گر بگویندت کہ جان را کن فدا رو فدا کن جانِ خود را دم مزن
تا نمی دانی من و ما را کہ کیست باش خاموش از من و ما دم مزن
ہمچو آدم علمِ اسمار را ز حق تا نگیری ہیچ از اسما دم مزن

آنکہ عینِ جملہ اشیار گشتہ است
مغربی را گفت از اشیار دم مزن

اوپر کے نمونوں سے مغربی کے اندازِ فکر اور طرزِ کلام کا خاصا اچّھا اندازہ ہو جانا چاہئے۔ اصلاً وہ صُوفی شعرار کے اسی گروہ کا رُکن ہے جس سے سنائی، شمسِ تبریز (یعنی مولانا جلال الدین رُومی)، عراقی اور جیساکہ

اُس نے دعویٰ کیا ہے شیخ فریدالدین عطار تعلق رکھتے ہیں ؎

از موجِ او[1] شدہ است عراقی و مغربی
وز جوشِ او سنائی و عطار آمدہ

تاہم گو وہ انہی کا ہم زمرہ ہے بہت کم اُن کی سطح تک پہنچتا ہے ؛

---

(۹) ابو اسحاق (بُسحٰق) عُرف اَطعِمہ

(فخر الدّین احمدِ حلّاجِ شیرازی)

بُسحٰقِ شیرازی گو اس زمانے کے اور بہت سے شاعر ہیں جو تذکرے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ مثلاً عصّار تبریزی، جلالِ عضد، جلال طبیب وغیرہ۔ مگر یہ باب پہلے ہی اتنا طول پکڑ چکا ہے کہ مَیں صرف ایک اَور شاعر یعنی ابو اسحٰق شیرازی کا ذکر کروں گا جو غذاؤں کا شاعر ہے اور اس لئے "اطعمہ" کہلاتا ہے۔ صوفی و ہمہ اوستی شاعر مغربی سے یہ شاعر اتنا تفاوت رکھتا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ؛

حسبِ معمول ابو اسحٰق کے حالاتِ زندگی بھی بہت کم معلوم ہیں بس اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ عُمر کا بیشتر حصّہ اس نے شیراز میں گزارا اور وہاں کے عمائد و اکابر اور بالخصوص تیمور کے پوتے اسکندر ابنِ عمر شیخ میرزا کی عنایات سے بہرہ مند ہُوا۔ جو ۸۱۲ھ سے ۸۱۷ھ (۱۴۰۹ء سے ۱۴۱۵ء) تک

---

[1] یعنی خدا جسے بحرِ وجود سمجھا گیا ہے اور مظاہر گویا اس کی موجیں ہیں ؛

فارس اور اصفہان کا حاکم رہا۔ دولت شاہ نے ابو اسحٰق کیلئے ایک طویل مقالہ وقف کیا ہے۔ لیکن یہ بیشتر اسکے کلام کے اقتباسات اور ان کے علاوہ اس کے مربّی اسکندر کے اولوالعزمانہ منصوبوں اور المناک انجام کی روداد پر مشتمل ہے جو اپنے چچا شاہ رُخ کے حکم سے ۲ر جمادی الاول ۸۱۷ھ (۲۰ر جولائی ۱۴۱۴ء) کو اندھا کر دیا گیا۔ اور اس سے اگلے سال فوت ہؤا۔ ابو اسحٰق جیسا کہ اسکے لقب "حلاّج" سے پتہ چلتا ہے پیشے کا دُھنیا تھا۔ ایک مرتبہ کئی روز تک شہزادہ اسکندر کی مجلس میں حاضر نہ ہؤا جب آیا تو اسکندر نے پُوچھا کہ اتنے دنوں کہاں رہے؟ اس نے جواب دیا ایک روز رُوئی دُھنکتا ہوں اور تین روز ڈاڑھی میں سے رُوئی چُنتا ہوں"۔

ابو اسحٰق کے مختصر مذکورات آتشکدہ، ہفت اقلیم اور مجمع الفصحاء (جلد دوم ص ۱۰) میں دِئے ہیں لیکن دولت شاہ نے تھوڑا بہت جو کچھ درج کیا ہے اس پر یہ مذکورات کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ صرف مجمع الفصحاؔ میں البتہ ایک حکایت درج ہے جس کی رُو سے ابو اسحٰق اپنے تئیں شاہ نعمت اللہ کا مُرید دُمعتقد شمار کرتا تھا۔ شاہ نعمت اللہ

بسحٰق اور شاہ نعمت اللہ کرمانی

ماہان کے ایک صُوفی شاعر تھے۔ یہ کرمان کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں آج بھی ایک خوبصورت روضے کی شکل میں اُن کی یادگار

---

[1] میری ایڈیشن ص ۳۶۶ تا ص ۳۷۱؛

قائم ہے۔ جس کے مجاورین اُن کے بنا کردہ سلسلے کے درویش ہیں۔ ابو اسحٰق کی اس عقیدت وارادت نے عجب مشتبہ صُورت اختیار کی تھی کہ وہ شاہ نعمت اللہ کے عارفانہ کلام کی دُنیا پرستانہ اشعار میں ہزلیہ تعریف کرتا تھا۔ جو طرح طرح کے نفیس کھانوں سے خطاب کئے گئے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کی ایک غزل بالکل مغربی کے رنگ میں ہے اور یُوں شروع ہوتی ہے ؎

گوہرِ بحرِ بیکراں مائیم — گاہ موجیم و گاہ دریائیم
ما بدین آمدیم در دُنیا — کہ خدا را بخلق بنمائیم

بسحاق نے اس کی ہزلیہ تعریف یوں کی ؎

رشتۂ لاکِ معرفت مائیم — گہ خمیریم و گاہ بغرائیم
ما ازآن آمدیم در مطبخ — کہ بما ہیچہ قلیہ بنمائیم

بعد میں جب سید نعمت اللہ کی ابو اسحٰق سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا "کیا تو رشتۂ لاکِ معرفت ہے"؟ اس نے جواب دیا "جب میں اللہ کی باتیں کرنے کا اہل نہیں ہُوں تو نعمت اللہ کی باتیں کرتا ہُوں"[۱]

ابو اسحٰق کی تصانیف کے نسخے عام نہیں ہیں۔ عجائب خانۂ برطانوی میں اس کی ایک تصنیف کنز الاشتہا کا ایک نسخہ موجود ہے۔[۲] مجھ کو ایکدفعہ آنجہانی ڈاکٹر ڈُلف کے کتب خانے میں دیوانِ اطعمہ کے ایک نہایت

---

[۱] مجمع الفصحاء جلد دوم صفحہ ۱؛
[۲] دیکھو ریو کی فہرست مخطوطاتِ فارسی صفحہ ۶۳۴؛

دیوانِ اطعمہ کا نسخہ مملوکہ ڈاکٹر وُلف

اعلیٰ اور بہت مکمل نسخے کا جائزہ لینے کا اتفاق ہُوا۔ ڈاکٹر وُلف کو یہ نُسخہ ایک شخص حاجی عثمان نورالدین نے دیا تھا۔ اُنکے مرنے پر اُن کی وصیت کے مطابق یہ "انجمن تبلیغ مسیحیت در زمرۂ اہلِ یہود[1]" کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کی تاریخِ کتابت سنہ ۹۷۰ھ (۳ - ۱۵۶۲ع) ہے۔ اس میں ۲۲۰۴× ۱۲۰۷ سنٹی میٹر تقطیع کے ۱۶۲ اوراق ہیں۔ نیلی اور طلائی لکیروں کے درمیان باریک تعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اوراق ۸-۱۳۷ اور ۱-۱۶۰ پر کوئی نصف درجن نظمیں مقامی بولی میں ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۴۴ ہے۔ ان تھک فاضل مرحوم

قسطنطنیہ کی مطبوعہ اشاعتِ دیوان

میرزا حبیب اصفہانی نے سنہ ۱۳۰۳ھ (۶-۱۸۸۵ع) میں قسطنطنیہ سے یہ دیوان چھپوا کر نشر کیا۔ اور ہمارے لئے محفوظ کر دیا۔ ورنہ شاید ہی اس کا علم کسی کو رہتا۔ یہ طبع قسطنطنیہ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسکے شروع میں تذکرۂ دولت شاہ سے ذکرِ بسحٰق کا ایک اقتباس ملحق کیا گیا ہے۔ اور آخر میں ان طعامیاتی اصطلاحات و الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو سلسلۂ کلام میں آئی ہیں۔ اور جن میں سے بہت سی آج ایران میں متروک ہیں۔ ان میں اکثر ایسے کھانوں کے نام ہیں جواب تیار نہیں

---

[1] Society for the Propagation of Christianity amongst the Jews.

جانتے ہیں اور جن میں بہتوں کی پوری پوری کیفیت لازم ہے کہ مشکوک رہے گی۔ ابو اسحٰق کے دیوان کا اصل متن کنز الاشتہا سے شروع ہوتا ہے جس کے شروع میں ایک مختصر منثور دیباچہ ہے۔ اسکے بعد نظمیں آتی ہیں جو اکثر ہزلیہ تحریفات ہیں۔ ان میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن (قصیدہ، ترجیع بند، غزل، قطعہ، رُباعی اور مثنوی) کی نمائندگی ہوئی ہے۔ اُنکے آگے ملی جُلی نظم و نثر میں متعدد مقالے ہیں۔ مثلاً "ماجرای برنج و بغرا" "خوابنامۂ بسحٰق" وغیرہ۔ پھر "خاتمۂ دیوان" ہے۔ اور سب سے آخر میں "فرہنگِ دیوان" ہے۔ یہ فرہنگ غلطی سے وہ فرہنگ نہ سمجھ لی جائے جس کا اُوپر ذکر آیا ہے، وُہ تو حسبِ مذکور مرتّبِ دیوان میرزا حبیب نے زیرِ عنوان "تفسیر لغاتِ اطعمہ" اپنی طرف سے شامل کی ہے۔ اُنہوں نے اسی طرح دولت شاہ کے دِئیے ہوئے احوالِ ابو اسحٰق پر اپنے کچھ مشاہدات بھی اضافہ کئے ہیں ان میں وہ دیوانِ اطعمہ کی اس اہمیّت پر زور دیتے ہیں کہ یہ فرہنگ نویسی اور علم اللسان کیلئے بڑے کام کی چیز ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ گو یہ دیوان ایران میں کئی مرتبہ چھپ چُکا ہے لیکن ان تمام اشاعتوں میں اغلاط کی اتنی بھرمار ہے کہ ہر ایک ان میں تقریباً بیکار ہے۔ آگے اضافہ کرتے ہیں کہ قسطنطنیہ میں مجھے اسکے دو نسخوں کا پتہ چلا۔ اور گو وُہ دونوں ناقص تھے لیکن ان سے جو کچھ مَیں نے مرتّب کیا ہے میرے خیال میں خاصا مکمل اور قابلِ اعتبار متن ہے ؂

یہ نظمیں چونکہ ایرانِ قرونِ وسطےٰ کی طُرفہ اور متروک الاستعمال

مطبخی اصطلاحات سے بھری پڑی ہیں اور پھر ان میں جو ظرافت ہے اس کا لطف بھی اسی بات پر منحصر ہے کہ یہ اُن سنجیدہ نظموں کی ہزلیہ تحریفات ہیں جن سے مصنّف کے معاصرین بخوبی آشنا تھے۔ اسلئے ان کا ترجمہ کرنا ممکن نہیں کنز الاشتہا کے دیباچے میں مصنّف کا دعویٰ ہے کہ ایک دوست کی مضمحل بُھوک کے اُبھارنے کو بعینہٖ اسی طرح لکھی گئی جس طرح اس سے سابق تر زمانے میں ازرقی نے اپنے شاہی سرپرست طغانشاہ سلجوقی کی شہوانی رغبت تیز کرنے کو اپنی کتاب "الفیۃ شلفیۃ" تصنیف کی تھی[1]۔ ذیل میں بحذفِ حمدیہ دیباچہ پیش کیا جاتا ہے:۔

امّا بعد چنین گوید (اضعف عباد اللہ الرّزّاق ابو اسحٰق المعروف بحلّاج) دام نعمتہ، در زمانے کہ درخت جوانی سایہ گستر بود و شاخِ شادمانی از میوۂ امانی بارور، سخنی چند علی سبیل الارتجال مناسب ہر مقال دست میداد با خود اندیشہ کردم کہ حکمت آنست کہ سمندِ سخن بطریقی در میدانِ فصاحت رانم و شیلان سخن چنان در خوان عبارت کشم کہ غذا خوارانِ سفرۂ لذّت بنوالۂ ہرچہ تمامتر رسند و ارباب بلاغت در آن حیران مانند تا موجب زیادتی قبول و شہرت گردد و این بیت شنیدہ بودم ؎

---

[1] رک بہ تاریخ ادبیاتِ ایران از راقم۔ جلد دوم ص۳۲۳، اور وہاں جو حوالے دئے ہیں اُن کے علاوہ دیکھئے بہارستانِ جامی۔ طبع قسطنطنیہ ۱۲۹۴ھ۔ ص ۹-۷۸، (روضۂ ہفتم کے آغاز کے قریب)؛ نیز ملاحظہ ہو مجلّۂ آسیائی (Journal Asiatique) بابت ۱۸۲۷ء جلد دہم کے ص ۲۵۵ پر فون ہیمر (Von Hammer) کا ایک نوٹ؛

سخن ہر چہ گویم ہمہ گفتہ اند
بر و بومِ او را ہمہ سفتہ اند

چند روز درین فکر بودم کہ باوجود (اوصاف فردوسی) کہ نمک کلام او چاشنئ دیگ ہر طعام است، و (مثنویاتِ نظامی) کہ نباتِ ابیاتِ او طعمۂ طوطیان شکر زبان است، و (طیّبات سعدی) کہ در مذاقِ اہلِ وفاق بالاتفاق چون عسلِ شیرین است۔ و (غزلیات خواجہ جمال الدین سلمان) کہ در کام اہلِ کلام بمثابۂ شیر و انگبین است۔ و با (دستگاہ طبع خواجوی کرمانی) کہ زیرہ بای بیانش علاج سودا از دکان سلسلۂ سخن است و با (دقایق مقالات عماد فقیہ) کہ نطق شیرین او ادویہ ایست خوشبوی و اشربۂ دلجوی۔ و با (طلاقتِ الفاظ و متانت معانی حافظ) کہ خمریست بے خمار و شرابیست خوشگوار۔ و دیگر شعرا کہ ہر یک شہرۂ شہری و اعجوبۂ دہری بودہ اند من چہ خیال پزم کہ خلایق محظوظ کردند۔ درین اندیشہ بودم کہ بامدادی موافق کہ دود اشتہای صادق از مطبخ معدہ بالا گرفتہ بود چنانچہ معہود می باشد۔ ناگاہ محبوب سیمین بر و مطلوب ماہ پیکر۔ بادام چشم شکر لب ترنج غبغب نار پستان پستہ دہان چرب زبان شیرین بیان ماہی اندام حلوا کلام فندق چال مشکین خال چنانچہ شاعر گوید۔ "بیت"

از خندۂ شیرینِ نمکدانِ دہانش[1]
خون میرود از دل چو نمکسودہ کبابی

---

[1] ملاحت کی نسبت سے دہان کے لئے نمکدان کا استعارہ لایا گیا ہے۔

از در درآمد و گفت که بغایت بی اشتهایم و ممتلی شده ام چاره چیست۔ گفتم چون آنکس که پیش حکیم رفت و گفت عنّین شده ام از برای او "الفیہ و شلفیہ" ساخت چون او بخواند در حال دختر بکر در کنار کشید۔ من نیز از برای تو رسالۂ سفرہ سازم کہ چون یکبار بخوانی اشتہایت پیدا شود۔ پس از برای خاطر او کمر بر میان جان بستم و بآتشِ سعی در دیگِ اندیشہ طعامی بجوائج ترصیع و تصنیع پختم۔ و در تنور تفکر بخمیر مایۂ تدبیر نانی کہ با قرصِ آفتاب در جہانگیری پہلو میزد بستم و در مقام تفاخر میگویم۔ بیت

خوانی کشیدہ ام ز سخن قاف تا بقاف[2]
ہمکاسۂ کجاست کہ آید برابرم

و نام این سفرہ کنز الاشتہا کردم۔ بدان سبب کہ آن روز عیدِ فطر بود و در آن روز اکل و شرب بسیار است۔ و سبب نزول این نسخہ درین قطعہ یاد میشود "قطعہ":۔

(سبب نزول سفرۂ کنز الاشتہا)

گوش و ہوش و دل و جان یک نفسی با من دار
تا بدانی کہ غرض چیست مرا زین اشعار
دلبرے ہست مرا لب شکر و پستہ دہان
گُل رُخ و سَروقد و سیم تن و لالہ عذار

---

[1] دیکھئے حاشیہ ۱ بر صفحہ ۴۷۱ بالا!

[2] کوہِ قاف کو ربعِ مسکون کی حد سمجھا جاتا ہے۔

دوشش آمد ببرم ہمچو مریضے گفتہ
ممتلی گشتہ ام و چارہ بجویم زنہار
اشتہایم نبود ہرچہ مرا پیش آرند
بیم آنست کزین غُصّہ بگردم بیمار
گفتمش این مثلِ اوست کہ عنّین شدہ بُود
رفت و کرد او مرض خود بحکیمی اظہار
آن حکیم از جہتِ رغبتِ شہوت راندن
ساخت الفیہّ و شلفیہّ برای آن یار
چند صورت بقلم کرد و مصوّر زن و مرد
جمع کرد آن زن و آن مرد بشکلِ بسیار
مردِ عنّین چو بدیدش بشدش زود نعوظ
در زمان دخترِ بکری بکشید او بکنار
من دِگر بہرِ تو یک سفرہ بسازم اکنون
کاشتہا آوردت گر تو بخوانی یکبار

پوری نظم دس فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس میں کل ۱۰۸ ابیات ہیں شروع سے اخیر تک وہی قافیہ چلتا ہے۔ دراصل شیخ سعدی کے ایک قصیدہ[1] کی ہزلیہ تحریف ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

بامدادان کہ تفاوت نکند لیل و نہار ۔۔ خوش بود دامنِ صحرا و تماشای بہار

---

[1] ملاحظہ ہو کلیاتِ سعدی۔ طبع کلکتہ، ۱۷۹۵ء۔ جلد دوم۔ اوراق ۲۲۳ تا ۲۲۴؛

تحریف کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بامدادان کہ بود از شبِ مستیم خمار
پیشِ من جز قدحِ بورکِ پرسیر میار

کنز الاشتہا کے بعد شاہ سیف الدین کی مدح میں ایک قصیدہ بعنوان

دیوانِ اطعمہ کے بقیہ مشتملات

"آفاق و انفس" ہے۔ اس کے آگے ظہیر الدین فاریابی، خواجو کرمانی، نجمی، عماد فقیہہ کرمانی، خواجہ حافظ، سلمان ساوجی، حسن دہلوی، مولانا جلال الدین رومی، جلال عضد، صدر الدین قیروانی، کمال خجندی، سعد الدین نصیر، انوری، شیخ فرید الدین عطار، کمال الدین کاشانی، شاہ نعمت اللہ کرمانی، امین الدین محمد جوہری، عراقی، ابو نصرِ فراہی، آذری، عبید زاکانی، جلالِ طبیب، نظامی گنجوی وغیرہ کے قصائدؔ[1] کی ہزلیہ تحریفات ہیں۔ پھر دو منثور رسالے ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی خاتمۂ دیوان اور فرہنگِ دیوان۔ اس کے بعد کھجڑیؔ[2] کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ آخر میں طبخی اور طعامیاتی اصطلاحات و الفاظ کی وہ فرہنگ ہے جو مرتبِ دیوان (میرزا حبیب) نے تیار کر کے اضافہ کی ہے۔ یہ بارہ صفحوں پر شامل ہے *

اوپر جو وجوہات بتائی جا چکی ہیں اُن کی بنا پر ان نظموں کا ایسا ترجمہ کرنا کہ اصل نظموں کے نکات میں سے ایک بھی اس میں برقرار رہے ناممکن

---

[1] صرف قصائد ہی نہیں بلکہ دیگر اصنافِ سخن بھی شامل ہیں۔ (مترجم)

[2] کھچڑی۔ (مترجم)۔

ہے۔ ہمارے مطلب کے لئے اتنی بات ذہن میں رکھنا کافی ہے کہ ابو اسحٰق اپنے پیشرو عبید زاکانی (جس پر اس سے پہلے اس باب میں بحث کی جاچکی ہے) اور اپنے جانشین نظام الدین محمود قاری یزدی کے ساتھ ہجو اور ہزلیہ تحریف کے ایک مخصوص دبستان کی نمائندگی کرتا ہے ؂

---

(۱۰) نظام الدّین محمُود قاری یزدی

جس طرح ابو اسحٰق نے اپنے موضوعِ سخن کے لئے طعامیات کو انتخاب کیا تھا۔ اسی طرح نظام الدین نے لباسیات کو اختیار کیا۔ اس کے

نظام الدّین محمود قاری یزدی

دیوان کی ایک نفیس طبع انہی میرزا حبیب نے نکالی ہے جنھوں نے اس ٹکڑی کے باقی دو شاعروں کے دیوان بھی مدوّن کرکے شائع کئے ہیں۔ یہ تینوں مجلّدات اپنی تقطیع اور انداز میں یکساں ہیں۔ دیوانِ البسہ محمود قاری یزدی کی لباسیاتی نظموں پر مشتمل ہے۔ اسکے شروع میں فاضل مدوّن نے جو دیباچہ الحاق کیا ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ اس طبع کا متن جس نسخے پر مبنی ہے اُن کے خیال میں دُنیا کا واحد نسخہ ہے اور ایران اور قسطنطنیہ کے جتنے کتابخانوں کا اُنھوں نے جائزہ لیا ہے ان میں انہیں اس کا کوئی دُوسرا نسخہ نظر نہیں آیا۔ پھر لکھتے ہیں کہ سوائے ایک ہندوستانی تذکرے کے کسی تذکرے میں اُنہیں مصنّف یا اسکے عہد کا کوئی مذکور نہیں ملا۔ اس تذکرے کا نہ اُنھوں نے نام

بتایا ہے اور نہ اس سے اقتباس کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بتاتے ہیں۔ کہ مشہور فارسی لغات "برہانِ جامع"[۱] میں اس کا ایک شعر بطور استشہاد منقول ہے؛

دیوان البسہ کی تالیف کی تحریک خود باقرارِ مصنّف دیوان اطعمہ سے ہوئی جس کے اسلوب اور ترتیب کی اس میں پوری پوری تقلید کی گئی ہے۔ ایک منثور دیباچہ ہے جو بدقسمتی سے مصنّف کے عہد پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا۔ ایک قصیدہ "آفاق و انفس" ہے۔ ایک رزمیہ انداز کی مضحک نظم بہ عنوان "جنگنامۂ موئینہ و کتّان" ہے۔ "اسرارِ ابریشم" پر ایک نظم ہے۔ پھر اوحدی، خواجو، سعدی، سید حسن ترمذی، سنائی، کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی، ظہیر فاریابی، عماد فقیہہ کرمانی، حافظ، علی دُردزد، کمال خجندی، محمد فیروزآبادی، نیّر کرمانی، سید نعمت اللہ، امیر خسرو، مولانا جلال الدین رُومی، سلمان ساوجی، سید جلال عضد، سعد الدین نصیر، صدر الدین جوہری، امینی، امیر حسن دہلوی جمال الدین، شیخ فرید الدین عطّار، کاتبی، ناصر بخاری، سلطان ابوسعید، ہمام تبریزی، امیر خسرو[۲] دہلوی، درویش اشرفِ نمد پوش، عبید زاکانی اور جلالِ طبیب کے کلام کی ہزلیہ تحریفات ہیں۔ دیوان میں قریب قریب تمام چیدہ اصنافِ سخن کی نمائندگی ہوئی ہے۔ جن میں کچھ نظمیں برا کرتوں کی (یعنی فہلویات اور شیرازیات) بھی شامل ہیں۔ کتاب چند نثریہ رسالوں کے ساتھ

---

۱ یہ اعلیٰ اور مجمل لغات دراصل مشہور تر لغات "برہانِ قاطع" کی تجرید ہے۔ شوال سنہ ۱۲۶۰ھ (اکتوبر۔ نومبر ۱۸۴۴ء) میں تبریز سے اسکی ایک عمدہ سنگی طبع شائع ہوئی؛

۲ امیر خسرو کا نام غلطی سے اس فہرست میں دُہرایا گیا ہے؛ (مترجم)؛

دیوانِ محمود قاری کے دیگر مشتملات

ختم ہوتی ہے۔ یعنی "مناظرۂ طعام ولباس"۔ "صنفت خواب بدن وحمام"۔ "رسالۂ اوصافِ شعراء"۔ "قصۂ دزدِ رخت"۔ "مکتوب صوف باطلس"۔ "عرضداشت دیباجۂ وظیفہ"۔ "فرمان نشان کلاہِ نوروزی"۔ "کتاب التعریفات موسوم بہ دہ فصل"۔ (جیسا کہ نام سے مفہوم ہے اس میں دس فصلیں ہیں)۔ "رسالۂ صد وعظ"۔ مثنوی "مخیل نامہ[1] در جنگ صوف وکمخا" (شاہنامہ کی طرز پر) اور آخر میں البسہ کی ایک فرہنگ۔ مصنّف کے عہد پر واحد دلالت جو مجھے مل سکی ہے معاصر شعراء کی اس فہرست سے حاصل ہوتی ہے جو "رسالۂ اوصافِ

محمود قاری کا عہد تخمیناً

شعراء کے آخر میں درج ہے (متن ۹-۱۳۸)۔ اس میں قاسم الانوار متوفی ۸۳۷ھ (۴-۱۴۳۳ء) - عصمت (بخاری) - متوفی ۸۲۹ھ (۶-۱۴۲۵ء) کاتبی متوفی ۸۳۸ھ (۵-۱۴۳۴ء) - خیالی (بخاری) متوفی نحو ۸۵۰ھ (۷-۱۴۴۶ء) - شاہی متوفی ۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) اور آذری، متوفی ۸۶۶ھ (۲-۱۴۶۱ء) شامل ہیں۔ پس ہم کو لازماً اسی نتیجے پر پہنچنا چاہئے کہ محمود قاری یزدی کا زمانہ تصنیف اخیر الذکر تاریخ سے بعد کا ہے[2]۔ اس لحاظ سے دراصل

---

[1] پروفیسر براؤن نے "مخیط نامہ" لکھا ہے۔ لیکن اُن کے مآخذ یعنی دیوانِ البسہ (یعنی قسطنطنیہ) میں "مخیل نامہ" درج ہے۔ (مترجم)
[2] رسالہ اوصاف شعراء کے آخر کی اس فہرست کے سیاق و سباق میں نظام الدین محمود قاری نے کوئی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے ظاہر ہو کہ جن شاعروں کا وہ ذکر کر رہا ہے ان میں سے ہر ایک یا کم سے کم آخری یعنی آذری وفات پا چکا ہے (باقی حاشیہ سامنے کے صفحے پر)

وہ زیرِ غور عہد سے متأخّر زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ گو یہاں اس کا تذکرہ اس بنا پر مناسب معلوم ہُوا کہ وہ ابو اسحٰق کیساتھ گہری ادبی مشابہت رکھتا ہے۔ اور اپنی تالیف کی تحریک کے لئے بیشتر اسی کا مرہونِ منّت ہے۔ دُوسری طرف سید نعمت اللہ کو جو ان شاعروں میں سے ہیں جن کے کلام کی ابو اسحٰق نے ہزلیہ تحریف کی دراصل اس جگہ شاملِ تذکرہ کیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ وُہ ۸۳۴ھ (۱۴۳۰-۱ع) تک زندہ رہے۔ اور پھر یہ باب پہلے ہی غیر مناسب حد تک طویل ہو گیا ہے۔ اس لیئے میں انکی اور عصمت، کاتبی وغیرہ کی بحث اس کتاب کے ایک متأخّر حصّے پر اُٹھا رکھتا ہوں *

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۸) لہذا پروفیسر براؤن کا یہ نتیجہ کہ دیوان البسہ کا عہدِ تصنیف آخری شاعر یعنی آذری کے سنِ وفات سے بعد کا ہے قابلِ تسلیم نہیں۔ اس فہرست کو دیکھ کر ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ محمود قاری یزدی نویں صدی ہجری کا شاعر ہے۔ (مترجم)

اِس دَور کے عربی نثر نگار

اس دَور کے نثر نگار گو ضروری نہیں کہ اس عہد کے نثاروں پر کم و بیش اسی طول و بسط کے ساتھ بحث کیجائے جس سے شاعروں کے معاملے میں کام لیا گیا ہے تاہم ان میں سے کم سے کم چند ایک نثر نگار زیادہ نہیں تو ایک سرسری تذکرے کے مستحق ہیں۔ ان میں دو ایک ایسے بھی شامل ہیں جن کی نگارشات بیشتر یا تمامتر عربی میں ہیں ؛

تیمور کو مشرق کے ایک اَور ترکی النسل عظیم فاتح محمود غزنوی کی طرح جو اس سے چار سو سال پہلے ہو گزرا ہے اس بات کا بڑا شوق تھا کہ مفتوحہ شہروں[1] سے سربر آوردہ علماء اور فضلاء کو جمع کر کے اپنے پایۂ تخت لے جاتا۔ اور یوں اپنے دربار کی شان و شوکت اور علم و ادب کی سرپرستی میں اپنی نیکنامی بڑھانے کی کوشش کرتا۔ ان لوگوں میں جنہیں وہ یُوں بالجبر ساتھ لے گیا مشہور ترین شخص سعد الدین تفتازانی اور السید الشریف الجرجانی[2] ہیں ؛

---

[1] محمود غزنوی کے اس شوق کے مظاہرے کی ایک مثال آپ کو چہار مقالہ (سلسلہ یادگار گب ۱۱) میں ملے گی۔ (ص ۷۶ بعد)

[2] ملاحظہ ہو حبیب السیر (جلد سوم۔ جزو سوم۔ ص ۸۷ تا ص ۹۰) جس میں الجرجانی پر ایک طویل مذکور وقف کیا گیا ہے ؛

(صفحات کا حوالہ غلط ہے یہ مذکور ص ۸۹ پر شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ مترجم) ؛

(۱) سعدالدّین مسعود ابن عُمر التفتازانی

سعدالدّین التفتازانی

اس فاضلِ ممتاز کے بارے میں ماوراء النّہر کے معاصر علماء نے کہا تھا کہ "حالا سرآمد علمای عالم و مقتدای فضلای بنی آدم است"[۱]۔ بروکلمن[۲] نے اس کی سولہ تصانیف شمار کی ہیں۔ ۷۲۲ھ (۱۳۲۲ء) میں خراسان کے شہر نساء کے پاس تفتازان کے مقام پر متولد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی پہلی کتاب (الزنجانی کی صرف کی ایک شرح) سولہ برس کی چھوٹی عمر میں لکھی۔ اس کی ایک اَور تصنیف المطوّل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ملک معزّالدین کرت کے نام معنون کی جو ۱۳۳۱ء سے ۱۳۷۰ء تک ہرات کا حکمران رہا۔ پھر اُس نے خوارزم میں سکونت اختیار کی کہ اس زمانے میں علم و فضل کا بھاری مرکز تھا۔ یہاں اُس نے اپنی المختصر تصنیف کی۔ اور اُردوئے زریں[۳] کے فرمانروا جانی بیگ خان کے نام معنون کی جو مغول شہنشاہ باتو کے اخلاف میں سے تھا۔ اور ۱۳۴۰ء سے ۱۳۵۷ء تک مغربی قبچاق میں حکومت کرتا رہا۔ تیمور نے جب خوارزم پر قبضہ کیا تو مذکورہ بالا ملک معزّالدین کے سب سے چھوٹے بیٹے ملک محمد والیٔ سرخس کو اجازت دے دی کہ تفتازانی کو سرخس لے جائے۔ وہاں اسے معلّم کا منصب تفویض

---

[۱] حبیب السیر۔ جلد سوم۔ جزو سوم۔ ص۸۸۔ (مترجم)؛

[۲] تاریخ ادبیاتِ عرب۔ جلد دوم۔ ص ۲۱۵-۶؛

[۳] رک بہ حاشیہ [۱]، ص ۹۴ بالا۔ (مترجم)؛

ہؤا۔ لیکن بعد میں جب تیمور کو معلوم ہؤا کہ بہ حیثیت فاضل اس کی شہرت کس درجے کی ہے تو اسے خود اپنے دار السلطنت سمرقند بُلوا لیا۔ جہاں وُہ چند سال مقیم رہا۔ اور سب نے اُس کی بڑی تعظیم کی۔ اس کی وفات ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں (کہ خواجہ حافظ کا بھی سالِ وفات ہے) یا اَوروں کی روایت کی رُو سے ۷۹۷ھ (۵-۱۳۹۴ء[1]) میں واقع ہوئی۔ سرخس میں دفن ہؤا۔ ایک فرزند "مولانا محمد" نام چھوڑ مرا جو ۸۳۸ھ (۵-۱۴۳۴ء) میں ہرات کی وبائے طاعُون کا شکار ہؤا۔ حبیب السیر میں اس بیٹے کا ایک قصہ نقل ہے جو اس کی فرزندانہ سعادتمندی یا خلوصِ نیّت پر دال نہیں ؛

تفتازانی کی تصانیف کا تفصیلی تذکرہ غیر ضروری ہے۔ نہ صرف اسلئے کہ وہ عربی میں ہیں بلکہ اس سبب سے بھی کہ وہ خالص ادبی نوعیّت کی چیزیں نہیں ہیں۔ کیونکہ اکثر ان میں منطق، عربی صرف و نحو، فلسفہ، علمِ دین، تفسیر اور فقہ کی کتابیں ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے فارسی میں بھی کچھ لکھا یا نہیں۔ البتّہ اس نے ترکی نظم میں بوستانِ سعدی کا ایک ترجمہ کیا۔ جس کی بنا پر آنجہانی مسٹر گب نے اسے اپنی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ[2]" میں شامل کیا ہے ؛

---

[1] مجملِ فصیحی کی رو سے ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) ؛

[2] History of Ottoman Poetry - جلد اوّل۔ ص ۳-۲۰۲ ؛

(۲) علیؔ ابن محمّد السیّد الشریف الجرجانی

السیّد الشریف الجرجانی السیّد الشریف یورپی علماء میں زیادہ تر اپنی کتاب "تعریفات" کے ذریعے معروف ہے جو مصطلحات اور خصوصاً صوفی اصطلاحات کی تعریفات پر مشتمل ہے۔ ۷۴۰ھ (۱۳۳۹ء) میں جیسا کہ اس کی نسبت الجرجانی سے پتہ چلتا ہے بحرِ خزر کے ساحلی صوبہ گرگان یا جرجان میں استر آباد کے پاس پیدا ہؤا۔ ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں یہ سعدالدین تفتازانی نے اسے مظفرّی سلطان شاہ شجاع کے حضور میں پیش کیا جو اس وقت قصرِ زرد میں مقیم تھا۔ جاتا ہؤا الجرجانی کو شیراز لے گیا۔ وہاں اسے دارالشفا میں اُستاد مقرر کیا۔ ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں تیمور نے شیراز فتح کیا تو اسے سمرقند بھجوا دیا۔ جہاں پھر اسے تفتازانی کے ساتھ یکجائی نصیب ہوئی۔ اور دونوں میں بہت سے علمی مناظرے ہوئے۔ ۸۰۷ھ (۱۴۰۵ء) میں تیمور کے مرنے پر واپس شیراز آ گیا۔ یہاں ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) میں ۷۶ سال کی عمر پاکر فوت ہؤا۔ بروکلمن[۱] نے اس کی ۳۱ تصنیفات شمار کی ہیں جو عربی میں ہیں۔ تین فارسی کتابیں جو اس کی لکھی ہوئی ہیں یا اس کی طرف منسوب ہیں ریو کی فہرست مخطوطاتِ فارسی میں مذکور ہیں[۲]۔ ان میں عربی صرف کی ایک مشہور کتاب معروف بہ "صرفِ میر" ہے۔ منطق کا ایک رسالہ "الکبری

---

[۱] تاریخ ادبیاتِ عرب جلد دوم ص ۲۱۶-۷، نیز ملاحظہ ہو حبیب السیر جلد سوم جزو سوم صفحہ ۸۹؛

[۲] صفحہ ۵۲۲، صفحہ ۸۱۲، صفحہ ۸۶۴، وغیرہ؛

فی المنطق" ہے۔ اور ایک رسالہ "مراتب موجودیت" پر ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی مادری زبان میں بہت کم لکھا؛

---

(۳) ابنِ عربشاہ

ابنِ عربشاہ ایک تیسرا قابلِ اعتنا لیکن دوسروں کی نسبت بہت کم عمر مصنف جسے تیمور اس کے وطن (دمشق) سے بالجبر اپنے ساتھ لے گیا ابو العباس احمد ابنِ محمد ابن عبد اللہ ابنِ عربشاہ ہے۔ اس وقت یعنی ۸۰۳ھ (۱۴۰۰ء) میں جب وہ والدہ اور بھائیوں سمیت سمرقند لیجایا گیا اس کی عمر صرف بارہ برس تھی۔ اس کی شہرت کا زیادہ تر مدار تیمور کی سوانحعمری پر ہے جو اُس نے "عجائب المقدور فی نوایبِ تیمور" کے عنوان سے تصنیف کی اور جس میں اُس نے تیمور کے خلاف معاندانہ تلخ بیانی سے کام لیا ہے۔ اس کتاب کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے[۱]۔ ابنِ عربشاہ نے سمرقند میں صاحبِ موصوف الجرجانی سے تعلیم پائی۔ ترکی اور فارسی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی۔ سعد الدین وراوینی کی کتاب "مرزبان نامہ"[۲] کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ دُور دُور کی

---

[۱] ملاحظہ ہو بروکلمن کی تاریخ ادبیاتِ عرب۔ جلد دوم۔ ص ۲۸ تا ص ۳۰ جہاں اس کی پانچ تصانیف کی کیفیت بیان کی گئی ہے؛

[۲] اس کتاب کی ایک عمدہ اور ناقدانہ طبع مرتبہ میرزا محمد قزوینی "سلسلۂ مطبوعہ یادگارِ گب" میں شائع ہوئی ہے (سلسلہ ۸۔ ۱۹۰۹ء)؛

سیاحت کی۔ اس دوران میں خطا (تاتار چینی)، خوارزم، دشت، استراخان اور ادرنا کی سیر کی۔ ادرنا میں کچھ مدت کے لیے عثمانی سلطان محمد اول کا دبیرِ خاص ہو گیا۔ ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اپنے مولد دمشق واپس آ گیا۔ اس کے سات سال بعد حج کیا۔ ۸۴۰ھ (۱۴۳۶ء) میں قاہرہ جا رہا۔ اور ۸۵۴ھ (۱۴۵۰ء) میں وفات کر گیا۔ اس کی تاریخ کے ایک ایک صفحے پر تیمور سے کھُلم کھُلا نفرت آشکار ہے۔ شرف الدین علی یزدی اور دیگر ایرانی سیرت نگاروں کی مبالغہ آمیز اور ملال انگیز خوشامد اور مدح سرائی سے یہ نفرت دلچسپ تفاوت رکھتی ہے۔ ابنِ عربشاہ کی باقی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "فاکہۃ الخلفا" ہے۔

---

(۴) عضد الدّین الایجی

اس دور کے ایسے عربی مصنّفین پر میں کچھ نہ کہوں گا جنہیں ایران سے کچھ تعلق نہ تھا۔ مثلاً الیافعی اور الصّفدی کہ مفید سیرتی اور تاریخی اطلاعات کے لیے ہم ان دونوں کے رہینِ منّت ہیں۔ لیکن دو اور عربی نگار ایرانی

عضد الدین الایجی

کم سے کم ایک مختصر تذکرے کے مستحق ہیں۔ ان میں پہلا عضد الدین عبدالرحمٰن ابن احمد الایجی ہے۔ جو ۷۵۶ھ (۱۳۵۵ء) میں فوت ہوا۔ اس نے عربی میں فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی مضامین پر بہت سی کتابیں[۱] لکھیں جنمیں "المواقف" سب سے زیادہ مشہور

۱؎ بروکلمن (تاریخ ادبیاتِ عرب۔ جلد دوم ص ۲۰۸-۹) گیارہ تصانیف شمار کرتا ہے؛

ومقبول ہے۔ لیکن یہاں ہم نے اس کا ذکر خاص طور پر اس رابطے کے سبب کیا ہے جو اسے مظفّری سلاطین سے تھا۔ کیونکہ گو اس کا مقامِ پیدائش فارس کا قصبہ ایج ہے جو داراب جرد اور نیریز کے درمیان واقع ہے[1]۔ لیکن بظاہر اس نے اپنی مادری زبان میں کچھ نہیں لکھا یا لکھا تو بہت ہی کم۔ ہم اُوپر دیکھ آئے ہیں[2] کہ خواجہ حافظ نے اسے شیراز کے سب سے بڑے علمی زعماء میں شمار کیا ہے۔ وہ ایک شافعی فقیہہ اور متصوّف تھا۔ لیکن بعض اوقات سفارت کے فرائض پر بھی مامور ہوا۔ فارس نامۂ ناصری سے ہمیں پتہ چلتا ہے[3] کہ ۷۵۳ھ (۳-۱۳۵۲ء) میں وہ شیخ ابو اسحٰق کی طرف سے جو اُن دنوں حاکمِ شیراز تھا امیر مبارز الدّین محمد مظفری کی جانب بھیجا گیا کہ اُسے شیراز پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ مبارز الدین اس وقت کرمان کے نواح میں تھا۔ اس سفارت میں اسے ناکامی ہوئی گو مبارز الدین اس سے اچھی طرح پیش آیا۔ اپنے پیدائشی مقام ایج میں تین روز اُسے امیر کی ضیافت کرنی پڑی۔ امیر کے فرزند شاہ شجاع کو "المفصّل" (عربی نحو کی ایک مشہور کتاب مصنّفہ الزمخشری) پڑھ کر سُنانے اور اس کی شرح سمجھانے کا

---

[1] ملاحظہ ہو مسٹر سٹرینج (G. le Strange) کی کتاب (Lands of the Eastern Caliphate) ص ۲۸۹؛

[2] صـ ۳۹۹ بالا اور اسکے حاشیۂ زیریں [1] کی طرف رجوع کیجئے؛

[3] صوبۂ فارس کے حالات کا یہ جامع اور مفصّل بیان جو بڑی تقطیع کے کوئی ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے طہران سے ۱۳۱۳ھ (۶-۱۸۹۵ء) میں بچاپ سنگی شائع ہوا؛

اعزاز حاصل ہُوا۔ یہی شاہ شجاع آگے چل کر شیراز کا حکمران ہُوا۔ اور کبھی خواجہ حافظ کا مربّی اور کبھی حریف رہا ؂

---

(۵) الفیروز آبادیؔ

ایک اَور ایرانی فاضل جس نے تیمور سے ملاقات کی اور اسکی عنایات سے فیضیاب ہُوا مشہور عربی عالم اور لُغت نویس ابو الطاہر محمد ابن یعقوب الشیرازی الفیروز آبادی[1] ہے۔ جس کی سب سے زیادہ شہرت اپنی معرکۃ الآرا لغات القاموس کے مصنّف کی حیثیت سے ہے۔ فارس میں فیروز آباد کے مقام پر ۷۲۹ھ (۱۳۲۶ء) میں پیدا ہُوا۔ پہلے اُس نے شیراز میں تعلیم پائی۔ پھر عراق کے شہر واسط میں پھر بغداد میں (۷۴۵ھ مطابق ۱۳۴۴ء) اور اس کے بعد (۷۵۰ھ = ۵۰-۱۳۴۹ء) دمشق میں۔ یہاں السبکی کے درس میں حاضر ہوتا

الفیروز آبادی

فیروز آبادی کی وسیع سیاحتیں

---

[1] ملاحظہ ہو بروکلمن۔ تاریخ ادبیاتِ عرب جلد دوم۔ ص ۳-۱۸۱۔ یہاں جو اطلاعات دی جارہی ہیں اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ الفیروز آبادی کا ذکر الخزرجی کی تاریخ یمن میں بھی چھ یا سات جگہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو عربی متن (سلسلۂ یادگارِ گب۔ ۳ جلد پنجم) کا نصفِ ثانی۔ ص ۵-۲۶۴، ص ۲۷۸، ص ۲۸۶، ص ۲۹۰، ص ۲۹۷، ص ۴-۳۰۳۔ جہاں ۷۹۶ھ (۱۳۹۳ء) سے لیکر ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء و ۱۴۰۰ء) تک ہر سال میں اس کا ذکر کیا گیا ہے؛

رہا اور پھر اسکے ہمراہ بیت المقدس چلا گیا۔ وہاں دس سال خود درس و تدریس میں مشغول رہا۔ اسکے بعد پھر سیر و سیاحت کو نکل کھڑا ہوُا۔ اور اسکے دوران میں رُوم۔ قاہرہ اور مکہ میں وارد ہوُا۔ مکہ ۷۷۰ھ (۱۳۶۸ء) میں پہنچا۔ وہاں پندرہ سال قیام کیا۔ پھر ہندوستان گیا۔ وہاں دہلی میں پانچ سال گذارے۔ دوبارہ مکہ کا رُخ کیا۔ اور دس سال اَور وہاں بسر کئے۔ ۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں بغداد جا کر جلائر سلطان احمد ابن اویس کے دربار میں پہنچا۔ اور شیراز میں (غالباً ۷۹۵ھ = ۱۳۹۳ء میں) تیمور کے حضور میں بھی حاضر ہوُا۔ تیمور اس کیساتھ بڑی عزّت سے پیش آیا۔ یہاں سے خلیج فارس میں ہرمز کی راہ یمن کو روانہ ہوُا۔ اگلے سال (۷۹۶ھ = ۱۳۹۴ء میں) وہاں پہنچا۔ پندرہ ماہ تک تعزّ میں مقیم رہا۔ اس کے بعد یمن کا قاضی القضاہ بنا دیا گیا۔ اور

یمن میں اُس کی بلند حیثیت

سلطان الملک الاشرف نے اپنی دُختر اس کے عقد میں دے دی ۸۰۲ھ (۱۴۰۰ء) میں پھر مکہ پہنچا۔ وہاں اُس نے مالکی فقہ کا ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا۔ پھر المدینہ کی زیارت کرنے کے بعد واپس یمن کے شہر زبید میں چلا آیا۔ یہاں ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں فوت ہو گیا۔

اوپر جن پانچ عربی مصنّفوں کا ذکر ہے ان میں سوائے عرب شاہ کے (جسے تیمور سے وابستہ ہونے کے سبب شامل کیا گیا ہے) سب کے سب ایرانی تھے۔ ان دلائل کے مدّنظر جو مَیں نے ایک اور[۱] جگہ بیان کی ہیں میرے

۱؎ تاریخ ادبیاتِ ایران جلد اول ص ۷-۴۴۵؛

خیال میں ایرانی ادب کی کوئی تاریخ جو اپنے آپ کو فارسی نگارشوں تک محدود رکھے۔ اور ایرانیوں کی بے اندازہ مفید عربی تصنیفات کو نظر انداز کرے نہ حدودِ موضوع کے لحاظ سے کافی ہے اور نہ اس ہنرمند قوم کے حق میں انصاف پر مبنی ہے ؎

اِس دَور کے فارسی نثر نگار

بمقابلہ شاعروں کے قابلِ ذکر نثر نگاروں کے اعتبار سے زیر نظر زمانہ کہیں کم مایہ ہے۔ اور ہمیں چار پانچ سے زیادہ پر غور کرنے کی ضرورت نہیں

(۱) شمس الدّین محمّد ابنِ سعید فخر اصفہانی

پہلا نثر نگار جو ذکر کا مستحق ہے شمسِ فخری ہے جس کا پُورا نام اُوپر درج ہے۔ اس نے ۷۴۵ھ (۱۳۴۴ء) میں فارسی زبان پر ایک نہایت اعلیٰ کتاب "معیارِ جمالی" کے نام سے لکھی اور محبوبِ خلایق اور لائق لیکن بدنصیب سلطان شیخ ابو اسحٰق انجو کے نام معنون کی

شمسِ فخری

کتاب حسب ترتیب ذیل چار حصّوں میں تقسیم ہے :-

حصّۂ اوّل۔ نو ابواب میں۔ شاعری اور عروض کے بیان میں ؛

۱؎ رک بہ صفحہ ۲۴۲ بالا ؛

حصّۂ دوم۔ پانچ ابواب میں۔ قافیہ۔ مختلف اصنافِ سخن وغیرہ کے بیان میں؛

حصّۂ سوم۔ صنائع۔ بدائع۔ تشبیہہ واستعارہ وغیرہ کے بیان میں؛

حصّۂ چہارم۔ زبانِ فارسی۔ اس کے نادر اور متروک الاستعمال الفاظ وغیرہ کے بیان میں؛

چوتھا حصّہ جو ماہرینِ لسانیات کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا حامل ہے ۱۸۸۵ء میں کارل سالمان[1] نے کازان سے طبع کراکر شائع کیا۔ میرے پاس پوری تصنیف کا ایک نسخہ موجود ہے جس میں صرف شروع کا ایک ورق غائب ہے۔ یہ نسخہ اگست ۱۹۰۹ء میں میرے دوست ڈاکٹر رضا توفیق نے مجھے دیا تھا۔ تاریخ تصنیف گیارہ ابیات کی ایک نظم کے اشعارِ ذیل میں درج ہے جو "ابن محمود شاہ" (یعنی شیخ ابو اسحٰق اِنجو) کی مدح میں لکھی گئی ہے ؎

بفرمانِ دارای خورشید وماہ — بنامِ شہنشاہِ گیتی پناہ

زہجرت شدہ ہفصد وپنج وچل — ربیعِ دوم اوّلِ مہر ماہ

شد این درج پر درج گوہر تمام — کزو فاضلان را بود آب وجاہ

غیر مانوس فارسی الفاظ جو اس چوتھے حصّے میں سمجھائے گئے ہیں اپنے آخری حرف کے لحاظ سے الگ الگ مجموعوں میں مرتّب کئے گئے ہیں۔ ہر مجموعے کے لئے مصنّف کے شاہی سرپرست کی مدح میں ایک قصیدہ

---

[1] Carl Salemann

تیار کیا گیا ہے جس میں مجموعے کے الفاظ بطور قافیہ لائے گئے ہیں۔ کتاب کے پہلے تین (غیر مطبوعہ) حصّے گو اچھے ہیں لیکن چوتھے کی نسبت کم افادہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ جو موضوعات ان میں لئے گئے ہیں۔ اُن پر قدیم تر کتب مثلاً شمسِ قیس کی "معجم فی معاییر اشعار العجم"[1] اور رشید الدین وطواط کی "حدائق السحر" میں زیادہ مفصّل و مکمّل طور پر بحث کی جاچکی ہے ؛

(۲) معین الدّین یزدی

اس مصنّف کے جو کچھ حالات معلوم ہیں تقریباً سب ریو نے "مواہبِ الٰہی" کے نسخہ عجائب خانہ برطانوی کی کیفیت کے ضمن میں درج کر دئے ہیں[2]۔ "مواہبِ الٰہی" آلِ مظفّر کی تاریخ کا ایک رسالہ ہے جس میں اس خاندان کے حالات آغاز سے لیکر اس جنگ تک لکھّے گئے ہیں جو بہ ۷۶۷ھ (۶-۱۳۶۵ء) شیراز میں شاہ شجاع اور اُس کے حریف بھائی شاہ محمود کے درمیان ہوئی۔ معین الدین کے ہم شہر مفید نے اپنی کتاب جامع مفیدی[3] میں (جو ۱۰۸۲ھ اور ۱۰۹۰ھ = ۱۶۷۱ء اور ۱۶۷۹ء کے درمیان تصنیف ہوئی) اسے اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم کہا ہے۔ اس

آلِ مظفّر کی تاریخ مصنّفہ معین الدّین یزدی

---

[1] سلسلۂ مطبوعاتِ یادگارِ گب میں شائع ہو چکی ہے۔ سلسلہ نمبر ۱۰ (۱۹۰۹ء)؛

[2] فہرستِ مخطوطاتِ فارسی۔ ص ۹-۱۶۸؛

[3] رک بہ فہرستِ مخطوطاتِ فارسی مرتبہ ریو۔ ص ۸-۲۰۷؛

کے درس میں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔ اور گاہ گاہ ان میں اس کے مربی شاہ شجاع مظفری نے بہ نفسِ نفیس تشریف لاکر اسے مشرف کیا۔ شاہ شجاع ہی کی تحریک اور ہمت افزائی اور اس کے باپ مبارزالدین محمد کی تائید پر معین نے اصفہان میں بہ ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) اپنی تاریخ لکھنی شروع کی۔ گو اس کی تکمیل جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے دس برس بعد جاکر ہوئی۔ اس کی تاریخ کی ایک تلخیص کی رُو سے جو تاریخ گزیدہ کے بعض نسخوں میں ملحق ہے[1]۔ اس سے دو سال قبل یعنی ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں وہ کرمان کی ایک درس گاہ میں اُستاد مقرر ہؤا تھا۔ اس کی وفات ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں ہوئی ؂

مواہب الٰہی کے میرے پاس دو نسخے موجود ہیں جو میں نے آنجہانی سرہاؤٹم شنڈلر کے کتب خانے سے حاصل کئے[2]۔ اسکے علاوہ کیمبرج کے دارالآثار فٹس ولیم[3] کا ایک نسخہ بھی میری دسترس میں ہے۔ کتاب نہایت مایوس کُن ہے۔ اور ریو نے بہت بجا کہا ہے۔ کہ تاریخ وصاف کی طرح زیادہ تر "لفاظی کی نمائش کی غرض سے" لکھی گئی ہے۔ واقعی اس کتاب میں ناقابلِ برداشت

---

[1] یہ تلخیص جو محمود گُتبی (؟) نام ایک شخص کے قلم سے ہے اس نسخے میں شامل ہے جس کی طبعِ عکسی سلسلہ یادگارِ گِب میں نشر ہوچکی ہے (سلسلہ نمبر ۱۴۔ جلد اول ص ۶۱۳ تا ص ۷۵۵ اور جلد دوم ص ۱۵۱ تا ص ۲۰۷)؛ [2] ان نسخوں کی فہرست مرتّبۂ راقم مجلۂ انجمنِ ہمایونی ایشیائی بابت اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ملاحظہ فرمائیے۔ ص ۱-۶۷؛

[3] Fitzwilliam Museum

حد تک بیجا طمطراق اور عبارت آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ اگر کتاب کی منقولہ معلومات کا مفید ہونا مسلّم نہ ہوتا تو ہم یہ نقص معاف کرنے کو زیادہ آسانی سے تیار ہو جاتے۔ خوش قسمتی سے اسکے مندرجات کی آسان اور سادہ تلخیص نے جس کا ذکر پچھلے پیرے میں کیا گیا ہے بڑی حد تک ہمیں اسے غیر ملخّص شکل میں پڑھنے کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا ہے ؞

---

(۳) شیخ فخر الدّین ابو العبّاس احمد الشیرازی

شیراز نامہ یہ مصنّف مشہور شیخ زرکوب شیرازی کا پوتا ہے۔ اپنے ایک رسالہ موسوم بہ "شیراز نامہ" کی بنا پر ذکر کا مستحق ہے۔ یہ رسالہ اس نے اپنے وطن شیراز پر ۷۴۴ھ (۴-۱۳۴۳ء) میں تصنیف کیا۔ ریو نے اس کی کیفیت بیان کی ہے[1]۔ اب تک کہیں شائع نہیں ہوا[2]۔ اس کے نسخے کمیاب ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ کتاب کے سیرتی حصّے میں مصنّف نے اپنی توجّہ شاعروں کی نسبت مشایخ اور اولیاء پر بہت زیادہ وقف کی ہے ؞

---

[1] فہرست مخطوطاتِ فارسی ص ۵-۲۰۴؛

[2] مطبعہ روشنائی طہران سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا ہے؛ (مترجم)

(۴) مولانا نظام الدین شامیؔ[1]

مغول شاہ غازان خان نے تبریز سے جنوب مغرب میں دو میل کے فاصلے پر اپنے لئے ایک مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ جس کا نام شنبِ غازان تھا۔ اُس کی نسبت سے یہ مصنّف شنب غازانی کہلاتا ہے[2]۔ خاص طور پر اس حیثیت سے قابلِ توجّہ ہے کہ اس نے تیمور کی جو تاریخ لکھی جہاں تک معلوم ہے فاتح کی واحد تاریخ ہے جو اس کے حینِ حیات میں لکھی گئی۔ اس تاریخ کا عنوان شرف الدین علی یزدی کی متأخّر اور بہت زیادہ مشہور کتاب کی طرح ظفر نامہ ہی ہے بے حد نایاب ہے۔ اس کا واحد نسخہ جو میرے علم میں ہے عجائب خانۂ برطانوی کا نسخہ[3] ہے۔ اس کی ایک نقل میرے پاس ہے جو میرے دوست

نظامِ شامی۔ تیمور کا سب سے پہلا مؤرّخ

---

[1] شام شہر تبریز کے مضافات میں سے ایک جگہ ہے۔ ملاحظہ ہو گائی لوسٹرینج G. le Strange کی کتاب "ممالکِ خلافتِ شرقیہ" (Lands of the Eastern Caliphate) صفحہ ۱۶۲ (مترجم)

[2] "شنب" گنبد کا مترادف ہے۔ شنبِ غازان غالباً تبریز کی آبادی کے اس حصّے کا نام ہے۔ جو غازان خان کے متذکرہ بالا مقبرے کے اردگرد پیدا ہوا۔ ریو نے فہرستِ مخطوطاتِ فارسی میں (صفحہ ۱۷۰) "شنب غازانی" کی نسبت پر مفصّل بحث کی ہے۔ اور حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ مطلع السعدین اور ظفر نامۂ شرف الدین علی یزدی میں مولانا نظام الدین کی نسبت "شنبی" بھی لکھی گئی ہے؛ (مترجم)؛

[3] Add. 23,980

ڈاکٹر احمد خان صاحب نے مجھے تیار کر کے دی۔ نظام شامی کے جو کچھ حالات ہم جانتے ہیں بیشتر ان ضمنی بیانات سے ماخوذ ہیں جو اس کی تاریخ میں ایراد ہوئے ہیں اور جن میں کچھ اس کے جانشین شرف الدین، عبدالرزاق[1]، میر خواند اور خواند میر نے نقل کئے ہیں۔ مصنّف کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے ریو نے بوجہ احسن اس کا خلاصہ کر دیا ہے[2]۔ تیمور نے ۷۹۵ھ (۳-۱۳۹۲ء) میں جب بغداد فتح کیا تو نظام شامی وہیں تھا اور ان اشخاص میں سے تھا۔ جو سب سے پہلے فاتح کے حضور میں اظہارِ تسلیم و بندگی کرنے نکلے۔ تیمور اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آیا۔ تاتاری حملے کے بارے میں وہ اپنے تأثّرات بیان کرتا ہے۔ ۸۰۳ھ (۱-۱۴۰۰ء) میں وہ قلعۂ حلب میں نظر بند رہا۔ قلعے پر ایک حملے کا حال لکھتا ہے جو اس نے خود مشاہدہ کیا۔ ۸۰۴ھ (۲-۱۴۰۱ء) میں تیمور نے اسے حضوری میں طلب کیا۔ اور اپنے عہدِ حکومت اور اپنی فتوحات کی تاریخ ضبطِ تحریر میں لانے کا حکم دیا۔ تمام ضروری دستاویزیں یادداشتیں اور سرکاری کاغذات اس کے لئے مہیّا کئے[3]۔ اور اسے خاص طور پر حکم دیا کہ اس تصنیف کی عبارت میں طمطراق اور لفّاظی سے احتراز کیا جائے۔ اور سیدھے سادے انداز میں سب کچھ لکھا ہو۔ کہ

---

[1] مطلع السعدین میں؛ [2] فہرستِ مخطوطاتِ فارسی ص ۲-۱۷۰ و ص ۱۰۸۱، ص بالا کے ساتھ مقابلہ کیجئے؛ [3] جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس جگہ تیمور کی نام نہاد "تزکات" کا ذکر نہ ہونا اس بات کے خلاف محکم ترین دلائل میں سے ہے۔ کہ یہ تیمور کی تصنیف ہے۔ ملاحظہ ہو اوپر ص ۳-۲۷۲؛

معمولی آدمی بھی سمجھ سکے۔ عید الفطر ۸۰۶ھ (۱۲ اپریل ۱۴۰۴ء) کو اُس نے اردبیل کے پاس تیمور کی خیمہ گاہ میں اس کے سامنے خطبہ[۱] دیا۔ اس کے بعد جلد ہی تیمور نے اپنے دار السلطنت سمرقند کی جانب کُوچ کیا اور نظامِ شامی کو واپس اپنے وطن (بظاہر تبریز) چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اور اسے اپنے پوتے امیر عمر بہادر (پسر میراں شاہ کے نام سفارشی خطوط لکھ دیئے۔ جو ان ہی دنوں ایران کا والی مقرر ہوا تھا۔ اور اس منصب پر ۸۰۸ھ (۶-۱۴۰۵ء) تک فائز رہا۔ جب کہ اس کے بھائی امیر ابوبکر نے اسے نکال کر اس کی جگہ لے لی ؛

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تاریخ ۸۰۶ھ (۱۴۰۴ء) سے آگے نہیں چلی۔ جبکہ تیمور اپنی آخری گرجستانی مہم کے بعد قلیل وقفہ آرام کر کے اپنے دار السلطنت سمرقند کی طرف آخری واپسی سفر پر روانہ ہوا۔ جہاں سے ۸ دسمبر ۱۴۰۴ء کو چین کی مجوّزہ مہم پر نکلا۔ یہ مہم ۱۹ مارچ ۱۴۰۵ء کو تیمور کے مرجانے سے ناتمام رہ گئی۔ پس فاتح کی زندگی کے آخری سال کے حالات نظام شامی کی تالیف میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن ان کی اطلاع کے لئے اس تالیف کی ہم عنوان تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو ۸۲۸ھ (۵-۱۴۲۴ء) میں لکھی گئی اور جس کا مصنّف شرف الدین علی یزدی اس کے تیس سال بعد فوت ہوا۔ اس لحاظ سے

متأخّر ظفر نامہ مؤلّفہ شرف الدین علی یزدی

---

[۱] ملاحظہ ہو ظفر نامۂ شرف الدین علی یزدی۔ طبع کلکتہ۔ جلد دوم۔ ص۵۷۱، (مترجم)!

شرف الدین گو دراصل اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جس پر اگلے باب میں بحث ہوگی۔ لیکن اگر ہم اصلی ظفرنامے کے مصنف نظام شامی کے سلسلۂ ذکر کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی یہیں کردیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ متأخر ظفرنامہ دراصل متقدم ہی کی ایک پرتکلف اور لفاظانہ توسیع ہے۔ بہت سے مزید اشعار سے آراستہ ہے اور ضخامت میں اس سے کم وبیش ڈیوڑھی ہے *

شرف الدّین علی یزدی

اس مؤرّخ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے خواہ اس کے اپنے بیانات کے ذریعے یا جامع مفیدی، مطلع السعدین، ہفت اقلیم[1]، تاریخِ رشیدی حبیب السیر[2]، لطایف نامہ، تذکرۂ دولت شاہ[3] وغیرہ کتابوں سے، حسبِ معمول ریو نے نہایت قابلِ ستائش طریقے سے اس کا خلاصہ کردیا ہے[4]۔ دولت شاہ کے ہاں اس کا مذکور ایک شاعر کی حیثیت سے آیا ہے کہ شرف تخلّص کرتا ہے اور معمّا و لغز کے نظم کرنے میں کمالِ خصوصی رکھتا ہے۔ یہی تذکرہ نگار مبالغہ آمیز ستایش کے الفاظ میں اس کی تاریخِ تیموری یعنی ظفرنامہ کا ذکر کرتا ہے باوصف اس کے کہ اس کتاب کا اسلوبِ تحریر ناقابلِ برداشت حد تک ثقیل

---

[1] طبع کلکتہ ۱۹۳۹ء۔ جلد اوّل۔ ص ۴۔ ۱۷۳۔ (مترجم)

[2] جلد سوم جزو سوم ص ۱۴۸؛ [3] طبع راقم ص ۳۷۸ تا ص ۳۸۱؛

[4] فہرستِ مخطوطاتِ فارسی ص ۵۔ ۱۷۳؛

اور طنطنہ آمیز ہے مصنّف کی شہرت کا تمامتر دار و مدار اسی پر ہے۔ رہیں کتاب کی اطّلاعات سو ہرچند مصنّف کے اظہار سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اس نے اصل سندات سے اور زبانی ایسے لوگوں سے جمع کی ہیں جنہوں نے بیان کردہ واقعات میں خود حصّہ لیا۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر سرسری اعتراف کیساتھ یا بالکل بلکہ بلا اعتراف اس نے اپنے پیشرو نظام شامی کے ہاں سے اخذ کی ہیں۔ اسی ماخذ کا وہ قرآن اور کلامِ شعرائ کے اقتباسات کے لئے بھی مرہونِ منّت ہے۔ تاہم اس کی تصنیف نے اس کے پیشرو کی کتاب کو بالکل پسِ پردہ ڈالدیا ہے۔ کلکتہ سے "سلسلۂ کتبِ ہند"[۱] میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ (۸-۱۸۸۷ء)۔ "موسیو پتی دولا کروا"[۲] نے فرانسیسی میں (سنہ ۱۷۲۲ء) اور جے ڈاربی[۳] نے اس کا فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا (سنہ ۱۷۲۳ء)۔ صاحب ہفت اقلیم شرف الدین کے بارے میں لکھتا ہے "در عصرِ خود اشرف فضلای ایران و الطف علمای دوران بود"

روشن بیان و تیز زبان و بلند قدر

مجلس فروز و انجمن آرای و سرفراز"

اور اسکے ظفر نامے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے "بلطافتِ آن در فارسی نسخہ مکتوب نگشتہ" پھر اضافہ کرتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۸۲۸ھ (۵-۱۴۲۴ء) میں تالیف ہوئی۔ اور یہ تاریخ "صُنِّفَ فی شیراز" کے مادے سے نکلتی

---

[۱] Bibliotheca Indica Series ؛

[۲] Petis de la Croix ؛ [۳] J. Darby ؛

ہے۔ آگے بتاتا ہے کہ مصنّف نے فنِ معمّا و لُغز پر ایک رسالہ لکھا۔ البُوصیری کے مشہور عربی قصیدۂ "البردہ" کی ایک شرح لکھی۔ ایک

شرف الدّین علی یزدی کی دیگر تصانیف

کتاب مبارک اعداد اور جادو کے مربعوں پر بہ عنوان "کنہ المراد در علم وفق اعداد" تصنیف کی۔ اور متعدد رُباعیاں، مثنویاں اور قصائد لکھے۔ جن کا صاحبِ تذکرہ نے صرف ایک مختصر سا نمونہ دیا ہے ؂

ریو لکھتا ہے "شرف الدین نے کیا بذریعہ اپنے علم و تقدس کے اور کیا بذریعہ شُستہ اسلوبِ تحریر کے نہایت ممتاز و بلند رُتبہ حاصل کیا۔ اور مدت تک وہ شاہ رُخ اور اسکے فرزند میرزا ابراہیم سلطان کا مقرّب رہا۔ تاریخِ رشیدی میں بیان ہُوا[1] ہے کہ اوّل الذکر نے مغولوں کے جواں سال خان یونس خان کو جسے ۸۳۲ھ (۹-۱۴۲۸ء) میں میرزا الغ بے نے گرفتار کر لیا تھا شرف الدین کی نگرانی اور لائق اتالیقی کے سپرد کیا۔ اور وُہ شرف الدین کی وفات تک اسی کے پاس رہا۔ میرزا سلطان محمد عراق کا والی مقرر ہُوا تھا۔ اور اُس نے قُم میں سکونت اختیار کی تھی ۸۴۶ھ (۳-۱۴۴۲ء) میں اُس نے شرف الدّین کو جس سے ان دنوں اسکے وطن یزد میں شاگردوں کا ایک جمِ غفیر تعلیم پا رہا تھا اپنے دربار میں مدعو کیا۔ اور بطور ایک

---

[1] ملاحظہ ہو ارسکن (Erskine) کی تاریخِ ہند اور "تاریخ مغولانِ ایشیائے وسطیٰ" از الیاس و رَدس (History of the Moghuls of Central Asia) صفحہ ۴۷ (باب ۳۶) و صفحہ ۵-۸۴ و صفحہ ۱۵۵؛

مہمانِ عزیز اور مشیرِ معتمد کے اپنے پاس رکھا۔ کچھ سال آگے چل کر جب میرزا سلطان محمد نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ تو شاہ رُخ اسے مطیع کرنے کو لشکر لے کر اصفہان پہنچا اور اس نے میرزا کے بہت سے غلط اندیش صلاح کاروں کیلئے سزائے موت کا حکم دیا۔ شرف الدین پر بھی یہ الزام لگا کہ اُس نے امیر کو بغاوت پر اکسایا ہے۔ لیکن میرزا عبد اللطیف کی بروقت دخل اندازی کے طفیل خطرے سے بچ نکلا۔ میرزا عبد اللطیف نے یہ حجت پیش کی کہ میرے والد میرزا الغ بے کو اپنے فلکیاتی مشاہدات میں مولانا کے تعاون کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس بہانے شرف الدین کو سمرقند بھیج دیا۔ شاہ رُخ کی وفات کے بعد سلطان محمد نے جو اس وقت خراسان کا حاکم تھا اسے واپس یزد چلے جانے کی اجازت دے دی۔ شرف الدین ۸۵۳ھ (۵۰-۱۴۴۹ء) میں اپنی جائے پیدائش کو لوٹ آیا۔ اور پاس کے ایک گاؤں تفت میں اقامت گزین ہوا۔ وہیں ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں اُس نے انتقال کیا۔ اور ایک مدرسے کے احاطے میں مدفون ہوا جو خود اسی نے تعمیر کیا تھا۔ اور اسی کے نام پر شرفیہ کہلاتا تھا۔"

ظفر نامے کے بعض نسخوں میں "ایک مقدمہ شامل ہے جو خانانِ ترک کے انساب اور چنگیز خان کی اور تیمور تک اسکے اخلاف کی تاریخ سے بحث کرتا ہے"[1]۔ یہ مقدمہ ۸۲۲ھ (۱۴۱۹ء) میں ظفر نامے سے چھ سال قبل تالیف ہوا۔ نظام الدین شامی اور شرف الدین علی یزدی کی تاریخوں کے متوازی اجزاء کا مقابلہ مفید ثابت ہوگا۔ اسکے ذریعے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح

---

[1] فہرست مخطوطات فارسی مرتبہ ریو۔ ص ۵-۱۷۴؛

متاخرؔ مصنف نے اپنے پیشرو کی تصنیف کو طول دیا ہے اور اس پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ اگر جگہ کی گنجائش ہوتی تو پہلو بہ پہلو دونوں کے ایسے ہم موضوع مقامات کے ترجمے پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوتا۔ مثلاً جنگِ انگورا (۱۹ار جون ۱۴۰۲ء) کی روداد جو عثمانی سلطان بایزید معروف بہ یلدرم کی شکست اور گرفتاری پر منتج ہوئی۔ چونکہ شرف الدین کی متاخرؔ تالیف میں باوجود نقائصِ مذاق و اسلوب کے نظامِ شامی کی مندرج کردہ تمام یا تقریباً تمام اطلاعات مل جاتی ہیں۔ اسلئے یہ بات مشتبہ ہے کہ نظام شامی کی تاریخ کبھی شائع ہوگی۔[۱] گو بذاتہ اپنے تقدم اور پھر نسبتہ سادہ اور مجمل ہونے کے سبب زیادہ قابلِ پسند کتاب ہے ؎

حروفی فرقہ اور اُس کا بانی

فضل اللہ استر آبادی

حروفی فرقہ اس باب کے ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ حروفیوں کے عجیب و غریب بدعتی فرقے کے متعلق کچھ کہا جائے۔ تیموری عہد میں ایک شخص فضل اللہ استر آبادی نے اس کی بنا ڈالی اور اسکے مسلک و

---

[۱] پراگ (چیکوسلوواکیا) سے بہ تصحیح و ترتیب ڈاکٹر ریکا (Ripca) شائع ہو چکی ہے ؎ (مترجم)؛

عقائد کی تبلیغ و اشاعت کی۔ یہ فرقہ نہ صرف اپنے غیر معمولی قسم کے عقائد اور اپنے معتدبہ ادب (جس میں شاعری خصوصًا ترکی شاعری کا حصہ کُچھ کم نہیں ہے) کے سبب قابلِ اعتنا رہے بلکہ اس لئے کہ تاریخی اہمیت کے بُہت سے واقعات اس کیساتھ وابستہ ہیں۔ ایک طرف تو یہ فرقہ جور و تعدی کا شکار ہُوا اور دُوسری طرف اس کے جواب میں اس نے خُفیہ اور فریب کارانہ طریقوں سے خون کیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں اس فرقے کا زور زیادہ عرصہ قائم نہ رہا بلکہ ترکیہ کو منتقل ہو گیا۔ اور وہاں اس کو بکتاشی درویشوں کا حلقہ مل گیا جو اس کے پھلنے پھُولنے کا مناسب وسیلہ ثابت ہُوا۔ اسی سلسلہ کے درویش آج اس فرقے کے اگر اکیلے نہیں تو سب سے بڑے نمائندے ہیں ؛

اس فرقے اور اسکے بانی کے معاملے میں اس دور کے ایرانی مؤرّخ بالکل خاموش ہیں جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی طرف واحد اشارہ جو مجھے ملا ہے مجملِ فصیحی خوافی میں درذیل ۸۲۹ھ (۱۴۲۶ء) آیا ہے۔ اور زیادہ مبسوط طور پر حبیب السیر میں[1] ایراد ہُوا ہے جس میں بیان کردہ واقعہ کی تاریخِ وقوع اس سے عین ایک سال بعد کی بتائی گئی ہے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۸۲۹ھ (۴ مارچ ۱۴۲۶ء) گویا اس سے اگلے سال کے اسی روز

---

[1] جلد سوم۔ جزو سوم۔ ص ۸-۱۲۷ ، میں نے مجمل کی متعلقہ عبارت کا مکمل ترجمہ میوزیوں (Museon) کے اس شمارۂ خاص میں شائع کیا ہے جو ۱۹۱۵ء میں مطبعۂ جامعۂ کیمبرج میں چھپا۔ ص ۴۸ تا ص ۵۰۔ نیز ملاحظہ ہو پرائس کی "نظرِ بازگشتہ بر وقائعِ گزشتہ" (Price's Retrospect) جلد سوم جزو دوم۔ ص ۷ - ۵۴۶ ؛

(۲۱ر فروری ۱۴۲۷ء) شاہ رُخ پسر تیمور ہرات کی جامع مسجد سے باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت احمدِ لُر نامی ایک شخص عرضی پیش کرنے کے معمولی بہانے سے اس کے سامنے حاضر ہُوا اور اس کے پیٹ میں چُھرا بھونک دیا۔ تاہم زخم کاری نہ لگا تھا۔ عازمِ قتل کو بادشاہ کے ایک خدمتگار علی سلطان قوچین نے فوراً مار ڈالا۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی کہیئے کہ بلاشبہ بڑے عذاب سے چھُوٹ گیا۔ ورنہ زندہ رہتا تو خدا جانے اس پر کیا کُچھ گُزرتی۔ لیکن بعد میں میرزا بایسنقر اور دُوسرے امرا کو جنہیں اس معاملے کی تفتیش پر لگایا گیا اس کے مارے جانے پر بڑی پشیمانی ہوئی کہ بڑے کام کا سُراغ اُن کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ البتہ مقتول کی جیب سے ان کو ایک گھر کی چابی ملی۔ اس گھر کی جانچ پڑتال کی گئی تو مولانا معروف نامی ایک شخص پر شُبہ ہُوا۔ یہ شخص نامی خطّاط، فاضل اور بذلہ سنج تھا۔ اوائلِ حال میں سلطان احمد جلائر کی ملازمت کرتا رہا۔ اواخر میں میرزا اسکندر حاکم شیراز کی سرکار کا نوکر ہُوا۔ اور وہاں سے شاہ رُخ اسے ہرات لے آیا۔ یہاں اس نے بہُت سے اربابِ علم، درویشوں اور دُوسرے لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ انھی میں بظاہر یہ احمدِ لُر بھی تھا۔ بایسنقر میرزا نے جو مولانا معروف سے کُچھ ذاتی عناد رکھتا تھا اسے سزائے قتل دینی چاہی اور کئی مرتبہ اُسے پھانسی کے تختے پر لائے لیکن انجام کار قلعہ اختیار الدین کے تہ خانے میں قید کر دیا گیا۔ دُوسرے جو زیادہ بدنصیب تھے مارے گئے اور اُن کی لاشیں جلائی گئیں۔ ان میں فضل اللہ الحروفی استر آبادی کا نواسا خواجہ عضد الدین بھی تھا۔ مشہور

شاعر سید قاسم الانوار پر بھی کچھ شبہ کیا گیا۔ اور میرزا بایسنقر نے اُسے ہرات سے بدر کر دیا۔ اس شاعر کا تذکرہ ہم اگلے باب میں کرینگے ؛

فضل اللہ الحروفی کے ان معدودے چند مذکورات میں سے جو میری نظر سے گزرے ہیں ایک ابن حجر العسقلانی (متوفّی ۸۵۲ھ = ۹-۱۴۴۸ء) کی اِنباء میں آیا ہے۔ یہ مذکور بالفاظ ذیل ہے[1] :-

ابنِ حجر کی اِنباء میں فضل اللہ الحروفی کا حال

"فضل اللہ ابنِ ابی محمد تبریزی ان بدعتیوں میں سے تھا جو متقشّفانہ زندگی اختیار کرتے ہیں۔ ملحد تو وہ پہلے سے تھا۔ پھر اُس نے ایک نیا فرقہ نکالا جو حروفی کہلاتا ہے۔ اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ حروف انسان کے اوتار ہیں۔ اور اسی طرح کی اَور بہت سی خرافات پیش کیں جو سراسر بے بنیاد ہیں۔ اُس نے امیر تیمور لنگ کو اپنی بدعت کی طرف دعوت دی۔ تیمور نے اُس کے قتل کا ارادہ کیا۔ اس کی خبر اُس کے (تیمور کے) بیٹے (میرانشاہ) کو ہوئی۔ کیونکہ فضل اللہ اسی کے پاس پناہ لینے آیا۔ چنانچہ اُس نے خود ہی اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مار دی۔ تیمور کو اطلاع ہوئی تو اُس نے اس (فضل اللہ) کا سر اور جسم طلب کیے۔ اور اسی سال یعنی ۸۰۴ھ (۲-۱۴۰۱ء) میں یہ دونوں سپردِ آتش کر دیے"؛

[1] یہ کتاب میری رسائی سے باہر ہے لیکن فلوگل (**Flugel**) نے حاجی خلیفہ کی کشف الظنون کا جو نسخہ شائع کیا ہے اس کی جلد دوم کے دیباچے میں صفحہ نز تا صفحہ ح پر اس نے یہ عبارت اصل الفاظ میں نقل کی ہے؛

جاویدانِ کبیر فضل اللہ کے عقائد سب سے پہلے ایک نہایت عجیب و غریب کتاب موسوم بہ جاویدانِ کبیر میں پیش کیے گئے۔ اس کا کچھ حصہ عربی میں ہے کچھ فارسی میں اور کچھ فارسی کی ایک پراکرت میں۔ اسکے قلمی نسخے قسطنطنیہ کے کتابخانۂ ایہ صوفیہ، عجائب خانۂ برطانوی[1]، لیڈن، کتابخانۂ جامعۂ کیمبرج[2] اور میرے ذاتی مجموعۂ کتب میں موجود ہیں میرے نزدیک یورپ میں اس عجیب و غریب کتاب کی سب سے پہلی توصیف کتاب خانۂ لیڈن کی پُرانی فہرست مرتبہ ۱۸۶۶ء (جلد چہارم ص ۲۹۸) میں درج ہے۔ یعنی اس کتابخانے کے مخطوطۂ جاویدانِ کبیر کی کیفیت کا مختصر بیان فہرست کے مصنف کا قول ہے کہ کتاب کا کوئی دُوسرا نسخہ موجود نہیں ہے تصنیف کا ایک بہت زیادہ مفصل نامۂ کیفیت موسیو کلیان اُیوآر[3] نے مجلۂ آسیائی بابت ۱۸۹۹ء[4] میں بہ عنوان "مسلمانی پہلوی زبان کے ایک مخطوطے پر ایک نظر[5]" شائع کیا۔ یہ مخطوطہ قسطنطنیہ کا نسخہ ہے جس پر بظاہر اصل عنوان کی بجائے "الاسئلۃ المتعلقۃ بالقرآن العظیم" لکھا ہے۔ موسیو اُیوآر نے نسخے کے مندرجات و مضامین سے اتنا واسطہ نہیں رکھا جتنا اس کی زبان سے۔ اور اس کا جائزہ لیتے ہوئے اسے جاویدانِ کبیر یا حروفیوں کی خاص درسی

۱؎ Or. 5957 ؛ ۲؎ Ee. I. 27 ؛

۳؎ Clement Huart ؛

۴؎ Journal Asiatique (VIIIe Series, t. XIV, pp. 23870

۵؎ "Notice d'un manuscrit pehelvi-musulman."

کتاب یا تصنیفِ فضل اللہ استرآبادی کی حیثیت سے نہیں پہچانا۔ اپنی "فہرست مخطوطات فارسی در کتابخانۂ جامعۂ کیمبرج[1]" مرتبہ ۱۸۹۶ء میں میں نے جاویدان کبیر کے ایک نہایت نفیس نسخہ مقبوضہ کتابخانۂ مذکور پر ایک طویل تذکرہ وقف کیا تھا۔ یہ نسخہ اکتوبر ۱۶۸۱ء میں قسطنطنیہ میں خریدا گیا۔ قیمت دس لوئن ڈالر[2] ہے۔ خاص دلچسپی کی ایک بات یہ ہے کہ اس میں ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں فارسی کی ایک پراکرت میں چند مسلسل خوابوں کا ماجرا لکھا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ خواب خود فضل اللہ نے دیکھے۔ سُرخ روشنائی کے ساتھ بین السطور کسی حد تک عبارت کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ ان میں کئی خوابوں کی تاریخیں بھی درج ہیں۔ سب سے پہلی ۷۶۵ھ (۴-۱۳۶۳ء) کی ہے۔ "جبکہ ابھی تشریحِ احلام اور تعبیر رؤیا کی صلاحیت عطا نہ ہوئی تھی"۔ اور سب سے آخری ۷۹۶ھ (۴-۱۳۹۳ء) کی ہے۔ پس ان خوابوں کا زمانہ تیس سال پر محتوی ہے۔ ان میں بہت سے مقامات اور اشخاص کے حوالے آئے ہیں۔ مقامات میں استرآباد

اشخاص و مقامات جو فضل اللہ کے خوابوں کے سلسلے میں مذکور ہیں

بغداد۔ باکو۔ بروجرد۔ دامغان مصر۔ فیروزکوہ۔ عراق۔ اصفہان (خصوصاً وہاں کی ایک عمارت موسوم بہ عمارتِ طُوخچی یا طُوقچی)۔ خوارزم۔ جزیرہ۔ قزوین۔ سمرقند۔ تبریز

---

[1] Catalogue of the Persian Manuscripts in the Library of the University of Cambridge

[2] Lion dollars

اور حشیشین کے دو مضبوط قلعے رودبار (متصل استرآباد) اور قلعۂ گردِ کوہ مذکور ہوئے ہیں۔ اشخاص میں مندرجہ ذیل کا ذکر آیا ہے:۔ امیر تیمور۔ سلطان اویس[1] توقتامش خان[2]۔ پیر پاشا۔ سید عماد الدین (یعنی ترکی حروفی شاعر نسیمی[3]) سید شمس الدین۔ سید تاج الدین۔ خواجہ فخر الدین۔ خواجہ حسن۔ خواجہ بایزید مولانا کمال الدین۔ مولانا محمود۔ مولانا مجد الدین۔ مولانا قوام الدین۔ مولانا صدر الدین شیخ حسن۔ شیخ منصور۔ ملک عزّ الدین۔ امیر شمس۔ درویش توکّل۔ درویش مسافر۔ درویش کمال الدین۔ عبد الرحیم۔ عبد القادر۔ حسین کیا۔ عمر سلطانیہ۔ یوسف دامغانی ÷

گو بین السطوری تشریحات کے ذریعے اکثر الفاظ کے معنی اسی مقامی بولی میں سمجھائے گئے ہیں۔ لیکن ان کی مدد کے ساتھ بھی ان خوابوں کی روئداد سمجھنا بڑا ٹیڑھا اور مشکل کام ہے۔ اسلئے کہ بظاہر لکھنے والے نے یہ بیانات صرف بطور یادداشت قلمبند کئے ہیں کہ اس کے ذہن میں خواب کا نقشہ تازہ کرنے کو کافی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب نامے جاویدانِ کبیر کا کوئی جزو نہیں ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کے بیشتر نسخوں میں

---

[1] قیاساً سلطان اویس جلائر جس کا زمانۂ حکومت ۷۵۷ھ سے ۷۷۶ھ (۱۳۵۶ء سے ۱۳۷۵ء) تک ہے؛ [2] رک بہ ص ۴۴۵ بالا؛

[3] ملاحظہ ہو گب کی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ" (History of Ottoman Poetry) جلد اول۔ ص ۳۴۳ تا ص ۳۶۸۔ بدعت کی وجہ سے ۸۲۰ھ (۱۴۱۷-۸ء) میں اس شاعر کی کھال کھچوالی گئی تھی؛

شامل نہیں ہیں ؛

میری فہرستِ مخطوطات کے شائع ہونے کے ذرا ہی بعد یعنی ۲۳ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو میرے مشفق آنجہانی مسٹر گب نے اپنے ایک مکتوب میں میری توجہ اس امر کی طرف منعطف کرائی کہ متعدد ترکی تذکرہ نگاروں (مثلاً لطیفی اور عاشق چلبی) نے ترکی شاعر نسیمی[1] کو جو اوپر مذکور ہوا "حروفی" بتایا ہے اور فضل اللہ سے اس کا تعلق خود اس کے اپنے بعض اشعار سے ثابت ہے مثلاً ؂

علمِ حکمتدن بلورشک گل بروگل ای حکیم
سن نسیمی منطقندن دکلہ فضل اللہی گور

(اگر تو علمِ حکمت سیکھنا چاہتا ہے تو اے حکیم! ادھر آ اور نسیمی کی تقریر میں اللہ کے فضل (فضل اللہ) کا مشاہدہ کر!)

مسٹر گب نے اس دلالت کا تتبع کرتے ہوئے اپنی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ" کی پہلی جلد میں ترک حروفی شاعروں خصوصاً نسیمی اور رفیعی پر ایک باب (ساتواں، ص ۳۳۶ تا ص ۳۸۸) وقف کیا ہے۔ ان دو میں دوسرا پہلے کا مرید تھا۔ مسٹر گب سترھویں صدی کے وسط کے بعد حروفیوں کا پتہ نہیں چلا سکے البتہ اُنھوں نے ترکی تاریخوں سے دو دلچسپ اقتباسات دئے ہیں جن سے

---

[1] نسیمی جو اصلاً بغداد کا باشندہ تھا دو زبانی شاعر تھا۔ اس کے دیوان کا ایک حصہ فارسی ہے اور ایک ترکی۔ دونوں حصے ایک پتلی سی جلد میں بہ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) قسطنطنیہ سے شائع ہوئے۔ مسٹر گب نسیمی کو "مغربی ترکوں کا سب سے پہلا حقیقی شاعر اور اس عہدِ بعید کا واحد حقیقی شاعر" کہتے ہیں؛

اس بے پناہ جور وایذا کا پتہ چلتا ہے جس کا کئی بار یہ فرقہ شکار ہوا۔ پہلا اقتباس "شقایق النعمانیہ" سے ہے جو ترک اولیاء کا ایک تذکرہ ہے۔ اس میں[1] واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ کیونکر قسطنطنیہ کے ایرانی مفتی فخرالدین عجمی نے کہ السید شریف الجرجانیؒ کا شاگرد تھا۔ چند حروفیوں کو الحاد کے الزام میں پکڑوا کر زندہ جلوا دیا۔ یہ حروفی سلطانِ وقت محمد ثانی "الفاتح" کا لطف واعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سلطان باہمہ زور واقتدار ان کو علماء کی شدّتِ غضب اور کٹّر لوگوں کے تعصب سے نہ بچا سکا۔ یہاں تک روایت کی جاتی ہے کہ مفتی اپنے جوشِ مذہبی میں ایسا از خود رفتہ ہوا کہ گرفتاروں کے لئے جو آگ جلائی گئی تھی اسے دھونکتے ہوئے اس نے اپنی ریشِ دراز جُھلسا ڈالی جو کہ اس کا طرۂ امتیاز تھی۔ دُوسرا اقتباس لطیفی کے "تذکرۂ شعرائے ترکی" سے ہے۔ اس میں ایک حروفی شاعر تمنّائی کے ملحدانہ اقوال وعقائد اور اسکے "کفر آمیز مہملات" کا ابطال کیا گیا ہے۔ یہ شاعر بھی دُوسرے ہم فرقہ اصحاب کے ساتھ سلطان بایزید کے عہد میں[2] تیغ وآتش کی نذر ہوا۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں[3] کہ سلطان بایزید یلدرم نے ۸۰۴ھ (۱۴۰۲ء)

---

[1] رک بہ ص۴۸۳ بالا؛ [2] مسٹر گب کا خیال ہے کہ یہ واقعہ بایزید ثانی (عہد سلطنت ۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ = ۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) کے عہد کا ہے کیونکہ از روئے روایتِ سعد الدین (مؤرخ) اس کے زمانے میں ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں قلندروں کی شدید تعذیب وتعقیب کی گئی۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ان میں سے ایک قلندر نے سلطان کو قتل کرنے کی کوشش کی؛

[3] رک بہ ص۴۹۶ بالا؛

میں جنگِ انگورا میں تیمور کے مقابلے پر شکست کھائی اور اسکے بعد جلد ہی وُہ فوت ہوگیا۔ چونکہ فضل الحروفی کے قتل کیئے جانے کا سال بھی یہی[1] ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اس کے عقائد اس کے جیتے جی دُور دُور (استر آباد سے ادرنا تک) پھیل چکے تھے۔ اور راسخ العقیدہ لوگوں میں اس کی نسبت انتہائی غضب آلود نفرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مسٹر گب کہتے ہیں کہ حروفیوں کی آئندہ تحریکوں کی کوئی تاریخی شہادت اُن کو تلاش سے نہیں مل سکی۔ اسلیئے وہ مائل بہ قیاس ہیں کہ اس فرقے کی سرگرمیاں پندرھویں صدی کے اختتام سے آگے نہیں چلیں اور اگر اس کے پاس کچھ تنظیم تھی تو غالبًا ان مظالم سے تباہ کر دی گئی جو بایزیدی دور میں ان پر برستے رہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی سرگرمی آج تک جاری ہے

بیکتاشی درویش حروفی عقائد کے موجودہ وارث ہیں

اور بیکتاشی درویش اب تک حروفی عقائد کے علمبردار اور محافظ ہیں۔ حال ہی میں یعنی ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴-۵ء) میں اسحٰق آفندی نے حروفیوں اور بیکتاشیوں کے عقائد و سنن کی ایک تردید بعنوان "کاشف الاسرار و دافع الاشرار" شائع کی ہے۔ اس مصنّف نے جن مضامین پر قلم اُٹھایا ہے ان سے خوب واقف ہے اور جن عقائد کو جھٹلایا ہے ان کی صاف اور بے لاگ شرح کرتا ہے۔ اپنے رسالے کو اُس نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں فضل اللہ الحروفی کے نسب اور بعض بیکتاشیوں کے اصُول و ضوابط پر بحث کی ہے۔ دُوسرے میں جاویدانِ فرشتہ زادہ کے

[1] اوپر ص۵۰۰ کی طرف رجوع کیجئے۔ لیکن آگے ص۵۱۶ سے بھی مقابلہ کیجئے؛

دعاوئ باطلہ پر اور تیسرے میں باقی جاویدانوں کے مشمولہ کافرانہ دعووں پر۔ رسالے میں اس نے ۱۲۴۱ھ (۶-۱۸۲۵ء) کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جس میں سلطان محمود[1] نے بکتاشیوں کی تعذیب کی اور ترکی شاعر عارف حکمت بے نے خاص سرکاری مفتش کے فرائض انجام دِئے۔ مصنف کہتا ہے کہ جس چیز نے مجھے اپنی کتاب کی تالیف واشاعت پر آمادہ کیا وہ یہ ہے کہ ۱۲۸۸ھ (۲-۱۸۷۱ء) میں بکتاشیوں نے عشق نامۂ فرشتہ زادہ (عبدالماجد ابن فرشتہ عزّالدین) کو طبع وشائع کرنے کی جسارت کی۔ لکھتا ہے "جن کتابوں کو یہ لوگ (یعنی بکتاشی اور حروفی) جاویدان کہتے ہیں تعداد میں چھ ہیں۔ ان میں ایک تو ان کے اصل گمراہ کنندہ فضل اللہ الحروفی کی مصنّفہ ہے۔ اور باقی پانچ اس کے خلفار کی تصانیف ہیں"۔ پھر لکھتا ہے کہ "ان پانچ کتابوں میں اُن کے کافرانہ اظہار اور دعاوئ باطلہ بالکل کھلے نظر آتے ہیں اور ان کا معمول ہے کہ چھپ چھپا کر ان کو آپس میں پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ لیکن فرشتہ زادہ نے اپنی جاویدان میں جس کا عنوان عشق نامہ ہے اپنی کفریات پر تا حدّے پردہ ڈال دیا ہے۔ مصنّف آگے لکھتا ہے:-

"کچھ عرصے میں ان بدعتیوں کے عقائدِ قبیحہ لوگوں پر آشکار ہو گئے اور تیمور کے بیٹے (یعنی میران شاہ) نے فضل الحروفی کو مروا ڈالا۔ پھر اسکی ٹانگوں میں ایک رسّی بندھوائی اور حکم دیا کہ بازار اور گلیوں میں اس کی نعش کو کھینچے پھرو اور دُنیا کو اسکے وجودِ لئیم سے پاک کیا۔

---

[1] یعنی سلطان محمود عثمانی دوم۔ عہدِ سلطنت ۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ؛ (مترجم)

"اس پر اس کے خلفاء نے آپس میں طے کر لیا کہ دنیائے اسلام میں منتشر ہو جائیں۔ چنانچہ یہ مسلمانوں کو فاسد و گمراہ کرنے پر تُل گئے۔ ان خلفاء میں وُہ جو "العلی الاعلیٰ" کے لقب سے ملقب تھا اناطولیہ میں حاجی بکتاش کی درگاہ پر چلا آیا۔ اور یہاں اُس نے تنہائی میں بسر اوقات شروع کی۔ اور خُفیہ خُفیہ درگاہ کے مجاوروں کو جاویدان پڑھانے لگا۔ اُنکو یقین دلایا کہ یہ تمہارے ولی حاجی بکتاش کے مسلک و مذہب کو پیش کرتی ہے۔ اہلِ درگاہ جاہل اور بے وقوف تھے۔ وہ جاویدان پر ایمان لائے۔ حالانکہ اس کی کھلی ہوئی تعلیم جملہ فرائضِ رُوحانی کا انکار اور خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل میں کوشاں رہنا ہے۔ اس کا نام اُنہوں نے "راز" رکھا۔ اور اسکے اخفا کی پابندی ایسے غایت درجے کی عائد کی کہ اگر کوئی ان کے حلقے میں داخل ہو۔ اور پھر یہ "راز" افشا کر دے تو سمجھتے ہیں کہ وہ جینے کے حق سے محروم ہو گیا اُن کے اس نام نہاد "راز" سے مراد جاویدان کی چند ملحدانہ عبارات ہیں جن کے لئے ذ، ق، ج، ز وغیرہ مجرّد حروف کی علامتیں مقرر ہیں ان علامتوں اور کنایوں کی تشریح و تعبیر کے لئے انہوں نے ایک رسالہ مفتاح الحیوٰۃ کے نام سے مرتّب کیا ہے اسے وہ راز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور جس کسی کے پاس یہ موجود ہو وہی جاویدان کو سمجھتا ہے۔ اس کی مدد کے بغیر وہ ناقابلِ فہم ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے اس "راز" کو چھپانے میں بڑے مُحتاط تھے۔ اس ڈر سے کہ مبادا علمائے دین کو اس کی نوعیت کا کچھ اشارہ مل جائے اور وہ اس کی اشاعت روک دیں۔ پس اسی طور پر

۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) سے یہ لوگ بہت سے اشخاص کو بہکانے اور بھٹکانے میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔"

اس کے بعد مصنّف ان مکّاریوں اور حیلوں کی پردہ دری اور مذمّت کرتا ہے جن کے ذریعے یہ لوگ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم سب کو اپنی بدعات کی طرف لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر لکھتا ہے :-

"ان سب باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ (یعنی بکتاشی) دراصل شیعہ نہیں ہیں بلکہ یہ فرقہ اصلاً مشرکین کا ہے۔ اپنے دین کے یہ لوگ کتنے ہی زوردار دعوے کیوں نہ کیا کریں یہودیوں اور عیسائیوں کو کبھی اپنے مذہب کی طرف نہیں لے جاسکتے۔ تاہم بعض ایسے مسلمانوں کو ضرور کھینچ لیتے ہیں جو شیعہ مذہب کے حامی ہیں۔ چنانچہ جب مَیں نے چند بکتاشی نومذہبوں سے دریافت کیا تو انھوں نے اپنے تئیں جعفری (یعنی امامی یا شیعہ) فرقے کے افراد بتایا۔ انہیں جاویدان کے اسرار کی کوئی خبر نہ تھی اور اپنے آپ کو شیعہ ہی خیال کرتے تھے۔ لیکن جب مَیں نے ایک فاضل ایرانی سیّاح میرزا صفا سے بکتاشیوں کے بارے میں رائے پُوچھی تو اُنھوں نے جواب دیا۔ "میرا ان سے بہت میل جول رہا ہے۔ اور مَیں نے بڑے غور سے ان کے دین کی چھان بین کی ہے۔ یہ لوگ شریعتِ مقدسہ کے احکام کی پابندی سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے حتماً اس فرقے پر بیدینی کا حکم لگایا۔ نعوذُ باللہ من جہلھم!"

ایسٹر ۱۸۹۷ء کی تعطیل میں مجھ کو پیرس کے قومی کتبخانے کے مملوکہ دو[2]

حروفی نُسخوں کے جائزے کا موقع ملا[1] جن کی کیفیت میں نے مجلۂ انجمن ہمایونیٔ ایشیائی بابت ۱۸۹۸ء (صہ ۶۱ تا صہ ۹۴) میں ایک مقالے میں شائع کی جس کا عنوان "حروفی فرقے کے ادب اور عقائد کے متعلق چند تصریحات[2]" ہے۔

استوانامہ ان میں سے ایک نسخہ مؤرخہ ۹۷۰ھ (۶۳-۱۵۶۲ء) میں امیر غیاث الدین کا "استوانامہ" شامل ہے۔ یہ فارسی میں سکندرِ اعظم کی تلاشِ آبِ حیات پر ایک مثنوی ہے۔ اسکے علاوہ اس نسخے میں مقامی بولی کے اُن الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو جاویدانِ کبیر میں ایراد ہوئے ہیں۔ دُوسرے

محبّت نامہ نسخے میں جس کی تاریخِ کتابت ۸۹۵ھ (۹۰-۱۴۸۹ء) ہے۔ "محبّت نامہ" شامل ہے جسے فضل اللہ کی اپنی تصنیف مان لینے کی وجہ موجود ہے۔

اس سے نوسال بعد مجلۂ انجمن ہمایونی ایشیائی بابت ۱۹۰۷ء میں مَیں نے اسی موضوع پر ایک اَور مقالہ بعنوان "حروفی ادب کے متعلق مزید تصریحات اور بیکتاشی درویشوں سے حروفیوں کا تعلّق[3]" شائع کیا۔ اس میں مَیں نے ۴۳ حروفی نسخوں کی کیفیت قلمبند کی تھی جو ان دنوں عجائب خانۂ برطانوی، کتابخانۂ جامعۂ کیمبرج اور خود مَیں نے حاصل کئے تھے۔ جس طریقے سے یہ نسخے حاصل

---

[1] Ancien Fonds Persan 24 and Suppl. Persan 107

[2] (Some Notes on the Literature and Doctrines of the Hurufi Sect.)

[3] (Further Notes on the Literature of the Hurufis and their connection with the Bektashi Order of Dervishes.)

کیئے گئے۔ اس کے متعلق اس وقت مَیں نے مندرجۂ ذیل الفاظ لکھّے تھے:

"حروفیوں اور بیکتاشیوں کے باہمی تعلق کا علم سب سے پہلی دفعہ مجھے ذیل کے طریقے سے ہوا۔ اوپر جس مقالے کا مَیں نے حوالہ دیا ہے اس کی اشاعت کے تین سال بعد لندن میں مشرقی نسخوں کے ایک تاجر نے کہ بغداد کا باشندہ تھا مجھ سے مطلوبہ کتابوں کی فہرست مانگی کہ مشرقی ممالک میں اپنے آڑھتیوں کو بھیج دے۔ مَیں نے یہ فہرست مہیّا کر دی اور اس میں جاویدان نامہ کو شامل کیا۔ اور یہ بھی لکھا کہ حروفیوں کی جو کتابیں مل سکیں فراہم کی جائیں۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ (فروری۔ مارچ ۱۹۰۱ء میں) اس نے نسخوں کا ایک پارسل مجھے بھیجا۔ اس میں قسمِ مذکور کی چند کتابوں کے علاوہ جاویدان نامہ کا ایک نسخہ بھی شامل تھا۔ قیمتیں جو ان نسخوں پر لگی ہوئی تھیں بہت زیادہ تھیں۔ لیکن کوئی چھ ایک نُسخے کتاب خانۂ جامعۂ کیمبرج نے خریدے اور پانچ یا چھ عجائب خانۂ برطانوی[1] نے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان نسخوں کے اتنے مہنگے دام جو ملے تو اس قسم کے نسخوں کی تلاش زیادہ زور شور سے شروع ہوئی اور جوں جوں ان کی فراہمی نہ صرف یہ کہ جاری رہی بلکہ بڑھتی گئی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ حروفی کتابیں خاصی افراط سے موجود ہیں۔ اور مشرق اور خصوصاً ٹرکی کے طول و عرض میں پڑھی اور نقل کی جاتی ہیں۔ غرض ان کی قیمتیں تیزی سے گرتی گئیں اور

[1] یہ اب عجائب خانۂ برطانوی کا نمبر Or. 5957 ہے۔

[2] عجائب خانہ کے نسخوں کے نمبر اب Or. 5957 تا Or. 5961 ہیں۔

اور حال میں بہت ہی کم نسخے ایسے آئے ہونگے جن کے دام اُن کے محدود خریدار
سے دو یا تین پاؤنڈ سے زیادہ وصول ہوئے - جلد ہی یہ حقیقت بھی کھل گئی - کہ
یہ بیکتاشی درویش ہیں جن سے یہ نسخے تقریبًا سب کے سب بالواسطہ یا براہِ
راست حاصل کئے گئے ہیں - اور یہ کہ اسی سلسلے کے اراکین میں آج بھی
حروفی عقائد زندہ ہیں"۔

اس مقالے میں جن نسخوں کی کیفیت لکھی گئی ہے ان میں دو تین
رسالے حاجی بیکتاش کی سوانحمری اور ان کے سکھائے ہوئے مذہب پر
ہیں - حاجی بیکتاش ہی کے نام پر اسکے پیرو بیکتاشی کہلاتے ہیں - یہ ولی
فضل اللہ الحروفی کی ولادت سے دو سال قبل یعنی ۷۳۸ھ (۸-۱۳۳۷ع)
میں فوت[1] ہوا - عجائب خانۂ برطانوی میں ایک نسخہ[2] ہے جس کے ایک ابتدائی
خالی ورق پر مطابق ذیل پانچ تاریخیں درج ہیں - ایک فضل اللہ الحروفی کی
تاریخِ ولادت ہے اور باقی چار ایسے واقعات کی تاریخیں ہیں جو فرقے کی
اوایلی تاریخ سے وابستہ ہیں :-

(۱) فضل اللہ کی ولادت، ۷۴۰ھ (۴۰-۱۳۳۹ع)؛

(۲) اس کا اپنی تعلیم عقائد کا اعلان کرنا ۷۸۸ھ (۷-۱۳۸۶ع)؛

(۳) فضل اللہ کی شہادت ۵۶ سال قمری کی عمر میں ۷۹۶ھ (۴-۱۳۹۳ع)

---

[1] اس تاریخ کا ماخذ معلّم ناجی کی کتاب اسامی ہے (ص۱۰۶)، عجیب اتفاق ہے کہ سلسلے کے نام یعنی لفظ "بیکتاشیہ" سے بھی یہی تاریخ نکلتی ہے؛

[2] Or. 6381

(۴) اسکے خلیفہ "حضرت علی الاعلیٰ" کی وفات ۸۲۲ھ (۱۴۱۹ع)؛

(۵) میرانشاہ پسرِ تیمور، (جسے حروفی دجّال اور ماراں شاہ یعنی سانپوں کا بادشاہ کہتے تھے۔ اور جس نے فضل اللہ کو مروایا تھا) کی وفات ۸۰۳ھ (۱۴۰۰-۱ع)؛

اسی صفحے پر ایک شعر نقل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فضل اللہ نے ۷۷۵ھ (۱۳۷۳-۴ع) میں حج کیا۔ ان ہی نسخوں میں ایک اَور نسخہ[۱] کے ورق ۲۶ب پر ایک دلچسپ تحریر ملتی ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ فضل اللہ کا وصیت نامہ ہے۔ اس کا پورا متن مع ترجمہ مقالۂ زیر بحث میں چھپا ہے[۲]۔ اس تحریر کی رو سے فضل اللہ شیروان میں مارا گیا۔ مقالہ ان کتب اور اشخاص کے مکمّل اشارے کے ساتھ ختم ہوتا ہے جو اس میں مذکور ہیں۔ بیشتر کتابوں کے عنوان خواہ وہ فارسی کی ہیں یا ترکی کی لفظ نامہ پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً آدم نامہ، آخرت نامہ، عرش نامہ، بشارت نامہ وغیرہ؛

۱۹۰۹ء میں سلسلۂ یادگار گب کی ایک جلد (سلسلہ ۹) شائع ہوئی اس میں ایم کلیمان آیوآر[۳] کا متعدد حروفی رسالوں کا فرانسیسی ترجمہ شامل ہے۔ اور اسکے بعد فرانسیسی ہی میں حروفی عقائد و مذہب پر ایک تبصرہ ڈاکٹر رضا توفیق کے قلم سے ہے۔ جو ترکی میں بالعموم فیلسوف رضا کے نام سے مشہور

---

[۲] مجلۂ انجمن ہمایونی ایشیائی۔ بابت ۱۹۰۷ء۔ یہی مقالہ الگ کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ص ۱-۹؛ [۱] Or. 6380؛

[۳] Clement Huart.؛

ہیں۔ مشرق و مغرب دونوں کے علوم کی تحصیل میں قابلِ ذکر رُتبے کے مالک ہیں۔ اور ٹرکی کے مختلف درویشی سلسلوں سے متعلق جملہ حالات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب اس موضوع پر کہیں اہم ترین تصنیف ہے اور اس فرقے کے نرالے اور انوکھے عقائد کی معلومات کی ایک زرخیز کان ہے۔ گو آج سے بیس سال پہلے یورپ میں کوئی اس فرقے کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ لیکن مغربی ایشیا کی تاریخ میں اس کا حصّہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اسکے مخصوص طرز کے عقائد جو بے سروپا بھی ویسے ہی ہیں جیسے پُر از جدّت، متذکرۂ صدر مقالوں اور کتابوں میں خاصی تفصیل سے معرضِ بحث میں لائے جا چکے ہیں۔ جو قارئین ان کے بارے میں زیادہ مفصّل معلومات حاصل کرنا چاہیں اُنکی طرف رجوع کریں ⁂

دفترِ سوم

تیمور کی وفات سے
سلاطینِ صفویّہ کے طلوع تک

(۸۰۷ھ تا ۹۰۷ھ = ۱۴۰۵ء تا ۱۵۰۲ء)

بابِ ششم

متاخر تیموری دور کی تاریخ

وُہ صدی جو کتاب کے بقیہ حصّے کا موضوع ہے کِس نوعیّت کی ہے؟

جس صدی کا ہم جائزہ لینے والے ہیں اسکا آخری حصّہ ان ابتری اور طوائف الملوکی کے ادوار میں سے ہے جو تاریخ ایران میں اکثر ایک زبردست فاتح اور معمار سلطنت کے مرنے پر نمودار ہوتے ہیں۔ اس صدی میں جو واقعات شامل ہیں ان کی تفصیل یُوں ہے :۔ ماوراء النہر میں ازبکوں کا قُوت پکڑنا؛ تیمور کی اس وسیع سلطنت کا تدریجی زوال اور انتشار جو اُس نے قہر و خون کی اتنی بھاری قیمت کے عوض تعمیر کی تھی۔ دو ترکمان خاندانوں کا باری باری برسرِ اقتدار آنا کہ قراقونیلو (گوسفندانِ سیاہ) اور آق قونیلو (گوسفندانِ سیاہ) کہلاتے ہیں۔ اور خاندانِ صفوی کا ظہور اور غلبہ جو ایرانِ جدید کا سب سے عظیم شاہی خاندان

ہے اور ایک طرح ایرانی قومی جذبے کا خالق یا کم سے کم بیدار کنندہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دور کا آغاز تیمور کی وفات یعنی ۸۰۷ھ (۱۴۰۵ع) سے ہوتا ہے اور خاتمہ جنگِ شرور (۹۰۷ھ = ۱۵۰۱-۲ع) پر، جس میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے آق قونیلو ترکمانوں کو دو ٹوک شکست دی۔ تبریز کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور ایران کی بادشاہی کا تاج پہنا گو پورے ایران پر تسلط قائم کرنے میں اسے کچھ سال لگ گئے تا آنکہ بالفاظِ لین پول[۱] "اس کی سلطنت دریائے جیحوں سے خلیج فارس تک اور افغانستان سے فرات تک پھیل گئی"۔

اگر ہم اس ایک صدی کا غور سے مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ زمانہ لازمی طور پر دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے جن کی درمیانی حد تیمور کے تیسرے بیٹے شاہ رخ کا سنِ وفات یعنی ۸۵۰ھ (۱۴۴۶-۷ع) ہے۔ جب تک وہ زندہ اور بر سرِ حکومت رہا اقارب کی متعدد سرکشیوں کے باوجود باپ کی مفتوحہ کل سلطنت کو صحیح و سالم رکھنے میں کامیاب رہا لیکن اسکی موت کے بعد پہلے قراقونیلو، پھر آق قونیلو ترکمانوں اور آخر میں ازبکوں کے ہاتھوں اس کا شیرازہ تیزی سے بکھرا حتّٰی کہ بالآخر آلِ تیمور کے بچے کھچے لوگوں سمیت ان خاندانوں کا خاتمہ بھی اقبال مند شاہ اسمٰعیل صفوی نے کیا۔ آلِ تیمور گو ایران سے نکالی گئی۔ لیکن ابھی اُس کی قسمت میں ہندوستان آ کر

> شاہرخ کی وفات (۱۴۴۶ع)
> اس دَور کو دو غیر مشابہ حصّوں میں تقسیم کرتی ہے

---

[۱] Stanley Lane-Poole.

آلِ تیمور نے ایران سے نکالے جانے کے بعد ہندوستان میں کارہائے نمایاں کیئے

کارہائے نمایاں کا انجام دینا لکھا تھا۔ تیمور کے پڑپوتے کے پوتے ظہیر الدین بابر کو ازبکوں نے خود اس کی اپنی ریاست فرغانہ سے نکالدیا تھا۔ اُس نے ہندوستان میں ایک خاندان کی بُنیاد رکھی جس کے سلاطین یورپ میں بالعموم "مغلہائے بزرگ" کے نام سے معروف ہیں۔ یہ سلسلۂ سلاطین تین صدیوں سے زیادہ عرصے تک رہا۔ اور بالآخر ۱۸۵۷ء کے غدر میں منقطع ہو گیا۔ اس کتاب میں ہمیں ہندوستان کے "مغلہائے بزرگ" سے براہِ راست کوئی سروکار نہیں۔ صرف اُن تعلّقات کی حد تک ہمیں ان سے واسطہ ہے جو اُن کے اور ایران کے صفویوں کے درمیان قائم ہوئے۔ شاہ رُخ کی وفات کے بعد ہر چند ایران میں متاخّر تیموریوں کی سیاسی وقعت برابر گھٹتی چلی گئی لیکن ان کی رہی سہی مملکتوں کے دربار بدستور ادبی سرگرمیوں کے مرکز بنے رہے جنہیں بہت سے نامور شعراء اور اربابِ علم وفضل زینت بخشتے تھے۔ اس کے علاوہ خاندان کے کئی سلاطین خصوصًا سلطان ابو الغازی حسین ابنِ منصور ابن بایقرہ، الغ بیگ، بایسنقر اور خود بابرِ اعظم نے علم و ادب میں اپنے قلم سے قابلِ ذکر اضافے کیئے۔ میر علی شیر نوائی جو سلطان ابو الغازی حسین کا وزیر تھا۔ چوٹی کا شاعر تھا۔ (خصوصًا ترکی زبان میں) اور علماء و فضلاء کا فراخدل سرپرست تھا۔ مختصر یہ کہ ادبی شکوہ و عظمت کے لحاظ سے تیموریوں کے عہد کے ہرات کا مقابلہ محمودی دور کے غزنہ سے کیا جا سکتا ہے:۔

سیاسی نقطۂ نظر سے متذکرۂ صدر خاندانوں کے اہم ترین نمائندے یہ ہیں:- تیموریوں میں شاہرخ، قراقونیلو ترکمانوں میں قرا یوسف، آق قونیلو ترکمانوں میں اوزون حسن، ازبکوں میں شیبانی خان اور زبردست خاندانِ صفویہ میں اس کا بانی شاہ اسمٰعیل جوان سب نمائندوں میں سب سے جلیل اور برتر ہے *

اوزون حسن کے ہاں وِنیس کے سفیروں کا وُرُود

اوزون حسن[1] کے عہدِ حکومت کی معاصر یوروپی روئدادیں ہمیں کیٹرینو زینو[2]، جوزفا باربیرو[3]، اور ایمبروزیو کنٹارینی[4] کے بیانات میں ملتی ہیں جو اس کا نام مختلف طور پر "اُسُن کسانو[5]" اور "اسمبی[6]" لکھ رہے ہیں۔ یہ تینوں اشخاص وینس سے اس جلیل القدر فرمانروا کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ یہ سفارتیں اس لئے بھیجی گئیں کہ اہلِ یورپ عثمانی تُرکوں کی بڑھتی ہوئی خوفناک طاقت کے خلاف اوزون حسن کی کمک حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس غرض سے یکے بعد دیگرے یہ سفیر ۱۴۷۱ء اور ۱۴۷۸ء کے مابین ایران میں وارد ہوئے۔ ان کے بیانات بیحد دلچسپ ہیں اور ان میں جیتے جاگتے خدوخال نظر آتے ہیں درحالیکہ یہ دونوں اوصاف ایرانی مؤرخوں کی کتابوں میں شاذ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ہیکلویٹ سوسائٹی[7] نے ان سیاحت ناموں

---

[1] اوزون کے لفظی معنی طویل قامت کے ہیں؛

[2] Caterino Zeno؛ [3] Josafa Barbaro؛

[4] Ambrosio Contarini؛ [5] Ussun Cassano؛

[6] Assambei؛ [7] Hakluyt Society؛

کا انگریزی ترجمہ ایک کتاب میں شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان[1] "اطالویوں کے قلم سے سولھویں اور سترھویں صدیوں کے چھ ایرانی سیاحت نامے" ہے[2]۔

تیمور کے بیٹے

قراقوئنلو اور آق قوئنلو ترکمانوں کا زیادہ مفصل مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ آلِ تیمور کی تاریخ جہاں تک وہ ایران سے وابستہ ہے مجملاً بیان کی جائے۔ تیمور کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹوں میں سب سے بڑا یعنی جہانگیر باپ کی موت سے تیس[30] برس پہلے چل بسا تھا۔ اور اس سے چھوٹا عمر شیخ میرزا دس برس پہلے تیسرا بیٹا میرانشاہ تیمور کی موت کے بعد تین سال زندہ رہا لیکن ذلیل و خوار ہوا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاتر العقل ہو گیا۔ چوتھا شاہرخ تھا جو صحیح معنوں میں تیمور کا جانشین ہوا۔ اور اس نے ۴۳ سال (۸۰۷ھ تا ۸۵۰ھ = ۱۴۰۴ء تا ۱۴۴۷ء) کا طویل اور با فروغ زمانہ پایا۔ تیمور کی مرضی یہ تھی کہ جہانگیر کا

---

[1] Six Narratives of Travel in Persia by Italians in the Sixteenth and Seventeenth Centuries.

[2] باقی تین داستانیں جو اس کتاب میں شامل ہیں یہ ہیں:۔

گیوان ماریا انگیولیٹو (Giovan Maria Angioletto) کے اندراجات پر ...... جن میں اُسُن کسانو کے وقائع عمری اور کارنامے قلمبند ہیں گیوان بٹّسٹا رموسیو (Giovan Battista Ramusio) کا مقالہ ایک تاجر کی سیاحتِ ایران (بعہد شاہ اسمٰعیل)؛ وِنسینشیو دوالیسنڈری (Vincetio d'Allesandri وینزی سفیر فرستادہ بجانب شاہ طہماسپ) کا سفر نامہ؛

بیٹا پیر محمد اس کا جانشین ہو لیکن اُس نے اپنے چچا میرانشاہ کے بیٹے خلیل

خلیل سُلطان کا مُختصر عہدِ حکومت

سلطان سے شکست کھائی۔ خلیل سُلطان سمرقند پر تسلط جمانے اور بہت سے مقتدر امراء کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور بالآخر اپنے دادا کی وفات کے دو سال بعد اپنے معتمد وزیر علی تاز یا پیر علی کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ خلیل سلطان گو بے ہنر نہ تھا لیکن جو بات اُس کی تباہی کا سامان ہوئی وہ یہ تھی کہ اپنی داشتہ شاد ملک کی محبت میں وارفتہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے مسرفانہ خبط پُورے کرنے کو ہر لحظہ تیار رہتا تھا۔ یہ بات امراء اور عمائد کو سخت ناگوار ہوئی۔ چنانچہ وہ خداداد اور بردی بیگ کی سرکردگی میں آن کی آن میں سب اسکے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے معزول اور بدر کر کے کاشغر بھیج دیا۔ اس پر اس کا چچا شاہرخ لشکر لیکر بڑھا اور تاج و تخت پر قابض ہو گیا۔ لیکن اس میں اتنی رحمدلی تھی کہ اس نے بدنصیب خلیل کے پاس اس کی دلدار شاد ملک کو پہنچا دیا۔ جب خلیل کی وفات ہوئی تو شاد ملک نے اپنے عاشق کی جان نثاری کی یہ قدر کی کہ اپنے سینے میں خنجر بھونک لیا اور جان بحق ہوئی۔ دونوں رَے میں ایک ہی مقبرے میں دفن ہوئے۔[1]

---

[1] یہ سر جان میلکم (Sir John Malcolm) کی روایت ہے (تاریخ ایران طبع ۱۸۱۵ء۔ جلد اول [illegible]) اور دوگوئین (De Guignes) کی سند پر مبنی ہے لیکن دولت شاہ (ص ۳۵۴) کہتا ہے کہ باغی امراء نے شاد ملک کے ناک کان کاٹ دئے اور خلیل سلطان اور اس کے وصال کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

خلیل سلطان نہ صرف شعراء کا فیاض مربّی تھا بلکہ خود بھی شعر کہتا تھا۔ اس کے کلام کے کئی نمونے دولت شاہ نے دیے ہیں[1]۔

شاہ رُخ۔ عہدِ سلطنت سنہ ۱۴۰۷ء تا سنہ ۱۴۴۷ء

شاہ رُخ جو اب تخت نشین ہوا سنہ ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں پیدا ہوا تھا۔ پس اس وقت اس کی عُمر ۲۸ برس تھی۔ بیس سال کی عمر سنہ ۷۹۹ھ = ۱۳۹۶ء) میں خراسان کا عامل مقرر ہوا۔ اور اس صوبے میں پہلے ہی سے تقریبًا خود مختار رہا۔ اور وہاں اپنے نام کا سکہ چلا رہا تھا۔ اسکے مقبوضات میں باری باری ماژندران (سنہ ۸۰۹ھ = ۷-۱۴۰۶ء)، ماوراء النہر (سنہ ۸۱۱ھ = ۹-۱۴۰۸ء)، فارس (سنہ ۸۱۷ھ = ۵-۱۴۱۴ء)، کرمان (سنہ ۸۱۹ھ = ۱۴۱۶ء) اور آذربائیجان (۸۲۳ھ = ۱۴۲۰ء) شامل ہو گئے۔ پچھلے باب میں جو واقعہ مذکور ہے[2] کہ احمدِ لُر نے شاہرُخ پر قاتلانہ حملہ کیا (سنہ ۸۳۰ھ = سنہ ۱۴۲۷ء) میں پیش آیا۔ بالآخر رَے میں سنہ ۸۵۰ھ (۱۴۴۷ء) میں ۷۲ سال کی عُمر اور ۴۳ سال کا عہدِ حکومت پا کر شاہ رُخ نے وفات کی۔ قراقونیلو خاندان کے حکمران قرا یوسف اور اسکے بیٹے اسکندر کے ساتھ اُس نے کامیاب جنگیں لڑیں۔ لیکن مجموعی طور پر جیسا کہ سر جان میلکم نے کہا ہے[3]: "اس نے باپ کی تاراج کاریوں کی توسیع نہیں بلکہ تلافی کرنی چاہی۔ اُس نے ہرات اور مرو کے شہروں کی فصیلیں پھر سے تعمیر کرائیں اور اپنی سلطنت کے قریب

---

[1] میری ایڈیشن۔ ص ۶-۳۵۵؛ [2] ملاحظہ ہو اوپر ص ۵۰۳

[3] تاریخ ایران طبع سنہ ۱۸۱۵ء جلد اوّل ص ۴۸۰؛

قریب ہر شہر اور صوبے میں فارغ البالی کو بحال کیا۔ مزید برآں سلطان نے ارباب علم وفضل کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا دربار بڑی شوکت والا تھا۔ اس نے ہمعصر فرمانرواؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کیے اور ہمیں اس کے مؤرخ کے اوراق میں چند سفارتوں کے نہایت دلچسپ حالات ملتے ہیں جو اس کے اور شہنشاہِ چین کے درمیان عمل میں آئیں[1]۔

شاہ رُخ کی سیرت کی تصویر فروغی کے قلم سے

شاہ رُخ کی سیرت کے اس تخمینے سے ایران کا جدید ترین مؤرخ میرزا محمد حسین خان ذکاء الملک المتخلص بہ فروغی کامل طور پر متفق ہے۔ لکھتا ہے[2]:

"تیمور کے بعد اس کا بیٹا میرزا شاہرخ اس کا جانشین ہوا۔ مگر وہ بالکل اپنے پیشرو کی ضد یعنی ایک صلح جو اور حلیم شخص تھا جو کبھی کسی کے ساتھ جنگ و جدل کرنے پر آمادہ نہیں ہوا سوائے ان مفسد باغیوں اور ان لوگوں کے جو اس کی سلطنت میں شورشیں بپا کرنے کے وسائل ڈھونڈتے رہتے تھے اور جن کی بیخ کنی وہ ضروری سمجھتا تھا۔ مختصر یہ کہ تیمور نے جس سلطنت کی بنا ڈالی تھی۔ میرزا شاہرخ کی کوششوں نے اسے سنوارا۔ اُس نے اپنے طویل عہد

---

[1] شاہ رُخ نے سنہ ۸۲۴ھ (سنہ ۱۴۲۱ء) میں ہندوستان سے ایک سفارت وصول پائی اور سنہ ۸۳۹ھ (سنہ ۱۴۳۵-۶ء) میں ترک سلطان مُراد ثانی کی جانب ایک سفارت روانہ کی (صحایف الاخبار مصنفہ منجم باشی۔ جلد سوم۔ ص ۷-۵۹)۔ ان سفارتوں کا جو ہندوستان اور چین بھیجی گئیں۔ اسی باب میں آگے چل کر ذکر کیا جائے گا؛

[2] تاریخِ ایران طبع سنگی (طہران سنہ ۱۳۲۳ھ = سنہ ۱۹۰۵ء) ص ۷-۲۶۶؛

کو باپ کی تاخت و تاراج کی تلافی کرنے۔ رعایا کے حالات سے واقف ہونے اور ان کی شادمانی کی تدبیر کرنے میں صرف کیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے، کہ ایسے سنگدل شخص کا بیٹا ایسا رحمدل، مہربان، کریم اور علم نواز ہو اور سب کے ساتھ اور بالخصوص اہلِ فضل و ہُنر کیساتھ لُطف و عنایت سے پیش آتا ہو۔ چنگیز خان کا بیٹا اوگتائی خان بھی کسی حد تک ایسی ہی طبیعت اور عادات کا مالک تھا۔ خصوصًا اپنی سخاوت کی زبردست شہرت تاریخ میں چھوڑ مرا ہے، چنانچہ اسے "عہدِ متأخر کا حاتم" کہتے ہیں اور سابق مؤرخوں کے صفحات پر ہمیں اس کی فیاضی اور رحمدلی کے متعلق کئی حکایتیں ملتی ہیں"۔

دولت شاہ بھی اسی جوش کیساتھ اس کا ثناخوان ہے اور اپنی عادی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ لکھتا ہے:

دولتشاہ کے قلم سے

" رعایا آن آسودگی و فراغت کہ بروزگار دولت او یافتہ اند از عہدِ آدم الیٰ یومنا در ہیچ عہد و زمان واوان نشان نداده اند"۔ دولتشاہ یہ بھی لکھتا ہے کہ سُلطان ایسے پاک اخلاق کا مالک تھا کہ علم غیب اور کرامات اس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ ان کرامات کی دو مثالیں جو اس تذکرہ نگار نے دی ہیں ان میں سے ایک خود مصنف کے والد کی روایت پر مبنی ہے۔ جو شاہ رُخ کے مقربین میں سے تھا۔ تاہم بقولِ تذکرہ نگار شاہرخ پر قہرِ الٰہی نازل ہوا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے اصفہان کے تین عالم اور مقدس بزرگوں کو اس شُبہ پر

---

[1] میری ایڈیشن صفحہ ۳۴۰؛

مروا ڈالا کہ انہوں نے اس کے پوتے سلطان محمد بایسنقر کی بغاوت میں اسکی ہمت افزائی کی۔ مرنے سے پہلے انہوں نے اسے بد دُعا دی۔ ''درِ آسمان گشادہ تھا۔ ان عزیزانِ بیگناہ و مظلوم کی دُعا قبول ہوئی۔ اور اس پادشاہِ عالی منزلت کی نسل منقطع ہوگئی اور سلطنت مرکزِ اصلی کی طرف منتقل ہوگئی''۔ عہدِ شاہ رُخ کے متعدد اربابِ فن اور علماء میں سے دولتشاہ چار کا ذکر خصوصیت سے کرتا ہے[1] جو اس کے دربار کی خاص زینت تھے۔ یعنی خواجہ عبد القادر مراغی عالمِ موسیقی (جسے منجم باشی[2] نے اُن ممتاز اشخاص میں شمار کیا ہے جو سنہ ۸۳۸ھ (۱۴۳۴ء) میں ہرات کی وبائے طاعون کی نذر ہوئے)؛ یوسف اندکانی قوال و مطرب؛ استاد قوام الدین مہندس و معمار؛ اور مولانا خلیل مصور جو اپنے کمال کے لحاظ سے ''ثانی مانی'' تھا۔

ترک مؤرخ منجم باشی[3] بھی شاہ رُخ کی تعریف و توصیف میں ان سیرت نگاروں سے پیچھے نہیں جن کے الفاظ اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ لکھتا ہے:۔ ''(شاہ رُخ) دانا، عادل، صاحبِ حزم اور کرم پرور بادشاہ تھا۔ عفو و درگذر اور کارہائے خیر

...... منجم باشی کے قلم سے

---

[1] میری ایڈیشن صہ ۳۴۰؛

[2] صحایف الاخبار۔ جلد سوم۔ صہ ۵۷ (قسطنطنیہ سنہ ۱۲۸۵ھ)۔ یہ مفید تاریخ اصلاً عربی میں احمد ددے افندی بن لطف اللہ نے تصنیف کی اور سنہ ۱۰۸۳ھ (سنہ ۱۶۷۲ء) تک آتی ہے۔ اسکا ترکی ترجمہ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۲۰ء) میں احمد بن محمد ندیم (الملقب بہ منجم باشی) نے عظیم الشان وزیر داماد ابراہیم پاشا کیلئے کیا؛ [3] صحائف الاخبار۔ جلد سوم صہ ۵۸؛

کی طرف مائل تھا۔ طاعت گزار، پرہیزگار اور متقی تھا۔ سفر ہو یا حضر خواہ جنگ کی گھڑی کیوں نہ ہو کبھی اس نے فجر ظہر اور عصر کی نمازیں فوت نہیں ہونے دیں۔ ایامِ بیض اور ہر مہینے کی پہلی کو روزہ رکھتا تھا۔ اور ہر جمعہ کی شام حفاظِ قرآن کو جمع کیا کرتا تھا۔ اور اپنے سامنے ان سے تلاوت کراتا تھا۔ اپنی ساری زندگی کے دوران میں کبھی وہ دانستہ کسی گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ ہمیشہ علماء و مشایخ کی صحبت کا طالب رہتا تھا۔ اور ان کو بڑے سے بڑے انعاموں اور احسانوں سے نوازتا تھا۔ کبھی اُس نے شکست کا مونھ نہیں دیکھا اور تقدیر نے ہمیشہ اس کی یاوری کی اور برابر مظفر و منصور رہا۔ جب کسی نئی سرزمین پر قدم رکھتا اگر وہاں کوئی درگاہ ہوتی پہلے اُس کی زیارت کرتا۔" اسی مصنف کے الفاظ میں "اس کی سلطنت اکنافِ چین سے روم کی سرحدوں تک اور ترکستان کے دُور ترین علاقوں سے ہندوستان کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی"۔

شاہرخ کے پانچ بیٹوں[1] میں سے صرف ایک الغ بیگ زندہ رہا۔ کہ باپ کے تاج و تخت کو سنبھالے۔ باقی چاروں میں بایسنغر میرزا شاید

---

[1] الغ بیگ اور بایسنغر کے علاوہ باقی تین بیٹے ابو الفتح ابراہیم (المتوفی ۸۳۸ھ = ۵-۱۴۳۴ء) جو شرف الدین علی یزدی مؤرخ کا مربی تھا)؛ سیورغتمش (المتوفی ۸۳۰ھ = ۷-۱۴۲۶ء)؛ اور محمد جوکی (المتوفی ۸۴۸ھ = ۵-۱۴۴۴ء) تھے۔

بایسنقر میرزا سب سے زیادہ ہنرمند تھا[1]۔ ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) میں ۳۷ سال کی عمر پاکر کثرت میخواری سے (جو اس خاندان کی پھٹکار تھی) مرگیا۔ وُہ اپنے خاندان میں علم و فن کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ اسکے دربار میں فارس۔ عراق۔ آذربائجان اور ایران کے ہر حصّے کے خطّاط، مصوّر، جلد ساز اور نقاش جوق درجوق آتے تھے۔ فارسی ادب کے سلسلے میں اس کا نام زیادہ تر شاہنامۂ فردوسی کے اُس دیباچے کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس کی تصنیف اس کی طرف منسوب ہے اور جو اسکے لئے ۸۲۹ھ (۱۴۲۶ء) میں لکھّا گیا۔ حبیب السیر میں اس کی وفات کا مندرجۂ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے ؎

سلطانِ سعید بایسنقر سحرم گفتا کہ بگو باہلِ عالم خبرم
من رفتم و تاریخِ وفاتم این است "بادا بجہان عمرِ دراز پدرم"

شاہ رُخ نے ۱۳ مارچ ۱۴۴۷ء کو رَے کے قریب وفات پائی اور جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے اس کا بیٹا الغ بیگ جانشین ہوا گو بلا مزاحمت نہیں۔

الغ بیگ اپنے باپ کے عہد میں وہ توران یا ترکستان کا والی رہا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے سمرقند میں اپنی مشہور رصدگاہ بنوائی اور وہاں چار ممتاز علماء صلاح الدین موسیٰ المعروف بہ قاضی زادۂ رومی۔ ملا علاءُ الدّین علی قوشجی (شارح تجرید)، غیاث الدین

---

[1] حبیب السیر۔ جلد سوم۔ جزو سوم۔ صك ۱۳۱؛ صحایف الاخبار از منجّم باشی۔ جلد سوم۔ صك ۹۶
بایسنقر کو خطّاطی سے خاص دلچسپی تھی؛

جمشید اور معین الدین کاشانی کی مدد سے قابلِ ذکر رصد تیار کی جو زیجِ الغ بیگ یا زیجِ جدید سلطانی کہلاتی ہے۔ غالباً یہ رصد ۸۴۱ھ (۸-۱۴۳۷ء) میں مکمل ہوئی۔ اسکے متعلق مفصل اطلاعات ریو نے دے دی ہیں[1]۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے الغ بیگ کو اپنا تسلط قائم کرنے میں فوری کامیابی نہیں ہوئی۔ علاؤ الدولہ نے بادشاہت کے لیئے اس کا مقابلہ کیا۔ ہرات پر قبضہ کر لیا اور الغ بیگ کے بیٹے عبد اللطیف کو قید کر لیا۔ الغ بیگ کا اقتدار جب جما

الغ بیگ اپنے فرزند عبد اللطیف کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے

تو زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ کیونکہ اس کے پسرِ موصوف عبد اللطیف کی شہ پر ۱۰ رمضان ۸۵۳ھ (۲۷ اکتوبر ۱۴۴۹ء) کو عباس نامی ایک شخص نے اس کو ہلاک کر دیا۔ اس المناک سانحے کی تاریخ "عباس کُشت" سے نکلتی ہے۔

عبد اللطیف نے باپ کے قتل پر قناعت نہ کی اور اپنے بھائی عبد العزیز کو بھی مار ڈالا۔ لیکن اپنے اس گناہ سے زیادہ دیر نفع نہ اُٹھا سکا۔ اور اگلے سال (۸۵۴ھ = ۱۴۵۰ء) خود

عبد اللطیف

بھی باباحسین نام ایک شخص کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تاریخ "باباحسین کُشت" کے مادے سے نکلتی ہے۔ میر خواند

---

[1] فہرست مخطوطاتِ فارسی ص ۷-۴۵۵۔ جہاں اس تصنیف کی یورپی اشاعات اور ترجموں کا شمار درج ہے۔ نیز ملاحظہ ہو کلیمنٹس مارکھم کی تاریخِ ایران۔ ص ۲۲۴۔ حاشیۂ زیریں؛

اس حادثے کو روایت کرتے ہوئے نظامی کا مشہور شعر نقل کرتا ہے جس میں پدر کُش بادشاہوں کے ناپائدار فروغ کا مضمون ہے ؎

پدر کُش بادشاہی را نشاید
اگر شاید بجز شش مہ نپاید

ترک مؤرخ منجّم باشی رقمطراز[1] ہے۔ عبد اللّطیف ہُنرمند اور با استعداد آدمی تھا مگر تند خُو، سفاک اور بے رحم تھا۔ چنانچہ لوگوں کے دل اس سے پھر گئے تھے۔ اس کے مرنے پر ماوراء النہر میں الغ بیگ کی اولاد کا خاتمہ ہوگیا۔

اس وقت سے لے کر ایران میں اپنے انقراض تک آلِ تیمور اپنی طاقت کا پیوستگی اور وسعتِ مقبوضات سب میں تیزی سے تنزّل کرتی رہی

عبد اللہ بن ابراہیم سلطان بن شاہرخ

یہاں تک کہ حکمرانوں کی زمانی ترتیب بھی کچھ غیر متیقّن سی ہے یا زیادہ صحیح طور پر یُوں کہئے کہ یقین نہیں کسے بالادست سمجھیں اور کسے زبردست۔ چنانچہ سٹینلے لین پول[2] نے عبد اللہ بن ابراہیم سلطان بن شاہرخ کو عبد اللّطیف کا جانشین قرار دیا ہے جبکہ میرخواند اس کی جگہ میرزا ابوالقاسم بابر (مغلیہ سلطنت کا بانی نہیں) بن بایسنقر بن شاہ رُخ کو جانشین بتاتا ہے۔

ابو القاسم بابر بن بایسنقر

ابو القاسم بابر نے مرنے سے چار سال پہلے قراقوینلو ترکمان جہانشاہ بن قرا یوسف سے

---

[1] صحائف الاخبار، جلد سوم۔ صـ ۶۵؛ [2] Stanley Lane-Poole سلسلہ ہائے سلاطین اسلامی (Mohammadan Dynasties) صـ ۲۶۸؛

شکست کھا کر عراق، فارس اور کرمان سے ہاتھ دھوئے۔ اس نے اپنے بھائی اور فارس کے معزول حکمران سلطان محمد کو میدانِ جنگ میں تہ تیغ کیا۔ اس کی اپنی موت سنہ ۸۶۱ھ (۷-۱۴۵۶ء) میں واقع ہوئی ‌‌٭

بایسنغر کا ایک اَور بیٹا میرزا علاء الدّولہ اپنے دادا شاہرخ کی وفات کے وقت ہرات کی ولایت پر مامور تھا۔ لیکن مخالفت کے خفیف مظاہرے

علاء الدّولہ ابنِ بایسنغر

کے بعد اس نے الغ بیگ اور بابر (اوّل) سے صُلح کر لی اور خبوشان (واقع خراسان) سے لیکر استرآباد اور دامغان تک کے علاقے کی حکومت پر قناعت کی۔ سنہ ۸۵۲ھ (۹-۱۴۴۸ء) میں الغ بیگ نے ہرات کے قریب اسے شکست دی۔ اور بدخشان اور دشتِ قپچاق کی طرف بھگا دیا۔ پھر اسے طرح طرح کی نیرنگیاں پیش آئیں جن کے دوران میں چند بار اپنے بھائیوں سے نبرد آزما ہوا۔ اور کُچھ عرصہ اپنے خاندان کے دشمن جہان شاہ قراقونیلو ترکمان کا مطیع رہا۔ بالآخر سنہ ۸۷۵ھ (۱-۱۴۷۰ء) میں راہیِ عدم ہوا۔ اس کا بیٹا ابراہیم اپنے چچا ابو القاسم بابر کی حراست سے بھاگ نکلا۔ اور مُرغاب جا پہنچا۔ وہاں اُس نے

ابراہیم ابن علاء الدّولہ

خاصی فوج اکٹھی کر لی۔ اور ہرات پر متصرّف ہو گیا۔ پھر اپنے چچا (بابر) کے بیٹے شاہ محمود کو شکست دی اور استرآباد میں اسے پامال کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ آناً فاناً زبردست قراقونیلو ترکمان جہان شاہ اس پر چڑھ آیا۔ ہرات سے دستکش ہو کر اس نے غنیم کو پیٹھ دکھائی۔ لیکن جب جہانشاہ یہاں سے واپس ہوا تو

پھر آن پہنچا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اور سلطان ابوسعید نے اسے ہزیمت دی۔ ۸۶۳ھ (۹-۱۴۵۸ء) میں جبکہ لشکر لیکر دامغان سے مشہد کو جا رہا تھا۔ اُس کی موت واقع ہوئی۔ اس کا مذکورہ بالا چچازاد بھائی میرزا شاہ محمود بھی اسی سال مارا گیا۔

میر خواند نے روضۃ الصفا میں میرانشاہ کے پوتے سلطان ابوسعید کی توصیف بدیں الفاظ کی ہے: "سلاطینِ آلِ تیمور میں علوِ ہمّت۔ بلندیٔ مرتبہ۔

سُلطان ابُوسعید بن سُلطان محمّد بن میران شاہ بن تیمُور

اور فراستِ کاملہ کے اعتبار سے سب پر فائق تھا۔ اربابِ فضل، علمائے دین اور ادبا، کا دوست اور مُربّی تھا۔ اور اسکے دورِ حکومت میں ترکستان، توران، خراسان، زابلستان، سیستان اور ماژندران کے ممالک اقبال مندی کے عروج پر پہنچے۔" اپنی ابتدائی زندگی میں وُہ اپنے قابل ولائق قرابتدار الغ بیگ کے دربار سے وابستہ رہا۔ جس کے بیٹے عبداللطیف نے اپنے باپ کو مروا کر ابوسعید کو زندان میں ڈال دیا۔ پہرہ داروں کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر ابوسعید قید سے نکل بھاگا۔ اور بخارا جا پہنچا۔ جب خود عبداللطیف بھی مارا گیا تو وُہ لشکر لیکر بخارا سے اُٹھا۔ اور اپنے رشتہ دار ابوبکر کو شکست دیکر ترکستان اور توران میں مختارِ کل ہو بیٹھا۔ ۸۶۱ھ (۷-۱۴۵۶ء) میں اُس نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ اور گوہر شاد خاتون کو مار ڈالا۔ ۸۶۲ھ (۸-۱۴۵۷ء) میں جہانشاہ نے خراسان پر چڑھائی کی اور ہرات پر قابض ہو گیا۔ لیکن بعد میں ابوسعید کے حق میں اس سے

دست بردار ہو گیا۔ دس برس بعد یعنی ۸۷۲ھ[1] (۸-۱۴۶۷ء) میں جب حریف قبیلے یعنی آق قونیلو ترکمانوں کے سلطان اوزون حسن نے جہانشاہ کو زک دیکر تہِ تیغ کیا تو ابوسعید کو ان حالات سے فائدہ اُٹھانے کی اُمّید ہوئی۔ ادھر عراق فارس، کرمان، آذربائجان اور دُوسرے کھوئے ہوئے علاقوں کے وفد اس کے پاس دعوتِ تسخیر لیکر پہنچے۔ جس سے اس کی ہمّت اَور بڑھی۔ چنانچہ فوج لیکر مغرب کی جانب اپنے نئے حریف اوزون حسن سے جنگ آزما ہونے چلا۔ لیکن میانہ کے پاس اس سے شکست کھاکر گرفتار ہوا۔ تین دن بعد اس کے حریفِ غالب نے اس کی ہلاکت کا فیصلہ کرکے اسے یادگار محمد کے سپرد کردیا۔ جس نے اپنی دادی گوہر شاد خاتون کے خون کا انتقام لینے کے لئے اسے قتل کردیا۔ ایران کا فلسفی جلال الدّین دوّانی جو مشہور اخلاقی کتاب "اخلاقِ جلالی" کا مصنّف ہے ذیل کے قطعۂ تاریخ میں اُس کی یادگار قائم کرتا ہے ؎

سلطان ابوسعید کہ در فرِّ خسروی
چشمِ سپہرِ پیر چو او نوجوان ندید
الحق چنان بکشتہ بکشتی کہ کشتہ بود
تاریخِ سال "مقتل سلطان ابوسعیدؒ"

وینیزی سیّاح ابُوسعید کو بُوسچ لکھتے ہیں

اس دور کے وینیزی سیاح جن کی دی ہُوئی بہت سی

---

[1] ۸۷۳ھ مطابق ۹-۱۴۶۸ء؛

دلچسپ اطلاعات اور جداگانہ تاریخی تفصیلات کے ہم ممنون ہیں ابو سعید کو "بُوسیچ"[1] لکھتے ہیں۔ اوزون حسن کو "اُسن کسانو"[2]۔ "اسمبیو"[3] یا "اسمبی"[4] اور جہان شاہ کو "گیانسا"[5]۔ اسی طرح اُن کے سیاحت ناموں میں عُرفہ، اصفہان، کاشان، قُم، یزد اور خرپُوت کے ناموں کی شکلیں علی الترتیب "اورفی"۔ "سپاہم"۔ یا "سپاآن"۔ "کاسن"۔ "کومو"۔ "جیکس۔ اور کارپرتھ" دی گئی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ روضۃ الصّفا اور حبیب السیر وغیرہ عمومی تاریخوں کے علاوہ

مطلع السّعدین کی تاریخی قدر و قیمت

کمال الدین عبد الرزاق کی تاریخ "مطلع السعدین" بھی اس عہد کی تاریخی اطلاعات کا ایک گراں قدر خزانہ ہے یہ کتاب مخصوصًا "دو مبارک ستاروں" کے زمانۂ حکومت پر موقوف ہے۔ ان سے مراد دونوں ابو سعید ہیں۔ ایک تو مغول ایلخانی جس کا عہدِ سلطنت ۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ (۱۳۱۶ء تا ۱۳۳۵ء) ہے۔ اور دُوسرا تیموری ابو سعید جو زیرِ بحث ہے مطلع السعدین کی تکمیل ۸۷۵ھ (۱-۱۴۷۰ء) میں یعنی ابو سعیدِ متاخّر کی وفات کے صرف دو سال بعد ہوئی۔ اب تک یہ تاریخ چھپی نہیں[6]۔

---

[1] Busech
[2] Ussun Cassano
[3] Assimbeo
[4] Assambei
[5] Giansa
[6] بہ تصحیح و ترتیب خان بہادر مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، اورینٹل کالج میگزین میں، باقساط چھپ رہی ہے۔ (مترجم)

ابوسعید کے بعد اس کے دو بیٹے احمد اور محمود باری باری تخت پر بیٹھے۔ سٹینلے لین پول نے انہیں ایران اور وسطِ ایشیا میں آلِ تیمور کے آخری (ہشتم و نہم)

ابوسعید کے بیٹے احمد اور سعید

تاجدار شمار کیا ہے۔ ان میں اوّل الذکر نے ماوراء النہر میں حکومت کی اور سمرقند کو اپنا پایۂ تخت رکھا۔ دوسرا یعنی محمود بدخشان، ختلان اور ترمذ وغیرہ میں حکمران رہا۔ اور شیبانی خان ازبک کے ہاتھوں ہلاک ہُوا۔ دونوں کی موت پندرھویں صدی کے آخری سنین (علی الترتیب ۸۹۹ھ = ۱۴۹۳-۴ع اور ۹۰۵ھ = ۱۴۹۹-۱۵۰۰ع) میں واقع ہوئی ⁘

سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں تو ادبی نقطۂ نظر سے ان پچھلے دو سلطانوں سے کہیں زیادہ اہم سلطان حسین بن منصور بن بایقرہ تھا۔ جس کا دربار ہرات

سلطان حسین بن منصور بن بایقرہ

فن وادب اور علم وفضل کے ان درخشندہ ترین مرکزوں میں سے تھا۔ جو ایران میں کبھی پیدا ہوئے۔ اس شہزادے کو جو ابتداء میں الغ بیگ کی سرکار اور سایۂ عاطفت کا دامن پکڑے ہوئے تھا۔ الغ بیگ اور اسکے بیٹے عبداللطیف کے مرنے کے بعد ابوسعید نے قید کر دیا تھا۔ لیکن یہ وہاں سے چھُپ کر نکلا۔ اور ابوالقاسم بابر سے مل کر خوارزم یا خیوا کو بھاگ گیا۔ ۸۶۲ھ (۱۴۵۷-۸ع) میں اُس نے صوبۂ گرگان یا جُرجان (قدیم ہرکینیا[1]) کے پایۂ تخت استراباد کو مسخر کیا۔ اور وہاں اس کی تاج پوشی ہوئی۔ لیکن اس نے ابوسعید کو اپنا

لہ Hyrcania

حکمفرمائے اعلیٰ تسلیم کیا۔ اور اس کے جوار کا دامن پکڑا۔ ایک سال گذرنے پر ابوسعید نے پھر اسے خوارزم بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ اور خود استراباد پر تصرف کر لیا۔ لیکن جلد ہی سلطان حسین نے گرگان اور ماژندران کے صوبوں سمیت دوبارہ استراباد پر قبضہ کر لیا۔ ابوسعید کے مرنے پر اُس نے ہرات تسخیر کیا۔ اور وہاں ۱۰ رمضان ۸۷۲ھ (۳ اپریل ۱۴۶۸ء) کو اس کی رسم تاجپوشی ادا ہوئی۔ منجم باشی نے اس تاریخ کو اس کے ۳۸ سالہ عہدِ حکومت کی ابتدا قرار دیا ہے جو ۱۱ ذی الحجہ ۹۱۱ھ (۵ مئی ۱۵۰۶ء) کو بروزِ دوشنبہ اس کی موت سے ختم ہُوا جبکہ اس کی عمر ستّر سال ہو چکی تھی۔ اس زمانے کے آخری بیس سال اس کے جسم کا کچھ حصّہ مفلوج رہا۔ اس کا قابل وزیر میر علی شیر نوائی جو نہ صرف اپنے آقا کی طرح ادبا و فضلا کا مربّی تھا۔ بلکہ نظم و نثر دونوں میں (خصوصاً تُرکی زبان میں) اعلیٰ پائے کا مصنّف تھا۔ ۱۲ جمادی الثّانی ۹۰۶ھ (۳ جنوری ۱۵۰۱ء) کو ۶۲ سال کی عُمر پاکر فوت ہُوا۔ اسکی زندگی اور اس کے ادبی مشاغل پر ایک جداگانہ مقالہ موسیو بیلین[۱] نے مجلّہ آسیائی بابت ۱۸۶۱ء میں شائع کیا تھا[۲]۔ جو ایک کتابچے کی شکل میں علیحدہ بھی

---

[۱] M. Belin ؛ [۲] میر علی شیر کے وقائع عمری اور ادبی مشاغل کا تذکرہ اور اس کی تصانیف کے اقتباسات مرتبہ موسیو بیلیں (Notice biographique et litteraire sur Mir Ali-Chir Nevaii, suivie d'extraits tires des aeuvrs du meme auteur, par M. Belin.) یہ مقالہ ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے ؛

چھپا۔ سلطان حسین کو ادبی ذوق کے علاوہ کبوتروں، پالی کے مُرغوں اور دُوسرے پرندوں کا بیحد شوق تھا۔ اور وہ اپنے خاندان کے بہُت سے افراد کی طرح کثرتِ مے نوشی میں مبتلا تھا؀

ابھی نسلِ تیموری کے بزرگ ترین رُکن ظہیرالدین بابر کا ذکر کرنا باقی ہے۔ گو اس نے ایران پر کبھی حکومت نہیں کی لیکن وہ ہندوستان میں

ظہیرالدّین بابر

ایک نئی اور شاندار تیموری سلطنت کا بانی تھا۔ اس خاندان کے بادشاہوں میں جو یورپ میں عموماً "مغلہائے بزرگ" کے نام سے معروف ہیں ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگزیب عالمگیر کے سے رفیع الشان فرمانروا شامل ہیں۔ ہرچند یہ سلطنت اقبال و سعادت اور خوبیوں سے رفتہ رفتہ عاری ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کا وجود ۱۸۵۷ء کے عظیم ہندوستانی غدر تک قائم رہا۔ اٹھارویں صدی کے اوائل تک دِلّی میں ان کا پرشکوہ دربار کثیر التعداد ممتاز ایرانی شاعروں، عالموں اور ادیبوں کو کھینچتا رہا۔ اور یہ ایک ایسا زمانہ گزرا ہے جبکہ دِلّی میں ہُنر و استعداد کی قدر اصفہان سے بڑھ کر اور تربیت وہاں سے زیادہ فیاضانہ ہوتی تھی؀

توزکِ بابری

بابر کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات جو غیر معمولی طور پر مکمّل و مستند ہیں ہمیں اس کی خود نوشتہ سوانح عمری میں ملتی ہیں۔ یہ سوانح عمری جو عموماً "بابر نامہ" کے عنوان سے مشہور ہے بابر نے ترکی یا چغتائی زبان میں لکھی۔ اس بے مثل کتاب کے اصل ترکی

متن کی ایک طبع المنسکی[1] نے ۱۸۵۷ء میں کازان[2] سے شائع کی تھی[3]۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد کے اس نسخے کی (جو ان ہی دنوں منکشف ہوا تھا) ایک عکسی طبع مسز بیوریج[4] نے سلسلۂ مطبوعاتِ گب کے لئے تیار کی[5]۔ اس ترکی متن کو "موسیو پاوے دو کورتئیہ"[6] نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ اور یہ ترجمہ ۱۸۷۱ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ اصل کتاب کا ایک فارسی ترجمہ بھی موجود ہے۔ جو واقعاتِ بابری یا توزکِ بابری کے عنوان سے معروف ہے اور ۹۹۸ھ (۹۰-۱۵۸۹ء) میں بابر کے پوتے شہنشاہِ اعظم اکبر کی فرمائش پر اسکے ہنرمند سپہ سالار مرزا عبدالرحیم خان خاناں نے تیار کیا[7]۔ ڈاکٹر لیڈن[8] اور مسٹر ولیم ارسکن[9] کا مشہور انگریزی ترجمہ (مطبوعہ لندن ۱۸۲۶ء) اسی ترجمے پر مبنی ہے۔ اسکے

میرزا حیدر دُغلات کے وقائع

علاوہ بابر کے حالات کے لئے ہمارے پاس اسکے خالہ زاد بھائی میرزا حیدر دُغلات کے پر قدر اور بصیرت افروز وقائع ہیں۔ انگریزی خوان یہ وقائع سر ای ڈینی سن راس[10] کے ترجمے میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ترجمہ دیباچہ، تمہید،

---

[1] Ilminsky ؛ [2] Kazan ؛

[3] اس کا متن ۵۰۶ صفحات پر مشتمل ہے ؛

[4] Mrs. Beveridge ؛ [5] متن کے ۳۸۲ اوراق، اشاریات کے ۱۰۷ صفحات اور دس صفحے کے ایک دیباچے پر مشتمل ہے ؛ [6] M. Pavet de Courtaille ؛

[7] ملاحظہ ہو ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی صفحہ ۲۴۴ بعد ؛ [8] Dr. John Leyden ؛

[9] Mr. William Erskine ؛ [10] Sir E. Denison Ross ؛

شرح، حواشی اور ایک نقشے کے ساتھ آنجہانی مسٹر ایلیاس[۱] نے (کہ سابقاً خراسان اور سیستان میں برطانیہ کے قونصل جنرل تھے) مرتب کیا ہے اور اس کا عنوان "مغولانِ ایشیائے وسطی کی ایک تاریخ یعنی میرزا محمد حیدر دُوغلات کی تاریخِ رشیدی[۲]" رکھا ہے۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں لندن سے شائع ہوا۔ جیسا کہ اِس کتاب کے اس عنوان سے آشکار ہے۔ اس کی حدودِ موضوع بابر نامے سے بہت زیادہ وسیع ہیں۔ میرزا حیدر نے اپنی تالیف میں بابر نامے سے استفادہ کیا ہے[۳] اس کی معلومات کی بہت کچھ تکمیل کی ہے اور اطلاعات پر مزید روشنی ڈالی ہے[۴]۔ یہ دونوں تصنیفیں تو خاص توجّہ کی مستحق ہیں نہ صرف اس سبب سے کہ ان کے مصنّف عالی رُتبہ تھے۔ بلکہ اس لئے کہ جو تاریخ وہ تحریر کرتے ہیں اس کی تعمیر میں خود عملی حصّہ لے رہے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اس دور کے تاریخی مآخذ غیر معمولی طور پر سیر حاصل اور ثقہ ہیں ؛

بابر کی زندگی مفصّل طور پر مذکورہ بالا اور متعدد تصانیف[۵] میں پڑھی

---

[۱] Mr. Ney Elias [۲] A History of the Moghuls of Central Asia, being the Tarikh-i-Rashidi of Mirza Mohammad Haydar Dughlat. ؛ [۳] مسٹر ایلیاس (Mr. Ney Elias) کے ترجمے کے مقدمے کا ص ۲۳ ملاحظہ ہو ؛ [۴] بابر نامے کے اندراجات سنہ ۹۳۶ھ (۳۰-۱۵۲۹ء) تک آتے ہیں اور تاریخ رشیدی میں سنہ ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) تک کی تاریخ ہے ؛ [۵] بابر کے حالات کا بہترین بیان ولیم ارسکن William Erskine کی تصنیف "آلِ تیمور کے پہلے دو بادشاہوں یعنی بابر اور ہمایوں کے عہد کی تاریخِ ہند" (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

جا سکتی ہے۔ یہاں اسکے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ اجمالی نظر سے ہم اسے تین

بابر کے حالاتِ زندگی کا خاکہ

حصّوں میں منقسم دیکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلا حصّہ فرغانہ کی مختصر ریاست میں گزرا جہاں وہ ۱۴۸۲ء میں پیدا ہوا۔ اور جہاں سے شیبانی خان اور اس کے ازبکوں نے اسے ۱۵۰۴ء کے قریب بدر کر دیا۔ دوسرے دور (۱۵۰۴ء تا ۱۵۲۵ء) میں وہ افغانستان اور بدخشان پر حکمران رہا۔ بالآخر اس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اور "خاندانِ مغلہائے بزرگ" کی بنیاد اِس مُلک میں ۲۰ر اپریل ۱۵۲۶ء کو پڑی۔ جب بابر نے دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی پر شاندار فتح پائی۔ اور آگرہ، دہلی اور دریائے سندھ سے بنگال تک تمام شمالی ہند اپنے تصرّف میں لے آیا۔ تیسرا اور سب سے مختصر دور ۲۶ر دسمبر ۱۵۳۰ء کو بابر کی وفات پر ختم ہوا۔ اور اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا۔ بابرنامے کے اندراجات بابر کے جلوس یعنی رمضان ۸۹۹ھ (جون ۱۴۹۴ء) سے شروع ہوتے ہیں (جبکہ اس کی عمر ابھی کل بارہ سال تھی) اور اسکے سالِ وفات سے ایک سال قبل یعنی ۹۳۶ھ (۳۰-۱۵۲۹ء) تک چلتے ہیں لیکن اس میں کچھ رخنے بھی ہیں۔ یعنی ۹۱۵ھ تا ۹۲۴ھ (۱۵۰۹ء تا ۱۵۱۸ء) اور ۹۲۷ھ تا ۹۳۱ھ (۱۵۲۱ء تا ۱۵۲۵ء) کے واقعات قلمبند نہیں ہیں؛

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۳) History of India under the two first Sover-eigns of the House of Taimur, Baber and Humayun. دو جلدوں میں۔ لندن ۱۸۵۴ء)؛

ہم اپنے موضوعہ عہد کی حدّوں سے تجاوز کر گئے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک تاریخِ ایران کا تعلق ہے آلِ تیمور اس میں ۱۵۰۰ء سے قبل ناپید ہو جاتی ہے۔ اس خدا ناترس خونی تیمور نے جو عظیم سلطنت قائم کی تھی۔ اسے اس کے حلیم اور روشن خیال بیٹے شاہرخ نے اپنے مرتے دم (۸۵۰ھ = ۱۴۴۷ء) تک برقرار رکھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی روئداد بیشتر برادر کشانہ جنگوں اور ازبکوں اور دوسرے وحشی قبیلوں کے حملوں کی ایک افسردہ کن داستان ہے۔ اس تاریک پہلو کی تلافی شاعروں، باکمالوں اور عالموں کی ان درخشندہ کہکشاؤں سے ہوتی ہے۔ جنہیں ان فتنہ خو اور جنگ جو امیروں کی بے حساب بخشش اور مسلمہ خوش مذاقی کی کششیں برابر مختلف درباروں خصوصاً دربارِ ہرات میں جمع کرتی رہتی تھیں۔ اس دور کے محاربوں کی تفاصیل جو طول و بسط کے ساتھ میر خواند، خواندمیر، عبدالرزاق (اور انگریزی میں) ارسکن[1] نے قلمبند کی ہیں خاصی تھکا دینے والی ہیں۔ کیونکہ یہ کشاکش کچھ قوموں اور اصولوں کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہی گھرانے کے جاہ طلب افراد کے درمیان ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں اپنے مقصد کے لئے سر جون میلکم[2] کے ان الفاظ سے آگے جانے کی ضرورت نہیں جن میں موصوف نے ایرانی تاریخ کے اس دور کا خلاصہ پیش کیا ہے لکھتے ہیں[3]: "الغ بیگ کی موت (۸۵۳ھ = ۱۴۴۹ء) کے بعد ہمیں تیمور کے

---

[1] پچھلا ذیلی حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔ ونسنٹ اے سمتھ (Vincent A. Smith) کی کتاب "اکبرِ اعظم" (Akbar the Great Moghul) ارسکن کی تصنیف کی ایک عمدہ ذیل ہے۔ (مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۷ء) اکبر کا عہد ۱۵۴۲ء تا ۱۶۰۵ء ہے!

[2] Sir John Malcolm

کے اخلاف کا ایک ہجوم نظر آتا ہے جس کے لوگ اس کی سلطنت کے صوبوں پر قبضہ کرنے کیلئے باہم برسرِپیکار ہیں اور لوگوں کے دلوں میں اس ہیرو کی اولاد کا ایسا احترام تھا کہ کوئی شخص جو اپنی رگوں میں تیموری خون کا دعویٰ کر سکتا ایسے حمایتی حاصل کر لیتا جو یا تو اسے کوئی تخت دلوانے کا سامان پیدا کرتے یا ایک واجب الاحترام قبر۔

دُوسری طرف ان سلاطین کے فنّی و ادبی کمالات اور مذاق کی زور دار شہادت دیکھنی ہو تو ایرانی مصوّری اور تصویر چوں[۱] کے فن کے عالم مستند ڈاکٹر ایف۔آر۔ مارٹن[۲] کے الفاظِ ذیل میں دیکھیے جو اُن کی معرکۃ الآرا تصنیف[۳] "ایران ہندوستان اور ٹرکی کی تصویر چہ کشی اور اُنکے تصویر چہ کش" میں سے نقل کئے ہیں[۴]:-

"جلد ہی تیموریوں نے ایک ایسے ڈھب کی زندگی اختیار کی جو اُن کے آبا و اجداد کی جنگوں میں سمیٹی ہوئی دولت کیساتھ نبھ سکتی تھی۔ اور جتنی جلد ہو سکا انہوں نے اس دولت کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ تاریخ جو واقعات کو مسلسل دُہراتی رہتی ہے ان فرمانرواؤں کی زندگی کا ایک سچا رزمیہ افسانہ پیش کرتی ہے۔ انہیں دیکھ کر ہمیں شانسوں دو ژلیست کے قدیم پیلادِن[۵] یاد آجاتے ہیں جو ایک قلیل عرصۂ دہر میں مسندِ شاہی کے کرّ و فر سے انتہائی تنزّل کے گڑھے میں جا گرے تھے۔ باایں ہمہ ایرانی

اِس دور کی ایرانی مصوّری پر ڈاکٹر مارٹن کے الفاظ

ڈاکٹر ایف۔ آر۔ مارٹن ۔ Dr. F. R. Martin[۲] ؛ Miniatnres[۱]

The Miniature Painting and Painters of Persia, India and Turkey.[۳] کوارِچ Quatritch ۱۹۱۲ء ؛ [۴] ص ۹-۳۵ ؛ [۵] حاشیہ سامنے دیکھیے؛

بادشاہوں میں ان سے بڑے فن شناس اور فن پرست نہیں ہوئے اگر تیمور کے فتحمند لشکروں نے صناعی کے بہت سے نمونے برباد کر دئے تو اسکے جانشینوں نے صناعی کے ایسے ایسے شاہکار پیدا بھی کرائے کہ اگر وُہ نہ ہوتے تو ان عجائب و نفائس کا وجود عمل میں نہ آتا۔ کیا ایک سمرقند ہی تیمور کے برباد کئے ہوئے کئی شہروں کا نعم البدل نہیں؟ جو کچھ اس نے تباہ کیا اسکا از خود تباہ ہونا پہلے سے مقدّر تھا۔ اور تیمور نے اُسے صرف آخری دھکا دیکر ختم کر دیا۔ ہم تیمور کو مسماری کا آلہ سمجھنے کے عادی ہیں لیکن حقیقتہً وہ ایسا نہ تھا۔ بلکہ ایسا صاحب اختیار شخص تھا جس نے آہنین سختی کیساتھ حالات کو منظّم کیا۔ اسکی زندگی زمانے کی فطری رفتار کے سلسلے کی ایک کڑی تھی اور اُس کی سلطنت میں سے آئندہ قرنوں کا ایران نئے سانچے میں ڈھل کر نکلا۔ اسکے جانشینوں نے صناعی کو اوجِ کمال تک پہنچایا تیموری لوگ کوئی وحشی نہ تھے۔ ان کی ہر چیز بلا شبہ اسی حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ یہ نہایت متمدن اور شائستہ لوگ تھے صحیح معنوں میں عالم و فاضل تھے اور فن کے صرف فن کی خاطر پرستار تھے۔ ایمیں نمود و نمائش کو کچھ دخل نہ تھا۔ جب انکو جنگ و جدل سے فرصت ملتی تو وہ اپنے کتابخانوں کی فکر اور شعر و شاعری سے لذت اندوز ہوتے انمیں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے درباری شاعروں کی شاعری سے کہیں بہتر کلام تصنیف کیا۔ سلطان حسین میرزا کچھ کم پایہ شاعر نہ تھا۔ اور اسکی ترکی غزلیں بہت سے مشہور شاعروں

ـلہ (حاشیہ صفحہ ۵۴۶) Paladins in the Chansons de Gestes. - شانسوں دو ژیست "بہادرانہ کارنامے کا نغمہ" قدیم فرانسیسی رزمیہ نظموں کو اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں مشہور ترین نظم "شانسوں دو رولیں" (Chansons de Roland) ہے۔ پیلادن وہ بارہ بانکے سردار تھے جو رومن شہنشاہ شارلیمین (Charlemagne سنہ ۷۴۲ء تا ۸۱۴ء) کے دربار سے وابستہ تھے۔ شانسوں دو رولیں کا ہیرو رولیں بھی ان ہی میں شامل تھا۔ (مترجم)

کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ وہ عربی میں بھی کہتا تھا اور مشہور شاعر جامی سے اسکی مسابقت تھی۔ زندگی کے نہایت مہذب طور طریقے اُن دنوں متداول تھے جو بعض لحاظ سے ہمیں اسی زمانے کے یورپ یا اٹھارویں صدی کے فرانسیسی بادشاہوں کی یاد دلاتے ہیں۔ گو ادبی ذوق میں تیموری اُن سے کہیں آگے ہیں ❊

"بایسنغر۔ شاہرخ، الغ بیگ اور سلطان حسین میرزا کتابوں کے عاشق تھے۔ اُن کے ہمعصر برگنڈی کے ڈیوک[1] یا رنے شاہِ آنژو[2]" اس شوق میں انکو

---

[1] Dukes of Burgundy یہ تعداد میں چار تھے ان کی ترتیب یہ ہے:۔ ڈیوک فلپ دلیر (Duky Philip the Bold عہدِ حکومت ۱۳۶۳ء تا ۱۴۰۴ء)؛ جون نڈر (عہدِ حکومت ۱۴۰۴ء تا ۱۴۱۹ء)؛ فلپ نکوکار (عہدِ حکومت ۱۴۱۹ء تا ۱۴۶۵ء)؛ چارلس دلیر (Charles the Bold عہدِ حکومت ۱۴۶۵ء تا ۱۴۷۷ء)؛ ان کا کتابخانہ "دُنیائے عیسائیت کا بہترین کتاب خانہ" سمجھا جاتا رہا۔ لیکن مشرقی کتاب خانوں کے مقابلے پر اس کتابخانہ کا پیمانہ بہت چھوٹا تھا۔ اور نسخوں کی تعداد کل ایک ہزار کے لگ بھگ تھی جو ان چاروں حکمرانوں کی کوشش سے جمع ہوئے۔ نسخوں کی تیاری میں یہ ڈیوک بہت خرچ کرتے تھے۔ اور اس میں سونا چاندی اور جواہر استعمال کرتے تھے۔ انکے درباری مصنّفوں کی اکثر کتابیں ان ہی کی شان میں ہیں۔ مجموعے میں دینیاتی۔ موعظتی اور تاریخی کتابیں شامل تھیں۔ کتاب فروشوں کے مربّی تھے۔ کتاب کے ہدیے کو بہترین ہدیہ سمجھتے تھے۔ میدانِ جنگ میں بھی کتابیں لیکر جاتے تھے۔ نسخوں کی ظاہری ساخت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اور انکے نفسِ مضمون کو کم۔ ملاحظہ ہو کارٹلیری Cartellieri کی تصنیف "دربارِ برگنڈی" (The Court of Burgundy) میں کتابخانے کا باب (مترجم)۔

[2] آنژو (Anjou) انقلاب سے پہلے فرانس کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں کا بادشاہ رنے (Rene)

مات نہیں کر سکتے۔ شہرت و ناموری میں بھی یہ لوگ سولھویں اور سترھویں صدی کے فرانسیسی اور اطالوی شائقینِ کتاب سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ صرف کتابیں جمع کرنا ہی اُن کا کام نہ تھا بلکہ کتابیں پیدا کرتے تھے۔ ایران کے حق میں بایسنغر اور حسین میرزا وہی کچھ ہیں جو چار سو سال آگے چل کر ولیم مورس[1] انگلستان کے حق میں ثابت ہوتا ہے۔ اُنھوں نے کتاب کی ایک نئی وضع ایجاد کی جو یورپی کتابوں کی وضع سے بہت زیادہ دیرپا، صنعت کارانہ اور طمطراق والی تھی۔ کام کی نفاست کے اعتبار سے یورپ کی عمدہ ترین کتابیں اور نسخے گنتی کی چند ایک مثالوں کے سوا مشرقی نمونوں

(بقیہ حاشیہ ص ۵۴۸) ۱۶ جنوری ۱۴۰۹ء کو پیدا ہوا۔ اور ۱۰ جولائی ۱۴۸۰ء کو فوت ہوا خود شاعر اور مشہور مصوّر تھا اور مُحبِّ نزاشی مصوری، کتابوں کی تنقیش و طلاکاری اور قالی بافت کے فنون کی تربیت و ہدایت کرتا تھا۔ ان فنون میں اُس نے ایک نئے دبستان کی بنا ڈالی۔ اس کے دربار سے بہت سے علماء و ادباء وابستہ تھے۔ (مترجم)

[1] William Morris انگلستان کا مشہور شاعر اور مصنّف تھا۔ ۲۴ مارچ ۱۸۳۴ء کو پیدا ہوا اس کی پُرنگاری حیرت انگیز ہے۔ دیگر حیثیتوں کا بھی مالک تھا۔ فنِ تعمیر کے تزیینی پہلوؤں کا ماہر تھا۔ عُمر کے آخری حصّے میں سیاسیات میں بھی حصّہ لیتا رہا۔ انگلستان میں اس نے تزیینی فن کے احیاء کی رہنمائی کی۔ اوائل عمر میں اس نے گھر سجانے کو اپنا پیشہ قرار دیا اور اس غرض کیلئے اپنے فنکار دوستوں کیساتھ مل کر ایک کمپنی کھولی۔ اس میں وہ گھروں کے لئے ہر قسم کا سامانِ آرائش، قالین، فرنیچر، دیواروں کے کاغذ، سوزن کاری اور قالی بافت کی چیزیں وغیرہم اپنے سوچے ہوئے نمونوں اور ہدایتوں کے مطابق تیار کراتا تھا۔ فطری تزیین کا دلدادہ تھا۔ باوجود اس کے کہ فن اس کی روزی کا وسیلہ بھی تھا۔ وُہ دولت کے لئے فن کے معیار کو گرانا کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں اس نے ایک مطبع جاری کیا اور فنِ طباعت میں بڑی بڑی باریکیاں اور صنعتیں نکالیں۔ اس کے مطبع کا بہترین کارنامہ چوسر کا کلیات مانا جاتا ہے۔ مورس نے ۱۸۹۶ء میں وفات پائی۔ (مترجم)

کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکتے *

"بالیسنغر شاہرخ کا بیٹا اور تیمور لنگ کا پوتا تھا۔ استرآباد میں جہاں وُہ گورنر تھا ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) میں وفات پائی۔ جبکہ اس کی عمر ۳۷ برس

بالیسنغر کا شمار عظیم ترین شائقینِ کتاب میں

کی تھی وُہ ایرانی کتاب سازی کے ایک نہایت نفیس طرز کا موجد تھا۔ اور بجا طور پر اس کا نام دنیا کے عظیم ترین عاشقانِ کتاب میں محفوظ رہے گا۔ اس کے زیرِ اہتمام مولانا جعفر تبریزی کی نگرانی میں چالیس خطاط نسخے نقل کرنے پر مامور تھے۔ مولانا جعفر خود عبداللہ بن میر علی کے شاگرد تھے بڑی بڑی تنخواہوں اور شاہانہ بخششوں کے عوض بالیسنغر اپنے زمانے کے بہترین باکمالوں کو اپنی خدمت میں منسلک رکھتا تھا۔ اور یہ باکمال اعلیٰ مجلدات کی تیاری میں غایت درجے کی کاریگری صرف کرتے تھے۔ کاغذ بے مثل ہوتا تھا۔ نقش و نگار میں انتہائی نزاکت پیدا کی جاتی تھی اور جلدیں تو آج تک ان کی سی تیار نہیں ہوئیں۔ اس کے وسیع کتب خانے کی کتابیں اب کل دُنیا میں بکھر گئی ہیں اور جہاں کہیں ملیں قدر و احترام کی مستوجب ہیں *

اِس دَوْر میں دُوسری صنعتوں کا معراج

"حقیقت یہ ہے کہ ایران میں نفیس ترین قالین شاہ عباس کے زمانے میں نہیں بلکہ تیموریوں کے زمانے میں بنے ہیں۔ عُمدہ ترین اسلحہ اور زرہیں اور ہاتھی دانت کا کام جس کی باریکی تمام دُوسرے ممالک

کے نمونوں سے بڑھ گئی ہے۔ سب اُن کے دربار کی پیداوار ہے۔ ایرانی صنعت کے ان تمام نمونوں کا مبدأ و منبع جن میں اعلیٰ ترین مذاق اور کاریگری آشکار ہے تیموریوں کا زمانہ یا دورِ صفوی کے آغاز کا سرا ہے ؎

"مشرق کی تمام صنّاعانہ پیداوار براہِ راست بادشاہ کی تشویق کا ثمر ہے اگر بایسنغر اور سلطان حسین میرزا نہ ہوتے تو ہم اُن کے پروردہ باکمالوں کی دلپذیر مرقّع کشی سے محروم رہ جاتے۔ کیونکہ یہ خود ہی اپنی تصانیف تھیں جن کی آرائش و تنقیش کیلئے وہ اپنی سلطنت کے گوشے گوشے سے مصوّروں کی

"مشرق کی کُل حقیقی صنّاعی درباری صنّاعی ہے"

اتنی آؤ بھگت کرتے تھے۔ شاہ عباس نہ ہوتا تو ہمارے پاس خوشنا نقش و نگار کی مخمل نہ ہوتی۔ اور سلیمانِ عظیم الشان نہ آتا تو آج ہم ازنیق کی چینی ظرف سازی نہ دیکھتے۔ سلطان احمد پیدا نہ ہوتا تو قرآن کے بےنظیر اور نظر نواز نسخے نہ ہوتے جن کے دم سے آج بھی ان لوگوں کے ذوقِ جمال کو بقا حاصل ہے۔ مشرق کی کل حقیقی صنّاعی درباری صنّاعی ہے یا ہنر پرور مربّیوں کی تربیت پر موقوف رہی ہے۔ نویں صدی میں بغداد کے عبّاسی دربار پر اس کا دار و مدار رہا۔ مصر اور اسپین میں ہر جگہ یہی کچھ نظر آتا ہے۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس سے بہت سی ایسی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں جو اسکے بغیر ناقابلِ فہم ہیں ؎

"یہ اندازہ کرنا کہ ایسی روشن صنّاعی تاجدار کے معدوم ہونے کے ساتھ بالکل مٹ جاتی ہوگی غلط ہے۔ وہ بادشاہ نہ رہے لیکن باکمال زندہ

سولھویں صدی میں آکر اس صنّاعی کا زندہ رہنا

رہے اور اُنہوں نے اوروں کا دامن پکڑا۔ تیمور کی دی ہوئی تشویق ایسی زور دار تھی کہ سولھویں صدی کے ایک بہت بڑے حصّے تک قائم رہی۔ ایران کے نئے فرمانرواؤں یعنی صفویوں ہی پر موقوف نہیں دُوسرے چھوٹے چھوٹے تاجداروں نے جن کے نام بھی تاریخ میں قریب قریب نامعلوم ہیں ان دستوروں کو جاری رکھّا اور ایسے ایسے گراں بہا نسخے تیار کراتے رہے کہ یورپ والوں نے خواب و خیال میں بھی پیدا نہیں کئے"۔

ایران، چین اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت

ممکن ہے کہ بعض ناظرین کو یہ تصور ہو کہ بڑے پیمانے کے دُور اثر بین الاقوامی تعلقات جدید وقتوں کے پیدا کردہ ہیں اور آمد و رفت کی نئی نئی سہولتوں کا نتیجہ ہیں۔ اُن کو یہ خیال دلانا ضروری ہے کہ زیرِ غور زمانے میں دُور دُور کے ایشیائی (صرف اسلامی نہیں) ممالک میں باہمی روابط کتنے گہرے تھے۔ کاترمیر[1] نے ۱۸۴۳ء میں عبدالرزّاق سمرقندی کی پُرقدر لیکن تاحال غیر مطبوعہ[2] تاریخ مطلع السعدین میں سے چند دلچسپ اقتباسات فرانسیسی میں ترجمہ کر کے شائع کئے[3]۔ انہیں دو اقتباس

---

[1] Quatremer؛ [2] اب زیرِ طبع ہے۔ ملاحظہ ہو اوپر صفحہ ۵۳۹، ذیلی حاشیہ ۶؛ (مترجم)

[3] کتابخانۂ شاہی کے مخطوطات کے کیفیت نامے اور اقتباسات" (Notices et extraits des Manuscrites de la Bibliotheque du Roi) جلد ۱۴، ص ۱ تا ص ۴۷۳؛

ایسے شامل ہیں جن میں دربارِ ہرات کی دو سفارتوں کا حال درج ہے۔ایک چین بھیجی گئی اور دُوسری ہندوستان۔ اول الذکر کی رودادا غیاث الدین نقاش کی زبانی ہے۔ جو سفارت کیساتھ تھا۔ دوسری سفارت کا حال خود عبدالرزاق نے بیان کیا ہے جو قائدِ وفد تھا۔چین والی سفارت ۴ر دسمبر ۱۴۱۹ء کو ہرات سے روانہ ہوئی۔ایک سال اور دس روز بعد پکین (خان بالغ یا کمبلگ) پہنچی اور ۲ر ستمبر ۱۴۲۲ء کو واپس ہرات پہنچ گئی[1]۔ہندوستان کو جو وفد بھیجا گیا ۱۳ر جنوری ۱۴۴۲ء کو ہرات سے چلا۔ اور واپسی پر ۲۰ر اپریل ۱۴۴۴ء کو اُس نے خلیج فارس کی بندرگاہ ہرمز پر اُتر کر دوبارہ خاکِ ایران پر قدم رکھا[2]۔اس بندرگاہ کے کاروبار اور ہر ملکی نوعیت کی کیفیت اس سفیر نے ذیل کی توصیفی عبارت میں خُوب بیان کی ہے[3]:۔

"واین ہرموز کہ آنرا جرُون گویند درمیان دریا بندریست کہ ع

در روی زمین بدل ندارد

تجّارِ اقالیمِ سبعہ از مصر و شام و روم و آذربائجان و عراقِ عرب و عجم

---

[1] پچھلے ذیلی حاشیے کا حوالہ ص ۳۸۷ تا ص ۴۲۶؛

[2] ایضاً۔ص ۴۷۲ تا ص ۴۷۳؛

[3] پروفیسر براؤن نے عبارت کا انگریزی ترجمہ دیا ہے۔ میں نے مطلع السعدین کی اُس طبع میں سے جو باقساط اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہو رہی ہے اور جس کا حوالہ اوپر ص ۵۲۹ کے ذیلی حاشیہ [6] میں دیا گیا ہے۔اصل فارسی عبارت نقل کردی ہے۔(طبع مذکور جلد دوم جزو دوم۔ص ۷۶۷ تا ص ۷۶۹)؛ مترجم

وممالکِ فارس وخراسان وماوراء النهر وترکستان ومملکت دشتِ قبچاق ونواحی قلماق وتمام بلادِ مشرق وچین وماچین وخان بالیق روی توجه بآن بندر دارند، ومردمِ دریابار از حدودِ چین وجاوہ وبنگالہ وسیلان وشہرہای زیرباد تناصری وسقوطرہ وشہرِنو وجزایر دیوہ محل تا دیار ملیبار وحبش وزنگبار وبندرہای بیجانگر وگلبرگہ وگجرات وکنبات وسواحلِ برِ عرب تا عدن وجدّہ وینبوع نفایس وظرایف کہ ماہ وآفتاب وفیضِ سحاب آن را آب وتاب دادہ وبر روی دریا توان آورد بآن بلدہ آرند، ومسافرانِ عالم از ہر جا آیند، وہر چہ آرند در برابر ہر چہ خواہند بی زیادتِ جست وجوی در آن شہر یابند، ہم نقد دہند وہم معاوضہ کنند، ودیوانیان از ہمہ چیز غیرِ زر ونقرہ عُشر ستانند، واصحابِ ادیانِ مختلفہ بل کفّار دران شہر بسیارند، وبیرون از عدل باہیچ آفریدہ معاملہ ندارند، وباین سبب آن بلدہ را "دار الامان" گویند ومردمِ آن بلدہ تملّقِ عراقیان وتعمّقِ ہندیان باشند"۔

تیموریوں اور عُثمانی سُلطانوں کے باہمی تعلقات

شاہرخ اور اُس کے جانشینوں اور عُثمانی سلاطین محمد اوّل (۱۴۰۲ء تا ۱۴۲۱ء) مراد ثانی (۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء)، محمد ثانی (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) اور بایزید ثالث (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) کی باہمی مراسلت کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ بات کہ یہ مراسلت بادشاہوں اور سیاسی معاملوں کیلئے مخصوص نہ تھی فریدون بے کے ان محفوظ کردہ خطوط[1]

---

[1] منشآت۔ قسطنطنیہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) جلد اوّل۔ ص ۵ - ۳۶۱۔

سے ظاہر ہوتی ہے جو ایک طرف بایزید ثانی اور دوسری طرف مولانا جامی، جلال الدین دوّانی فلسفی اور احمد تفتازانی عالمِ دینیات کے درمیان بھیجے گئے۔ اوّل الذکر کو اس عثمانی سلطان نے ایک ہزار فلورن (فی = ۲ شلنگ (مترجم)) اور ثانی الذکر کو پانچ سو فلورن کا عطیہ ارسال کیا اور ساتھ تحسین و آفرین کے شفقت آمیز کلمات لکھے[1]۔ مزید برآں سلطان حسین کا بیٹا بدیع الزمان جب درپے قتل ازبکوں سے جان چھڑا کر بھاگا ہے تو قسطنطنیہ ہی میں آکر اسے آخری پناہ ملی اور وہیں اس کو مرقد نصیب ہؤا۔

ترکمۂ قراقونیلو و آق قونیلو آلِ تیمور کے انحطاط کا حال لکھ چکنے کے بعد اور صفویوں کے عروج کی منازل پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم بیچ کے قراقونیلو اور آق قونیلو ترکمان خاندانوں کا ایک اجمالی جایزہ لے لیں۔ یہ دونوں قبیلے نسل اور خصوصیات میں ایک دوسرے سے بے حد مشابہ ہیں۔ قراقونیلو پہلے برسرِ اقتدار آئے۔ تیمور کے عہد میں ان کی عملداری ایرانی صوبۂ آذربایجان میں تھی۔ اور ان کے ایک سردار بیرام خواجہ نے کہ قبیلۂ بہارلو سے تھا اپنے تئیں سلطان اویسِ جلائری کی خدمت سے وابستہ کر لیا۔

بیرام خواجہ

---

[1] اس بے انداز اور زبردست اثر کے بارے میں جو مولانا جامی اور میر علی شیر نوائی نے عثمانی ادب خصوصًا شاعری پر ڈالا آں جہانی مسٹر گب (E. J. W. Gibb.) کی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ" (History of Ottoman Poetry.) جلد دوم ص ۷ تا ص ۱۱) ملاحظہ فرمائیے؛

جب اویس مرا۔ تو اُس نے موصل، سنجر اور ارجیش پر قبضہ کر لیا۔ ۷۸۲ھ (۱۳۸۰-۱ء) میں یہ وفات پا گیا۔ اور اس کا بیٹا قرا محمد اس کا جانشین **قرا محمد** ہوا۔ اُس نے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے آپ کو مذکورہ بالا سلطان اویس کے بیٹے سلطان احمد کی خدمت سے وابستہ کر لیا۔ انجام کار ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) میں شام میں جنگ کرتا ہوا کام آیا۔ اسکے **قرا یوسف** بعد اس کا بیٹا قرا یوسف برسرِ اقتدار آیا۔ یہ اس خاندان کا پہلا شخص ہے جس نے ایک خود مختار بادشاہ کا درجہ حاصل کیا۔ اُس نے تبریز کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ تیمور سے کئی بار نبرد آزما ہو کر بالآخر اس نے عثمانی سلطان بایزید یلدرم کے پاس پناہ لی اور بغداد فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے جلد ہی تیمور کے پوتے ابوبکر نے اسے نکال دیا۔ اور یہ ایک ہزار لشکریوں سمیت مصر کو بھاگ گیا۔ سلطانِ مصر نے قہرِ تیموری سے خائف ہو کر اسے قید کر دیا۔ لیکن تیمور کے مرنے پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے بکھرے ہوئے ساتھی اس سے آن ملے اور اُس نے دیارِ بکر لے لیا۔ اور جلد ہی ۸۰۹ھ (۱۴۰۶-۷ء) میں نخجوان کے مقام پر ابوبکر کو شکست دی۔ چار سال بعد اس نے تبریز کے قریب اپنے پُرانے آقا اور مصر کے شریکِ اسیری سلطان احمد جلائری کو شکست دیکر قتل کر دیا۔ ۸۲۲ھ (۱۴۱۹ء) میں اس نے تین اہم ایرانی شہر ساوہ۔ قزوین اور سلطانیہ فتح کئے۔ اس سے اگلے سال ۶۵ برس کی عمر اور ۱۴ برس کا عہدِ حکومت پا کر فوت ہوا۔ پانچ بیٹے چھوڑ مرا۔ ان میں سے دو یعنی اسکندر اور جہانشاہ تخت نشین ہوئے؛

ایک سابق باب میں ان سرکاری کاغذات کے اہم مجموعہ کا ذکر آچکا ہے، جو فریدون بے کی منشآت میں شامل ہیں[1] اور سلطنتِ عثمانی کی خارجی حکمتِ عملی سے متعلق ہے۔ ان میں سے ایک خاصی تعداد زیرِ غور زمانے سے متعلق ہے۔

معاصر سرکاری کاغذات

چنانچہ ہمارے پاس سلطان احمد جلائری کا ایک مکتوب مؤرخہ ۷۹۸ھ (۱۳۹۶ء) بنام سلطان بایزید یلدرم موجود ہے۔ اس میں اُس نے حملہ آور تیموری فوجوں کے مقابلے پر اپنی پسپائی کا ماجرا لکھا ہے۔ اس خط کے ساتھ ہمارے پاس سلطان بایزید کا جواب بھی موجود ہے۔ پھر اس مجموعے میں وہ متعدد مکتوبات ہیں جو سلطان محمد اوّل (۸۰۵ھ تا ۸۲۴ھ = ۱۴۰۲ء تا ۱۴۲۱ء) اور شاہرخ، قرایوسف، اسکندر اور سلطان خلیل نوشیروان کے مابین بھیجے گئے۔ سلطان مراد ثانی (۸۲۴ھ تا ۸۵۵ھ = ۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء) اور شاہرخ کے آپس کے خطوط ہیں۔ سلطان محمد ثانی فاتح ۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ = ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) اور جہانشاہ، الغ بیگ، بایسنقر، بہمن، شاہ ہندوستان، اوزون حسن اور حسین بن منصور بن بایقرہ کے باہمی مراسلات ہیں اور اسکے بعد شاہ اسمٰعیل صفوی اور شاہ طہماسپ صفوی کے ساتھ سلاطینِ عثمانی کی ایک ضخیم مراسلت دی ہے یہ خطوط نہ صرف اسلئے دلچسپ ہیں کہ جن واقعات کیطرف اشارے کرتے ہیں ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ان تعلّقات کے آئینہ دار ہیں جو ان فرمانرواؤں کے درمیان قائم تھے چنانچہ مثال کے طور پر سلطان محمد عثمانی اوّل کے نام شاہرخ کے ایک خط (مؤرخہ

---

[1] طبع قسطنطنیہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) ص ۶۲۶؛

۸۱۸ھ = ۱۴۱۶ء) میں لہجے کا تکبّر دونوں لحاظ سے بہت نمایاں ہے کہ جو
القاب اس کے لئے لکھے ہیں وہ بھی ادنےٰ ہیں اور سلطان کو ملامت بھی
حقارت آمیز الفاظ میں کی ہے کہ اُس نے اپنے سرکش بھائیوں لعینی سلیمان
موسیٰ اور عیسیٰ کو مروا ڈالا - بقول اسکے یہ حرکت گو" عثمانی دستور سے موافقت
رکھتی ہے" لیکن" ایلخانی قاعدے کی رُو سے ناشائستہ حرکت" ہے - یہہ
غرور اس متحکمانہ مطالبے سے بھی ٹپکتا ہے کہ اگر قرا یوسف عثمانی علاقے میں
پناہ لینی چاہے تو اس کو ہرگز اجازت نہ دی جائے - بخلاف اس کے
سلطان محمد کے جواب کا پیرایہ نہ صرف مصالحانہ ہے بلکہ منکسرانہ ہے - اس
نے شاہ رُخ کو خطاب کرتے ہوئے بلند بانگ القاب کا باقاعدہ تانتا باندھ
دیا ہے - بھائیوں کو قتل کرنے پر ندامت کا اظہار کرتا ہے اور اس کیساتھ
ہی شیخ سعدیؒ کا مشہور مقولہ نقل کرتا ہے کہ" دہ درویشان در گلیمے بخسپند و
دو شاہان در اقلیمے نگنجند"[۱] اپنا یہ اندیشہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر میں قرا یوسف
کو اپنے علاقے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دُوں اور وُہ برانگیختہ ہو جائے
تو ممکن ہے وہ ہمسایہ قرامانی، حمیدی، اسفندیاری، طُورغُودی اور ذوالقدری
خاندانوں کے تاجداروں کو آمادۂ فساد کرنے کی کوشش کرے اور احتمال ہے کہ
سلطان مصر کو بھی جا بھڑکائے - شاہانِ ترکمان لعینی قرا یوسف اور قرا اسکندر
اور عُثمانی سلطان کے درمیان معاملہ برعکس ہے - سلطان ان سے زیردستوں
کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے اور وہ اسے بطور برتر مخاطب کرتے ہیں -

---

[۱] گلستان - طبع پلیٹس (Platts) ص ۱۶ ؛

اس دلچسپ مجموعے کے مشمولہ مکاتیب و مراسلات کی زیادہ مفصل چھان بین کریں تو محنت وصول ہو جائیگی لیکن یہاں اتنی گنجائش نہیں۔ البتہ وقتاً فوقتاً جہاں جہاں موقع ہوگا اسکے حوالے دئے جائینگے[1]۔

امیر اسکندر قراقو ینلو نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی شاہرخ پر حملہ کیا۔ اس میں اسے شکست ہوئی لیکن جلد ہی پھر آذربائجان پر متصرف ہو گیا۔ ۸۲۸ھ

اسکندر

(۱۴۲۵ء) میں شمس الدین حاکمِ اخلاط اور ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) میں سلطان احمد حاکمِ کُردستان اس کی جنگجویانہ شجاعت کے شکار ہوئے۔ اور شیروان اور سلطانیہ کے شہر اس کے ہاتھوں میں آ گئے۔ ۸۳۲ھ (۱۴۲۹ء) میں وہ اور اس کا بھائی جہانشاہ باوجود اسکے کہ بڑی مردانگی سے لڑے دوبارہ شاہرخ کے مقابلے پر پسپا ہوئے۔ چھ سال بعد یعنی ۸۳۸ھ (۵-۱۴۳۴ء) میں شاہرخ نے اسکندر کے خلاف پھر پیش قدمی کی۔ اور رے تک چلا آیا۔ یہاں اسکندر کا بھائی جہان شاہ اپنے بیٹے حسن علی سمیت اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسکندر بھاگ گیا اور شاہ رُخ نے اس کا علاقہ اس کے بھائی کو اس کی اطاعت گزاری کے صلے میں بخش دیا۔ اسکندر ایک قلعے میں پناہ گیر ہوا۔ لیکن قلعہ بند ہو کر مقابلے کی تدبیر کر رہا تھا کہ اس کے بیٹے قُباد نے اس کی داشتہ لیلےٰ کے اُکسانے پر اس کا کام تمام کر دیا۔

---

[1] پروفیسر ایچ۔ اے گبنز (H. A. Gibbons) نے اپنی تصنیف "تاسیسِ سلطنتِ عثمانی" (Foundation of the Ottoman Empire - آکسفورڈ ۱۹۱۶ء) میں منشآت فریدون بے کا استعمال کیا ہے ہیمر پرگشٹال (Hammer-Purgstall) نے بھی اسے اپنے مآخذ میں شمار کیا ہے؛

۸۳۹ھ (۶-۱۴۳۵ء) میں شاہرخ کی حمایت اور تائید سے اب جہانشاہ

جہانشاہ متوفی بھائی کے تخت پر متمکن ہوا۔ اور اس نے بھائی کی متروکہ مملکت کی بہت کچھ توسیع کی۔ ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) میں اُس نے عراق عجم پر دھاوا بول دیا۔ اہلِ اصفہان کا قتلِ عام کیا اور فارس اور کرمان پر چڑھائی کی۔ ۸۶۲ھ (۸-۱۴۵۷ء) میں خراسان فتح کرلیا۔ اور اسی سال ۱۳ شعبان (جون-جولائی ۱۴۵۸ء) میں ہرات میں اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ چھ ماہ وہاں مقیم رہا کہ تیمور کا پڑپوتا سلطان ابوسعید اس پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ ساتھ ہی اسے خبر پہنچی کہ اس کا بیٹا حسن جو آذربائجان میں قید تھا بھاگ نکلا اور اس کے خلاف باغی ہوگیا ہے۔ چنانچہ طوعًا و کرہًا اسے ابوسعید کے ساتھ صُلح کرنی پڑی اور بارہ فرسنگ (تقریبًا پینتالیس میل) روزانہ کی اوسط رفتار سے یلغار کرتا ہؤا مغرب کو چلا۔ اس شتاب روی میں بیس ہزار اونٹ اور دس ہزار گھوڑے اس کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ اپنے بیٹے حسن کو مغلوب کر کے اس نے وہاں سے نکال دیا۔ اور دُوسرے بیٹے پیر بُداق کو ولایتِ فارس سے ہٹا کر بغداد منتقل کر دیا۔ کچھ عرصے میں پیر بداق نے بھی خود سری کی۔ اس پر جہانشاہ نے کامل ایک سال تک بغداد کا محاصرہ کئے رکھا۔ اور باغی فرزند کو تہ تیغ کرنے میں کامیاب ہوگیا اس کی جگہ اس نے اپنے ایک اَور بیٹے محمد میرزا کو والی مقرر کیا۔ اور پھر واپس آذربائجان چلا آیا۔ اب اس کی سلطنت مغرب میں ترکی سرحد سے لیکر عراق، کرمان، اور سواحلِ خلیجِ فارس تک پھیل گئی۔ چنانچہ اسمیں خراسان

اور بحرِ خزر کے ساحلی صُوبوں کو چھوڑ کر سارا ایران شامل تھا؎

۱۴۶۷ء میں اوزون حسن کے ہاتھوں جہانشاہ کی ہلاکت

۸۷۱ھ (۷-۱۴۶۶ء) میں اُس نے حسن باینڈری پر جس کا زیادہ مشہور نام اوزون حسن ہے اس ارادے سے حملہ کیا کہ دیارِ بکر پر قابض ہو جائے۔ لیکن فوج کی آڑ میں شکار کھیل رہا تھا کہ اوزون حسن اچانک اس پر آن پڑا اور اسے تہ تیغ کر دیا۔ اس کے دو بیٹے گرفتار کر لئے گئے اور اکثر چیدہ امرا قتل کر دیئے گئے۔ اس سانحے کی یاد اشعارِ ذیل میں باقی رہ گئی ہے ؎

اردوی جہانشاہ بہادر ز دبان
باآن ہمہ اسباب زبردستی و پُشت
ثانی عشر ماہِ ربیع الثانی
ویران شد و تاریخ "حسن بیگ بکُشت"[1]

ترک مؤرخ منجم باشی جس کی تاریخ سے قراقونیلو خاندان کی تاریخ کا مندرجہ بالا خاکہ لیا گیا ہے[2] جہانشاہ کی سیرت کا بہت بُرا منظر پیش کرتا ہے۔ اس

جہانشاہ کی سیرت

مصنف کی رائے میں وُہ ایک بداطوار، بداخلاق اور سفاک ظالم تھا۔ طبیعت کا خبیث تھا۔ کفر و الحاد کی طرف مائل تھا اور شریعتِ مقدسہ کی کچھ پرواہ نہ کرتا تھا۔ رات رات بھر

---

[1] حسن بیگ بکشت = ۸۷۲؛ ۱۲ ربیع الثانی ۸۷۲ھ = ۱۰ نومبر ۱۴۶۷ء؛

[2] صحائف الاخبار۔ طبعِ قسطنطنیہ ۱۲۸۵ھ۔ جلد سوم۔ ص ۴-۱۵۰؛

عیش ونشاط اور فسق وفجور میں گزار دیتا۔ دن کو کُتّے کی طرح سویا رہتا۔ اسی سبب سے اس کو "خفاش" (چمگادڑ) کہتے تھے"۔ ستر برس کا ہوکر ۳۲ سال کے عہدِ حکومت کے بعد مرا۔ اور تبریز میں مدفون ہوُا۔ اس کے بعد اس کا

حسن علی

بیٹا حسن علی جسے اس نے برطرف کر دیا تھا۔ اور جسے ایک وقت اوزون حسن نے پناہ دی تھی تخت نشین ہوُا۔ کہتے ہیں کہ اسیری نے اس کا دماغ مختل کر دیا تھا۔ تبریز میں اسے حکومت کرتے تھوڑا ہی عرصہ ہوُا تھا کہ اوزون حسن نے اسے نکال باہر کیا۔ وہاں سے ہمدان کی طرف بھاگا اوزون حسن کے بیٹے اوغورلو محمد نے اس کا پیچھا کیا۔ اور اسے مار ڈالا۔

قراقونیلو خاندان کا خاتمہ ۸۷۳ھ (۱۴۶۸-۹ء)

یہ ۸۷۳ھ (۱۴۶۸-۹ء) کا واقعہ ہے اس کے ساتھ قراقونیلو خاندان انجام پذیر ہوُا۔ اور اس کی جگہ آق قونیلو خاندان نے لے لی۔

آق قونیلو یا بایندری ترکمانوں کی سرگرمی کا اصلی مرکز دیار بکر تھا۔ جہاں کے امیروں میں بہار الدّین قراعثمان کہ اپنی حرص اور خونخواری کے باعث

آق قونیلو خاندان۔ قراعثمان

قرا ایلک (سیاہ جونک) کے عُرف سے معروف تھا سب سے پہلے ناموری حاصل کی۔ اس نے حریف ترکمان قبیلہ قراقونیلو کے امیر قرایوسف کو شکست دی۔ لیکن اس کے بعد اس کے نسبتہً کم استعداد بھائیوں احمد اور پیر علی کے حسد نے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ قراعثمان نے مجبور ہوکر

سیواس میں قاضی برہان الدین[1] کی ملازمت اختیار کی۔ ۸۰۰ھ (۸-۱۳۹۷ء) میں قرا عثمان نے اپنے میزبان کو قتل کر کے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جب اسے معلوم ہؤا کہ سلیمان کے زیر کمان ایک عثمانی لشکر سیواس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ ارزنجان بھاگ گیا۔ شام اور رُوم کی مہم میں اس نے تیمور کا ساتھ دیا اور اپنی خدمات کے صلے میں دیارِ بکر کا شہر پایا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد قراقو نیلو ترکمان قرا یوسف مصر سے نکل بھاگا اور اس نے قرا عثمان پر چڑھائی کی۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے ذوالحجہ ۸۲۳ھ (دسمبر ۱۴۲۰ء) میں وفات پا گیا۔ اس کا بیٹا اسکندر جانشین ہؤا جس نے اگلے سال شاہرخ سے ہزیمت اُٹھائی۔ قرا عثمان نے ۸۳۸ھ (۵-۱۴۳۴ء) میں وفات کی۔ اور اس کا بیٹا علی بیگ اس کا جانشین ہُوا۔ اپنے بھائی حمزہ کی بغاوت کے سبب اسے کچھ عرصہ عثمانی سُلطان مُراد ثانی کے پاس پناہ لینی پڑی ؎

علی بیگ ابنِ قرا عثمان

---

[1] اس قابلِ ذکر سپاہی شاعر کے حالات کا ایک مفصل بیان مسٹر گِب نے اپنی "عثمانی شاعری کی تاریخ" (History of Ottoman Poetry. جلد اول ص ۲۰۴ تا ص ۲۲۶) میں دیا ہے۔ اس کا ذکر شلٹ برگر (Schiltberger) کی کتاب "قید و سفر" (Bondage and Travels بابِ نہم) میں بھی آیا ہے جس کا انگریزی ترجمہ ہیکلوئیٹ سوسائٹی (Hakluyt Society) نے ۱۸۷۹ء میں شائع کیا۔ اس تصنیف میں "برہان الدین" کو "وُرچنَدِین" (Wurchanadin) لکھا گیا ہے۔ اس میں قرا عثمان (اوٹمن Otman) کے بھی کئی حوالے ملتے ہیں ؎

علی بیگ کے بعد اس کا فرزند جہانگیر تخت پر بیٹھا۔ لیکن جلد ہی (۸۵۷ھ = ۱۴۵۳ء میں) اسے ہٹا کر اس کی جگہ اس کے زیادہ اولوالعزم اور لائق

جہانگیر — اوزون حسن

بھائی اوزون حسن نے لے لی جو بلاشبہ آق قونیلو خاندان کا سب سے طاقتور اور نامور بادشاہ ہُوا ہے وہ "قرا ایلک" کا پوتا تھا۔ اور سالِ مذکور میں آمد (دیارِ بکر) میں تخت پر بیٹھا۔ یہ وہی سال ہے جس میں عثمانی تُرکوں نے قسطنطنیہ کو تسخیر کیا۔ عُثمانی اقتدار اور شجاعت کی اس تازہ شہادت سے یورپ اور بالخصوص اٹلی میں خطرے کا جو احساس پیدا ہُوا اسی کے سبب سے پے در پے وینیزی سفیروں نے تُرکوں کے خلاف اوزون حسن کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وُہ اِس امید میں تھے کہ اوزون حسن مشرقی سرحد پر تُرکوں کو پریشان کر کے مزید مغربی فتوحات سے ان کی توجہ ہٹا دے گا۔ چنانچہ ان سفارتوں کے بعد جو ایک زمانے میں اسی قسم کی غرض لیکر منگولی دربار قراقرم میں پہنچی تھیں اب ایک بار پھر "مشرقی مسئلے" نے ایک نئی شان اور اہمیت اختیار کی اور اقوامِ یورپ میں ایران کی خوش خواہی حاصل کرنے کی لگاتار کوشش ہونے لگی۔ وینس کے یہ ایلچی اپنے سفر اور مہموں کی سرگزشتیں چھوڑ مرے ہیں۔ جو ایران کے حالات اور اوزون حسن کی سیرت پر مفید ضمنی روشنی ڈالتی ہیں۔ کیٹرینو زینو[1] کے سفرنامے پر رموسیو[2] نے جو دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں وُہ نہایت اعلےٰ الفاظ میں اوزون حسن کی تعریف کرتا ہے اور یہاں تک کہتا ہے

---

[1] Caterino Zeno [2] Ramusio

کہ "جب حکومت ایرانیوں کے ہاتھوں سے چھن کر یونانیوں کے ہاتھوں میں آئی تب سے لیکر آج تک تمام ملوکِ شرقیہ میں ایک بادشاہ بھی ایسا نہیں آیا جو عظمت کے لحاظ سے دارا گشتاسپ اور اُسن کسانو (یعنی اوزون حسن) سے ٹکر کھا سکے"۔ پھر لکھتا ہے: "بڑے افسوس کا مقام ہے کہ بعض مشرقی حکمرانوں کو جو قوت اور فراست دونوں کے اعتبار سے عالی رتبہ تھے ایسے تاریخ نگار نصیب نہ ہوئے جو ان کے مآثر کی دھوم مچاتے۔ چنانچہ سلاطینِ مصر اور ملوکِ ایران میں ایسے ایسے اشخاص ہو گزرے ہیں جو بے مثل مردِ میدان تھے۔ اور نہ صرف اُن کا مقابلہ بجا طور پر اُن قدیم الکھڑ بادشاہوں سے کیا جا سکتا ہے جو سپہگری میں نام رکھتے ہیں بلکہ ان تمام اوصاف میں جو ایک لائق فوجی سپہ سالار کے خواص ہیں بڑے بڑے یونانی اور رومی سپہ سالاروں کی ہمسری کے بھی مستحق ہیں[1]"۔ آگے چل کر وہ اس بات کی داد دیتا ہے کہ "کس طرح اُسن کسانو (اوزون حسن) ——— ایک مفلس رئیس زادہ جو کئی بھائیوں میں سب سے زیادہ بیکس ہے ..... جس کے پاس ایک چھوٹے سے قلعے کے علاوہ تیس سے زیادہ سپاہی نہیں ہیں۔ آگے چل کر اپنے تئیں اس دبدبے کا مالک بنا لیتا ہے کہ آلِ عثمان کے

---

[1] "اطالویوں کے قلم سے سولھویں اور سترھویں صدیوں کے چھ ایرانی سیاحت نامے"

(Six Narratives of Travel in Persia by Italians in the Sixteenth and Seventeenth Centuries.) شائع کردہ ہیکلویٹ سوسائٹی (Hakluyt Society) ۱۸۷۳ء، صـ۲ ؛

کے مقابلے پر سلطنتِ ایشیا کا دعویٰ کرنے کی جُرأت رکھتا ہے۔ وہی آلِ عثمان جو محمد ثانی کے عہد (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) میں تمام مشرق کے لئے موجبِ دہشت تھی۔" کنٹارینی[1] جو سنہ ۵-۱۴۷۴ء میں اوزون حسن کے پاس

اوزون حسن کی توصیف کنٹارینی کے قلم سے

تھا لکھتا ہے کہ" وہ ہمیشہ کھانے کے ساتھ شراب پیتا تھا۔ تعیش پسند معلوم ہوتا تھا اپنے آگے چُنے ہوئے کھانوں میں ہمیں شرکت کی دعوت دیکر اسے خوشی ہوتی تھی۔" پھر لکھتا ہے[2]" اس کے سامنے برابر سازندوں اور گویّوں کا ایک طائفہ بیٹھا رہتا تھا۔ انہیں جو چیز چاہتا گانے یا بجانے کا حُکم دیتا۔ غرض شہنشاہِ عالی جاہ بڑا رنگین طبع نظر آتا تھا۔ اس کا قد لمبا اور بدن چھریرا تھا۔ شکل میں تاتاری شباہت کی خفیف جھلک تھی۔ اور چہرے پر ہر وقت سُرخی رہتی تھی۔ جب شراب پیتا تھا۔ تو اس کا ہاتھ لرزتا تھا۔ عُمر ستّر سال معلوم ہوتی تھی[3]۔ بے تکلف انداز میں اپنا دِل بہلانے کا شوقین تھا۔ لیکن جب حد سے بڑھ جاتا تو خطرناک ہوجاتا

---

[1] Contarini؛

[2] پچھلے سے پچھلے ذیلی حاشیے میں جس کتاب کا حوالہ ہے۔ اس میں ملاحظہ ہو کنٹارینی کا " سیاحت نامۂ تانہ و ایران" (Travels to Tana and Persia. ص ۳-۱۳۲؛

[3] یقیناً اپنی اصل عمر سے بہت زیادہ بُوڑھا نظر آتا ہوگا۔ کیونکہ اس نے کل ۵۴ سال عمر پاکر (۸-۱۴۷۷ء میں یعنی کنٹارینی کی باریابی کے دو سال بعد) وفات پائی؛

بہر حال سب کچھ دیکھ کر یہی کہیں گے کہ بھلا اور زندہ دل آدمی تھا۔"

اس غیر معمولی شخص کی ایسی صاف لفظی تصویر کسی مشرقی مؤرّخ کے اوراق میں نہیں ملے گی۔ البتہ منجّم باشی کے قلم سے اس کی سیرت کا مندرجۂ ذیل تخمینہ پیش کرنے کے قابل ہے[۱]:-

"دانشمند، عادل، شجاع، متّقی، متدیّن اور طاعت گزار بادشاہ تھا۔ علماء اور باخدا لوگوں کا دوستدار، دریا دل اور مخیرِ عوام تھا۔ اس نے مذہبی

......منجّم باشی کے قلم سے

ضروریات کی بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ اُس نے ایک قلیل فوج کے ساتھ جہانشاہ اور ابوسعید جیسے زبردست بادشاہوں پر غلبہ پایا، گرجستان کو اپنا باجگذار بنایا۔ اور آذربائجان، عراقین، کرمان، فارس، دیار بکر، کردستان اور آرمینیا پر حکومت کی"۔

علماء اور فضلاء کی تربیت کا ذکر کرتے ہوئے یہی مؤرّخ اس سے پچھلے صفحے پر کہتا ہے "اس نے تبریز کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اور وہاں اردگرد کے ممالک اور صوبوں سے بہت سے فضلاء اور استادانِ علم وفن

اوزون حسن کے دربار میں علماء اور فضلاء کی سرپرستی

جمع کیے۔ ان کی ایسی ایسی خاطریں اور عزّتیں ہوئیں کہ گمان میں بھی نہیں آسکتیں"۔ منجملہ اُن اربابِ علم کے جو اس کے انعام واکرام سے سرفراز ہوئے مشہور ترین اشخاص میں ایک

۱؎ صحائف الاخبار۔ جلد سوم صہ ۱۶۵؛

علی قوشجی تھا جو حج سے واپس اپنے گھر جاتے ہوئے اس کے علاقے سے گزرا۔

اوزون حسن ابھی نوجوان ہی تھا اور صرف دیارِ بکر کا حاکم تھا کہ اس نے ایک صاحبِ جمال عیسائی خاتون یعنی دسپینہ خاتون سے شادی کرلی۔ یہ

دسپینہ خاتون

طرابزون کے آخری عیسائی شہنشاہ کالوجونز[1] کی (جو عالی نسب کومنی خاندان سے تھا) دُختر[2] تھی۔ اس کے بطن سے اس کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ان میں سے ایک جس کا نام مارٹا[3] تھا شاہ اسمٰعیل (بانئ خاندانِ صفوی) کے باپ شیخ حیدر سے بیاہی گئی۔

اوزون حسن کے زمانۂ سلطنت کا مفصل ترین حال جو مجھے میسر آچکا ہے منجم باشی کی "صحائف الاخبار"[4] میں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اَور ماخذ سے معلومات کی خوشہ چینی کی جاسکتی ہے۔ یہ فریدون بے کا سرکاری سندات کا مجموعہ (منشآت) ہے۔ گو اس کے ان بارہ خطوط میں جو اوزون حسن اور سلطان

---

[1] Kalo Joannes؛

[2] ہیکلوئیٹ سوسائٹی کے شائع کردہ مذکورہ سیاحت ناموں میں "ایک تاجر کی سیاحتِ ایران" (Travels of a Merchant in Persia) کے ص ۹-۱۷۸ ملاحظہ ہوں۔ دسپینہ خاتون (دسپینہ کیٹن) کی توصیف میں یہ تاجر لکھتا ہے "بہت خوبصورت تھی اور اپنے وقت کی سب سے خوبصورت عورت سمجھی جاتی تھی اور اس کے حسن وجمال کی شہرت کل ایران میں پھیلی ہوئی تھی"؛ [3] Marta؛ [4] جلد سوم ص ۱۵۷ تا ص ۱۶۴؛

[5] جلد اول ص ۲۷۴ تا ص ۲۸۶؛

محمد فاتح نے ایک دُوسرے کو لکھے۔ تاریخوں کا درج نہ ہونا قابلِ افسوس ہے اطالوی سفیروں کی داستانیں بھی جن کا اوپر ذکر آچکا ہے بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ قراقونیلو اور آق قونیلو خاندانوں کی جو روئداد میں میر خواند اور دُوسرے ایرانی مؤرخوں نے دی ہیں بیشتر ناقص اور تشنہ ہیں*

اوزون حسن کے عہد کے پہلے تین یا چار سال (۱۴۵۳ء تا ۷-۱۴۵۶ء) بیشتر اس کے بھائیوں اور خصوصًا جہانگیر کی مکرر بغاوتوں سے پُر ہیں۔ بھائیوں کی باہمی رقابت کی آگ کو اُن کی ماں سرائے خاتون بار بار ٹھنڈا کرتی رہتی تھی۔ ان کی ان چپقلشوں کا اکھاڑہ بیشتر ایران سے باہر دیار بکر، موصل اور خصوصًا ماردین کے آس پاس رہا جسے لُوٹ مار کی شدید آفتیں سہنی پڑیں۔ جہانگیر نے حریف خاندان آق قونیلو کی مدد مانگنے میں کچھ تأمل نہ کیا۔ جس کا نمائندہ ان دنوں جہانشاہؔ تھا۔ اپنے عہد میں ایک مرتبہ اوزون حسن نے خراسان پر لشکر کشی کی۔ لیکن ایک بغاوت سے نپٹنے کے لئے اسے راستے ہی میں لوٹنا پڑا جو اس کے بھائی جہانگیر نے جہانشاہ کی معاونت سے کھڑی کی تھی۔ باغیوں نے فرات کے قریب اوزون حسن کے ہاتھوں بُری طرح شکست کھائی اور مفرورین میں سے بہت سے دریا میں ڈُوب گئے۔ اوزون حسن نے ۵۰۰ قیدیوں کی گردنیں ماردیں۔ ان میں رُستم بیگ بھی تھا۔ ماں کے بیچ بچاؤ کرنے سے اس نے جہانگیر اور دُوسرے بھائی اویس کو چھوڑ دیا۔ لیکن جہانگیر کے بیٹے علی خان کو بطور یرغمال اپنے ساتھ ارزنجان

---

* وینزی سیّاحوں کا گیانسا" (Giansa)!

لے گیا۔

اس فتح یابی (۸۶۱ھ = ۷-۱۴۵۶ء) کے بعد اوزون حسن کا زور واقتدار بہت بڑھ گیا۔ اور رُوم و شام کے بہت سے امراء نے اسکی اطاعت قبول کی۔ ۸۶۴ھ (۶۰-۱۴۵۹ء) کے قریب اس نے ایوبی خاندان سے قلعہ "حصنِ کیفہ" چھین لیا۔ اور اپنے بیٹے خلیل اللہ میرزا کو وہاں حاکم مقرر کیا۔ اسی سال جہانشاہ کے بیٹے حسن علی نے باپ کے خلاف بغاوت کی۔ اور اوزون حسن کے پاس پناہ لی لیکن حسن علی پر کچھ کفر کے فتوے لگائے گئے اور اس پر اوزون حسن نے کچھ عرصے کے بعد اسے نکال دیا۔

اوزون حسن عثمانی سُلطان محمدؐ فاتح کی جانب سفارت روانہ کرتا ہے

۱۴۶۱ء میں یا اس سے قبل اوزون حسن نے اپنے بھتیجے مُراد بے کو عثمانی سلطان محمد ثانی "فاتح" کے پاس بطورِ سفیر اس درخواست کے لیئے بھیجا[1] کہ میرے خُسر کالوجونز[2] شہنشاہ طرابزون پر دست اندازی نہ کرو۔ ترکی سُلطان نے اس التجا کی بالکل پرواہ نہ کی بلکہ اُلٹا طرابزون پر حملہ کر کے اسے زیر کر لیا۔ اور بازنطینی سلطنت کے آخری نمائندے ڈیوڈ کومینناس[3] کو جو اپنے بڑے بھائی کالوجونز کے بعد

۱؎ عبدالرحمن شرف بے کی تاریخ بعنوان "تاریخ دولتِ علیہ" میں (ص۱۶۱) لکھا ہے کہ اوزون حسن نے اپنی ماں سرائے خاتون کو اس سفارت پر بھیجا؛

۲؎ Kalo Joannes؛

۳؎ David Commenas؛

تخت پر بیٹھا تھا قسطنطنیہ لے گیا۔ وہاں گیووان ماریا انگیولیٹو[1] کی روایت کی رُو سے "اس کے ساتھ کافی عزّت کا سلوک کیا گیا۔ لیکن ابھی ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ۱۴۶۲ء میں وفات پاگیا"[2]۔

اوزون حسن نے عثمانی ترکوں سے جو جو جنگیں لڑیں اُن کی تاریخیں کچھ خلط ملط سی ہیں۔ منجم باشی نے ایک مُختصر مجادلے کا ذکر جو اوزون حسن کی پہلی مہم گرجستان سے ذرا پہلے کا ہے ۸۷۱ھ (۷-۱۴۶۶ء) کے تحت کیا ہے۔ اور اسی سال کے ذیل میں ایک سفارت کا ذکر کرتا ہے جو خورشید بیگ کی قیادت میں اوزون حسن نے سلطان محمد ثانی "فاتح" کے پاس یہ التجا کرنے روانہ کی کہ طرابزون پر حملہ نہ کرے۔ حالانکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ طرابزون ۱۴۶۱ء ہی میں عثمانیوں کے تصرف میں آچکا تھا۔ بہر حال یکم

جہان شاہ اوزون حسن کے ہاتھوں منہزم اور ہلاک ہوتا ہے

ربیع الثانی ۸۷۲ھ (۳۰ را کتوبر ۱۴۶۷ء) کو آذربائیجان میں خوئی کے قریب اُس نے قراقوینلو ترکمانوں کو شکست دی۔ اُن کا بادشاہ جہانشاہ شکار کھیل رہا تھا کہ اوزون حسن نے اسے محافظ دستے سے الگ ہٹا کر اس کا سر کاٹ دیا اور تیموری سُلطان ابوسعید کے پاس بھیج دِیا۔ اور اس کی لاش کو اس کے باپ قرا یُوسف

---

[1] Giovan Maria Angioletto

[2] ہیکلوئیٹ سوسائٹی (Hakluyt Society) کی مذکورہ بالا جلد میں ص۷۲ اور اس کا ذیلی حاشیہ[1] ملاحظہ ہو؛

کے مقبرے میں دفن کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر اُس نے عراق اور آذربائجان پر قبضہ کیا اور بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ فریدون۔بے کے مجموعے[1] میں سلطان محمد ثانی کے نام اوزون حسن کے نام جو پہلا مکتوب درج ہے اس میں اس ظفر یابی کا ذکر ہے۔اس خط کا پیرایۂ الفاظ (بعد کے چند خطوط کے لہجے کی نسبت) بڑا مؤدبانہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد نے اس کی رسید نہ دی ؛

"فاتح" کے نام اوزون حسن کا دُوسرا خط (جس پر افسوس ہے کہ تاریخ درج نہیں) اس کے دورِ مساعی کے دُوسرے اہم واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی مرند کے مقام پر جہان شاہ کے بیٹے حسن علی کی شکست جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اس شہزادے نے اب سے تقریبًا سات برس قبل اوزون حسن کے پاس پناہ لی تھی۔ لیکن اب اس نے اپنے باپ جہانشاہ کا انتقام لینے کو اس پر حملہ کیا۔ اوزون حسن نے تیموری سلطان ابوسعید سے کمک کی التجا کی اور اس بات کا واسطہ دیا کہ آق قونیلو خاندان ہمیشہ آلِ تیمور کا وفادار رہا ہے۔ اور اس کے برعکس حریف قبیلہ قراقونیلو نے ہمیشہ تیموریوں سے دغا کی ہے۔ ساتھ ہی اس کمک کے عوض عراق ابوسعید کے حوالے کر دینے کی پیشکش بھی کی بشرطیکہ آذربائجان اس کے پاس رہنے

سلطان ابوسعید کا اوزون حسن کے ہاتھوں گرفتار اور قتل ہونا

دیا جائے۔ اس تجویز کا قبول کرنا تو درکنار ابوسعید نے جھٹ جہانشاہ

[1] منشآت جلد اوّل ص ۲۷۴-۵ ؛

کی ہلاکت کا بدلہ لینے کو اوزون حسن کے خلاف لشکر کشی کی۔ لیکن زک اُٹھا کر محمد اور شاہرخ اپنے بیٹوں سمیت گرفتار ہُوا۔ اوزون حسن نے اسے یادگار محمد کے حوالے کر دیا۔ جس نے اسے گوہر شاد خاتون کا انتقام لینے کو اس کا کام تمام کر دیا۔ ۱۰ر نومبر ۱۴۷۴ء کو وینیزی سفیر کنٹارینی جب اوزون حسن کے قصر واقع سپاں (اصفہان) میں باریاب ہُوا تو اس کی نظر وہاں "ایک تصویر" پر پڑی۔ جس میں سلطان بوسچ (ابوسعید) کے سر کاٹے جانے کا منظر تھا۔ اور اس میں دکھایا تھا کہ کس طرح کرلومیتھ[1] (اوغورلو محمد پسرِ اوزون حسن) جس نے وہ کمرہ تیار کرایا تھا اسے ایک رسے سے باندھ کر قتل کے لئے لایا[2]"۔ ابوسعید کی میت اس کی والدہ کی سپردگی میں جو ساتھ ہی پکڑی آئی تھی پوری تعظیم اور احترام کے ساتھ خراسان بھیج دی گئی۔ جس خط میں اوزون حسن نے سلطان محمد فاتح کو حسن علی اور "اس کے کم و بیش تین ہزار ہمراہیوں" کی ہزیمت اور ہلاکت کی خبر دی ہے۔ اسی میں اسے آذربایجان، عراق فارس اور کرمان کی تسخیر اور اپنے اس قصد کی اطلاع بھی دی ہے کہ آئندہ تبریز اس کا پایۂ تخت ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مراسلہ سید احمد طغان اوغلو نام ایک قاصد کے ہاتھ بھیجا گیا ؞

اوزون حسن کے تیسرے خط میں طرزِ تخاطب پچھلے خط سے اَور بھی کم مؤدّبانہ ہو گئی ہے۔ اس پر بھی تاریخ درج نہیں ہے۔ اس میں اس نے

---

[1] Curlumameth ؛

[2] ہیکلوئیٹ سوسائٹی (Hakluyt Society) کی مذکورہ جلد کا صـ ۱۳۱ ؛

ایک عُثمانی ایلچی امیر بے کے پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد تیموری سلطان حسین (ابن منصور بن) بایقرہ سے اپنی گفت وشنید، جنگ اور پھر اس پر فتح پانے کا ماجرا لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ اس شکست خوردہ کے علاقے کی تقسیم و تفویض کیسے کی گئی ہے۔ لُرستان کے شہر خرم آباد کو فتح کرنے کی اطلاع بھی دی ہے ؂

چوتھا خط بھی غیر مؤرخہ ہے۔ اس میں اوزون حسن نے عثمانی فاتحِ عظیم کو "مقتدر ترین امیر ...... شمس الدین بے" کے اہانت آمیز القاب سے مخاطب کیا ہے اور شیراز کو جو اوزون حسن نے نیا نیا فتح کیا تھا۔ "پائے تختِ سلطنت" اور "مستقرِ خلافت" کی صفات کیساتھ مذکور کیا ہے اس کے آگے خوزستان کی تسخیر کی اطلاع دیتا ہے۔ یہ آخری خط فاتح کا جواب لیکر آتا ہے جس میں انتہائی اشتعال اور غُصّے کا اظہار ہے۔ عثمانی "سلطان محمد بن مراد بن محمد بن بایزید" اپنے گُستاخ خطاب کنندہ کو "تُو" کہکر مخاطب کرتا ہے۔ اور اسے خبردار کرتا ہے کہ اس عارضی خوش قسمتی پر نہ اِتراؤ اور تہدید کرتا ہے کہ آئندہ ماہِ شوّال میں تجھ پر چڑھائی کروں گا۔ ان ہی دِنوں اس نے اپنے بیٹے امیر مصطفےٰ حاکمِ قرمان کے نام ایک خط روانہ کیا۔ اس میں حکم دیا کہ اوزون حسن پر دھاوا بول دو۔ اور اسے "مستحق دار و رسن اوزون حسن" کہہ کر مذکور کیا۔ اس خط کے جواب میں ہمارے پاس امیر مُصطفےٰ کا خط بھی موجود ہے۔ اس میں کل ماجرا لکھا ہے کہ کس طرح اپنے اتالیق گیدک احمد پاشا کی مدد سے اُس نے ہفتے کے روز ۱۴ ربیع الاوّل

۸۷۷ھ (۱۹ اگست ۱۴۷۲ء[1]) کو قونیہ کے قریب اوزون حسن کی فوج کو شکست دی اور اس کے بیٹوں یوسف، زینل اور عُمر کو تہ تیغ کیا۔ فریدون بے کے دیئے ہوئے اس سلسلۂ سندات کی آخری دو دستاویزیں عربی میں ہیں۔ ان میں اوزون حسن سے متعلق دو خوابوں کی تعبیر ہے۔ جو آق شمس الدین نے کی ہے ٭

سلطنتِ عُثمانیہ اور اوزون حسن کی مخاصمت کے اسباب

اوزون حسن اور عثمانیوں کی باہمی مناقشت کی جو روئدادیں کیٹرینوزینو[2] گیووان ماریا انگیولیٹو[3]، "ایک تاجر کی سیاحتِ ایران[4]" کے مصنّف، منجّم باشی اور عبدالرحمٰن شرف بے نے دی ہیں گو تاریخی و زمانوی تفاصیل میں پُرمایہ نہیں ہیں۔ لیکن اس کشمکش کے اسباب اور اس کی رفتار کو کافی روشن کر دیتی ہیں۔ اوزون حسن کے اس بڑھتے ہوئے تکبّر کے علاوہ جو متذکرہ صدر خطوط سے ظاہر ہے عثمانی سُلطان کو اس ہمسایہ تاجدار کے خلاف شکایت کے چار اور سبب پیش آگئے ہیں:-

---

۱ منشآت کی دی ہوئی یہ تاریخ انگیولیٹو (Angioletto) کی دی ہوئی تاریخ (اگست ۱۴۷۴ء) سے مختلف ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ کون سی صحیح ہے۔ یہ ہیکلیوئیٹ سوسائٹی کی مذکورہ جلد میں انگیولیٹو کے سیاحت نامے کے باب ہشتم میں (ص۸۹ پر) درج ہے ٭

۲ Caterino Zeno ، ہکلوئیٹ سوسائٹی کی مذکورہ بالا کتاب ص۱۴ تا ص۳۱؛

۳ Giovan Maria Angioletto - ایضاً۔ ص ۴۷ تا ۹۶؛

۴ Travels of a Merchant in Persia. - ایضاً ص ۱۸۰ تا ۱۸۲؛

(۱) اوزون حسن نے وینس والوں کے ساتھ اس بارے میں گفت و شنید کی کہ ٹرکی پر مشرق اور مغرب دونوں جانب سے حملہ کیا جائے؛

(۲) اس نے قراقونیلو ترکمان جہانشاہ پر حملے کیے۔ اور اسے نہ صرف مغلوب کیا بلکہ مار ڈالا۔ اس کے علاوہ سلطان حسین بایقرہ تیموری پر حملے کیے درحالیکہ ان دونوں کے ساتھ سلطان محمد فاتح کے دوستانہ تعلقات تھے؛

(۳) اس نے طرابزون کے عیسائی شہنشاہ سے وعدہ کیا کہ عثمانی دست اندازیوں کے خلاف اس کو مدد دی جائے گی؛

(۴) اس نے پیر احمد[1] اور دوسرے قرامانی سلاطین و امرا کو اپنے ہاں پناہ دی۔ جبکہ قرامان خاندان آلِ عثمانی کا دیرینہ اور جانی دشمن تھا؛

چنانچہ نتیجۃً جو جنگ ہوئی اور ۸۷۷ھ (۱۴۷۲-۳ء) میں شروع ہو کر ۸۷۸ھ (۱۴۷۳-۴ء) میں ختم ہوئی۔ اُس نے دو پہلو بدلے۔ پہلے

تُرکوں اور ایرانیوں کی جنگ ۸۷۷ھ ۱۴۷۲-۴ء

میں فتح نے ایرانیوں کا ساتھ دیا۔ اور دوسرے میں تُرکوں کا۔ پہلا معرکہ فرات کے کنارے مَلَطیہ کے پاس ہوا۔ اس میں تُرکوں کے ہاتھ سے میدان کے جاتے رہنے کی بڑی وجہ رومیلیا[2] کے نوجوان بگلربگی "مُراد پاشا پیلیولوگس[3]" کی جلد بازی تھی۔ علاوہ ان کے جو میدانِ جنگ میں کام

---

[1] زینو (Zeno) نے اس کا نام پرامتو (Pirameto) لکھا ہے؛

[2] انگیولیٹو (Angioletto) کے ہاں اس جگہ کا نام اسموُرت لکھا ہے؛

[3] Murad Pesha Palaelogus؛

آئے بہت سے تُرک، دریا کے بھنوروں میں غرق ہو گئے۔ اور شام کو جب موجودات
لی گئی تو بارہ ہزار آدمی غیر حاضر نکلے[1]۔" جن میں بہت سے سرکردہ اشخاص بھی
شامل تھے"۔ انگیولیٹو (جو ترکی فوج کے ہمراہ تھا) لکھتا ہے "یہ ہزیمت اُٹھا کر
تُرک سپہ سالار بہت ہراساں ہوا۔ اور اس نے ارادہ کر لیا کہ سب سے
چھوٹے راستے سے فوج کو واپس اپنے ملک لے جائے"۔ چنانچہ لشکر نے
طرابزون کی طرف پیچھے ہٹ کر ایک وادی میں ڈیرے ڈال دئے۔ اس

اوزون حسن کا تُرکوں سے شکست کھانا

جگہ اخیر اگست ۱۴۷۳ء میں دُوسری زبردست
لڑائی ہوئی۔ اوزون حسن کو دوٹوک شکست ہوئی۔ اس کا بیٹا زینل مارا گیا۔
اور فتحمند لشکر کے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت آیا۔ شہزادہ مصطفےٰ نے اس
جنگ میں مردانگی کے بڑے جوہر دکھائے۔ انگیولیٹو لکھتا ہے "اگر اُن کسانو
(اوزون حسن) اپنی فتح پر قانع رہتا تو ترک لشکر فضیحت اُٹھا کر واپس چلا
جاتا اور جو علاقے اُس نے گنوائے وہ اس کے ہاتھ سے نہ جاتے"۔[2]
عبدالرحمٰن شرف بے رقم کرتا ہے "اس جنگ نے اوزون حسن کا جامِ تقدیر
اُلٹ دیا۔ اور بیس یا تیس سال کے لئے سلطان کو مشرقی سرحد کی حفاظت
کی طرف سے اطمینان ہو گیا"[3]۔

---

[1] ہیکلوئیٹ سوسائٹی کی مذکورہ کتاب میں ملاحظہ ہو۔ انگیولیٹو کا سفرنامہ صـ۸۸؛

[2] پچھلے ذیلی حاشیے کی طرف رجوع کیجئے؛

[3] تاریخ دولتِ علیہ۔ صـ۱۰۳؛

اوزون حسن اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ تبریز چلا گیا" وہاں اس نے لہو و لعب اور جشن کے سامان کرائے اور اپنی شکست کی چنداں پروا نہ کی کیونکہ اپنے مقبوضات میں سے اس کے ہاتھ سے کچھ نہ گیا تھا"۔ تاہم اس کے امن و آرام میں جلد ہی اس کے بیٹے اوغورلو محمد[1] کی سرکشی نے خلل ڈالا جو شیراز پر متصرف ہو گیا۔ جب اُس نے سُنا کہ باپ اس کے خلاف بڑا لشکر لیکر آ رہا ہے تو قسطنطنیہ بھاگ گیا۔ وہاں عثمانی سلطان نے بڑی تعظیم و تکریم سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اس سے وعدہ کیا کہ "باپ کی جگہ جو تُمہارا دشمن ہے تمہیں ایران کا بادشاہ بنایا جائیگا"۔ اوزون حسن نے اسکی فرزندانہ ناسپاسی کے جواب میں مکر و ریا سے کام لیا۔ پہلے بیماری کا بہانہ کیا پھر اپنی موت کی افواہ پھیلا دی ؛

اوزون حسن کس ترکیب سے اپنے بیٹے کو لالچ دِکھا کر واپس ایران بُلاتا ہے اور پھر مار ڈالتا ہے

انگیولیٹو لکھتا ہے[2]" اس اثنا میں کہ وہ جھوٹ مُوٹ دکھاوا کر رہا تھا۔ یہ خبر اُڑتی اُڑتی قسطنطنیہ جا پہنچی کہ بیٹے کی بغاوت کے سبب اُس کسانو پر مالیخولیا کا خطرناک حملہ ہوا ہے اور جب اس کی حالت بدتر ہوتے جانے کی افواہ اُڑنے لگی تو جیسا کہ پہلے سے ٹھہرا لیا گیا تھا۔ اس کے بعض نہایت

---

[1] انگیولیٹو نے اس کے نام کی شکل "اُگرلی مہمت" (.Ugurlimehemet)، اور زینو نے اُنگرمنمت (Ungermanmet) درج کی ہے ؛

[2] اخیر باب نہم۔ صفحہ ۹۶ ؛

نمکحلال ہوا خواہوں نے اس کی موت کا اعلان کر دیا۔ اور دستور کے مُطابق اُگرلی مہمت (اوغورلُو محمد) کے پاس چٹھیاں اور باپ کی موت کے ثبوت کی نشانیاں دیکر قاصد دوڑا دئے۔ اور اس سے التجا کی کہ واپس آکر تخت پر قابض ہو جائے۔ پیشتر اس کے جیکب اور ہلُل[1] (کذا) اس کے بھائیوں میں سے کوئی ایسا کر سکے۔ اس معاملے کو صداقت کا مزید رنگ دینے کے لئے تجہیز و تکفین کی رسمیں ادا کی گئیں اور واقعی اس کی موت کا کُل مُلک میں یقین ہو گیا۔ اُگرلی مہمت (اوغُورلُو محمد) کے پاس جب تین مُختلف ایلچی ایسے خُفیہ پیغام لیکر پہنچے۔ جن سے خاص امورِ سلطنت میں کام لیا جاتا ہے تو اس نے تورِس (تبریز) جانے میں کوئی خطرہ نہ جانا اور ایک چھوٹا سا محافظ دستہ لیکر چند روز میں وہاں پہنچ گیا۔ جب شاہی محل میں بادشاہ بننے کو داخل ہُوا تو اسے وہاں لے گئے جہاں اس کا باپ بالکل تندرست و توانا بیٹھا تھا۔ اوزون حسن نے اُسے قید میں رکھنے کا حُکم دیا۔ اور بعد میں اس کو مروا دیا۔ اور اس کا کچھ لحاظ نہ کیا کہ بیٹا ہے۔"

اوزون حسن نے عثمانیوں کے مقابلے پر جو شکست کھائی اس کی کسر کسی حد تک دیگر کامیابیوں سے نکل گئی۔ ایک فتح اس نے مصریوں پر پائی جنہوں نے عرفہ پر قبضہ جما کر اسے تاخت و تاراج کیا تھا۔ اور دُوسری کامیابی اسے گرجستان کی مہم میں ہوئی۔ جس میں اسے سولہ ہزار ڈیوکٹ[2] (فی = تقریباً ۹ شلنگ)

---

[1] (Jacob and Halul) یعقوب اور خلیل ۔ یہ دونوں باری باری تخت نشین ہوئے؛

[2] ducats ؛

کا باج اور شہر تفلس کی اطاعت حاصل ہوئی۔ بالآخر ۸۸۲ھ (۸-۱۴۷۷ء)
میں اُس نے وفات کی اور سلطان خلیل اس کا بیٹا جانشین ہُوا۔ اسکو تخت

سُلطان خلیل

پر بیٹھے ابھی چھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ خوئی کے نزدیک اس کے بھائی یعقوب نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل
کر دیا[1]۔ یہ سلطان تقریبًا تیرہ سال برسرِ حکومت رہا۔ اور اس دوران میں

یعقوب کا صفویوں پر تعدّی کرنا

اس نے شیخ حیدر ابن شیخ جنید صفوی کو مروا ڈالا۔ جس کے روز افزوں اقتدار
نے اسے خطرے سے متنبہ کیا۔ شیخ حیدر کے بیٹوں کو اس نے قدیم
ساسانی پایۂ تخت اصطخر میں نظر بند کر دیا۔ ان میں آنے والے خاندانِ
صفوی کا بانی اسمٰعیل بھی تھا۔ منجّم باشی نے لکھا ہے کہ اس نے تبریز کے باہر
موسمِ گرما میں رہنے کا خوب صورت محل "ہشت بہشت" (جسے ونیزیوں نے
"استی بستی" لکھا ہے) بنوایا۔ لیکن اطالوی تاجر سیّاح[2] اس کی تعمیر اوزون حسن
کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسی سیّاح کی سند کی رُو سے یعقوب کو اُس کی بیگم

---

[1] بروایت منجّم باشی (صحایف الاخبار، جلد سوم ص۱۹۵) خلیل نے اپنے بھائی مقصود کو مروا ڈالا۔ اور اس پر اس کے دُوسرے بھائی اس سے بیزار اور متنبہ ہوئے؛

[2] ہیکلوئیٹ سوسائٹی کی مذکورہ کتاب میں "ایک تاجر کی سیاحت ایران" (Travel of a Merchant in Persia.) کا باب ہشتم "در تورس (Tauris یعنی تبریز) کے باہر اسمبی (Assambei یعنی اوزون حسن) کے تعمیر کردہ شاہی محل کا حال"۔ ص۱۷۳ تا ص۱۷۸

[3] ایضًا ص۱۸۳ تا ص۱۸۴؛

نے مندرجہ ذیل حالات میں زہر دیکر مار ڈالا - یہ واقعہ میر خواند اور منجم باشی کے ہاں مذکور نہیں ہے :-

"اس نے ایک عالی نسب خاتون سے شادی کی جو ایک ایرانی امیر کی دختر تھی لیکن پرلے درجے کی بے باک عورت تھی - اسے دربار کے ایک سر بر آوردہ وزیر سے عشق ہو گیا - تو اس عیارہ نے اپنے شوہر یعقوب سلطان کو چلتا کرنے کی تدبیریں سوچیں اور یہ منصوبے باندھے کہ اپنے آشنا سے شادی کرکے اسے گدی پر بٹھا دے کیونکہ اسے خیال تھا کہ یعقوب کا قریبی رشتہ دار ہوتے ہوئے یعقوب کی اولاد کی عدم موجودگی میں وہ از روئے حق بادشاہ بن جائے گا - اس کے ساتھ سب معاملہ ٹھہرا کر اس نے اپنے شوہر کے لئے ایک اندر ہی اندر کام کرنیوالا زہر تیار رکیا - جب یعقوب ایک معطر غسل کر چکا تو اپنے کم سن بچے کے ساتھ جو آٹھ نو برس کا تھا بائیسویں گھنٹے سے لیکر غروبِ آفتاب تک حمام ہی میں رہا - جب باہر نکلا تو حرم میں داخل ہوا - جو حمام کے ساتھ ہی ملا ہوا تھا - وہاں اس کی بدکار بیوی ہاتھوں میں ایک صراحی اور سونے کا ظرف لئے اس سے ملی جس میں زہر تھا - جب وہ حمام میں تھا تو اس نے یہ زہر تیار کر رکھا - کیونکہ جانتی تھی کہ حمام سے نکل کر اسے کچھ نہ کچھ پینے کی عادت ہے - اس روز اس مکارہ نے معمول سے زیادہ اس سے لگاوٹ کی باتیں کیں کہ اپنی شرارت کر گزرے - لیکن اپنے چہرے پر کافی قابو نہ پا سکی اور رنگ بجد

یعقوب کو اُس کی بیوی نے کس طرح زہر دے کر مار ڈالا

زرد ہو گیا۔ اس پر یعقوب کے دل میں شبہ پیدا ہوا جو پہلے ہی اس کی بعض کارروائیوں سے بدظن ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے اُسے چکھنے کا حکم دیا۔ ہرچند وُہ جانتی تھی کہ اس میں موت یقینی ہے لیکن اب چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ کچھ حصہ اُس کا پی گئی۔ پھر سونے کا پیالہ شوہر کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اور اس کا بیٹا باقی زہر چڑھا گئے۔ زہر ایسا تُند اثر تھا۔ کہ کہ آدھی رات تک تینوں ٹھنڈے ہو گئے۔ اگلے روز صُبح سلطان یعقوب اس کی بیگم اور بچّے کی موت کی خبر پھیل گئی۔ بڑے بڑے امراء نے جب بادشاہ کی، وفات کی اطلاع پائی تو آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ چنانچہ پانچ چھ سال تک ایران اسی خانہ جنگی کی حالت میں رہا۔ کہ کبھی ایک امیر سلطان بنا بیٹھا ہے تو کبھی دُوسرا۔ بالآخر چودہ سال کا ایک نوجوان الُمُت نام تخت پر بٹھایا گیا۔ جو شیخ اسمٰعیل سلطان کی تخت نشینی تک اس پر متمکن رہا[1]۔"

منجّم باشی یعقوب کی توصیف میں رقمطراز ہے۔ "مے ومستی اور خُوشباشی کا دلدادہ اور شعر و شاعری کا بڑا شایق تھا۔" پھر لکھتا ہے۔ "بہت سے شعراء کل اطراف و جوانب سے اس کے دربار میں جمع ہوتے تھے۔ اور اس کی شان میں دھُوم دھام کے قصیدے لکھ کر لاتے تھے۔" اس کے بعد

---

[1] منجّم باشی صرف اتنا لکھتا ہے (جلد سوم۔ ص ۱۹۶) کہ یعقوب محرم ۸۹۶ھ (مطابق نومبر۔ دسمبر ۱۴۹۰ء) میں فوت ہوا۔

اس کا بیٹا بایسنقر تخت نشین ہوُا۔ جس نے ایک سال اور آٹھ مہینے حکومت

بایسنقر بن یعقوب — رستم بن مقصود

کی۔ اس کے بعد اس کے چچا زاد بھائی رُستم بن مقصود نے اس کی جگہ لے لی۔ اُس نے بدیع الزمان تیموری کے خلاف لشکر کشی کی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ خراسان میں مقابلے کی نوبت آتی اس کو اصفہان کی طرف متوجہ ہونا پڑا جہاں کا والی اس کی اطاعت سے منحرف ہوگیا تھا۔ رُستم کے نزول پر یہ والی قم کو بھاگ گیا۔ لیکن اس کا تعاقب کیا گیا۔ مقتول ہوُا اور اس کا قلم کیا ہوُا سر رُستم کے پاس لایا گیا۔ اسی سال یعنی ۸۹۸ھ (۳-۱۴۹۲ء) میں شیروان کے خلاف اُسنے ایک مہم روانہ کی۔ اس میں اس کے فتحیاب لشکر نے فتح ونصرت کی خوشی تیموری شان سے منائی۔ یعنی کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کئے لیکن ان ہی شیروانیوں میں سے بایسنقر بن یعقوب نے آذربائجان پر حملہ کرنے کے لئے ایک فوج اکٹھی کرلی۔ اس پر رُستم نے سلطان علی اور

صفوی قیدیوں کی رہائی

دُوسرے ان صفویوں کو جو اِصطخر میں نظربند تھے رہا کر دیا۔ تبریز میں اُن کے ساتھ بڑی خاطر تواضع سے پیش آیا۔ اور پھر انہیں اُن کے باپ شیخ حیدر صفوی کا انتقام لینے کے لئے روانہ کیا جسے بابیسنقر کے باپ یعقوب نے قتل کیا تھا۔ سلطان علی اپنے ساتھیوں کو لیکر آہر کی طرف بڑھا۔ وہاں اُس نے بایسنقر کو شکست دیکر مار ڈالا۔ رُستم کو اس پریشانی سے نجات ہوئی تو اب وُہ سلطان علی کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے جلنے لگا۔ اور اس کو کچلنے پر آمادہ

ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک سردار کو چار ہزار سواروں کیساتھ اس کے پیچھے روانہ کیا اور بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ جس میں صفوی گو وہ تعداد میں صرف ... ، تھے بڑی مردانگی سے (بقول انگیولیٹو[1] "شیروں کی طرح") لڑے۔ لیکن پایانِ کار ان کو شکست ہوئی۔ اور سلطان علی اپنے چھوٹے بھائی اسمٰعیل کو اپنا جانشین نامزد کر کے قتل ہوا۔ وہ اور اس کا بھائی ابراہیم دونوں گیلان اور ماژندران کو بھاگ گئے۔ اور وہاں کچھ مدت لاہیجان اور لِشتا نشا (کذا) میں چھپے رہے وہاں سے تھوڑے عرصے بعد ابراہیم بھیس بدلکر اردبیل میں اپنی والدہ کے پاس چلا گیا۔

اسمٰعیل صفوی کی سرگرمیاں

اسمٰعیل گیلان ہی میں وہاں کے زیرِ حمایت ٹھہرا رہا اور اس دوران میں اس نے وہاں کے باشندوں میں ایک پُر زور اور کامیاب شیعی تبلیغ جاری رکھی۔ اور ان میں "صُوفیائے لاہیجان (جو قزلباش کہلاتے تھے[2]) کی تعداد برابر

---

[1] ہیکلوئیٹ سوسائٹی کی مذکورہ کتاب کا ص۱۰۸ ملاحظہ ہو۔ کیٹرینو زینو Caterino Zeno لکھتا ہے (ایضاً ص۴۶) کہ صفوی لشکر گو تعداد میں کم تھا۔ لیکن اس نے دلاوری کے حیرت انگیز جوہر دکھائے۔ اور ان میں کوئی شخص ایسا نہ رہا جو میدان میں کام نہ آیا ہو یا جسے کاری زخم نہ لگے ہوں۔ وِنیزی سیاح سلطان علی اور اس کے باپ شیخ حیدر کے درمیان تمیز نہیں کرتے۔

[2] منجم باشی کی صحائف الاخبار۔ ص۱۸۱۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ سُرخ ٹوپیاں جن کی وجہ سے یہ لوگ قزلباش کہلاتے تھے پہلی مرتبہ شیخ حیدر نے شیروان پر حملہ کرتے وقت اپنے لشکریوں کو پہنائیں؛

بڑھتی چلی گئی ؀

اسمٰعیل ابھی کل تیرہ ہی سال کا تھا[1] کہ ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ء و ۱۵۰۰ء) میں اس کی کامرانیوں کا آغاز ہوُا۔ اس کے ساتھ ۹ قبیلے تھے جو اسکے مرہونِ

اسمٰعیل کے دورۂ فتوحات کا آغاز

اطاعت تھے یعنی اُستاجلو۔ شاملو۔ تکلو۔ رُوملو۔ وارساق ذوالقدر، افشار، قاجار اور صُوفیائے قراباغ، اردبیل میں رسُما اپنے عالی مرتبت اسلاف کے مقبروں کی زیارت کرکے اپنی ضعیف ماں کی دُعائیں لیکر قراباغ، گُوکچا دنز اور ارزنجان کے رستے شیرِوان کی طرف بڑھا۔ اتنے عرصے میں یہ خبر دُور دُور پھیل گئی۔ کہ "شیخ کا بیٹا" اپنے حقوق کا دعویٰ کرنیوالا ہے۔ چنانچہ نمکحلال حمایتی شام، دیار بکر اور سیواس سے آآکر اسکے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے حتّیٰ کہ سات ہزار آدمیوں کا لشکر اس کی قیادت میں اکٹھا ہوگیا۔ دریائے کُرّ کو عبور کرکے گلستان کے قریب شماخا کے قرب وجوار میں اس نے باپ کے قاتل فرخ بیسار شاہِ شیروان پر حملہ کر دیا۔ اسے موت کے گھاٹ اُتارا۔ اس کی فوج کو بُری طرح شکست دی اور شیروان پر قبضہ کرلیا۔ وہاں شاہی خزانہ اس کے ہاتھ لگا۔ موسمِ سرما اس نے اسی مقام کے پاس محمود آباد میں گزارا امیر شمس الدین زکریا کو اپنا پہلا وزیر، شمس الدّین گیلانی عالمِ دین کو اپنا صدر الصدور (چانسلر) اور حسین بیگ شاملو اور ابدال بیگ کو مشیر مقرر کیا ؀

۹۰۷ھ (۲-۱۵۰۱ء) میں جب وُہ باکو پر قابض ہوچکا تھا۔ اور

---

[1] بقول منجّم باشی اسمٰعیل رجب ۸۹۲ھ (جون۔ جولائی ۱۴۸۷ء) میں پیدا ہوُا ؀

قلعۂ گلستان کا محاصرہ کر رہا تھا۔ اسے خبر ملی کہ آق قونیلو ترکمان اولاد بیگ ابنِ یوسف بیگ اس سے لڑنے کے لئے نخجوان تک آن پہنچا ہے، چنانچہ اسمٰعیل فتح کے پرچم اُڑاتا اسی کی طرف چلا۔ نخجوان کے قریب شرور کے مقام پر آق قونیلو ترکمانوں اور صفوی لشکر کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ ترکمانوں کی کمان موصل کے امیر عثمان کے ہاتھ میں تھی۔ اور صفوی فوج کا سپہ سالار پیری بیگ تھا۔ ترکمانوں کو دوٹوک شکست ہوئی۔ انکا سردار گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اولاد بیگ دیار بکر بھاگ گیا۔ اسمٰعیل نے تبریز پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں اس کی تاج پوشی ہوئی۔ اگلے سال (۹۰۸ھ مطابق ۳-۱۵۰۲ء میں) اس نے عراق پر فوج کشی کی اور آق قونیلو خاندان کے آخری تاجدار مُراد بیگ کو فاش شکست دی۔ وہ شیراز بھاگ گیا۔ اگلے ایک دو سال کے زمانے میں شیراز، کازرون، کرمان اور یزد نے فتحیاب شاہ اسمٰعیل کی اطاعت قبول کی۔ ۵-۱۵۰۴ء کا موسم سرما اس نے اصفہان میں بسر کیا۔ اس شہر کی قسمت میں اس خاندان کا رفیع الشان دارالسلطنت ہونا لکھا تھا جس کی بُنیاد شاہ اسمٰعیل صحیح معنوں میں اور نہایت مضبوطی سے اب تک رکھ چکا تھا۔ یہاں اس کے پاس عثمانی سلطان بایزید ثانی کا سفیر پہنچا۔ اس باعظمت اور حقیقۃً قومی خاندان کے اصل و آغاز نشو و نما اور زوال کو اس کتاب کی اگلی جلد کا موضوع مقرر کیا گیا ہے ؏

جنگِ شُرور

تیموریوں اور صفویوں کے ان باہمی روابط پر بھی ہم اگلی جلد میں مفصل غور کرینگے جو پہلے بابر اور شاہ اسمٰعیل کے مابین قائم رہے۔ اور بعد میں

تیموریوں اور صفویوں کے باہمی تعلقات

ہمایوں اور شاہ طہماسپ کے درمیان۔ مجموعی حیثیت سے یہ تعلقات حیرت انگیز طور پر دوستانہ تھے۔ باوجود اس کے کہ فریقین میں مذہبی اختلاف تھا۔ اور اختلاف بھی وُہ جو صفویوں کے زور پکڑنے اور شیعہ عقائد کے باقاعدہ قومی مذہب قرار پانے کے بعد ایران کو سُنی ہمسایوں سے الگ تھلگ رکھنے کا بھاری سبب ہُوا۔ بابر اور شاہ اسمٰعیل کو جو چیز متحد کئے ہوئے تھی وُہ شیبانی خاں اور اس کے خوفناک ازبکوں کا مشترکہ خوف اور عناد تھا۔ جن کے ہاتھوں آلِ تیمور نے آخری ایام میں خراسان اور ماوراالنہر میں اتنے شدید صدمے اُٹھائے تھے۔ ۱۵۰۰ء سے ۱۵۱۰ء تک کا زمانہ بالخصوص شیبانی خان کے ایک سلسلۂ فتوحات کا زمانہ ہے۔ جس میں اس نے باری باری سمرقند، فرغانہ تاشقند، خوارزم اور بالآخر خراسان پہ تصرف کر لیا۔ سلطان حسین جس کے پُرشکوہ دربارِ ہرات کا ہم ذکر کر چکے ہیں ۱۵۰۶ء میں مرگیا اس کے بیٹوں اور دیگر نوعمر اقارب کی کمزوری اور نا اتفاقی نے ان کو شیبانی خان کے لئے آسان شکار بنا دیا جو ۱۵۰۷ء کے دوران میں ان سب کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ صرف ایک سلطان حسین کا بیٹا بدیع الزّمان بچ نکلا جو پہلے شاہ اسمٰعیل کے پاس پناہ لینے آیا۔ اور بعد میں قسطنطنیہ کے عثمانی دربار میں پہنچا۔ وہیں اس نے وفات پائی۔ ۱۵۱۰ء میں شاہ اسمٰعیل نے خراسان پر

مرو میں ازبکوں پہ شاہ اسمٰعیل کی فتح

ازبکوں کے خلاف چڑھائی کی اور جنگِ مرو میں انکو شکستِ

فاش دی۔ شیبانی خان بھی میدان میں کام آیا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور یہ اعضاء مختلف شہروں میں بھیجے گئے۔ اس کی کھوپڑی کو سونے سے مرصع کر کے شاہ اسمٰعیل کے لئے اس کا ساغر بنایا گیا۔ اس کے سر کی کھال بھُس بھروا کر عثمانی سُلطان بایزید کے پاس قسطنطنیہ بھیج دی گئی۔ اور اس کا ایک ہاتھ ہولناک علامت کے طور پر خود اس کے اطاعت گزار حاکمِ مازندران کے پاس بھیجا گیا[1]۔ بابر کی بہن "خان زادہ خاتون" کو جو دس سال قبل ازبکوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئی تھی شاہ اسمٰعیل نے اس طویل اسیری کے بعد رہا کرایا۔ اور کامل اعزاز و احترام کے ساتھ اسکے بھائی کے پاس رُخصت کیا۔ بابر اپنی تزک[2] میں بہن سے اپنی ملاقات کا دلچسپ حال لکھا ہے۔ دونوں بادشاہوں[3] کے درمیان دوستانہ سفارتیں آتی جاتی رہیں۔ ۱۵۲۶ء تا ۱۵۲۹ء کے زمانے میں بابر جب ہندوستان کی کامیاب مہم کے بعد ماوراءالنہر سے بالکل دستبردار ہو گیا اور ہندوستان اس کا مستقرِ دولت قرار پایا تو تیموریوں اور ایرانیوں کی باہمی کشیدگی کے تمام امکانات دُور ہو گئے اور جو دوستی اس طرح قائم ہوئی وہ خاصی مستحکم تھی۔ اگلی نسل میں جب ہمایوں عارضی طور پر اپنی مملکت سے بدر کیا گیا تو شاہ طہماسپ کی مہمان نوازی نے اس دوستی کو پھر سے جلا دی۔ بابر نے شاہ اسمٰعیل کے متشدّد مذہبی

---

[1] ملاحظہ ہو ارسکن کی تاریخِ ہند (Erskiue's History of India.) جلد اول ص ۳۰۲-۳۰۳؛

[2] طبعِ المنسکی (Ilminsky) ص ۱۱؛

[3] بابر ۱۵۰۸ء میں رسماً پادشاہ کا لقب اختیار کر چکا تھا؛

عقائد کے معاملے میں مسامحت سے کام لیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس وجہ سے ایک وقت ماوراء النہری رعیّت میں اس کی ہر دلعزیزی کو خاصا نقصان پہنچا۔ کیونکہ ماوراء النہری آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی مذہبِ اہلِ سُنّت سے دُوسروں کی نسبت بہت زیادہ پر جوش عقیدت رکھتے تھے۔ اور شاہ اسمٰعیل نہایت بے دردی سے اس مذہب پر تعدّی روا رکھتا تھا[1]۔ ایران اور ہندوستان کے یہ تعلقات فرماں رواؤں تک ہی محدود نہ تھے کیونکہ

صفوی دَوْر میں ایران اور ہندوستان کے درمیان ادبی میل جول

ہم ایک آئندہ جلد میں دیکھینگے کہ تمام صفوی دور میں بلکہ اسکے بعد بھی ایرانی شاعروں کا ایک تانتا لگا رہتا تھا جو قدر دانی کی تلاش میں اپنے وطن سے ہجرت کر کے مغل شہنشاہوں کے دربار میں چلے آئے۔ ہندوستان میں مُغلوں کے اختتام یعنی غدر ۱۸۵۷ء تک فارسی کو نہ صرف سفارتی مراسلات کی زبان کا رتبہ حاصل رہا۔ بلکہ شایستہ گفتگو کی زبان کا بھی ؛

---

[1] ارسکن (Erskine) کی تاریخ ہند جلد اوّل ۔ ص۳۲۱ ؛

باب ہفتم

متأخر تیموری دَور کے نثر نگار

زیرِ تبصرہ دور کی ادبی اور فنی دولت کی طرف ہم نے سرسری طور پر پچھلے باب میں اشارہ کیا ہے۔ اس باب میں ہمارا کام یہ ہوگا۔ کہ دُنیائے علم و ادب کے ان چند بہترین نمائندوں کی تصنیف و تالیف پر زیادہ مفصل بحث کریں جو اس دور میں پیدا ہوئے۔ اس کے تمام قابلِ ذکر شعراء اور فضلاء پر قلم اُٹھانا خواہ کتنے ہی مختصر طور پر ہو ایک متوسط حد کے اندر ناممکن ہے۔ تاریخ کی کتاب حبیب السیر میں جو خصوصاً اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں ہر عہدِ حکومت یا تاریخی دور کیساتھ بطورِ ضمیمہ اس کے مشہور مصنفوں اور شاعروں کے ترجمے دئے ہیں۔ اس زمرے کے ۲۱۱ اشخاص شمار کئے گئے ہیں جو تیموری دور میں زندہ[1] تھے۔ یقیناً یہ تعداد حیرت انگیز ہے۔ ان میں سے ۲۳

اِس دَور کی با افراط ادبی سرگرمی

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں؛

کے سوا جو خود تیمور کے عہدِ حکومت سے تعلق رکھتے ہیں باقی سب اِسی دَور کے نمائندے ہیں جس پر اس وقت ہماری توجہ مبذول ہے۔ عہدِ سلطان ابوالغازی حسین (۸۷۸ھ تا ۹۱۲ھ = ۱۴۷۳ء تا ۱۵۰۶ء) کے ہرات کو اس تابندہ دور کی معراج سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اس کی اہمیت اس اثرِ عظیم کے مدِّنظر اَور بھی بڑھ جاتی ہے جو اس نے عثمانی عہد کے تُرکی ادب پر ڈالا۔ اس حقیقت پر آنجہانی مسٹر گب[1] نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف[2] "عثمانی شاعری کی تاریخ" میں کماحقّہٗ زور دیا ہے اور اسے مکمّل طور پر دلائل اور مثالوں کیساتھ واضح کیا ہے ❊

جس دور کو مسٹر گِب "دُوسرے دَور" سے تعبیر کرتے ہیں اسکا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں (ص۳ تا ص۴) "یہ دبستان جو بیشتر غزلیہ اور رومانی شاعروں کی تربیت و پرداخت کرتا تھا اور جس نے لفظی صنعتوں پر

(حاشیہ ص ۵۹۰) یہ تمام تراجم حبیب السیر کی جلد سوم میں آتے ہیں اور بمبئی کی سنگی طبع (۱۸۵۷ء) میں اُن کے صفحات کے حوالے یہ ہیں:۔ ص ۸۵ تا ص ۹۲ (عہدِ تیمور)؛ ص ۱۴۲ تا ص ۱۵۰ (عہدِ شاہرخ)؛ ص ۱۵۱ تا ص ۱۶۱ (عہد الغ بیگ)؛ ص ۱۶۲ تا ص ۱۶۵ (عہدِ ابوالقاسم بابر)؛ ص ۱۶۶ تا ص ۲۰۱ (عہد ابوسعید)؛ ص ۳۲۴ تا ص ۳۵۰ (عہدِ سلطان ابوالغازی حسین بن بایقرہ)؛

اس تعداد میں بعض وہ اشخاص بھی شامل کیئے جانے چاہئیں جو اسی عصر میں آق قوینلو ترکمانوں اور ابتدائی صفویوں کی سرپرستی میں جلوہ آرا تھے (جلد سوم۔ جزو چہارم ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۸) انکو ملا کر ان تراجم کی تعداد ۲۷۴ تک جا پہنچتی ہے؛

[1] Mr. E. J. W. Gibb. ؛ [2] History of Ottoman Poetry,

جامی، میر علی شیر نوائی وغیرہ کا عثمانی ترکی ادب پر اثر

جان دینے میں امتیاز پیدا کیا اپنے اوجِ کمال کو پندرھویں صدی کے نصفِ آخر میں ہرات کے فاضل اور ہنرمند سلطان حسین (بن) بایقرہ کے دربار میں پہنچا۔ یہاں کے دو برگزیدہ فاضلوں یعنی زبردست شاعر مولانا جامی اور لائق مدبّر میر علی شیر نوائی کی گوناگوں تصانیف میں ہمیں اس دبستان کے جسم و جان کا لبِّ لباب اور نچوڑ نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ دو بلند پایہ قلم پرداز "دوسرے دور" (سنہ ۱۴۵۰ء تا سنہ ۱۶۰۰ء) میں برابر عثمانی شعراء کے لئے ستارگانِ ہدایت رہے اِس لئے ایک لمحہ ان کی تصانیف کو دیکھنا مناسب ہوگا"۔

مسٹر گب نے ان دو سرکردہ شخصیّتوں کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ پھر جس دبستان کے یہ نمائندے ہیں اس کی خصوصیات کی ایک قابلِ تعریف تعیین کی ہے۔ اور اسکے بعد اس کے چیدہ خواص کا خلاصہ بالفاظِ ذیل کرتے ہیں (ص ۱۲ تا ص ۱۳):-

اس میں "داخلیت، تصنّع اور قیود پرستی ہے جن کے ساتھ فن کاری ایک ہر لمحہ بڑھنے والی چرب دستی اور صنّاعی کی تابانی پائی جاتی ہے"۔ آگے لکھتے ہیں: "لفاظی اور صنائع کی یہ دلدادگی جس نے ان پرانے شاعروں کی تمامتر توجہ اپنی طرف مبذول کرلی ان کی راہ میں مہلک ترین گڑھا ہے اور بہت سی عباراتِ نظم اگرچہ لطیف ہوتی ہیں مگر ایک طفلانہ زعم کی دخل اندازی سے گھٹیا ہو کر رہ جاتی ہیں اور بہت سے اشعار جو اور ہر طرح حسین

ہوتے ہیں ایک دُور از کار تشبیہ یا بے سروپا استعارے سے بدنما ہو جاتے ہیں"۔

مولانا جامی کی جو اعلیٰ قدر و منزلت عثمانی دربار میں تھی اس کا ثبوت ہمیں سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) کے دو خطوں سے ملتا

مولانا جامی کی تعظیم و تکریم عثمانی سُلطان بایزید ثانی کی طرف سے

ہے جو اُس نے مولانا کو لکھے اور فریدون بے کی منشآت[1] میں چھپے ہیں۔ پہلا خط جو بیحد داد و تحسین کے پیرائے میں ہے جیسا کہ مولانا جامی کے جواب سے پتہ چلتا ہے "کسی خاص غرض سے نہ تھا۔ اور بلا کسی فرمائش کی مداخلت کے بے لاگ لُطف و نوازش، پُر خلوص حسنِ اخلاق اور احسان مندی کی راہ سے لکھا گیا۔ اپنے دُوسرے خط میں سُلطان بایزید شاعر کا خط وصول پانے پر خوشی کا اظہار کرتا ہے اور اسے اطلاع دیتا ہے کہ ایک ہزار فلورن[2] کا ہدیہ اسے بھیجا جا رہا ہے۔ شاعر نے اپنے دُوسرے خط میں اس عطیے کی احسانمندانہ رسید دی ہے۔ یہ خط اس نے محمد بدخشی نام ایک درویش کے ہاتھ بھیجا جو اَور چند لوگوں کی معیت میں حج کیلئے روانہ ہو رہا تھا۔ بدقسمتی سے ان چار خطوں میں کسی پر بھی تاریخ

---

[1] طبع قسطنطنیہ۔ جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ (فروری ۱۸۵۸ء) جلد اول۔ ص ۴ - ۳۶۱؛

[2] Florin۔ "عثمانی فلورن کا سکہ تھا جس کی قیمت تقریباً ۹ شلنگ کے برابر تھی"۔ گب کی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ" جلد دوم ص ۲۶۔ حاشیہ زیرین؛

دوسرے علما جنھیں بایزیدِ ثانی نے مشرّف کیا

درج نہیں۔ اسی سُلطان نے دو[2] اَور ایرانی فاضلوں کو بھی مشرّف کیا یعنی جلال الدین دوّانی فلسفی اور عالمِ دین فرید الدین احمد تفتازانی۔ لیکن اس میں سبقت تفتازانی کی طرف سے ہوئی جس نے اپنا خط ۲۵ر اکتوبر ۱۵۰۵ء کو لکھا۔ اور سُلطان کا جواب ۱۳ر جولائی ۱۵۰۷ء کو جا کر تحریر ہوُا۔ جامی کے مشہور و معروف مربّی میر علی شیر نوائی وزیر

ترکی میں میر علی شیر نوائی کا اثر

کے اثر پر مسٹر گب نے بہت زور دیا ہے[1] جو اُس نے عثمانی شاعری پر ڈالا۔ نوائی نے مشرقی ترکی اور فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر میں برابر کا امتیاز پیدا کیا۔ مسٹر گب نے یہ بھی بیان کیا ہے[2] کہ کس طرح

ایک ترک فقیہہ شیراز میں سات برس تعلّم کرتا ہے

فاضل عثمانی فقیہہ مؤید زادہ عبدالرحمٰن چلیبی سنہ ۷-۱۴۷۶ء میں اپنے وطن سے بھاگ نکلنے پر مجبور ہو کر شیراز چلا آیا۔ اور یہاں اس نے سات سال موصوفِ بالا فلسفی جلال الدین دوّانی سے تعلّم کیا۔ یہی شخص آگے چل کر سلطان بایزید ثانی کے زمانے میں علم و ادب کے فیاض مربی اور جامع کتب کی حیثیتوں سے مشہور ہوُا۔ مختصر یہ کہ

---

[1] "عثمانی شاعری کی تاریخ" (History of Ottoman Poetry.) جلد اوّل۔ ص۱۲۸؛ جلد دوم ص۱۰ تا ص۱۱، ص۴۸ و حاشیۂ زیریں؛

[2] ایضاً۔ جلد دوم ص۲۹ تا ص۳۱؛

یہی زمانہ جس پر ہم غور کر رہے ہیں وہ زمانہ ہے جس کے دوران میں ایران نے عثمانی ترکی ادب پر وہ گہرا اثر ڈالنا شروع کیا جو آئندہ دور میں اس نے ہندوستان میں پھیلایا۔

ان عمومی توجہات سے ہٹ کر ہم اب اس عہد کے افضل ترین انشاء پردازوں کا ایک خصوصی معائنہ کرتے ہیں اور شعراء کے جائزے کو ایک اَور باب پر موقوف رکھتے ہیں:-

مؤرّخین اور ترجمہ نگار

پچھلے دور کی طرح اس دور میں بھی تاریخ اور سیرت نگاری کی نمائندگی اچھی ہے۔ اور ان مضمونوں کے کم سے کم نو یا دس مصنّف بہرحال ایک مختصر تذکرے کے مستحق ہیں۔ عموماً یہ اپنے

مؤرّخین اور ترجمہ نگار

مغولی دور کے پیش رووں سے نمایاں طور پر گھٹیا ہیں۔ کیونکہ درحالیکہ ان کا اندازِ تحریر ویسا ہی آراستہ اور پرتکلّف گو نسبتہً کم جدت طرازانہ ہے۔ جیسا "وصافِ حضرت" کا۔ لیکن تفصیلات کی فراوانی، مباحث کی وسعت گیری اور تاریخی وقعت کی سندیں پیش کرنے میں یہ اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پھر جب ان کا مقابلہ علاء الدین عطا ملک جوینی اور رشید الدّین فضل اللہ کے سے جیّد مؤرخوں سے کیا جاتا ہے تو یہ اَور بھی فرومایہ نظر آتے ہیں۔ اب ہم زمانوی ترتیب سے فرداً فرداً

ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں :-

(۱) حافظ ابرو[1]

اس مؤرخ کا نام اس کی تصانیف سے زیادہ معروف ہے جو تا حال غیر مطبوعہ[2] ہیں اور جن کے قلمی نسخے بھی بہت نایاب ہیں۔ جو کچھ اسکے بارے میں معلوم ہے تقریباً سارا ریو کی " فہرست مخطوطاتِ فارسی " میں مندرج ہے[3]۔ اس کا اصل نام بالعموم خواجہ نورالدّین لطف اللہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے مجمل فصیحی میں

حافظ ابرو

---

[1] پروفیسر براؤن نے سطور آئندہ میں حافظ ابرو کی صرف دو تصنیفوں کا ذکر کیا ہے لیکن حافظ ابرو کی ایک تیسری تصنیف " ذیل جامع التواریخ رشیدی " {جامع التواریخ مصنفہ رشید الدین فضل اللہ (مذکورہ بالا بر ص ۱۱۶ بعد) کی تعقیب} بھی ہے جو ۱۳۱۷ھ شمسی میں طہران سے بہ تصحیح و ترتیب ڈاکٹر خان بابا بیانی شائع ہوئی ہے۔ یہ تاریخ ۸۱۹ھ میں مکمل ہوئی (دیباچۂ مرتب صفحہ یح) اور ۷۹۵ھ تک آتی ہے۔ ڈاکٹر خان بابا نے حافظ ابرو کے آثار و حالات پر ایک خاصا مبصّرانہ دیباچہ بھی لکھا ہے۔ (مترجم)

[2] اسکی تصنیف " ذیلِ جامع التواریخ رشیدی " طبع ہو چکی ہے۔ پچھلا ذیلی حاشیہ ملاحظہ ہو! (مترجم)

[3] اس کے جغرافیے کے لئے ملاحظہ ہو ص ۴-۲۱۴، اور تاریخ کیلئے ضمیمہ فہرست (Supple-ment) ص ۱۶ تا ۱۸۔ اس کی تاریخ کی کیفیت کا ایک پُر احتیاط اور طویل بیان بیرن وکٹر روزن (Baron Victor Rosen) نے اپنی تالیف " مجموعاتِ کتب علمی " (مخطوطات فارسی) {Collections Scientifique (Manuscrites Persans)} میں دیا ہے۔ جلد سوم ص ۵۲ تا ص ۱۱۱!

اس کا نام مختلف دیا ہے[1]۔ ہرات میں پیدا ہوا[2]۔ لیکن یہ کہیں درج نہیں کہ اس کا سالِ ولادت کیا ہے[3]۔ ہمدان میں اس کی تعلیم ہوئی۔ تیمور نے اسے خاص التفات سے نوازا۔ اس کی وفات کے بعد اس نے اپنے آپکو تیمور کے فرزند اور جانشین شاہرخ اور پوتے بایسنقر میرزا کے دربار سے وابستہ رکھا۔ آخر الذکر کیلئے اُس نے اپنی جامع تاریخ لکھی۔ یہ تاریخ جو عموماً زبدۃ التواریخ کے عنوان سے مشہور ہے لیکن جسے فصیحی خوافی نے مجمع التواریخ السلطانی کے نام سے مذکور کیا ہے[4] ۸۲۹ھ یا ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء یا ۱۴۲۷ء) میں مصنف کی وفات سے تین یا چار سال پہلے مکمل ہوئی[5]۔ اس کی کل چار جلدیں تھیں

---

[1] جن تذکرہ نگاروں نے "خواجہ نورالدین" لکھا ہے وہ مطلع السعدین کی تقلید کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر خان بابا نے اپنے دیباچہ (صفحہ ت) میں لکھا ہے کہ "ذیل جامع التواریخ رشیدی" کے باب تاریخِ ملوکِ کُرت کے مقدمے میں مصنف نے خود اپنا نام "عبداللہ بن لطف اللہ بن عبدالرشید" لکھا ہے۔ لہذا اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ دیکھو دیباچہ مذکور صفحہ ت و ع ؛ (مترجم)

[2] یا بقولِ فصیحی خواف میں پیدا ہوا۔ دیکھو آگے ص۵۹۹ ؛

[3] ڈاکٹر خان بابا نے معقول و مدلل حساب لگایا ہے کہ اس کی تاریخِ ولادت ۷۶۳ھ کے لگ بھگ ہے۔ اور اس نے تقریباً ستر سال عمر پائی"۔ دیکھو ذیل جامع التواریخ رشیدی" (مطبوعہ طہران ۱۳۱۷ھ شمسی) کا دیباچۂ مرتب۔ صفحہ ج تا صفحہ چ ؛ (مترجم)

[4] ڈاکٹر خان بابا نے اپنے دیباچے میں (صفحہ اب) مجمع التواریخ السلطانی کی ایک عبارت پیش کر کے یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ " زبدۃ التواریخ" صرف اس کتاب کی چوتھی جلد (رُبعِ رابع) کا نام تھا؛ (مترجم) [5] ریو کی فہرست مخطوطات فارسی ص۴۲۲ الف ؛

جن میں بدقسمتی سے تیسری اور چوتھی جو بعد الاسلامی ایرانی خاندانوں سے متعلق تھیں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تلف ہو گئیں[1]۔ پہلی اور دوسری جلدوں کے قلمی نسخے سینٹ پیٹرزبرگ[2] میں موجود ہیں۔ اور اُن کی کیفیت بیرن روزن[3] نے مفصّل بیان کی ہے۔ جلد اوّل کا ایک مخطوطہ جو سابقًا کونٹ دو گوبینو[4] کے مجموعۂ کُتب میں تھا اب عجائب خانۂ برطانوی میں[5] ہے۔ اور خود میرے پاس جلد دوم (مشتمل بر تاریخ محمد ؐ و خلافت تا انقراضِ خلافت) کا ایک عمدہ قلمی نسخہ مؤرّخہ جمعہ ۱۵ / شعبان ۸۲۹ھ (۲۲ / جون ۱۴۲۶ء) موجود ہے۔ اور ہرات میں اسی سال لکھا گیا جس میں یہ تصنیف مکمّل ہوئی ؂

اس تاریخ کے علاوہ حافظ ابرو نے ایک بلند پایہ جغرافی تصنیف بھی تیار کی جس کی جلد اوّل کی نمائندگی دو قلمی نسخے کرتے ہیں[6]۔ جن میں سے ایک عجائب خانہ برطانوی میں[7] ہے اور ریو نے اس کی مفصّل کیفیت بیان[8] کی

---

[1] روزن (Rosen) کی تالیفِ مذکور ص۵۳۔ (یہ دو جلدیں تلف نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر خان بابا نے مذکورہ دیباچے میں (صفحہ یٖ ببعد) پوری کتاب کی کیفیت بیان کرتے ہوئے چاروں جلدوں کے کئی نسخے شمار کیے ہیں۔ مترجم)؛

[2] St. Petersburg ؛

[3] Baron Victor Rosen ۔ تالیفِ مذکور جلد سوم ص۵۲ تا ص۱۱۱؛

[4] Comte de Gobineau ؛ [5] Or. 2774. ؛ [6] ڈاکٹر خان بابا نے اپنے دیباچے میں اس جغرافیے کے کل چھ نسخے شمار کیے ہیں۔ رک بہ صفحہ زٓ ببعد۔ (مترجم)؛

[7] OR. 1577 ؛ [8] فہرست مخطوطاتِ فارسی ص ۴۲۱-۴۲۴؛

ہے۔ اور دوسرا سینٹ پیٹرز برگ میں[1]۔ یہ تصنیف ۸۲۰ھ اور ۸۲۳ھ (۱۴۱۷ء اور ۱۴۲۰ء) کے درمیان شاہرخ کے لئے تیار کی گئی۔ ریو نے اسکے مطالعے سے مصنّف کی زندگی اور خصوصًا اس کی وسیع سیاحتوں کے بہت سے حالات اخذ کئے ہیں۔ تیمور کے ہمراہ وہ کئی مہموں میں شریک ہؤا۔ اور ۸۰۳ھ (۱۴۰۰-۱ء) میں حلب اور دمشق کی تسخیر میں اس کے ساتھ تھا۔ جب شاہرخ تخت پر بیٹھا تو ۸۱۸ھ (۱۴۱۵-۶ء) سے قبل اس نے ہرات میں رہ کر علمی و ادبی مشاغل اختیار کئے۔ لیکن سواروں کے ایک شاہی دستے کے ساتھ آذربائجان سے واپس آتا ہؤا زنجان میں انتقال کر گیا۔ اور وہیں مدفون ہے۔ "تاریخ وسیرت کی نادر کتاب مجمل فصیحی میں اس کا مندرجۂ ذیل وفات نامہ ۸۳۳ھ (۱۴۲۹-۳۰ء) کے تحت میں آتا ہے۔ مگر بیشتر اسناد میں اس کا سنِ وفات وہ دیا گیا ہے۔ جو اوپر مذکور ہؤا[2]:-

"اعلحضرتِ سلطانی (میرزا شاہرخ) کی مراجعت کے وقت مولانا شہاب الدین عبداللہ خوافی[3] المعروف بہ حافظ ابرو مؤلّف "مجمع التواریخ السلطانی"

---

[1] روزن - تالیف مذکور - ص ۱۱۱؛

[2] ملاحظہ ہو ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی کا ص ۴۲۲ اور وہ قطعہ تاریخ جو اس پر درج ہے؛

[3] اس کے نام اور مولد کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کا ذکر اوپر ص ۵۹۷ پر کیا جا چکا ہے؛

کی وفات بروز اتوار ۳ شوّال بمقامِ سرجام۔ زنجان میں فاضلِ الٰہیات اخو ابی الفرج زنجانیؒ کے مقبرے کے پاس مدفون ہے"۔

مصنّف کے ہمعصر عبدالرزاق سمرقندی نے جو اس سے عُمر میں چھوٹا تھا۔ اور جس کا ذرا آگے چل کر ہمیں ذکر کرنا ہے زبدۃ التّوارِیخ کا کُھلے بندوں استعمال کیا۔ مذکورۂ بالا جُغرافی تصنیف کا نصف حصّہ مابعدِ اسلام کی ایرانی تاریخ کے خلاصے پر مشتمل ہے جو متاخّر عہد پر آکر بہت مفصّل ہو جاتا ہے۔ اور رمضان ۸۲۲ھ (اکتوبر ۱۴۱۹ء) تک چلتا ہے۔ جہاں تک دُوسری جلد سے رائے قائم کی جا سکتی ہے (کتاب کا یہی حصّہ میری رسائی میں ہے) مصنّف کا اسلوبِ بیان بہت صاف اور سادہ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اس کی تصانیف کا جس قدر حصّہ دستیاب ہے شائع کیا جائے۔

---

(۲) فصیحی خوافی

فصیحی خوافی اس قابلِ اعتنا مؤرّخ اور سیرت نگار کو ہم صرف ایک کتاب کے ذریعے جانتے ہیں۔ یعنی "مجمل" جس میں تاریخِ اور سیرت کا اجمال ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کے صرف تین قلمی نسخے وجود میں ہیں۔ ان میں سے ایک سینٹ پیٹرز برگ کی وزارتِ

---

[1] دیکھو نفحات الانس جامی۔ طبع نساؤ لیس (Nassau Lees) ص ۱۹۶۔ جہاں اس کا نام "اخی فرج زنجانی" لکھا ہے اور اس کی تاریخِ وفات ۴۵۷ھ (۶۵-۱۰۶۴ء) دیگئی ہے؛

خارجہ کے ادارۂ السنۂ شرقیہ[1]" کی ملکیت ہے۔ اس کی کیفیت بیرن روزن[2] نے بیان کی ہے۔ روزن کا یہ کیفیت نامہ ڈورن[3] کے سابق اور زیادہ مفصّل کیفیت نامے کا ضمیمہ ہے۔ باقی دو میں سے ایک نسخہ پہلے پشتو زبان کے عالم آنجہانی کرنل ریورٹی[4] کی ملکیت تھا جو ۱۹۰۸ء میں ان کی بیوہ سے "سرمایۂ یادگارِ گِب" کے مؤتمنین نے خرید لیا۔ تیسرا نُسخہ مجھے میرے عزیز ترین مسٹر گائی لوسٹرینج[5] نے دیا۔ خود اُنہوں نے یہ آنجہانی سر ہاؤٹم شنڈلر[6] سے خریدا تھا۔ یہ مخطوطہ ریورٹی کے نسخے سے بہت بعد کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن صحیح اور خوشخط ہے۔ اور اس میں صرف دس سال (۸۳۴ھ تا ۸۴۴ھ = ۱۴۳۰ء تا ۱۴۴۰ء) کا ایک رخنہ ہے۔ جبکہ دُوسرے میں ۱۲۲ سال (۷۱۸ھ تا ۸۴۰ھ = ۱۳۱۸ء تا ۱۴۳۷ء) کا رخنہ ہے ؎

۱۹۱۵ء میں بلجیم کے جلا وطن اساتذۂ السنۂ شرقیہ نے جو عارضی طور پر کیمبرج میں اقامت گزین تھے مطبعۂ جامعۂ کیمبرج سے میوزیون[7] کا ایک شمارہ

---

[1] Institute des Langues Orientales du Ministere des Affaires Etrangeres de St. Petersburg ؛

[2] "مجموعاتِ کتبِ علمی .... مخطوطاتِ فارسی" (Collectiens Scientifique.... Manuscrites Persans,) ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۳ ؛

[3] Dorn ؛ [4] Col. Raverty. ؛

[5] Guy le Strange ؛

[6] Sir Alberts Houtam Schindler ؛ [7] Museon ؛

مجمل فصیحی کی توصیف اس میں مَیں نے ان کی دوستانہ فرمائش پر تیس صفحے کا ایک مقالہ اسی دلچسپ تصنیف پر معہ متعدّد اقتباسات کے شائع کیا۔ یہ مقالہ دونوں انگلستانی نسخوں پر مبنی ہے جو ان دنوں میرے پاس تھے جیسا کہ مَیں نے اس مقالے میں بتایا۔ مجمل ایک مقدمہ۔ دو مقالوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں تخلیق سے لے کر محمدؐ رسول اللہ صلعم کی ولادت تک کی تاریخ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلے مقالے میں یہی تاریخ ہجرتِ نبویؐ تک آگے چلتی ہے۔ دُوسرا مقالہ جو کتاب کے باقی حصّوں سے کہیں بڑا اور اہم تر ہے سنہ ۱ھ تا سنہ ۸۴۵ھ (سنہ ۶۲۲ء تا سنہ ۱۴۴۲ء) کی تاریخ پر محتوی ہے۔ خاتمہ جو بدقسمتی سے تمام معلوم نسخوں میں غائب ہے مصنّف کے مولد و مسکن ہرات کے حالات اور اسکے قبل الاسلامی تاریخ پر شامل ہے ؛

مجمل کے مصنّف فصیحی خوافی کے جو کچھ حالات ہمیں معلوم ہیں اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ اور مجھے اَور کہیں اس کا کوئی ذکر نہیں ملا۔ روزن کہتا ہے کہ وہ سنہ ۷۷۷ھ (۶-۱۳۷۵ء) میں پیدا ہوا۔ لیکن مجمل سے مَیں اس بیان کی تصدیق نہیں کر سکا۔ سنہ ۸۰۷ھ (۵-۱۴۰۴ء) میں اسے تین اَور اشخاص کیساتھ جن کے نام اس نے دئے ہیں خزانے سے متعلق ایک خدمت سپرد ہوئی۔ سنہ ۸۱۸ھ (۶-۱۴۱۵ء) میں وُہ شاہرخ کے ہمراہ اس کے بھتیجے امیر بایقرہ کی باغیانہ سرگرمیوں کو فرو کرنے شیراز گیا۔ سنہ ۸۲۵ھ (سنہ ۱۴۲۲ء) میں خزانے سے متعلق کسی معاملے میں کرمان بھیجا گیا۔ سنہ ۸۲۷ھ (سنہ ۱۴۲۴ء)

میں وہاں سے واپس بادغیس چلا آیا۔ ۸۲۷ھ (۵-۱۴۲۴ء) میں بایسنقر میرزا کے التفات سے سرفراز ہوا اور اس کی سرکاری ملازمت میں داخل ہوا۔ ۸۴۱ھ (۸-۱۴۳۷ء) کے تحت میں وہ شہاب الدین عزیز اللہ خوافی کے کچھ اشعار نقل کرتا ہے جو موصوف نے اس کے ایک فرزند کی ولادت بتاریخ ۲۴ر ذوالحجہ (۱۸ر جون ۱۴۳۸ء) کی یادگار میں لکھے۔ ۸۴۲ھ (۹-۱۴۳۸ء) میں وہ اپنے پوتے مغیث الدین ابو نصر محمد ابن محمود کی پیدائش بتاریخ ۱۰ر ذوالقعدہ (۲۴ر اپریل ۱۴۳۹ء) کا ذکر کرتا ہے۔ ۸۴۳ھ (۴۰-۱۴۳۹ء) میں اس نے اپنی شامت سے گوہر شاد آقا کو ناراض کیا۔ اور اُس نے اِسے قید کر دیا۔ دوبارہ ۸۴۵ھ (۲-۱۴۴۱ء) میں مقید ہوا۔ اسی سال پر آ کر یہ وقائع ختم ہو جاتے ہیں (گو ایک شعر میں جس پر ایک نسخہ ختم ہوتا ہے ۸۴۹ھ = ۱۴۴۵ء کی تاریخ مذکور ہے) اور بظاہر ۸۴۵ھ ہی میں ۱۵ر ذوالحجہ (۲۶ر اپریل ۱۴۴۲ء) کو اس نے کتاب شاہرخ کے حضور میں گزرانی ؛

مجمل فصیحی کے مفصّل حالات میں نے میوزیوں کے متذکرۂ صدر شمارۂ کیمبرج میں شائع کئے۔[1] اس مقالے کے ہوتے ہوئے یہاں اس کے

مجمل فصیحی کی خصوصیات

مندرجات کو پھیلا کر بیان کرنیکی ضرورت نہیں رہتی۔ مجمل کی دو نمایاں خصوصیتیں یہ ہیں کہ اس کا اسلوب نہایت سادہ ہے اور اس میں ادبی دلچسپی کی باتوں پر خاص توجہ کی گئی ہے۔

---

[1] دیکھئے میوزیوں (Museon) میں میرا مقالہ ص ۸-۵۷ ؛

اس کی ترتیب تاریخ وار ہے۔ ہر سال کے واقعات جن میں تمام طبقوں کے ممتاز اشخاص کی اموات بھی شامل ہیں اس سال کے تحت یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اموات کی فہرستوں میں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ شعرار علمار اور ادبار کی تعداد خصوصًا اُن کی جو خراسان اور ماوراء النّہر سے تعلق رکھتے ہیں کتنی زیادہ ہے۔ علاوہ برآں یہ امر بدیہی ہے کہ فصیحی نے اپنی اطلاعات بُہت حد تک ایسے مآخذ سے جمع کی ہیں جو متاخّر اور مشہور تر تذکرہ نویسوں اور مؤرّخوں کے استعمال کردہ مآخذ سے مختلف ہیں۔ اور یہ بات اس کتاب کو خاص وقعت بخشتی ہے ؂

---

(۳) کمال الدّین عبد الرّزاق سمرقندی

عبد الرّزاق سمرقندی

عبد الرّزاق ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) میں[1] گوہرات میں پیدا ہؤا۔ لیکن سمرقندی کہلاتا ہے۔ کیونکہ سمرقند اسکے والد مولانا جلال الدین اسحٰق کا پیدائشی مقام تھا جو شاہرخ کی فوج میں قاضی اور امام تھے۔ والد کی وفات کے بعد ۸۴۱ھ (۸-۱۴۳۷ء) میں ۲۵ سال کی عمر میں عبد الرّزاق نے صرف و نحو کا ایک رسالہ تصنیف کیا اور اسے سُلطان کے نام معنون کر کے اس کی عنایت حاصل کی۔ چار سال بعد

---

[1] حبیب السیر میں اس کی تاریخ ولادت ۱۲ ر شعبان ۸۱۶ھ (۷ ر نومبر ۱۴۱۳ء) دی گئی ہے ؂

۸۴۵ھ (۲-۱۴۴۱ء) میں شاہ بیجانگر کے پاس ایک خاص سفارت پر بھیجا گیا۔ جو تین سال تک جاری رہی۔ اپنی تاریخ میں اُس نے اس کی مفصّل روداد لکھی ہے۔ ۸۵۰ھ (۷-۱۴۴۶ء) میں ایک سفارت پر گیلان بھیجا گیا۔ اسی سال شاہرخ نے وفات پائی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے میرزا عبداللطیف، عبداللہ، ابوالقاسم بابر اور بالآخر ابوسعید کی ملازمت میں رہا۔ بعد میں اس نے ان مشاغل سے دستکش ہوکر عزلت گزینی اختیار کی اور ۸۶۷ھ (۱۴۶۳ء) میں ہرات میں شاہرخ کی خانقاہ کا شیخ ہوگیا۔ اور وہاں ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں اس نے انتقال کیا۔ یہ سب معلومات ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی[1] سے لی گئی ہیں۔ اور بیشتر مؤرخ کے اپنے بیانات سے یا حبیب السیر میں اس کے تذکورہ[2] سے ماخوذ ہیں۔ اس کی زندگی اور تصنیف و تالیف کا مکمل ترین حال کاترمیر[3] نے "مخطوطاتِ کتابخانۂ قومی کے کیفیت نامے اور اقتباسات[4]" میں دیا ہے۔ دیگر اسناد کے حوالے آپ کو ریو کی فہرست میں ملیں گے۔

عبدالرزّاق کی تاریخ مطلع السّعدین

جہاں تک مجھے معلوم ہے عبدالرزّاق نے پائے کی چیز صرف ایک لکھی یعنی وہ تاریخ جس کا عنوان مطلع السعدین ہے یہ دو جلدوں

---

[1] ص ۱۸۱ تا ص ۱۸۳؛ [2] جلد سوم۔ جزوسوم۔ ص ۳۳۵؛

[3] Quatremere؛ [4] Notices et Extraits des Manuscrites de la Bibliotheque Nationale. جلد چہارم ص ۱ تا ص ۵۱۴؛

میں ہے اور اس میں ۱۷۰ سال کی تاریخ ہے یعنی ایران کے آخری مغول سلطان ابوسعید کی ولادت (۷۰۴ھ = ۵-۱۳۰۴ء) سے اسکے ہمنام تیمور کے پڑپوتے[1] کی وفات تک کی۔ قیاساً سعدین سے مُراد یہی دو ابوسعید ہیں۔ پہلی جلد تیمور کی موت (۸۰۷ھ = ۱۴۰۵ء) تک آتی ہے۔ اس حیرت انگیز اتفاق کی طرف جو صاحبِ مطلع السعدین کے مشاہدے میں آیا ہے پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے[2] کہ ایران کے آخری مغولی فرمانروا ابوسعید کی تاریخِ وفات وسط ایشیا کی دُوسری عظیم تاتاری سلطنت کے بانی تیمور کی تاریخِ ولادت کے ساتھ قریب قریب بالکل منطبق ہے ؂

مطلع السعدین کے قلمی نسخے گو بہت عام نہیں ہیں لیکن اکثر بڑے بڑے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں اور جہاں تک مَیں نے دیکھا ہے عموماً

مطلع السّعدین کی قدر و قیمت اور ضرورتِ اشاعت

صحت اور عُمدگی کے اعتبار سے اوسط درجے کے نسخوں سے برتر ہیں[3]۔ یہ تصنیف گو قابلِ لحاظ حد تک حافظ ابرو کی زبدۃ التّواریخ

---

[1] ابوسعید تیموری کو اوزون حسن نے ۸۷۳ھ (۹-۱۴۶۸ء) میں گرفتار کرکے قتل کرادیا تھا۔ یہ تاریخ اس واقعہ کے ایک دو سال بعد یعنی ۸۷۵ھ (۱-۱۴۷۰ء) تک چلتی ہے؛ [2] صـ ۲۳۳ بالا؛

[3] کتاب خانۂ جامعۂ کیمبرج میں اس تصنیف کا ایک نسخہ دو جلدوں میں (Or. 267 and 268.) ہے اور ایک بہت بہتر نسخہ (Dd. 3. 5) کیمبرج کے کرائسٹ کالج (Christ College) میں محفوظ ہے؛

پر مبنی ہے۔ لیکن بڑی اہمیت کی چیز ہے اور اس کی ایک محققانہ طبع کی بہت ضرورت ہے[1]۔ کیونکہ یہ ایرانی تاریخ کے ایک بڑے اہم دور سے مفصّل طور پر بحث کرتی ہے۔ اور ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جس نے چشمدید حالات لکھے اور جن واقعات کی شرح کی ان میں سے اکثر میں خود نمایاں عملی حِصّہ لیا؛

---

(۴) معین الدّین محمّد اسفزاری

معین الدّین اسفزاری

معین الدّین اسفزاری خصوصاً اپنی کتاب "روضۃ الجنّات فی تاریخ مدینۃ الہرات" کے سبب قابلِ ذکر ہے۔ یہ سلطان حسین ابوالغازی کے لئے لکھی گئی۔ اسکے اندراجات ۸۷۵ھ (۱-۱۴۷۰ع) تک آتے ہیں۔ لیکن یہ شخص دربار اور سفارت کے کاموں کا بھی ماہر تھا اور اس پر اس نے ایک رسالہ تالیف کیا۔ علاوہ ازیں[2]

اس کی تاریخِ ہرات کے قلمی نسخے

اس کی تاریخِ ہرات کے تین نُسخے[3] عجائب خانۂ برطانوی میں محفوظ ہیں؛

---

[1] اورینٹل کالج میگزین میں اس کا متن بہ تصحیح و ترتیب خان بہادر محمد شفیع صاحب (سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) باقساط چھپ رہا ہے۔ دیکھو اوپر صفحہ ۵۳۹، ذیلی حاشیہ نمبر ۶؛ (مترجم)

[2] حبیب السیر۔ جلد سوم۔ جزو سوم۔ صفحہ ۲۴۲؛

[3] ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی ص ۲۰۶-۷۔ نیز ضمیمۂ فہرست صفحہ ۶۴؛

ایک اَور نسخہ جس کی تاریخ کتابت ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۳ء) ہے مسٹر ایلس[۱] کی ملکیت ہے۔ اور اُنھوں نے نہایت فیاضی سے کام لیتے ہوئے مجھے استعمال کے لیئے عنایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اَور نسخہ آں جہانی سر البرٹ ہاؤٹم شنڈلر[۲] کے کتابخانے میں تھا۔ اور جنوری ۱۹۱۷ء میں مَیں نے خرید لیا۔ اس اہم تصنیف کا مفصّل حال آنجہانی موسیو "باربیر[۳] دو مینار" نے بزبانِ فرانسیسی مجلۂ آسیائی میں شائع کیا (سلسلۂ پنجم۔ جلد شانزدہم صفحہ ۴۶۱ تا ۵۲۰) مصنّف نے اسے ۲۶ روضوں میں تقسیم کیا ہے جن میں اوّل تا ششم کے مباحث کی تفصیل یُوں ہے:۔ شہر ہرات؛ اس کے مضافات؛ اس کی جغرافی خصوصیات؛ اسلامی عہد میں اسکے ابتدائی حکّام؛ کُرت خاندان کے ساتویں اور آٹھویں تاجدار اور تیمور کے ہاتھوں اس خاندان کا خاتمہ؛ تیمور کی بقیۂ تاریخ؛ تیمور کے جانشینوں کی تاریخ سلطان حسین ابو الغازی کی دُوسری تخت نشینی تک۔ "شہرِ صفر" کے اعداد سے اس کی تاریخِ تکمیل ۸۷۵ھ (اگست ۱۴۷۰ء) نکلتی ہے۔ مصنّف نے اپنے مآخذ شمار کرتے ہوئے کُرت نامۂ ربیعی بوشنجی اور ابو اسحٰق احمد بن یٰسین، شیخ عبد الرحمٰن فامی اور سیفی ہراتی کی تاریخوں کے نام لیئے ہیں۔ کم سے کم ایک جگہ (روضۂ سیزدہم میں) وُہ مذکورہ بالا مطلع السعدین سے بھی استناد کرتا ہے ؎

ا؎ Mr- A. G. Ellis؛

۲؎ Sir Albert Houtam Schindler؛

۳؎ M. Barbier de Meynard؛

(۵) محمّد ابنِ خاوندشاہ ابنِ محمود المعروف بہ میرخواند

میرخواند کی ضخیم عمومی تاریخ روضۃ الصّفا شاید ایران میں اس قسم کی مشہور ترین تصنیف ہے اور ذرا ناواجب حد تک موردِ توجّہ رہی ہے۔ چھاپ سنگی کیساتھ

میرخواند

بمبئی (۱۲۷۱ھ = ۵-۱۸۵۴ء) اور طہران (۷-۱۲۷۰ھ = ۸-۱۸۵۴ء) سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ترکی ترجمہ قسطنطنیہ سے ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں چھپکر نکلا۔ چند متفرق حصّے جو مخصوص خاندانوں سے متعلق ہیں مع ترجمہ یا بلا ترجمہ یورپ میں چھپے ہیں اور ابتدائی حصّے کا انگریزی ترجمہ مسٹر رہٹ سک[1] نے کیا ہے جس کی تین یا چار جلدیں انجمنِ ہمایونی ایشیائی[2] کے اہتمام سے شائع ہوئی ہیں۔ افسوس کیساتھ ماننا پڑیگا کہ یہ جلدیں کچھ ایسی فائدہ مند نہیں ہیں۔ کیونکہ قطعِ نظر اس کے کہ ایک متعلّم جو انبیاء، بطارقہ اور شاہانِ قدیم کے بارے میں مسلمانوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے سابق تر اور زیادہ معتبر مآخذ سے معلومات تلاش کرنیکو ترجیح دیگا خود ترجمہ بھی عجب طرح کا ناقص اور بھونڈا ہے۔ اور پھر یہ بھی مستحسن نہیں کہ انگریزی خوان میرخواند کے اسلوب کا (گو وہ طوالت پسند اور پُرتکلّف ہے) اندازہ ایک ایسے ترجمے سے حاصل کریں جسے بلاضرورت مضحک اور بے سروپا بنا دیا گیا ہے۔ ایران میں آج

---

[1] Mr. Rehatsek

[2] Royal Asiatic Society

بھی اس کتاب کو جس تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس کا کافی ثبوت

روضۃ الصّفا کا ضمیمہ رضا قلی خان کے قلم سے

اس بات سے ملتا ہے کہ جدید زمانے کے ایک فاضل ترین مصنف رضا قلی خان لالہ باشی المتخلّص بہ ہدایت نے اپنے وقت کا بجا مصرف سمجھتے ہوئے اس پر ایک ضمیمے کا اضافہ کیا جس میں وہ تاریخ کی روایت اپنے زمانے یعنی اُنّیسویں صدی کے وسط سے چند سال بعد تک لایا ہے۔ ایرانِ جدید کی تاریخ کیلئے یہ ضمیمہ معلومات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے جس میں بابی مذہب کے طلوع اور ان خانہ جنگیوں اور تعدّیوں کے حالات جو اس سلسلے میں رُونما ہوئے بصیرت افروز پیرائے میں ملتے ہیں۔

میرخواند کے اخبارِ زندگی کچھ ایسے محفوظ نہیں ہیں حتّٰی کہ اس کے نتاخواں پوتے خواند امیر صاحبِ حبیب السیر نے بھی اسکے بارے میں

میرخواند کی سوانح عُمری

کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ اسکے والد سیّد برہان الدّین جو بُخارا کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ہجرت کرکے بلخ چلے آئے اور وہیں اُنھوں نے انتقال کیا۔ میرخواند نے زندگی کا بیشتر حصّہ ہرات میں اپنے وقت کے ہُنرپرور مدبّر میر علی شیر نوائی کے ظلّ عاطفت و تربیت میں گزُارا۔ اور وہاں ایک طویل علالت کے بعد ۲ ذوالقعدہ سنہ ۹۰۳ھ (۲۲ جون سنہ ۱۴۹۸ء) کو چھیاسٹھ کی عُمر پاکر وفات پاگیا[1]۔

---

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

روضۃ الصّفا کے مشتملات

ان سات جلدوں میں سے جن میں روضۃ الصفا کا تاریخی حصّہ منقسم ہے پہلی جلد میں بزرگانِ اسرائیل، انبیاء، اور ایران کے قبل الاسلامی بادشاہوں کی تاریخ ہے۔ دُوسری میں خاتم انبیاء محمد اور خلفائے راشدین کی تاریخ۔ تیسری میں بارہ اماموں اور خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کی تاریخ۔ چوتھی میں بعد الاسلامی ایرانی خاندانوں کی تاریخ تیموری یورش تک۔ پانچویں میں مغلوں اور تاتاریوں کی تاریخ تیمور تک۔ چھٹی میں تیمور اور اس کے جانشینوں کی تاریخ ۸۷۳ھ (۹-۱۴۶۸ء) تک۔ اور ساتویں میں جو کسی دُوسرے (غالباً مصنّف کے پوتے خواندامیر) کے قلم سے ہے تمامتر میر خواند کے مربّی ابوالغازی سلطان حسین کی زندگی اور عہدِ حکومت کی تاریخ ہے جو ۹۱۲ھ (۷-۱۵۰۶ء) میں مرا۔ یہ جلد میر خواند کی وفات سے کئی سال بعد تک چلتی ہے۔ آخری دو جلدیں جو مصنّف کے اپنے زمانے سے متعلق ہیں ظاہر ہے کہ پہلے حصّوں سے زیادہ باوقعت اور مستند ہیں اور افسوس ہے کہ اس تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کی توجّہ ان پر زیادہ مُرتکز نہیں رہی۔ سابق مؤرّخین کے اسلوب کی نسبت میر خواند کا اندازِ تحریر بہت زیادہ آراستہ اور طنطنہ آمیز

---

[1] دیکھو حبیب السیر جلد سوم جزو سوم ص ۳۳۹؛ ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی ص ۸۷؛ دوساسی (s. de Sacy) کی تصنیف "تذکرۂ آثارِ قدیمۂ ایران (Memoire sur les Antiquites de la Perse)" میں "ذکرِ میرخواند" (Notice sur Mirkhond) اور دیگر حوالے جو ریو نے دیئے ہیں؛

ہے اور اس لحاظ سے اپنے زمانے کی متداول تحریروں کا صحیح نمونہ ہے۔ یہ انداز بابر ہندوستان میں لایا۔ اور "مغلہائے بزرگ" کے دربار میں پرورش پاتا رہا اور اس عام خیال کا باعث ہوا۔ کہ یہ آراستگی اور طمطراق اصلاً ایرانی ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل بعید از واقعہ ہے۔ متقدم اور متاخر زمانوں میں بہت سی قابلِ ذکر تصانیف ایسی سادگی اور سنجیدگی کیساتھ لکھی گئی ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ چاہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ جن لوگوں کی سرپرستی میں اس ثقیل لفاظی نے خاص فروغ پایا۔ وہ تاتاری، ترک، ہندوستانی اور دیگر غیر ایرانی تھے۔ اور بالخصوص عثمانی ترکوں نے اسے بڑے اونچے درجے تک پہنچایا۔ سر چارلس ایلیٹ[1] اپنی کتاب "یورپی ٹرکی"[2] (طبعِ جدید ۱۹۰۸ء) کے صفحہ ۱۰۶ پر ایسے احسن الفاظ میں اس کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ میں انہیں نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتا:۔

پُرشوکت اسلوب کی طرف ترکوں کے طبعی رجحان پر سر چارلس ایلیٹ کے الفاظ

"وقار اور سادہ لوحی کا جو مرکب یہ اسلوب بہم پہنچاتا ہے بے مثل ہے، اس کی ناقابلِ بیان آسودگی میں جسے شدید ترین واقعات مضطرب نہیں کر سکتے کچھ سرایت کرنیوالا اثر ہے۔ ہر چیز رفیع الشان ہے۔ ہر شخص عالی حوصلہ اور نیرومند ہے۔ ہم بنیادی نیکیوں اور اُن کی مناسب جزاؤں کی (خدا ان کو زیادہ کرے!)

---

[1] Sir Charles Eliot

[2] Turkey in Europe

دُنیا میں چلتے پھرتے ہیں اور ہمیشہ منصور رہنے والے (عثمانی) خلیفہ کے سائے میں محفوظ رہنے والی باجگزار یورپی طاقتوں اور ناشکر گزار عیسائی رعیتوں کے وجود کا ہمیں صرف ایک دھندلا سا احساس رہتا ہے۔ کیا کوئی مغربی شاعر اپنے ناظرین کو اس سے زیادہ کسی طلسمی دُنیا میں لے جا سکتا ہے؟"

---

(۶) خواندامیر

میر خواند کے پوتے خواندامیر کو اس دور کے مؤرخین میں شامل کرنیکی ترغیب تین وجوہ سے ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ وہ اُن متعدد مصنّفوں اور اہلِ فن میں سے تھا۔ جو اپنی کامیابی کے لئے میر علی شیر نوائی کی مدبّرانہ تربیت کے مرہونِ منّت تھے۔ دوم یہ کہ نہ صرف وہ اس حلقے سے تعلق رکھتا تھا جس سے میر خواند وابستہ تھا بلکہ اس کا پوتا اور مزید برآں اس کا مُرید بھی تھا۔ اور آخری وجہ یہ کہ اس کی سب سے پہلی تالیف "خلاصۃ الاخبار" نہ صرف اصلاً روضۃ الصّفا کی تلخیص ہے بلکہ زیرِ تبصرہ دور کے ختم ہونے سے دو سال پہلے یعنی ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ء و ۱۵۰۰ء) میں لکھی گئی۔ خواندامیر کی زیادہ اہم تصنیف حبیب السیر ۹۲۹ھ (۱۵۲۳ء) میں جا کر تصنیف ہوئی۔ مصنّف ۹۴۱ھ (۵-۱۵۳۴ء) تک زندہ رہا۔ اس لحاظ سے درحقیقت زیادہ صحیح طور پر وہ اگلے دور کا آدمی ہے۔ لیکن زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس خاندانِ صفوی کے بانی شاہ اسمٰعیل کے سلسلے میں یہیں شامل

خواندامیر

کرلیا جائے جس کے دورِ حکومت کی ایک طویل روئداد کے ساتھ حبیب السیر ختم ہوتی ہے۔

کُتبِ سیَر

مؤرخین کے بعد سیرت نگاروں کی باری آتی ہے جن کی پانچ یا چھ[1] تصانیف تذکرے کی مستحق ہیں یعنی دولتشاہ کا "تذکرۃ الشعرا"؛ میر علی شیر نوائی کی "مجالس النفائس" (جو فارسی میں نہیں ترکی میں ہے)؛ مولانا جامی کی "نفحات الانس"؛ ابوالغازی سلطان حسین کی "مجالس العشاق"؛ حسین واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہداء"؛ اور اسکے بیٹے علی کی "رشحات"۔ ان میں سے ہر تصنیف کا یہاں اجمالی جایزہ لیا جائیگا۔ لیکن چونکہ نوائی۔ مولانا جامی اور حسین واعظ کاشفی ترجمہ نگاروں کے علاوہ اَور حیثیتوں سے زیادہ مشہور ہیں اسلئے ان کی زندگی کا خاکہ زیادہ مناسب طور پر اُس وقت پیش کیا جائیگا جب ہم دُوسرے زمروں کے مصنّفین پر گفتگو کرینگے۔

(۱) مولانا جامؔی کی نفحات الانس اور بہارستان

ملّا نورالدّین عبدالرحمٰن جامؔی کا تخلّص شہر جام کی نسبت سے ہے۔

---

[1] حاشیہ سامنے کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

جہاں وہ ۷؍ نومبر ۱۴۱۴ء[1] کو پیدا ہوئے۔ وہ اپنی تصانیف کے معیار و مقدار

مولانا جامی کی نفحات الانس اور بہارستان

دونوں کے اعتبار سے غیر معمولی شخص ہیں۔ انہیں اکثر "ایران کا سب سے آخری مستند (کلاسکی) شاعر" کہا گیا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ اُن دلائل کی بنا پر جو آگے چل کر پیش کی جائیں گی غلط ہے۔ زیادہ تر وُہ ایک ایسے صوفیانہ شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں جس میں تخیل کی بےمثل رسائی اور دلربائی پائی جاتی ہے۔ اپنے تیرھویں صدی کے ذی رُتبہ پیشرو شیخ فریدالدین عطّار کی طرح جو اگرچہ رعنائی میں جامی سے پیچھے ہیں لیکن پُرنویسی میں ان سے بھی آگے نکل گئے ہیں مولانا جامی نے صوفی اولیاء کا ایک زبردست تذکرہ "نفحات الانس" کے عنوان سے لکھا۔ اس کتاب کی ایک عمدہ طبع ۱۸۵۹ء میں کلکتہ سے نکلی[2]۔ جس کے ساتھ نساؤلیس[3] کے قلم سے مصنّف کے حالات کا بہت عمدہ بیان ہے۔ یہ طبع ۶۴۰ صفحات پر شامل ہے۔ اس تصنیف میں ۶۱۱ اولیاء اور ولیہ خواتین

(حاشیہ ص ۶۱۴) مولانا جامی کے تفصیلی مطالعے کے لئے ناظرین کی توجہ پروفیسر علی اصغر حکمت کی تالیف "جامی" (مطبوعۂ طہران۔ سنہ ۱۳۲۰ھ شمسی) کی طرف دلائی جاتی ہے۔ جس میں جامی کے احوال اور کلام کا تبصرہ ہے (مترجم)؛

[1] ۲۳؍ شعبان سنہ ۸۱۷ھ؛

[2] Nassau Lees ؛ [3] سنہ ۱۲۸۹ھ میں مطبعۂ حیدری سے اس کی ایک طبع نکلی جس کے حاشیوں میں سلسلۃ الذہب چھپی ہوئی ہے (مترجم)؛

کے ترجمے ہیں۔ اور اس موضوع پر سب سے زیادہ مفید اور آسانی سے دستیاب ہو جانے والے مآخذِ معلومات میں سے ہے۔ ۸۸۱ھ (۱۴۷۶ء) میں لکھی گئی۔ اس میں یہ سوانحعمریاں زمانوی ترتیب سے مُرتّب ہیں اور خواجہ حافظ کمالِ خجندی، مغربی وغیرہ شعراء کے ساتھ جو عہدِ تیمور کے اواخر اور عہدِ شاہرخ کے اوائل میں جلوہ افروز تھے ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں ۳۴ صفحوں کا ایک مقدّمہ بھی ہے جو نو فصلوں میں صُوفیوں کے عقائد، عمل اور تاریخ سے متعلق مختلف امور سے بحث کرتا ہے ؎

کتاب سیدھی سادی طرز میں لکھی گئی ہے جو ایسی تصنیف کے لئے موزوں ہے؛ اور اس میں شک نہیں کہ جامی کا مذاق اتنا سلجھا ہُوا اور ان کا خلوص اس درجے کا تھا کہ ان کی فطرتِ سلیم انہیں لفّاظی اور طنطنہ آمیزی کے اس گڑھے میں گرنے نہ دے سکتی تھی۔ جس نے اس عصر کی کئی کتابوں کا ستیا ناس کر دیا ہے ؎

مولانا جامی کی انشائیہ تصانیف میں سے ایک اَور "بہارستان" ہے[1] جس کے عنوان کی ساخت گلستانِ سعدی کی سجھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے پہلے باب میں جو اولیاء کے اقوال سے متعلق ہے اور ساتویں باب میں جو شاعری اور شعراء کے بیان میں ہے کچھ سیرتی مواد ملتا ہے۔ لیکن اس کتاب کا مقصد زیادہ تر ناظرین کے لئے تفریحِ طبع اور ہدایت کا فراہم کرنا ہے نہ کہ صحیح و مفصّل سیرتی معلومات کا بہم پہنچانا۔ اس کا پیرایۂ عبارت

---

[1] مطبعۂ نولکشور سے اس کی ایک غیر مؤرخہ طبع نکلی (مترجم)؎

نفحات الانس کے انداز سے نمایاں طور پر زیادہ مرصّع ہے۔ اس کا ایک انگریزی ترجمہ نام نہاد "کام شناستر سوسائٹی" نے شائع کیا تھا۔

(۲) دولتشاہ کا تذکرۃ الشّعرا

دولت شاہ

امیر دولت شاہ بن علاؤ الدولہ بُختیشاہ غازی سمرقندی فارسی کے مشہور ترین "تذکرۃ الشعراء" کا مصنّف ہے اور اپنے مغربی ترجمان فون ہیمر[۲] کے واسطے سے بیشتر اُس اندازِ نظر کا ذمہ دار ہے جس سے اہلِ یورپ ایرانی شاعروں کو دیکھتے ہیں۔ اس کا تذکرہ سات طبقات میں تقسیم ہے۔ ہر ایک میں کوئی بیس ایک کم و بیش ہمعصر شعراء اور ان سلاطین کا حال ہے جن کی سرپرستی میں وُہ پنپ رہے تھے۔ اس میں فنِ شاعری پر ایک مقدمہ بھی ہے۔ اور ایک خاتمہ ہے جو مصنّف کے ساتھ ہمعصر شاعروں کے حالات اور اس کے محسن بادشاہ ابوالغازی سلطان حسین

---

[۱] موسیو آنری ماسے (Henri Masse) نے ۱۹۲۵ء میں پیرس سے اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا۔ (مترجم)

[۲] Von Hammer "تاریخ ادبیاتِ ایران اور دو سَو ایرانی شاعروں کے کلام کے انتخابات" Geschichte der schonen Redekunste Persiens; mit einen. Bluthenlese aus zweihundert persischen Dichtern, (وی اینا۔ ۱۸۱۸ء)

کے مکارم و کمالات کے بیان میں ہے۔ یہ کتاب ایک دلچسپ لیکن ناقص تصنیف ہے۔ ایکطرف تو اس میں اشعار کا ایک عمدہ انتخاب ہے اور دوسری طرف تاریخی اغلاط کی بھرمار ہے جس نے بعض جگھوں پر ریو جیسے قابل اور محتاط عالم کو بھی گمراہ کردیا ہے۔ ۱۸۸۷ء میں اس کی ایک سنگی طبع بمبئی سے نکلی اور میں نے بہترین دستیاب نسخوں کا ایک انتخاب سامنے رکھ کر ۱۹۰۱ء میں اپنے چند روزہ سلسلہ مطبوعات موسوم بہ "سلسلۂ متن ہائے کتب تاریخ درزبانِ فارسی[1]" کی پہلی کڑی کے طور پر اس کی ایک طبع شائع کی[2]۔ سلیمان فہمی کا ایک ترکی ترجمہ بھی ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں قسطنطنیہ سے بعنوان "سفینۃ الشعراء" شائع ہوا۔

دولت شاہ کے حالات کی سب سے قدیم روایت وُہ ہے جو اس کے معاصر میر علی شیر نوائی کی "مجالس النفایس" میں (جس کا ہم ابھی ذکر کرینگے) درج ہے۔ دولت شاہ پر ایک مقالہ اس کتاب کے چھٹے باب میں وقف

دولت شاہ کے وقائعِ عمری

ہے۔ اس باب کا مبحث "خراسان اور دیگر مقامات کے چند ایسے اشراف اور امراء ہیں۔ جن کی اپج اور استعداد انکو شعر کہنے پر اکساتی تھی۔ لیکن وہ بہ سبب اپنے رتبۂ عالی اور بلند منصب کے اس (شوق) کو جاری نہ رکھ سکے"

---

[1] Persian Historical Texts Series.

[2] ۱۹۲۴ء میں بہ تصحیح و تمہید شیخ محمد اقبال صافی صاحب اس کی ایک سنگی طبع شیخ مبارک علی تاجر کتب نے لاہور سے شائع کی۔ (مترجم)

دولت شاہ کی توصیف میں وہاں یہ کلمات تحریر ہیں: "ایک کامل خوب نوجوان سادہ مزاج اور اچھی استعداد والا" جس نے گوشہ نشینی اور مطالعے کی زندگی کے لئے دنیوی جاہ و حشم اور اقتدار سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور ایک تذکرۃ الشعرا بالکل اسی موضوع پر تالیف کیا جس پر رسالۂ حاضرہ میں بحث کی گئی ہے۔" اس کی تصنیف کی مدح کر کے نوائی آگے لکھتا ہے کہ اس کی وفات کی خبر حال ہی میں موصول ہوئی ہے۔ بروایتِ ریو[1] "مرآۃ الصفا" میں دولتشاہ کی تاریخ وفات ۹۰۰ھ (۵-۱۴۹۴ء) دی گئی ہے۔ یہ تاریخ نوائی کے بیان سے متفق نہیں۔ الا یہ کہ اسکو دولت شاہ کی وفات کی جو اطلاع ملی وہ جھوٹی تھی۔ اپنا تذکرہ دولت شاہ نے ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) میں تصنیف کیا جبکہ اس کی عمر تقریباً ۵۰ سال تھی۔ اپنے زندہ ہمعصر شاعروں میں جن کا اس نے ذکر کیا ہے سب میں جامی کہیں فایق ترین ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ یورپ کے فارسی عالموں میں یہ جو نظریہ مقبول ہے کہ وہ "ایران کے آخری بڑے کلاسکی شاعر" ہیں اسی بات کا نتیجہ ہے کہ یہ مستشرق اپنے خیالات بالواسطہ یا بلاواسطہ دولت شاہ سے اخذ کر رہے ہیں[2]۔

---

[1] فہرست مخطوطاتِ فارسی ص۳۵۴؎

[2] دولت شاہ کے بارے میں خود اس کی اپنی تالیف سے جو کچھ ناکافی اطلاعات حاصل کی جا سکتی ہیں ان کا خلاصہ آپکو تذکرے کی اس طبع کے دیباچے میں (ص۱۵ پر) ملے گا جو میں نے شائع کی ہے؎

(۳) میر علی شیر نوائی کی مجالس النفائس

میر علی شیر نوائی کے متعلق پہلے بھی کچھ کہا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ وہ شعرار، مصنفین اور صناعوں کے ایک کامل حلقے کا مربّی تھا۔ فی الحال ہمیں صرف اس کے تذکرے کی کتاب مجالس النفائس سے سروکار ہے جو مشرقی ترکی زبان یا ترکی کی چغتائی شاخ میں لکھی گئی جسے صاف اور رائج کرنے کے لئے نوائی نے بہت کچھ کیا۔ مجالس النفائس ۸۹۶ھ (۱۴۹۰-۱ء) میں تصنیف ہوئی۔ میرے پاس اس کا ایک نفیس قلمی نسخہ ہے[۱] جو ۹۳۷ھ (۱۵۳۰-۱ء) میں سمرقند میں لکھا گیا۔ کتاب ایک تمہید اور آٹھ دفاتر پر مشتمل ہے ؎

میر علی شیر نوائی کی مجالس النفائس

پہلا دفتر اُن شاعروں کے بیان میں ہے جو مصنف کی کم سنی کے زمانے میں چل بسے اور جن سے ملنے کی سعادت اسے کبھی نصیب نہ ہوئی۔ ان میں پہلا اور اہم ترین قاسم الانوار ہے جو درحقیقت علی شیر کی ولادت سے نو سال قبل ۸۳۵ھ (۲-۱۴۳۱ء) میں فوت ہو چکا تھا۔ دُوسرے نامی شعرار جو اس دفتر میں مذکور ہیں آذری اسفراینی، کاتبی، خیالی، بساطی، سیبک قُدسی، طُوسی، بابا سودائی، بدخشی، طالب جاجرمی، عارفی، مسیحی، شاہی سبزواری وغیرہ ہیں ؎

---

[۱] کتابخانۂ جامعہ پنجاب میں اسکا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ (مترجم)

دُوسرا دفتر اُن شاعروں کے بیان میں ہے جن سے مصنف کی ذاتی طور پر آشنائی تھی لیکن جو مجالس النفائس کی تصنیف کے وقت دُنیا سے رُخصت ہو چُکے تھے۔ ان میں سب سے پہلا اور مشہور ترین شخص تیمور کی مشہور تاریخ ظفر نامہ کا مصنّف شرف الدین علی یزدی ہے۔

تیسرا دفتر اُن شعرار کے بیان میں ہے جو اس تذکرے کی تصنیف کے وقت زندہ تھے۔ اور جن سے مصنّف کی ذاتی طور پر آشنائی تھی۔ مثلاً امیر شیخم سُہیلی، سیفی، آصفی، بنّائی اور اہلی ترشیزی۔

چوتھا دفتر۔ اُن فاضل اور مقدّس بزرگوں کے بیان میں ہے جنہوں نے اگرچہ وُہ مقدّم طور پر شاعر نہ تھے خاص خاص موقعوں پر شعر کہے۔ مثلاً حسین واعظ کاشفی، مؤرّخ میر خواند وغیرہ۔

پانچواں دفتر۔ خراسان اور دُوسری جگہوں کے اُن سلاطین اور شاہی خاندانوں کے افراد کے بیان میں ہے جنہوں نے گاہے گاہے شعر کہے۔

چھٹا دفتر اُن غیر خراسانی فضلار شعرار اور بذلہ سنجوں کے بیان میں ہے جنہوں نے اچھی شاعرانہ استعداد کا ثبوت دِیا۔

ساتواں دفتر۔ ان سلاطین و امرار کے بیان میں ہے جنہوں نے یا خود اشعار کہے یا دُوسروں کے اشعار ایسے برجستہ اور برمحل نقل کئے کہ وُہ شاعروں کے ہم پلّہ کہلانے کے حقدار ہو گئے۔ اس باب میں جو فرمانروا مذکور ہیں ان میں خود تیمور کے علاوہ شاہرخ، خلیل سلطان، الغ بیگ، بایسنغر میرزا، عبداللطیف میرزا، اور حکمرانِ آلِ تیمور کے دُوسرے سلاطین

اور شہزادے شامل ہیں ؛

آٹھواں دفتر۔ شاہ وقت ابو الغازی سلطان حسین بن بایقرہ کے محاسن اور کمالات کے بیان میں ہے۔ جس کے عہدِ حکومت کے سیاسی واقعات پر (جیسا کہ موسیو بلین[1] نے اپنے اس مقالے میں جس کا ابھی ہم ذکر کرینگے مشاہدہ کیا ہے) میر خواند نے اپنی روضۃ الصفا کی آخری جلد وقف کی ہے[2] ؛

پچھلے فقرے میں جس مقالے کا ذکر ہے اس میں میر علی شیر اور اس کی تصانیف کے حالات کا بیان جہاں تک مجھے معلوم ہے بہترین ہے۔ یہ مجلۂ ایشیائی بابت ۱۸۶۱ء میں شائع ہؤا تھا۔ اور اس کے علاوہ الگ طور پر کتابی صورت میں بھی نشر ہؤا۔ اس کا عنوان یہ ہے "میر علی شیر کے وقائع عمری اور ادبی مشاغل کا تذکرہ اور اس کی تصانیف کے اقتباسات مرتبہ موسیو بلین (ترجمان سکرٹری، سفارتِ فرانس، قسطنطنیہ[3])۔ مجالس النفائس کے ان اقتباسات میں تمہید اور دفترِ ہفتم کا متن اور ترجمہ شامل ہیں۔ اس تصنیف کی طرز اور حدودِ موضوع کا تصوّر دلانے کو یہ اقتباسات کافی ہیں۔ دولت شاہ کے تذکرے سے مجالس النفائس نہ صرف اس لحاظ سے مختلف

---

[1] M. Belin. ؛ [2] دیکھو اوپر صفحہ ۶۱۱ ؛

[3] Notice biographique et literaire sur Mr. Ali-Chir Nevaii, suivie d'extaits tires des aeuvres du meme auteur, par M. Belin, Secretaire-Interprete de l'Ambassade de France a Constantinople.

ہے کہ بجائے فارسی کے ترکی میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ اسکے موضوع کی وُسعت کم ہے اور اس میں مصنّف نے صرف اپنے ہمعصر شعرار کو لیا ہے۔ یہ بات قابلِ توجّہ ہے کہ گو (جیسا کہ ہم دیکھ چُکے ہیں) نوائی نے عثمانی ترکی شاعری کی نشوونما پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عثمانی شعرار کو وہ بالکل نہیں جانتا یا کم سے کم انکو سراسر نظرانداز کرتا ہے ؛

(۴) ابوالغازی سُلطان حسین کی مجالس العشّاق

ہمیں عربی کی اس کہاوت کا خیال ہے کہ "کلام الملوک ملوک الکلام" اور پھر اس کا لحاظ بھی ہے کہ ایک اور شاہی سیرت نگار سام میرزا صفوی نے مجالس العشاق کے بارے میں لکھا ہے[1] کہ یہ مصنّف کے ادبی جوہروں کا کافی ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ ورنہ یہ کتاب بمشکل اس قابل ہے کہ اس کا ذکر سیرت کی ایک سنجیدہ تصنیف کے طور پر کیا جائے۔ سنہ ۹۰۸ھ (۳-۱۵۰۲ء) میں سلطان حسین نے تالیف کی۔ اس کی ابتدا ایک مرصّع عبارت دیباچے سے ہوتی ہے جس میں عشقِ حقیقی اور عشق مجازی کی بحث ہے۔ اور ثانی الذکر کو اوّل الذکر کی سیڑھی سمجھا گیا ہے[2]۔ اس کے بعد مصنّف نے ۷۶ (یا بعض نسخوں میں ۷۷) مقالے دِئے ہیں جن میں ہر ایک کا عنوان مجلس ہے۔ اور اس میں کسی

مجالس العشّاق

۱؎ دیکھو فہرستِ ریو صا۳۵۱ تا صا۳۵۳ ؛

۲؎ صوفیوں کے مشہور مقولہ "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" کے مصداق ؛

ولی صفت بزرگ یا شاہی شخص کی ایک کم و بیش عاشقانہ داستان درج ہے۔ اکثر حالتوں میں یہ داستان کسی افلاطونی معاملۂ عشق[1] کی روئداد ہے جو اس ولی یا شاہ کو پیش آیا۔ جیسا کہ ریو نے جتایا ہے۔ پہلے ۵۵ مقالے زمانی ترتیب کے ساتھ چلتے ہیں۔ امام جعفر الصادقؑ (المتوفی ۱۵۱ھ = ۷۶۸ء) سے شروع ہو کر مصنّف کے ممتاز ہمعصر شاعر مولانا جامی المتوفّی ۸۹۸ھ = ۱۴۹۲-۳ء) پر ختم ہوتے ہیں۔ کتاب میں آخری تذکرہ خود مصنّف "سلطان حسین بن سلطان منصور بن بایقرہ بن عمر شیخ بن تیمور گورگان" پر وقف ہے۔ کتاب کا عنوان "مجالس العشّاق" ذیل کے شعر میں دیا ہے ؎

بُود چون پُر ز حرفِ عشق اوراق
نام کردش مجالس العشّاق

کتاب کا ایک ہی نسخہ جس سے مَیں فائدہ اُٹھا سکا ہوں ایک جدید لیکن صاف مخطوطہ ہے جو حال ہی میں کتابخانۂ جامعۂ کیمبرج نے حاصل کیا ہے۔ لیکن مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس کی ایک سنگی طبع لکھنؤ سے نشر ہوئی ہے؛ یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ بابرِ اعظم کو اس کتاب کے مصنّف کے بارے میں اختلاف ہے (بابر نامہ، طبعِ المنسکی[2]۔ ص۲۲۱) اور وہ کتاب پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ اصل میں کمال الدین حسین گازرگاہی نے لکھی جو ان متصوّفین میں سے تھا جو میر علی شیر نوائی کی

---

[1] افلاطونی محبت (Platonic love) ایک ایسی روحانی محبت کو کہتے ہیں جو شہوات سے پاک ہو؛ [2] Ilminsky؛

صحبت میں اکثر شریک رہتے تھے۔ اور اس کی تربیت سے فیضیاب ہوئے۔ اس نکتے کی طرف میں دوبارہ رجوع کروں گا جب بابر نامے کی بحث پر آؤنگا۔

(۵) حسین واعظِ کاشفی کی روضۃ الشہدا،

حسین کاشفی الملقب بہ واعظ کی زیادہ شہرت مشہور کتاب انوارِ سُہیلی کے مصنّف کی حیثیت سے ہے۔ گو اس کتاب کی خوبی کا تخمینہ اصلیت سے زیادہ لگایا جاتا ہے۔ اس کا ذکر ہم ذرا آگے چل کر کرینگے۔ اس کی روضۃ الشہدا

روضۃ الشہدا از حسین واعظِ کاشفی

ایک خطیبانہ اندازِ تحریر میں پیغمبروں اور اماموں کی اذیتوں اور شہادتوں بالخصوص محمد رسول اللہ (صلعم) کے نواسے اور شیعوں کے تیسرے امام حسینؑ کی ایذا اور شہادت اور پھر اُن انتقامات کی توصیف کرتی ہے جو ان اماموں اور پیغمبروں کے ایذا دہندوں پر نازل ہوئے۔ یہ تصنیف گو تاریخی نقطۂ نظر سے کچھ اہمیت نہیں رکھتی لیکن اس جگہ ذکر کی مستحق ہے۔ کتاب کی پوری کیفیت ریو[1] نے بیان کی ہے۔ اور اس کی سنگی طبع سنہ ۱۲۸۷ھ (۱-۱۸۷۰ء) میں لاہور سے شائع ہوئی۔ ترکی میں اس کا ترجمہ اصل تصنیف سے تقریبًا نصف صدی بعد بغداد کے شاعر فضولی[2] نے چند زیادات کیساتھ تیار کیا۔

---

[1] فہرست مخطوطاتِ فارسی۔ ص ۳-۱۵۲؛ [2] دیکھو گب کی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ" (History of Ottoman Poetry) جلد سوم صفحہ ۹۰۔ فضولی نے سنہ ۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء) میں وفات کی؛

(۶) رشحات عین الحیات از علی ابن حسین کاشفی

یہ کتاب گو ۹۰۹ھ (۴-۱۵۰۳ء) میں تصنیف ہوئی (یہ تاریخ اس کے عنوان کے پہلے لفظ "رشحات" سے نکلتی ہے) اور اس لحاظ سے جس عہد کی اس باب میں بحث ہے۔ اس سے ذرا باہر جا پڑتی ہے لیکن یہاں اس کا تبصرہ اس لئے بہتر رہیگا کہ اسکا مؤلف علی آخر الذکر تصنیف کے مصنف حسین کاشفی کا بیٹا ہے۔ نیز اسلئے کہ یہ تصنیف کے مصنف حسین کاشفی کا بیٹا ہے۔ نیز اس لئے کہ یہ تصنیف ذوالقعدہ ۸۸۹ھ (نومبر۔ دسمبر ۱۴۸۴ء) اور ربیع الثانی ۸۹۳ھ (مارچ۔ اپریل ۱۴۸۸ء) میں اُن وقتوں کی جمع کی ہوئی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ جب مصنف مشہور نقشبندی شیخ خواجہ عبید اللہ المعروف بہ خواجہ احرار کی زیارات کو جاتا رہا ہے۔ خواجہ عبید اللہ کے پیشرو، وقائع عمری، ارشادات، کرامات اور مُریدین اس کتاب کے موضوع ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ عجائب خانۂ برطانوی میں محفوظ ہے اور ریو نے اس کی مکمل کیفیت بیان کی ہے[1]۔ لیکن اس کے نسخے عام نہیں ہیں۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں اپنی اصل شکل میں کبھی شائع نہیں ہوئی۔ البتہ اس کا ایک ترکی ترجمہ ۱۲۳۶ھ (۱-۱۸۲۰ء) میں قسطنطنیہ سے چھپ کر نشر ہوا۔

رشحاتِ عین الحیات

---

[1] فہرست مخطوطات فارسی۔ صفحہ ۳-۳۵۲؛

مذہب، تصوّف اور فلسفہ

تاریخ و سیرت کی کتابوں سے جو اوپر شمار کی گئی ہیں نسبتہً کم تعداد اور کم وقعت تصانیف وہ ہیں جو مذہب، تصوّف اور فلسفہ سے تعلّق رکھتی ہیں لیکن ان تین قسموں میں سے ہر قسم کی ایک یا دو کتابیں کم سے کم مختصر تذکرے کی مستحق ہیں ؛

(۱) حسین کاشفی کی مواہبِ علیّہ[1]

حسین کاشفی نے جس کا ذکر روضۃ الشہدا، کے مصنّف کی حیثیّت سے آچکا ہے۔ میر علی شیر کیلئے قرآنِ کریم کی ایک فارسی تفسیر بھی تالیف کی جس کا عنوان اپنے اسی مربّی کی نسبت سے اس نے مواہبِ علیہ رکھا۔ شروع میں اسکا ارادہ تھا۔

قرآن کی تفسیر مواہبِ علیّہ

کہ جواہر التفسیر لتحفۃ الامیر کے عنوان سے ایک بہت زیادہ بڑی اور مفصّل تفسیر لکھے۔ لیکن جب پہلی جلد ختم کر چکا تو اُس نے اپنے منصوبے میں تخفیف کرنے اور بہت زیادہ چھوٹی، سادہ تر اور مجمل تر تفسیر یعنی مواہب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی وفات سے گیارہ سال پہلے یعنی ۸۹۹ھ (۹۴-۱۴۹۳ء) میں اُس نے یہ تصنیف مکمل کی۔ اس کے نسخے نایاب نہیں ہیں۔ لیکن ایران میں اس کا ذکر کچھ ایسا سننے میں نہیں آتا۔ اور مطالعہ تو اَور بھی کم کی جاتی ہے۔ البتہ

---

[1] دیکھو ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی۔ صہ۹ تا صہ۱۱ ؛

مجھے اطلاع ہے کہ ہندوستان میں یہ اب بھی پڑھی جاتی ہے اور وہاں شائع ہو چکی ہے۔ گو میں نے کبھی اس کی کوئی ٹائپ کی یا سنگی طبع نہیں دیکھی ؛

(۲) اخلاقِ جلالی اور (۳) اخلاقِ محسنی

اخلاقِ ناصری کے بعد (جو تقریباً تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں مشہور منجم نصیر الدین طوسی نے لکھی[1]) فارسی میں اخلاق کے زیادہ پرانے رسالوں میں مشہور ترین اور مقبول ترین اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ محسنی ہیں۔ اخلاقِ جلالی

فارسی میں اخلاق کے تین مقبول ترین رسالے

کا پورا عنوان "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" ہے۔ ۱۴۶۷ء اور ۱۴۷۷ء کے درمیان جلال الدین دوانی فلسفی نے تصنیف کی اور آق قونیلو خاندان کے سلطان اوزون حسن کے نام معنون ہے۔ اخلاقِ محسنی صاحب موصوف حسین واعظِ کاشفی نے سنہ ۹۰۰ھ (۱۴۹۴-۵ء) میں تالیف کی اور ابو الغازی سلطان حسین بن بایقرہ کے نام معنون ہے۔ ان تینوں رسالوں کے سنگی اور ٹائپ میں چھپے ہوئے نسخے ملتے ہیں جو ریو نے شمار کئے ہیں۔ اور اخلاقِ محسنی کا متن مع ترجمہ (۱۸۵۱ء) ہرٹفورڈ میں چھپ چکا ہے۔ کیونکہ اپنے مصنف کی دوسری کتاب انوارِ سہیلی کی طرح سابقاً ہندوستان کے انگریز اہلکاروں میں (خصوصاً امتحانوں کے نصاب کے طور پر) مقبول تھی ؛

---

[1] ملاحظہ ہو ریو کی فہرست مخطوطات فارسی ص ۴۴۱-۲، اور میری تاریخ ادبیات ایران کی جلد دوم صفحات ۲۲۰، ۴۵۶، ۴۸۵ ؛

جن چیزوں کی طرف ایرانی طبیعت زیادہ رجوع کرتی ہے وہ مابعد الطبیعیات اور تصوف ہیں نہ کہ مسائلِ اخلاق اور ان تینوں اخلاقی رسالوں

اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ مُحسنی

میں سے کسی کو بھی عام افادے کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ البتہ ضمنی لحاظ سے مفید ہیں۔ کہ یہ ایرانی رسم و رواج اور اندازِ فکر پہ روشنی ڈالتے ہیں۔ اخلاقِ جلالی کا اسلوبِ تحریر سب میں کہیں زیادہ پُر تکلف اور مرصع ہے۔ اور اپنے مفروضہ اِشکال کی بنا پر جو اس کے نفسِ مضمون میں نہیں بلکہ زبان میں ہے سابقاً کیمبرج میں مشرقی (سابقاً ہندوستانی) زبانوں کے بی اے آنرز کے دوسرے یا اعلےٰ فارسی درجے میں باقاعدہ نصاب میں داخل تھی۔ اسلامی فلسفے کی ساخت اور ترتیب کو ارسطو نے بُو علی سینا کی ترجمانی کے ذریعے معیّن کیا ہے۔ یہ فلسفہ مقدّم طور پر "حکمت علمی" اور "حکمتِ نظری" میں تقسیم ہے۔ ان دو قسموں میں ہر ایک کی آگے تین شاخیں ہیں۔ حکمتِ نظری کی فروع ریاضیات، طبیعیّات اور مافوق الطبیعیات یا مابعد الطبیعیات ہیں اور حکمتِ عملی کی شاخیں تہذیب الاخلاق، تدبیر المنزل اور سیاست المدن ہیں۔ زیرِ بحث کتابیں اس دُوسری قسم کی تین شاخوں سے تعلّق رکھتی ہیں۔ ان میں دو جو زیرِ تبصرہ دور سے متعلّق ہیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر چھپ چُکی ہیں۔ اخلاقِ جلالی کا ترجمہ ڈبلیو۔ ایف۔ ٹامسن[1] (لندن ۱۸۳۹ء) نے زیرِ عنوان

---

[1] W. F. Thom son؛

"اہلِ اسلام کی حکمتِ عملی"[1] کیا ہے - اور اخلاقِ محسنی کا ایچ - جی - کین نے (ہرٹفورڈ ۱۸۵۱ء) پس جو انگریزی خوان چاہے انکے مندرجات سے بآسانی واقفیت حاصل کر سکتا ہے - اور یہاں ان کی مزید کیفیت بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ؛

جلال الدّین دوّانی

رہے ان کے مصنّف سو جلال الدین دوّانی کازرون کے قریب صوبۂ فارس کے گاؤں دوّان میں ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء) میں پیدا ہوا - کازرون میں اس کا باپ قاضی تھا - فارس میں جلال الدین خود بھی اسی منصب پر فائز رہا - اور شیراز میں جہاں اس نے اپنی بیشتر زندگی گزاری دارالایتام میں استاد بھی رہا - اپنے پیدائشی مقام پر ۹۰۸ھ (۱۵۰۲-۳ء) میں فوت ہوا اور وہیں مدفون ہُوا[2] - اس کی شہرت خود اس کے جیتے جی وطن کی حدود سے باہر دُور دُور پھیل چکی تھی اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں[3] دُور دراز کے عثمانی دربار میں بھی اس کی قدرشناسی ہوئی - باوجود اس کی شہرت کے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اخلاق کی کتاب کے علاوہ بجز چند رُباعیات کے جن کی شرح بھی اس نے خود کی ہے، اور خواجہ حافظ کی ایک غزل کی شرح کے کچھ نہیں لکھا ؛

---

[1] Practical Philosophy of the Mohammadan People.

[2] ملاحظہ ہو ریو کی فہرستِ مخطوطات فارسی - ص ۲-۴۴۲ ؛

[3] ملاحظہ ہو اوپر ص ۵۹۴ ؛

(۴) جواہر الاسرار - (۵) لوایح اور (۶) اشعۃ اللمعات

اس دور کے گراں مایہ اور فراواں صوفی ادب کے بڑے جزو پر ہم شعراء کے تذکرے میں بحث کرینگے - نثر کے حصے میں جواہر الاسرار، لوایح اور اشعۃ اللمعات کو اپنی قسم کے صحیح نمونے سمجھا جاسکتا ہے - ان میں دو کتابیں تو متقدم تصنیفوں کی شرحیں ہیں اور تیسری ایک جداگانہ تصنیف ہے ؛

نثر میں تصوف کی تین کتابیں

جواہر الاسرار و ظواہر الانوار مولانا جلال الدین رومی کی بلند پایہ صوفیانہ مثنوی کی شرح ہے - کمال الدین حسین بن حسن خوارزمی[1] نے تصنیف کی - جو متعدد اور کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے - اور ۸۳۵ھ اور ۸۴۰ھ (۱۴۳۲ء اور ۱۴۳۷ء) کے درمیان کسی وقت ازبکوں کے ہاتھوں مارا گیا - کسی قدر مشہور صوفی شیخ خواجہ عبد الوفار کا شاگرد تھا - جوانی کے ایام سے لگاتار نہایت تندہی اور انہماک سے مثنوی کا مطالعہ کرتا رہا - جواہر الاسرار سے پہلے وہ مثنوی رومی کی ایک نسبتہً مختصر شرح کنز الحقائق کے عنوان سے لکھ چکا تھا - بعد کی یہ زیادہ مکمل اور مفصل شرح جواہر الاسرار ہندوستان میں سنگی طباعت کیساتھ شائع ہوئی ہے - اسکے نصف اول کا ایک قلمی نسخہ عجائب خانہ برطانوی میں محفوظ ہے[2] اور کتابخانہ

جواہر الاسرار

---

[1] فہرست ریو - ص ۶ - ۱۴۴ ؛

[2] Add. 14051. - دیکھو فہرست ریو - ص ۵۸ ؛

جامعۂ کیمبرج میں اس کی ایک ہندوستانی سنگی طبع کے علاوہ اسکے دفترِ دوم کا ایک مخطوطہ[1] موجود ہے۔ کتاب کا سب سے اہم حصّہ تمہید ہے جو صُوفیوں کی تاریخ، اصطلاحات اور عقائد سے بحث کرتی ہے ؎

مذکورہ بالا باقی دو تصنیفیں مسلّم النبوت شاعر اور صُوفی مُلّا نور الدین عبد الرحمٰن جامی کے ابرِ قلم کے رشحات ہیں ؎

اَشِعَّۃُ اللّمعات، لمعاتِ عراقی کی ایک سرسری شرح ہے۔ لمعات پر پیچھے ایک باب میں بحث کی جا چکی ہے[2]۔ اَشِعَّۃُ اللّمعات کے قلمی نسخوں کے علاوہ

مولانا جامی کی اَشِعَّۃُ اللّمعات

جو عام نہیں ہیں ایران میں اس کا متن ایک غیر مؤرّخہ جلد میں شائع ہو چکا ہے۔ جس میں یہ اور تصوّف کے کئی دیگر رسالے شامل ہیں۔ جامی اپنے رسالے میں اشعّۃ اللمعات کا سبب تالیف یوں بیان کرتے ہیں[3]:۔

"اما بعد نمودہ می آید کہ در آن وقت کہ شیخ عالم عامل عارف عاشق صاحب النّثر الفائق والنّظم الرایق آن زجام کرم ارباب ہمم را ساقی فخر الدّین ابراہیم الہمدانی المشتہر بالعراقی بصحبت قدوۃ العلماء المحققین واسوۃ العرفاء الموحّدین ابو المعالی صدر الحقّ والملّۃ والدّین محمّد القونوی

دیباچے سے اقتباس

---

[1] Or. 238 ؛ [2] دیکھو اوپر ص ۲۰۳ تا ص ۲۱۰ ؛

[3] پروفیسر براؤن نے اس عبارت کا صرف انگریزی ترجمہ دیا ہے۔ مَیں نے کتابخانۂ جامعہ پنجاب کے مخطوطے (مذکورہ بر صفحہ ۲۰۴ بالا۔ حاشیۂ زیریں [3]) سے اصل فارسی عبارت نقل کر دی ہے، ورق ۲ الف تا ۳ الف۔ (مترجم) ؛

قدس اللہ تعالیٰ سرہ بما رسیدہ است و ازوی حقائق "فصوص الحکم"[1] شنیدہ و مختصری فراہم آوردہ و آنرا بسبب اشتمال بر لمعۂ چند از بوارق آن حقائق لمعات نام کردہ بعبارات خوش و اشارات دلکش جواہر نثر و نظم برہم ریختہ و لطایف عربی و پارسی درہم آمیختہ آثار علم و عرفان ازان پیدا و نور ذوق و وجدان دران ہویدا خفتہ را بیدار کند و بیدار را واقفِ اسرار گرداند آتشِ عشق را فروزد و سلسلۂ شوق بجنباند ؛

"امّا بواسطۂ آنکہ زبان زدہ ع "بدنام کنندۂ نکونامی چند" شدہ است و دست فرسودہ ع "از راہ فتادہ بی سرانجامی چند"[2] گشتہ اہلِ تقلید رقمِ ردّ

عراقی پر بیجا الزام

بران کشیدہ و دامنِ قبول ازان درچیدہ و این فقیر نیز چون آن ردّ و انکار را می دید از شغل آن فراغتی می ورزید تا آنکہ درین ولا اجلّ اخوان الصفاء و اعزّ خلّان الوفاء سیّرہ اللہ علی سیر عبادہ العرفاء کہ نام خجستہ فرجامش در اثناء این دعا بخوب ترین صورتی از صور رمز و ایماء بین اللہ و عبادہ سمتِ ادا یافت استدعای مقابلہ و تصحیح آن نمود- در مقابلہ آن جز انقیاد چارہ نبود- چون متصدی این شغل گشتم و بر تفاصیل اجزای آن بگذشتم- بہر ورقی ازان لمعۂ انوار حقائق دیدم و بر ہر

---

[1] شیخ محی الدین ابن العربی کی تصنیف جو بہت مشہور ہے اور اعلیٰ پائے کی سمجھی جاتی ہے- دیکھو میری تاریخ ادبیاتِ ایران- جلد دوم ص۴۹۷ تا ص۵۰۱ ؛ [2] یہ دو مصرعے ایک رُباعی کے ہیں جو بالعموم خیام کی طرف منسوب کی جاتی ہے- ملاحظہ ہو رباعیاتِ خیام کی طبع ونفیلڈ (Whinfield) مع ترجمۂ منظوم- رُباعی ۱۹۹- ص ۱۳۴-۵ ؛

صفحۂ نفحۂ از از ہارِ معارف شمیدم۔ باطن را بفہم دقایق آن انجذابی واقع شد۔ وخاطر را از صعوبت ادراک مقاصد آن اضطرابی حاصل آمد۔ امّا نسخ متن مختلف بود و بعضی از طریقِ صواب منحرف می نمود۔ در مواضعِ اجمال و مواقعِ اشکال بشرحهای آن رجوع افتاد۔ نہ از ہیچ یکی مشکل حل شد و نہ در ہیچ کدام مجملی مفصل گشت۔ لاجرم بر دل بفہم لطایف مایل این خاطر گذشت۔ و در خاطر بکُنہِ حقایق ناظر این داعیہ متمکن گشت کہ از برای تصحیحِ عبارات و توضیح اشارات آن شرحی جمع کردہ شود ملتقط از سخنان مشایخ طریقت و کبراء حقیقت بتخصیص شیخین کبیرین " محی الملّۃ والدّین محمد بن العربی" و مرید و تلمیذ وی صدر الحق والدّین "محمد بن اسحٰق القونوی" و متابعان ایشان قدس اللہ اسرارہم پس بمقتضای آن داعیہ خاطر بارتکاب این امر خطیر آرمید و بامداد توفیق الٰہی در زود ترین وقتی باتمام انجامید و چون بسیاری از سخنان کہ دران شرح اندراج یافتہ اند ازان قبیل است کہ از تامل در نیرات کلمات متن بر دل تافتہ، می شاید کہ آنرا اشعۃ اللمعات نام نہند و باین وصف و لقب بر نظر طالبان صادق جلوہ دہند و نیز مامول از ناظران منصف نہ منکران بعناد متصف آنکہ چون این مجموعہ را در نظر آرند و اندیشہ بر مطالعہ آن گمارند ہر کجا کہ خیر و کمالی بینند از مواہب حق سُبحانہٗ وتعالٰے شمارند و ہر کجا کہ عیب و نقصانی بعجز و قصورِ بشریّت راجع دارند و این کمینہ را بخصوصیت ہدفِ تیرِ ملامت نسازند و خود را در ورطۂ بدخوئی و بدگوئی نیندازند و التوفیق من اللہ سبحانہ وتعالیٰ"۔

تمہید کے بعد صُوفیوں کے فلسفے کے مختلف نکات پر ایک بسیط توضیحی مقالہ

ہے جس میں خاص خاص مشکلات حل کرنے کے لئے سوال و جواب بھی دئے ہیں۔ اس کے بعد متن کی سرسری شرح شروع ہو جاتی ہے۔ کتاب ایک فارسی عربی قطعۂ تاریخ پر آکر ختم ہوتی ہے۔ جس میں اس کی تکمیل کی تاریخ لفظ تَمَّمْتُهُ[1] سے نکلتی ہے:-

بآثام ہستی است جامی اسیر — محی اللّٰہُ آثارَ آثامِہٖ
بتسوید این شرح توفیق یافت — مُقِرًّا بزلّاتِ اُقدامِہٖ
وَاِذْ قالَ تَمَّمْتُہٗ قَدْ بَدَا — بِمَا قالَ تاریخُ اِتمامِہٖ

لوائح جس کے لفظی معنی لمعات کی طرح تجلیاتِ نُور کے ہیں نثر میں تصوف کا ایک رسالہ ہے۔ گو اس کی عبارات میں جا بجا رُباعیاں بھی ہیں

جامی کی لوائح

اس کی عکسی طبع دیباچہ، ترجمہ اور ضمیمہ جات کیساتھ مسٹر ونفیلڈ[2] نے شائع کی ہے۔ جنہوں نے ایرانی فاضلِ جید میرزا محمد ابن عبدالوہاب قزوینی کی مدد سے ہماری ایرانی تصوّف کی معلومات میں گرانقدر اضافات اور افادات کئے ہیں۔ یہ مختصر جلد مشرقی ترجمہ فنڈ کے سلسلۂ جدیدہ[3] کی سولھویں کڑی کے طور پر ۱۹۰۶ء میں انجمنِ ہمایونی ایشیائی کے اہتمام سے شائع ہوئی[4] اور چونکہ انگریزی خوان بآسانی

---

[1] ترجمہ:- مَیں نے اسے پورا کیا؛ [2] Mr. E. H. Whinfield؛

[3] The New Series of the Oriental Translation Fund؛

[4] ۱۳۰۱ھ میں لوائح کی ایک طبع مطبعہ نامی منشی نولکشور سے نکلی۔ مَیں نے نشریاتِ شرکتِ کتابفروشی ادب کی ایک فہرست میں اس کی ایک ایرانی طبع کا اعلان بھی دیکھا ہے (مترجم)؛

اس تک رسائی پا سکتے ہیں اس لئے اس کی کوئی طویل شرح کیفیت فضول ہوگی میری رائے میں کتاب کی دلپذیر ترین چیزوں میں اس کی ایک دُعا ہے جو آغازِ کتاب کے بعد اور دیباچے کے قبل درج ہے۔ وُہ دُعا یُوں ہے:۔

الٰھی الٰھی خلِّصنا من الاشتغال بالملاھی وأرنا حقائق الاشیاء کما ھی، غشاوت غفلت از بصر بصیرت مابگشای وہر چیزرا چنانکہ ہست ما بنمای، نیستی را بر ما در صورتِ ہستی جلوہ مدہ واز نیستی بر جمالِ ہستی پردہ منہ، این صُوَرِ خیالی را آئینۂ تجلّیاتِ جمالِ خود گردان نہ علّتِ حجاب ودوری، واین نقوشِ وہمی را سرمایۂ دانائی وبینائی ما گردان نہ آلتِ جہالت وکوری، محرومی ومہجوریِ ما ہمہ از ماست مارا بما مگذار مارا از مارہائی کرامت کن وباخود آشنائی ارزانی دار!

حروفی فرقے کا ادب

پچھلے باب میں (ص۳۶۵ تا ص۵۱۹ بالا) حروفی بدعت کے بیان میں اُن چیدہ کتابوں کا ضمنی ذکر کیا گیا جو اس عجیب وغریب فرقے نے پیدا کیں یا اس سے متعلق ہیں۔ سوائے چند ایک نظموں کے (مثلاً اسکندر نامہ جسے کلیمان اُیوآر[1] نے مع ترجمہ سلسلۂ یادگارِ گب کی جلد ۹ میں شائع کیا ہے)

---

[1] M. Clement Huart

خالص ادبی نقطۂ نظر سے ان کتابوں میں اکثر خوبی سے خالی ہیں[1]۔ گو علمِ مذہب کے طالب اور ماہر نفسیات کے لئے بیحد دلچسپ ہیں۔ ناواقف پڑھنے والے کے لئے فضل اللہ کا جاویدان نامہ خواہ اس میں کیسے ہی داخلی رموز کیوں نہ ہوں بے ربط اور تقریبًا ناقابلِ فہم ہذیان کا ایک سلسلہ ہے۔ فضل اللہ کی محفوظ نگارشات میں واحد تحریر جس کے آہنگ سے انسانی کان کچھ آشنائی محسوس کرتے ہیں ایک خط ہے جو اُس نے اپنی سزائے قتل کے اجراء سے قبل کی شام اپنے ایک مُرید کو لکھا۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ فضل اللہ شیروان میں قتل کیا گیا۔ جسے وہ شہادتِ امامِ حسینؑ کی تلمیح میں "کربلائے من" کہتا ہے[2]۔

حروفی الحاد کا ٹرکی میں پھیلنا

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں اس فرقے نے کوئی کارِ نمایاں سرانجام نہ دیا اور نہ یہ اپنے بانی اور اسکے فوری جانشین کی وفات کے بعد وہاں زیادہ عرصہ زندہ رہا۔ ٹرکی میں جہاں یہ بہت سُرعت کیساتھ پھیلا معاملہ مختلف تھا

---

[1] میرا اشارہ صرف حروفیوں کی فارسی تصانیف کی طرف ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے (ذیلی حاشیہ [1] بر ص ۵۰۸ بالا) مسٹر گب نے نسیمی کو "مغربی ترکوں کا پہلا حقیقی شاعر" تسلیم کیا ہے؛

[2] ملاحظہ ہو مجلۂ انجمنِ ہمایونی ایشیائی بابت جولائی ۱۹۰۷ء میں حروفیوں پر میرا دوسرا مقالہ۔ یہی مقالہ الگ کتابی شکل میں نشر ہوا ہے۔ اسکے صفحہ ۹ تا ۱۰ ملاحظہ ہوں۔ اس مقالے میں اس خط کا متن اور ترجمہ دونوں دیئے گئے ہیں؛

وہاں باوجود جور و تعدّی کی اُن متعدد مثالوں کے جو ترکی مؤرخین نے قلمبند کی ہیں حروفیوں کی تعداد بہت تھی۔ جن کے مشہور ترین اشخاص میں ترکی شاعر نسیمی بھی تھا۔ مذہبی آزادہ روی کے سبب ۸۲۰ھ (۸-۱۴۱۷ء) میں شہر حلب میں زندہ اس کی کھال اُدھڑوا دی گئی۔ نسیمی، اسکے مرید خاص ترکی شاعر رفیعی صاحب بشارت نامہ اور فرقۂ حروفی کے احوال کا ایک نہایت عُمدہ بیان آنجہانی مسٹر گب نے دیا ہے[۱]۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تمام حروفی تصانیف کے ناموں کو لفظ "نامہ" کے ساتھ ترکیب دی گئی ہے۔ چنانچہ فارسی میں ہمارے پاس آدم نامہ، عرش نامہ، ہدایت نامہ، استوا نامہ، کرسی نامہ، محبت نامہ وغیرہ کتابیں ہیں۔ اور ترکی میں مذکورہ بالا بشارت نامہ کے علاوہ آخرت نامہ قنبیات نامہ، فقر نامہ، فیض نامہ، گنج نامہ، حقیقت نامہ، عشق نامہ اور دیگر بہت سی تصانیف ہیں جن کے عنوان آپ کو اُس اشاریے میں ملیں گے جو مَیں نے حروفی ادب پر اپنے دوسرے مقالے (مجلۂ انجمنِ ہمایونیِ ایشیائی بابت جولائی ۱۹۰۷ء) کے آخر میں دیا ہے۔ اپنے اس مقالے میں مَیں نے ۴۵ حروفی مخطوطات کے مختصر کیفیت نامے دیئے ہیں۔ اس اشاریے میں تصانیف کی فہرست یقیناً کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی۔ اور پھر ان ۴۵ نسخوں کا بھی محض ایک سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ غرض اس میدان میں مزید تحقیق کی وافر گنجائش ہے۔ جن لوگوں کو فرقے اور اُس کی تاریخ اور

---

[۱] "عثمانی شاعری کی تاریخ" (History of Ottoman Poetry.) جلد اول، ص ۳۳۶ تا ۳۸۸؛

حروفی فرقے کے احوال کے بیان انگریزی اور فرانسیسی میں

ادب سے معمولی دلچسپی ہے اُن کے مطالعے کے لئے وہ مواد بہت کافی ہے جو انگریزی اور فرانسیسی میں شائع ہؤا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:۔ جاویدان کبیر کی کیفیت کا بیان میرے قلم سے[1]؛ مجلۂ انجمن ہمایونی ایشیائی بابت ۱۸۹۸ء و ۱۹۰۷ء میں حروفی ادب پر میرے دو مقالے؛ مسٹر گب کی تصنیف "عثمانی شاعری کی تاریخ[2]" میں متعلقہ باب؛ اور سلسلۂ یادگارِ گب کی جلد ۹ بہ عنوان "متونِ فارسی متعلقہ بہ فرقۂ حروفی جس کو موسیو کلیمان ایُوآر نے مع ترجمہ و حواشی شائع کیا اور جس کے آخر میں ڈاکٹر رضا توفیق المعروف بہ فیلسوف رضا کے قلم سے حروفی مذہب کا ایک تبصرہ ملحق ہے[3]"۔

اسحٰق آفندی نے حروفیوں کا رد ۱۲۸۸ھ (۲-۱۸۷۱ء) میں بزبانِ ترکی لکھا اور ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں "کاشف الاسرار و دافع الاشرار" کے

---

[1] ملاحظہ ہو میری تالیف "فہرست مخطوطاتِ فارسی در کتابخانۂ جامعہ کیمبرج" Catalogue of the Persian MSS in the Cambridge University Library.

[2] History of Ottoman Poetry. ص ۶۹ تا ص ۸۶؛

[3] Textes Persans relatifs a la secte des Houroufis, publies, traduites et annotes par M. Clement Huart suivies d'une Etude sur la Relgion des Houroufis, per le Docteur Riza Tevfiq, connu sous le nom de Feylesouf Riza.

حروفیوں کا ردّ اسحاق آفندی کے قلم سے

عنوان سے شائع ہُوا۔ گو اس کا لہجہ درشت ہے لیکن موادِ اطلاعات خاصا صحیح ہے اور محتاط لیکن متعصبانہ تحقیق کا نتیجہ ہے۔ ایک مختصر حمد کے بعد یہ رسالہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

"یاد رہے کہ اُن تمام فرقوں میں سے جو اپنے تئیں مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں مصروف رکھتے ہیں بکتاشی سب سے بڑے مجرم ہیں۔ یُوں تو اُن کے گفتار و کردار دونوں سے صریحاً آشکار ہے کہ وہ حقیقۃً مسلمان نہیں ہیں لیکن ۱۲۸۸ھ (۲-۱۸۷۱ء) میں انہوں نے اپنی حقیقت بالکل واضح کر دی۔ جن کتابوں کو یہ لوگ جاویدان کہتے ہیں تعداد میں چھ ہیں۔ ان میں ایک اُن کے اصل گمراہ کنندہ فضل اللہ حروفی نے لکھی اور باقی پانچ اس کے خلفاء کی تصانیف ہیں۔ اور چونکہ ان پانچ کتابوں میں ان کے دعاوی باطلہ اور کلماتِ کُفر بالکل کھُلے نظر آتے ہیں لہٰذا ان کا معمول ہے کہ چھُپ چھُپا کر آپس میں ان کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ لیکن فرشتہ زادہ نے اپنی جاویدان میں جس کا نام "عشق نامہ" ہے اپنی کفریات پر تا حدّے پردہ ڈال دیا۔ اور بعد میں سالِ مذکور (۱۲۸۸ھ = ۲-۱۸۷۱ء) میں جب اُسکے پیروؤں نے ایسی جسارت کی کہ اسکو چھاپا اور نشر کیا تو یہ بات بلاشُبہ ضروری ہو گئی کہ مومنوں کو ان کتابوں کے مشمولہ عقاید کی صحیح اصلیت اور کافرانہ نوعیت سے خبردار کر دیا جائے۔ اس لئے اللہ پر توکّل کرتے ہوئے میں نے اس طرح کا ایک رسالہ لکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ تین ابواب پر

مشتمل ہے یعنی :-

"پہلا باب - فضلِ حروفی کے نسب اور بعض بکتاشیوں کے اصول و عقائد کا بیان -

"دوسرا باب - جاویدانِ فرشتہ زادہ کے دعاویِ باطلہ کا بیان -

"تیسرا باب - باقی جاویدانوں کے دعاویِ باطلہ کا بیان"۔

قرمطیوں اور دوسرے ابتدائی زمانے کے ملحدوں اور حروفی فرقے کے بانی فضل اللہ استرابادی[1] کے حالات مختصر لکھنے کے بعد مصنف بیان کرتا ہے کہ کیونکر پسر تیمور (میرانشاہ) نے اُسے مروا ڈالا۔ اور "پھر اس کی ٹانگوں میں ایک رسّی بندھوائی اور حکم دیا کہ بازاروں اور گلیوں میں اس کی نعش کو کھینچے پھرو۔ اور دُنیا کو اس کے وجودِ لئیم سے پاک کیا"۔ اس پر اس کے خلفا دُنیائے اسلام میں منتشر ہو گئے۔ ان میں سے وہ جو العلیّ الاعلیٰ کے لقب سے ملقب تھا اناطولیہ میں حاجی بکتاش کی درگاہ پر چلا آیا اور اہلِ درگاہ کا اعتماد حاصل کر کے چوری چھپے انکو جاویدان کے عقائد کی تلقین کرنے لگا۔ اور ظاہر یہ کیا کہ یہ کتاب حاجی بکتاش کے باطنی مذہب کو پیش کرتی ہے۔ جاویدان کے عقائد کو اس نے "راز" کا نام دیا۔ جس کے افشا کی سزا موت تھی۔ جاویدان کی بعض مبہم علامتوں اور عبارتوں کو سمجھنے کے لئے "مفتاح الحیات"[2] کے نام سے ایک حل تیار کیا گیا۔ مصنف ساتھ ہی لکھتا

---

[1] المتوفی ۸۲۲ھ (۱۴۱۹ء)؛ [2] حروفیوں کے ادب پر میرے دوسرے مقالے میں مفتاح الحیات کے تین نسخوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ یعنی عجائب خانۂ برطانوی کا Or. 5957؛ کتابخانۂ جامعۂ کیمبرج کا Or. 488؛ اور میرا اپنا ایک نسخہ B. 15؛

ہے۔" جس کسی کے پاس یہ موجود ہو وہ جاویدان کو سمجھتا ہے ورنہ اس کی مدد کے بغیر یہ کتاب ناقابلِ فہم ہے"۔

ان تمام پیشبندیوں اور احتیاطوں کے باوجود ٹرکی میں حروفیوں اور بکتاشیوں پر کئی مرتبہ شدید تعدّی ہوئی۔ ان میں جدید ترین واقعہ سلطان محمود

ٹرکی میں حروفیوں پر جور و تعدّی

کے عہد میں پیش آیا۔ سنہ ۱۲۴۰ھ (۵-۱۸۲۴ء) میں اس نے بہت سے حروفیوں اور بکتاشیوں کو مار ڈالا۔ اُن کی درگاہیں اور خانقاہیں تباہ کرا دیں۔ اور ان کی املاک نقشبندی سلسلے کے درویشوں کو دے ڈالیں۔ انکے باقیماندہ مشایخ اور معمولی پیرووٗں میں سے بہت سے اشخاص نے نقشبندی قادری، رفیعی اور سعدی درویشوں کے حلقوں میں داخل ہو کر پناہ لی۔ اور بڑی احتیاط اور ہُشیاری سے ان نئے حالات میں بھی اپنی تبلیغ جاری رکھی غرض یہ سلسلہ نہایت تیز رفتاری سے پھر زندہ ہو گیا۔ اور آج بھی ٹرکی کے طول و عرض میں پھیلا ہوٗا ہے۔ حروفی فرقے کی متأخر تاریخ ایران سے نہیں بلکہ ٹرکی سے وابستہ ہے۔ ایران میں اس فرقے کے برقرار رہنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ گو بلاشُبہ اسکے بہت سے عقائد اور خیالات اب بھی اس نہ بھوٗلنے والے ملک کے درویش عرفا میں مقبول ہیں۔ پھر حروفیوں کے بعض مخصوص خیالات اور اصطلاحات کو بعد کے ملحدانہ فرقوں نے اپنا لیا۔ جیسے بابیوں نے جن پر اس تصنیف کی آخری جلد میں بحث کی جائیگی۔

اِس دَور کا تُرکی ادب بالخصوص بابر نامہ

یہ اصول اس کتاب میں بار بار بیان کیا گیا ہے۔ کہ ایک قوم کی ادبی تاریخ وسیع تر معنوں میں اُن تصانیف تک محدود نہیں رکھنی چاہیئے جو اُنہوں نے خود اپنی زبان میں لکھیں۔ اسی وجہ سے ایرانیوں کی لکھی ہوئی عربی کتابیں ہم نے اپنے جائزے میں شامل کر لی ہیں۔ تیموری درباروں میں خصوصًا عہدِ سلطان ابوالغازی حسین (۸۷۸ھ تا ۹۱۲ھ = ۱۴۷۳ء تا ۱۵۰۶ء) کے دربارِ ہرات میں جو کثیر اور قابلِ لحاظ ادب پیدا ہُوا اس کا ذکر کیئے جانے کا دعویٰ کچھ ایسا قوی نہیں۔ اس لئے کہ جن لوگوں نے یہ ادب پیدا کیا وُہ اگر سب کے سب نہیں تو اکثر و بیشتر ترکی النّسل تھے۔ گو ماوراء النّہر اور ترکستان میں دونوں زبانوں کے ساتھ ساتھ رائج ہونے کے سبب (جیسے کہ وُہ بے شک آجکل بھی ہیں) دو زبانی لوگوں کی تعداد یقینًا ہر زمانے میں اچھی خاصی رہی ہوگی۔ فارسی کا محاورہ چونکہ زیادہ صاف اور منجھا ہُوا تھا۔ اس لئے سب حتّٰی کہ شہزادگانِ آلِ تیمور مثلًا الغ بیگ، بایسنقر، میرزا حیدر دغلات اور خود سلطان حسین وغیرہ اسے ادبی اغراض کے لئے زیادہ عام طور پر استعمال میں لاتے تھے۔ لیکن فاضل بزرگ میر علی شیر نوائی نے چغتائی ترکی کو

تُرکی ادب ایران کی ایک ادبی تاریخ میں بھی ہماری کچھ توجّہ کا مُستحق ہے

ترکی زبان اور ادب پر میر علی شیر نوائی کے احسانات

ادبی زبان کے رُتبے تک پہنچانے کے لئے وُہ کچھ کیا جو کسی اَور سے نہ ہُوا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ایک رسالہ بہ عنوان "محاکمۃ اللُغتَین" میں صراحت کیساتھ چغتائی تُرکی کو فارسی زبان سے افضل قرار دیا۔ میر علی شیر کی متعدد تالیفات پر پہلے کچھ کہا جا چُکا ہے جو شایق اس بارے میں زیادہ مفصّل اطلاعات چاہتے ہیں وہ مجلّۂ آسیائی بابت ۱۸۶۱ء میں موسیو بلیںؔ[1] کا مذکورۂ سابق مقالہ اور مجلّۂ مذکورہ بابت ۱۸۶۶ء میں محبوب القلوب[2] پر موصوف کا ایک اَور مقالہ زیرِ عنوان "میر علی شیر کے خصائل اقوال اور افکار"[3] ملاحظہ فرمائیں۔ دولتشاہ بھی اپنے تذکرۃ الشعراء کے خاتمے میں معاصروں میں سے کئی اَور ممتاز تُرکی شاعروں کا ذکر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس زبان کی نثر و نظم دونوں کی متعدّد تصانیف کا ذکر آپکو ریو کی "فہرستِ مخطوطاتِ ترکی در عجائب خانۂ برطانوی" میں ملیگا۔ با ایں ہمہ سوائے اُس شخص کے جو تُرکی زبان کے وسیع تر معنوں میں اس کا طالبعلم ہے یہ بات مشکوک ہے کہ ترکی کی اس خاص شاخ (یعنی چغتائی) سے ہماری دلچسپی اسکے سیکھنے کی زحمت کا مقابلہ کرے۔ ہاں البتہ اگر بابر کی بینظیر تصنیف بابرنامہ کو اصل شکل میں پڑھنے کیلئے یہ زحمت اُٹھائی جائے

بابرنامہ کی بے مثال نوعیت

۱؎ M. Belin ؛ ۲؎ ۱۲۸۹ھ (۳-۱۸۷۲ء) میں اس کا متن (میرے خیال میں قسطنطنیہ سے) طبع ہوکر شائع ہوا ؛

۳؎ Caracteres, Maximes et Pensees dc Mir Ali Chir Nevaii

تو گوارا ہو سکتی ہے۔ ایرانی یا ہندوستانی تاریخ کے ہر متعلم کو کم سے کم اس کتاب کا فرانسیسی یا انگریزی میں ترجمہ ضرور پڑھنا چاہئے۔ اس نادر کتاب کی "نوعیت بے مثل ہے۔ اور اگر ہم مصنف کے حالات کو پیشِ نظر رکھیں تو

تو زک کی تعریف میں اس کے استعمال کرنیوالوں کی رطب اللسانیاں

اس کی بے نظیری میں کوئی شُبہ باقی نہیں رہتا۔" ارسکن[1]، پاوے دو کُوغتیہ[2] اور دوسرے تمام وہ مصنفین جنہوں نے بابر نامے پر کام کیا ہے جی کھول کر اس کی تعریف کرتے ہیں اور کوئی شخص جس نے بنظرِ امعان اس کے اوراق کا مطالعہ کیا ہے ان تعریفوں کو مبالغہ نہیں سمجھیگا۔ ایلفنسٹن[3] کی توصیف سے بہتر اس کی توصیف کرنا ناممکن ہے وُہ لکھتا ہے "اس میں ایک زبردست تاتاری شہنشاہ کی زندگی کی ایک مفصّل روئیداد ہیں جس میں اخفاؤ ریا سے بری خیالات اور احساسات کا ایک قدرتی بہاؤ ہے جو انتہائی آزاد گوئی اور صاف بیانی کے دکھاوے سے بھی ویسا ہی پاک ہے۔ اندازِ بیان ہموار و مردانہ بھی ہے اور شگفتہ و رنگین بھی؛ اور

---

[1] پاوے دو کُوغتیہ (Pavet de Courteille) کا فرانسیسی ترجمہ اصل ترکی سے کیا گیا لہٰذا لیڈن اور ارسکن (Erskine) کے انگریزی ترجموں پر اسکو ترجیح ہے۔ جو فارسی ترجمے پر مبنی ہیں؛ [2] تاریخ ہند (.History of India) جلد اول، ص ۵۲۲-۵؛ [3] Pavet de Courteille اس کے ترجمے کے دیباچے کا صفحہ ۲؛ [4] Elphinston. تاریخ ہند (History of India) ص ۱۱۷ تا ص ۱۱۹؛

مصنّف کے اہلِ وطن اور معاصرین کی وضع قطع، آداب و رسُوم، مقاصد و مشاغل اور کاروبار کا ایک ایسا صاف عکس پیش کرتا ہے جیسے آئینے میں ہو۔ اس اعتبار سے یہ ایشیا میں سچّی تاریخ نگاری کا تقریبًا واحد نمونہ ہے۔ کیونکہ معمولی لکھنے والے گو اکابر کے کارناموں اور جشنوں کا پُرطمطراق نقشہ کھینچتے ہیں۔ لیکن جو اس طبقے سے نیچے ہیں اُنہیں وُہ بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور پھر طبقۂ اکابر کے حالاتِ زندگی اور آداب و رسُوم کی توصیف کا چھوڑ جانا بھی ان سے بعید نہیں۔ بابر ہمیں جس شخص سے متعارف کرتا ہے اس کی صورت شکل، مذاق اور عادات سب ایسی مُوشگافی اور واقعیت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم خود اس کے معاصرین میں زندہ ہیں اور ان سے اور ان کی سیرتوں سے خوب واقف ہیں۔ جو جو ملک اس نے دیکھے ان کے حالات، مناظر، آب و ہوا، پیداوار اور صنعت و حرفت کی ایسی پوری اور صحیح تصویریں کھینچتا ہے کہ شاید ہی اتنی قلیل ضخامت میں کسی جدید سیاح کے ہاں ملیں گی۔ اور اگر ہم ان حالات کو بھی مدِّنظر رکھیں جن میں یہ سب کچھ تالیف ہُوا تو واقعی حیرت ہوتی ہے"۔

کتاب واقعی غیر معمولی طور پر صاف بیان اور بے تکلّف ہے۔ بس بالکل ایسا روزنامچہ ہے جو آدمی اپنے ذاتی دِل بہلاوے کے لئے لکھتا ہے نہ اس لئے کہ اس کے بڑے سے بڑے رازدار دوست بھی اسے دیکھیں چہ جائیکہ اس کی رعیّت اسے پڑھے۔ غالبًا کسی بادشاہ نے کبھی اپنے ذاتی حالات اس طرح قلمبند نہیں کئے۔ یا کم سے کم انہیں مشتہر کرنا گوارا نہیں

کیا۔ بہت سے عظیم تاریخی واقعات جنھیں اس نے حصہ لیا بیان کرتے ہوئے وہ ان باتوں کے ذکر میں کچھ تأمل نہیں کرتا کہ کب اس نے (۹۰۹ھ = ۴-۱۵۰۳ء میں ۲۳ سال کی عمر میں) پہلی مرتبہ اپنی حجامت بنائی[1]۔ کب پہلی دفعہ سہیل ستارہ دیکھا[2]۔ کب پہلی بار (۹۱۲ھ = ۷-۱۵۰۶ء میں) ہرات میں اسے شراب چکھنے کی ترغیب ہوئی[3]۔ اور کب اُس نے تُرکی شعر کہنے کی سب سے پہلی کوشش کی[4]۔ وہ عائشہ سلطان بیگم کیساتھ اپنی نامبارک شادی[5]، بابری کے ساتھ اپنے ناعاقبت اندیشانہ اور بے قابو عشق[6]، اپنے دور ہائے مے نوشی[7]، اور اپنی پسندیدہ شراب[8] کا حال لکھتا ہے۔ اور یہ کہ کس طرح ایک موقع پر اُس نے محفلِ شراب میں بے اعتدالی سے احتراز کیا۔ اس غرض سے کہ دُوسروں پر بدمستی کے اثرات کے بارے میں ایک بے لاگ اور منصفانہ رائے قائم کرے[9]۔ اسکے جغرافی مشاہدات کے افادے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لیکن وسطی ایشیا اور ہندوستان کے حیوانات و نباتات پر اس کی یادداشتیں بھی تقریباً اسی قدر دلچسپ ہیں۔ اسکے علاوہ اس کے شاہی قرابتداروں اور مشہور ترین معاصروں کے خصائل اور ذاتی خصوصیات کے غیر متعصبانہ اور باریک نقش لفظی خاکے بھی بیحد دلچسپ اور پُر قدر ہیں۔ ہمارے موجودہ نقطۂ نظر سے اس کی توزک کا کوئی حصہ

---

[1] بابرنامہ۔ طبع النسکی (Ilminsky) ص ۱۴۶؛ [2] ایضاً ص ۱۵۳؛ [3] ایضاً ص ۲۳۹؛

[4] ایضاً ص ۱۰۷؛ [5] ایضاً ص ۶۲؛ [6] ایضاً ص ۶۲ تا ص ۶۳؛

[7] ایضاً ص ۲۹۱، ص ۲۹۳، ص ۳۰۵؛ [8] ایضاً ص ۶؛ [9] ایضاً ص ۳۰۴؛

بابر نامے میں علماء وفضلاء اور اہلِ فن کی توصیفات

اس حصّے سے زیادہ دلچسپ نہیں۔ جو اُس نے اُن سرکردہ شعراء، مصنّفین اور باکمالوں پر وقف کیا ہے[1]۔ جو سلطان ابوالغازی حسین کے دربار کے لئے باعثِ افتخار تھے۔ یہ حصّہ اُس نے خود بادشاہ موصوف اور اس کے ہنرمند وزیر میر علی شیر نوائی سے شروع کیا ہے[2]۔ چونکہ یہ سب حصّہ "پادے دو کورتیہ"[3] کے فرانسیسی ترجمے کی پہلی جلد (ص ۳۶۴ تا ص ۴۱۵) میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہاں چند زیادہ دلچسپ عبارتوں کا ملخّص پیش کر دینا کافی ہوگا۔

سلطان حسین کی ولادت، وفات، شکل وشباہت اور اس کے خاندان کا تذکرہ کر چکنے کے بعد بابر اس کے شیعی میلان کا ذکر کرتا ہے جس کا اُس

سُلطان حسین کی توصیف

نے اپنے عہد حکومت کے شروع میں اظہار کیا۔ لیکن جسے میر علی شیر نے روک دیا۔ دردِ مفاصل کی مُزمن بیماری کے سبب وُہ نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ لیکن یہ بیماری اس قصور کے لئے کوئی معقول عذر نہیں کہ وہ روزہ بھی نہ رکھتا تھا۔ تخت پر بیٹھنے سے چھ سات سال بعد وُہ شرابخوری میں پڑ گیا۔ اور چالیس سال کے عرصے میں جس میں وُہ خراسان کا بادشاہ رہا کوئی دن ایسا نہ آیا۔ کہ جس میں اُس نے پیشیں کی نماز کے بعد شراب نہ پی ہو۔ لیکن صبُوحی کبھی نہ

---

[1] بابر نامہ۔ طبع المنسکی، ص ۲۲۱ تا ص ۲۳۱؛ [2] ایضاً ص ۲۰۳ تا ص ۲۱۴؛

[3] Pavet de Courteille

پیتا تھا۔" اس کے بیٹے، سپاہی اور شہری اسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عیش وفسق کرتے تھے۔ تاہم اس کی شجاعت مسلّمہ تھی۔ تلوار چلانے میں چابکدست تھا۔ ترکی زبان میں خاصے شعر کہہ لیتا تھا اور حُسینی تخلص کرتا تھا۔ اس کی مملکتِ خراسان مشرق میں بلخ تک، مغرب میں بسطام اور دامغان تک، شمال میں خوارزم (خیوا) تک اور جنوب میں قندھار اور سیستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ ذرا آگے چل کر بابر کہتا ہے "سلطان حسین کا زمانہ عجیب زمانہ تھا۔ خراسان اور بالخصوص شہرِ ہرات بینظیر اہلِ فضل سے بھرا پڑا تھا۔ ہر شخص جس کام میں مشغول تھا اس میں اس کی ہمّت وغرض یہ تھی کہ اس کام کو کمال تک پہنچائے۔"

اس کے بعد میر علی شیر نوائی کی بحث ہے۔ اس کی شاعرانہ استعداد نے بابر سے اعلےٰ خراج تحسین وصُول کیا ہے۔ اور بابر نے اس کی روانی اور غزلیہ شاعری اور رُباعیات کی یکساں تعریف کی ہے۔ لیکن اس کے

میر علی شیر کی توصیف

اسلوبِ خط نویسی کو فروتر ٹھہرایا ہے۔ گو وُہ زیادہ تر تُرکی میں لکھتا تھا۔ لیکن اسکا ایک فارسی دیوان بھی ہے جس میں وُہ فانی تخلّص کرتا ہے۔ اہلِ فضل و ہُنر کا زبردست مربّی تھا۔ اور بہزاد اور شاہ مظفر دونوں مصوّروں کی شہرت یابی بڑی حد تک اسی کی ہمّت افزائی کا نتیجہ تھی۔ عبادت گذار اور راسخ العقیدہ تھا اور مذہبی فرائض کا خیال رکھتا تھا۔ شطرنج سے اسے بیحد شغف تھا۔ لیکن اس شوق میں میر مرتاض اس سے بھی بڑھا ہُوا تھا۔

اس کا تو یہ عالم تھا کہ جب اُسے دو اچھے حریف کھلاڑی بیک وقت مل جاتے تو ایک سے بازی لگاتا اور دُوسرے کو روک رکھنے کے لئے اسکا دامن پکڑے رہتا۔ حتّٰی کہ ایک بازی اس سے بھی کھیل لیتا۔ میر علی شیر مجرّد ہونے کے سبب خانگی بندھنوں سے آزاد تھا۔ اور اپنے قریبی دوستوں کیساتھ بڑا آزاد اور بے تکلّف تھا۔

شیخم بیگ سُہیلی

شیخم بیگ جو سہیلی تخلّص کرتا تھا۔ سلطان کے امرا میں سے ایک اَور شخص تھا جو شاعری کا کچھ ملکہ رکھتا تھا۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اُسے مُہیب الفاظ و معانی کے استعمال کا بیجا حد تک شوق ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُس نے مولانا جامؔی کی موجودگی میں ذیل کا شعر پڑھا ؎

شبِ غم گرد بادِ آہم از جا بُرد گردُون را
فرو خورد اژدہای سیلِ اشکم رُبعِ مسکون را

مولانا جامؔی نے سُن کر کہا۔ کہ "شما شعر میگوئید یا آدم می ترسانید؟"

کمال الدّین گازرگاہی

اس سے ذرا آگے چل کر بابر لکھتا ہے :" کمال الدین گازرگاہی صُوفی نہ تھا بلکہ متصوّف تھا۔ اس طرح کے متصوّف علی شیر بیگ کے حضور میں جمع رہتے تھے اور وجد و سماع کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر سے اس کے اصول بہتر تھے اور اسکو جو رعایات حاصل تھیں اُن کا سبب غالبًا اسکے اصُول ہی تھے کیونکہ یوں وُہ کسی خاص قابلِ ذکر لیاقت کا مالک نہ تھا۔ اُس نے ایک

کتاب مجالس العشاق لکھی۔ جس کی مصنفی اُس نے حسین میرزا سے منسوب کر دی۔ نہایت بے معنی تصنیف ہے۔ اور اس میں اکثر جھوٹ لکھے ہیں اور جھوٹ بھی بے مزہ اور بیہودہ ہیں اور ان میں سے بعض سے کفر کی بُو آتی ہے۔ چنانچہ بہت سے انبیاء اور اولیاء کو اس میں عشقِ مجازی سے منسوب کیا گیا ہے اور ہر ایک کے لئے ایک معشوق و محبوب تراشا گیا ہے۔ ایک عجیب احمقانہ حرکت یہ ہے کہ دیباچے میں جہاں کمال الدین کتاب کو سُلطان حسین میرزا کی تصنیف بتا رہا ہے وہاں اُس نے کتاب میں اپنے جتنے جتنے اشعار نقل کئے ہیں ان کے اوپر "للمؤلف" لکھ رہا ہے"[1]۔

مولانا جامی اور سیف الدین تفتازانی

اس عہد کے سب سے افضل شاعر مولانا جامی پر بابر کسی قسم کی تنقید کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ "مولینا کا درجہ احتیاجِ تعریف سے بالا ہے۔" اور اس لئے توزک میں اُنکا مذکور صرف "ازجہتِ تیمّن و تبرّک" کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بابر نے مشہور سعد الدین تفتازانی کے بیٹے شیخ الاسلام سیف الدین احمد کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ علوم عربیّہ و نقلیّہ میں وہ خوب دستگاہ رکھتا تھا۔ اور اس کے تدیّن کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ تقریباً ستر سال اس نے کبھی نمازِ جماعت ترک نہ کی۔ پھر لکھا ہے کہ شاہ اسمٰعیل نے جب ہرات پر قبضہ کیا تو اس کو اس بات پر مروا ڈالا کہ اس نے شیعی عقائد و فرائض کی پابندی سے

---

[1] اوپر ص ۶۲۳ تا ص ۶۲۴ سے مقابلہ کیجئے؛

انکار کر دیا۔ کیونکہ شاہ نہایت متشدّدانہ طور پر اس مذہب پر مصر تھا۔ توزک

عبد الغفور لاری

میں جامی کے شاگرد و مرید ملّا عبد الغنی لاری کا مذکور زیادہ لمبا ہے۔ اُس نے اپنے استاد کی نفحات الانس پر شرح لکھی۔ درویشوں کی صحبت کا اسے اس قدر شوق تھا۔ کہ جب وہ سُن پاتا کہ کوئی نیا درویش وارد ہوا ہے تو جب تک اس سے ملاقات اور گفتگو نہ کر لیتا اسے قرار نہ آتا۔ اس کے بعد عربی کے ایک اچھے عالم میر عطاء اللہ مشہدی کا ذکر ہے جس نے فارسی میں قافیے پر ایک رسالہ لکھا۔ اس رسالے کا بڑا عیب بابر کی نظر میں یہ ہے کہ مصنّف نے مثالوں کے طور پر خود اپنے اشعار پیش کئے ہیں۔ اسکے علاوہ اُس نے صنائعِ شعر پر "بدایع الصنائع" نام ایک رسالہ لکھا[1]۔

ان شعراء کے علاوہ جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں دُوسرے شاعر جن کا تذکرہ بابر نے کیا ہے آصفی، بنائیؔ، سیفی بخاری (عروض کے ایک مفید رسالے کا مصنّف)، ہاتفیؔ (ملّا جامیؔ کا بھانجا جسے عبد اللہ

بابر کے ہاں مذکورہ دیگر شعرا

مثنوی گو" بھی کہتے ہیں)، میر حسین معمائی، محمد بدخشی، یوسف بدیعی، آہی، محمد صالح، شاہ حسین کامی، اہلی اور ہلالی ہیں۔ ہلالی کی مثنوی "شاہ و درویش" یا "شاہ و گدا" کے نفسِ مضمون اور طرزِ ادا پر بابر بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتا ہے۔ دربارِ ہرات کے متعدّد خوشنویسوں میں سے

---

[1] یہ رسالہ معہ ترجمۂ انگریزی و تشریحات بلوخمان (Blochmann) نے کلکتہ سے شائع کیا؛

خوش نویسان و صناعان

وہ صرف سلطان علی مشہدی کا ذکر کرتا ہے۔ جو سلطان حسین اور میر علی شیر دونوں کیلئے کتابت کرتا تھا۔ مرقع کشوں میں سے وہ صرف بہزاد اور شاہ مظفر کا ذکر کرتا ہے۔ جو شاعر بھی تھا۔ بہزاد کی تصاویر پر اسکی تنقید یہ ہے کہ گو وہ ریشدار چہرے خوب کھینچتا تھا۔ لیکن بے ریش لڑکوں اور لڑکیوں کی تصویروں میں اسے ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ ان میں وہ ٹھوڑیوں کو غیر متناسب حد تک بڑا کر دیتا ہے[1]۔ ایک اَور جگہ[2] ان کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو شیبانی خان نے تسخیرِ ہرات (بہ ۹۱۳ھ = ۸-۱۵۰۷ء) کے بعد کیں بابر اسے اس حرکت پر سخت ملامت کرتا ہے کہ اس نے بہزاد کی تصویروں کی اصلاح و تصحیح کرنیکی کوشش کی۔ آخر میں بابر متعدد مُطربوں اور نغمہ گروں کا ذکر کرتا ہے ؛

اس عہد کی ادبی تاریخ کی اطلاعات کیلئے وافر مواد

ہم نے دیکھ لیا کہ اس عہد کی ادبی خصوصًا شعراء کی تاریخ کے لئے اطلاعات غیر معمولی طور پر وافر اور مستند ہیں کیونکہ ان ضمنی مذکورات کے علاوہ جو بابر نامے میں ملتے ہیں ہمارے پاس دولت شاہ کا ضخیم تذکرۃ الشعراء ہے جو ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) میں تصنیف ہوا اور میر علی شیر کی مجالس النفائس (بزبانِ ترکی) ہے جو تقریبًا چار سال آگے چل کر مکمل ہوئی اور جس کے مندرجات کی کچھ کیفیت اُوپر بیان کی جا چکی ہے[3]

---

[1] طبع المنسکی۔ ص ۲۲۸ تا ص ۲۲۹ ؛ [2] ایضًا ص ۲۶۲ ؛ [3] اوپر ص ۶۲۰ تا ص ۶۲۲ ؛

ان کے ضمیمے کے طور پر ایک اور شاہی مصنّف سام میرزا ابنِ شاہ اسمٰعیل صفوی کی متأخر تصنیف ہے۔ سام میرزا ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں متولّد ہُوا۔ اور ۹۸۴ھ (۷-۱۵۷۶ء) میں مارا گیا۔ اس نے اپنی "تحفۂ سامی"[1] ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) میں لکھّی[2]۔ جو قدرے نادر کتاب ہے۔ اس پر ہم اگلی جلد میں بحث کرینگے۔ ان کے علاوہ خواند امیر کی حبیب السیر کے پُراز معلومات سیرتی مذکورات ہیں۔ ان تمام صاحبانِ مآخذ میں بابر سب سے بڑھکر خوشگن اور پُر افادہ ہے۔ کیونکہ اس میں ظرافت بھی ہے اور مزید برآں ایک ناقدانہ صلاحیّت ہے جو دُوسرے تذکرہ نگاروں کے ہاں نہیں پائی جاتی کہ وُہ اپنی جا و بیجا ستائش آرائی سے اپنی تنقید کو تمام حقیقی قدر و قیمت سے محروم کر دیتے ہیں ؛

---

[1] ملاحظہ ہو ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی۔ صـ ۳۶۷ تا صـ ۳۶۸ اور وہ حوالے جو وہاں دئے گئے ہیں۔ کتابخانۂ جامعۂ کیمبرج میں بھی اس کا ایک نسخہ (Or. 6 48.) موجود ہے ؛

[2] اس کتاب کے صحیفۂ پنجم (جو شاعروں کے بیان میں ہے) کی ایک طبع بسعی و تصحیح مولوی مولوی اقبال حسین صاحب پٹنہ سے شائع ہوئی ہے ؛ (مترجم) ؛

بابِ ہشتم

متاخّر تیموری دَور کے شعراء

تیموری زمانے میں ادبی مذاق

جیسا کہ ایک سے زیادہ جگہ جتایا جاچکا ہے تیموری دور میں جو فن متداول تھا خواہ وہ فنِ ادب تھا یا فنِ مصوّری اس کا امتیازی خاصہ ایک انتہا درجے کی تکلّف پسندی اور تصنّع آمیزی تھی جو جدید یورپی مذاق کے موافق نہیں گو ادبی شعبے میں اس فن سے بہت مشابہ ہے جو ایران میں جامی کی شہرت کے عروج پر پہنچنے سے تقریبًا ایکصدی بعد جون للی[۱] اور مرصّع نگاروں[۲] کے طبقے نے انگلستان[۳] میں نکالا[۴]۔ انگلستان میں اس آراستہ اور متصنّع اسلوب کو

---

[۱] John Lyly؛ [۲] Euphuists؛ [۳] للی سنہ ۴-۱۵۵۳ء میں پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنی کتاب یوفیوئیز (Euphues) ۱۵۷۸ء میں لکھی۔ مولانا جامی نے اپنی نفحات الانس ۱۴۷۸ء میں تصنیف کی اور اپنا پہلا دیوان ۱۴۷۹ء میں تالیف کیا؛ [۴] حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھیں؛

صرف ایک مختصر زمانے کے لئے مقبولیت حاصل رہی۔ ایران میں یہ قلیل وقفوں کے ساتھ ایک زمانے تک خصوصاً تاتاریوں اور تُرکوں کی سرپرستی میں فروغ پذیر رہا لیکن مسلسل نہیں اور نہ مُلک کے تمام حِصّوں میں۔ چنانچہ زیرِ غور زمانے سے پہلے اور بعد سادہ، پُختہ اور بے ساختہ فارسی نثر اور نظم کے عمدہ نمونے پیش کرنا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن اس عہد میں ایران میں عام

تُرکی اور ہندوستانی اسلوب پر فارسی کے شدید ترین اثر کا زمانہ

ادبی اسلوب مرصّع اور تصنّع آمیز تھا۔ اور یہ بدنصیبی ہے کہ متّصلہ ممالک ترکیہ۔ ہندوستان اور ماوراء النّہر پر ایران کا ادبی اثر کسی اور زمانے میں اس شدّت سے نہ ہُوا جس قدر اس عہد میں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ اسلوب تمام مغربی اور وسطی ایشیا میں نمونہ قرار پایا۔ اور بہت سے لوگ خصوصاً وُہ جنہوں نے اپنی لسانی تحصیل ہندوستان میں رہ کر کی ہے اسے مخصوص طور پر ایرانی اسلوب سمجھتے ہیں۔ تاہم یہ بات مسلّم ہے کہ نہ صرف ایرانی، ترک اور ہندوستانی بلکہ عرب بھی جن کا طبعی رُجحان نسبتہً شُستہ اور آسان انداز کی طرف ہے اور جو اپنے اس مقولے کو کہ "خَیرُ الکلام ما قلّ ودلّ" شاید ہی کبھی کاملاً

(حاشیہ ص ۶۵۵) جون للی نے نومبر ۱۶۰۶ء میں وفات پائی۔ اس کی تصنیف (Euphues) نثر میں ایک اطالوی شخص کی رومان ہے۔ اس کتاب نے جس نئے اسلوبِ تحریر کو رواج دیا وہ (Euphuism) کہلاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تشبیہ تلمیح اور تضاد کی صنعتیں افراط کیساتھ استعمال کی جاتی ہیں؛ (مترجم)

فراموش کرتے ہوں ادبی تحریر میں ظاہری ساخت کو خیالات سے زیادہ اہم سمجھنے پر مائل ہوتے ہیں۔ اس کی پروا کم کرتے ہیں کہ کہنے والا کہتا کیا ہے اور اس کی زیادہ کہ کیونکر کہتا ہے اور تقلید کو اختراع پر ترجیح دیتے ہیں۔ نامی گرامی اور جدت طراز مؤرّخ ابنِ خلدون کے اقوال (جو نہ صرف تیمور کا معاصر تھا بلکہ ۱۴۰۰ء کے اختتام پر جب دمشق نے تیمور کی اطاعت قبول کی تو تیمور کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات پیدا ہوئے[1]) نہایت مفید اور بصیرت افروز ہیں۔ یہ مشاہدات اس موضوع سے متعلق دیگر مشاہدات کے ساتھ میں نے ایک سابق جلد میں درج کیے ہیں[2]۔ ان کی طرف ناظرین کو توجہ دلائی جاتی ہے۔ خاص طور پر فارسی شاعری بالخصوص بعد کے زیادہ آرائش پسند مصنّفوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے شرف الدین رامی کی دلچسپ کتاب "انیس العشّاق" تجویز کی جاتی ہے جو ۸۲۶ھ (۱۴۲۳ء) میں مراغہ واقعہ آذربایجان میں لکھی گئی۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ موسیو کلیماں اُوآر نے کیا ہے جو ۱۸۷۵ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ انیس العشّاق کی اجمالی کیفیت میں نے ایک سابق جلد[3] میں بیان کی ہے[4]۔

---

[1] ملاحظہ ہو "مذکورات و اقتباسات" (Notices et Extraits) میں بیرن میک گوگن دوسلین" (Baron McGuckin de slane) کے ترجمے کا پہلا حصّہ۔ صفحات ۵ اور ۶ تا ۶۴؛

[2] تاریخ ادبیاتِ ایران۔ جلد دوم ص۸۱ تا ص۸۹، خصوصاً ص۸۶ تا ص۸۹؛

[3] ایضاً ص۸۳ تا ص۸۴؛ [4] حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں؛

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تمام شاعر جن کا اس باب میں تذکرہ کیا جائیگا یا سب وہ جو سلطان حسین کے دربارِ ہرات میں پرورش پا رہے تھے اسی ثقیل اور مزین اسلوب سے کام لیتے ہیں۔ نثرنگاروں میں یہ اسلوب زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان میں مؤرخین بھی شامل ہیں جن کو اس سے زیادہ تمیز ہونی چاہیئے کہ جو بات ایک صفحے میں بخوبی کہی جاسکتی ہے اس پر دس صفحے بھر دیں۔ ابتدائی شعرا مثلاً شاہ نعمت اللہ اور قاسم الانوار جن کا ہم ابھی تذکرہ کرینگے۔ اس عیب سے (کہ اس تصنع آمیز اسلوب کو عیب ہی کہنا ٹھیک ہے) خالی ہیں اور اسی طرح مولانا جامی بھی بالعموم اس سے مبرا ہیں جو بالاتفاق اور بجا طور پر نہ صرف دربارِ ہرات کی خاص زینت سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ ایران کے ماضی کے سب سے بڑے شعرار میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ جو لوگ اس ادبی قباحت کے خاص مُرتکب ہیں وہ اس دور کے متاخر حصے کے ترصیع پسند نثرنگار اور ادر گھٹیا شاعر اور تُک بند ہیں۔ چیستانوں اور معمّوں کا شوق جو آخرالذکر طبقے میں عام تھا بہت نمایاں ہے اور مرصّع نگاروں کے اسالیب کی عمدہ مثال حسین واعظِ کاشفی کی انوارِ سُہیلی ہے۔ مثلاً اُس میں ایک چُوں چُوں کرتے ہوئے چُوہے کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ "اپنی فریاد فلک الجو

پُرتکلّف اسلوب اتنا عالمگیر نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے

---

[1] انیس العشاق اُن تشبیہات کے بیان میں ہے جو معشوق کے مختلف جسمانی اعضار کے لئے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ (مترجم)

تک بلند کر رہا تھا"۔ ایک سابق جلد میں مَیں نے "کتاب کلیلہ و دمنہ" کے تین مختلف ترجموں کی متوازی عبارتیں پیش کی تھیں[1]۔ ان میں سے عبد اللہ بن مقفّع کا عربی ترجمہ آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ نظام الدین ابو المعالی نصر اللہ نے فارسی ترجمہ بارھویں صدی میں اور حسین واعظ نے سولھویں صدی کے آخر میں کیا۔ میں نے ان عبارات میں یہ دکھایا تھا کہ کیونکر اس آخری مترجم نے اپنے پیشروؤں کے کام کو بہتر بنانے اور اس پر حاشیہ آرائی کرنے پر کمر باندھی ہے ۔

(۱) سیّد نعمت اللہ کرمانی

گو بلا امکانِ تردید مولانا جامی زیرِ غور زمانے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن یہاں بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمانوی تسلسل کیساتھ چلا جائے اور سب سے متقدم شاعر سید (یا شاہ) نعمت اللہ کرمانی سے ابتدا کی جائے۔ جو (۱۴۳۱ء کے موسمِ بہار میں) ۲۲ رجب ۸۳۴ھ کو طویل عُمر پاکر فوت ہوئے۔ اور کرمان کے قریب ماہان کے دلفریب گاؤں میں مدفون ہوئے۔ جس کے متعلق کسی ستم ظریف نے کہا ہے ؎

سیّد نعمت اللہ کرمانی

ماہان کی شان میں ایک لطیف شعر

بہشتِ روی زمین است خطّۂ ماہان بشرطِ آنکہ نکانش دہند در دوزخ

---

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران - جلد دوم - ص ۳۴۹ تا ص ۳۵۳؛

اُن کی قبر کا امتیازی نشان ایک نہایت عمدہ خانقاہ ہے۔ جس میں ان کے بیان کردہ شاہ نعمت اللّٰہی سلسلے کے درویش رہتے ہیں۔ وُہ ایک برگزیدہ ولی اور صُوفی بھی تھے۔ اور شاعر بھی۔ اُن کے اشعار فتنۂ آخرالزمان (فتنۂ دجال)، ظہورِ مہدی اور اسی قسم کے دُوسرے امُور سے متعلق مبہم الہامی اقوال سے بھرے پڑے ہیں۔ مَیں نے کرمان سے رُخصت ہونے سے ذرا پہلے ستمبر ۱۸۸۸ء میں اُن کے مزار کی زیارت کی اور اس کے مجاوروں نے بڑی مہمان نوازی سے میری خاطر تواضع کی ۔

حسبِ معمول شاہ نعمت اللّٰہ کے احوال کا بہترین بیان رِیو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی میں[1] ملتا ہے۔ ریو نے وہاں معمولی تذکروں کی فراہم کردہ معلومات کے لُبِ لباب کا تکملہ اُن تفصیلات سے کیا ہے جو یزد اور اس کے مشہور ترین اشخاص کی ایک نادر معاصر تاریخ معروف بہ "جامِع مُفیدی" سے اخذ کی گئی ہیں۔ یہ تاریخ عجائب خانۂ برطانوی میں محفوظ ہے[2]۔ ان کا پورا

شاہ نعمت اللّٰہ کے حالاتِ زندگی

نام امیر نورالدین نعمت اللّٰہ تھا۔ ان کے والد کا نام میر عبداللّٰہ تھا۔ اپنا سلسلۂ نسب شیعوں کے پانچویں امام محمّد باقرؑ سے ملاتے تھے جو حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کے پڑپوتے تھے۔ ۷۳۰ھ (۱۳۲۹ء) میں یا اس سے اگلے سال حلب میں پیدا ہوئے۔ لیکن جوانی کا بیشتر حصّہ اُنہوں نے عراق

---

[1] ص ۶۳۴ تا ص ۶۳۵؛

[2] Add. 16,837 اوراق ۳۳۹ تا ۲۸؛

میں گزارا - ۲۴ سال کی عمر میں اُنھوں نے مکّہ کی زیارت کی - وہاں سات برس مقیم رہے اور تصوّف اور تاریخ کے ایک مشہور مصنّف شیخ عبداللہ الیافعی (المتوفی ۷۶۸ھ = ۷-۱۳۶۶ء) کے خاص مُریدوں میں شامل ہوگئے - اواخرِ زندگی میں اُنھوں نے سمرقند، ہرات، یزد اور بالآخر ماہان (نزدِ کرمان) میں بسر کئے - جہاں جیسا کہ ذکر آچکا ہے ۲۲ رجب ۸۳۴ھ (۵ اپریل ۱۴۳۱ء) کو وُہ سو سال سے زیادہ عُمر پاکر فوت ہوئے - مشہور مؤرخ عبدالرزّاق سمرقندی نے ۸۴۵ھ (۲-۱۴۴۱ء) میں ان کی قبر کی زیارت کی ؛

نعمت اللہ درویشوں کے بادشاہ تھے ("شاہ" کا لقب ہمیشہ اُن کے نام سے پہلے لگایا جاتا ہے) اور بادشاہوں کے دوست تھے - انہیں شاہرخ کا خاص التفات حاصل رہا - احمد شاہ بہمنی شاہِ دکن نے اس بات کو

شاہ نعمت اللہ اور اُنکی اولاد کو شاہی عنایات حاصل رہیں

اپنے لئے سعادت سمجھا کہ اس نے اُنکے ایک پوتے کو اپنے دربار میں آنے پر آمادہ کرلیا - دُوا اَور پوتے اپنے والد کی معیت میں اس کے پیچھے وہاں پہنچے - علاوہ ازیں شاہ نعمت اللہ کی اولاد میں سے بہت سے لوگ جو ایران میں رہے صفویوں کے شاہی خاندان کے ساتھ باہم شادی بیاہ کرتے رہے - ریو نے لکھا ہے[1] کہ دیوان

---

[1] فہرستِ مخطوطاتِ فارسی - ص ۶۳۵ ؛

کے علاوہ شاہ نعمت اللہ پانچ سَو سے زیادہ رسائلِ تصوّف چھوڑ مرے[1] لیکن ان کی خاص اور قابلِ ذکر تصنیف دیوان ہی ہے۔ اور یہاں صرف اسی کا جائزہ ضروری ہے۔ اس کا واحد مکمل نسخہ جسے میں استعمال کر رہا ہُوں طہران کی سنگی طبع ہے جو ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) میں شائع ہُوئی[2]۔ مختلف تذکروں اور بیاضوں میں جہاں ان کا مذکور ہے اُن کے دیوان کے بہت سے انتخابات ملتے ہیں۔ لیکن اُن کی شہرت زیادہ تر ایک ولی اور صُوفی کی حیثیت سے ہے نہ بحیثیتِ شاعر اور ان کا کلام مجموعی طور پر یک آہنگ اور معمولی درجے کا ہے۔ اور اپنے انداز اور مضامین میں مغربی کے کلام سے ملتا جلتا ہے۔ اور شمسِ تبریز کا سوز اور تاباں برجستگی تو اس میں نام کو نہیں۔ ان کی سب سے مخصوص انداز کی نظمیں گو وُہ تعداد میں بہت کم ہیں وُہ ہیں

اہمیت جو اُنکی پیشنگوئیوں کو دی جاتی ہے

جن کا پیرایہ ملہمانہ ہیں۔ یہ نظمیں ایران میں آج بھی اثر رکھتی ہیں اور شاہ نعمت اللّٰہی درویشوں کے علاوہ دُوسرے ایرانی بھی اپنے دعووں کی تائید میں یہ نظمیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً بابی مجھ کو کرمان میں بتایا کرتے تھے کہ باب کے ظہور کی تاریخ (سنہ ۱۲۶۰ھ = سنہ ۱۸۴۴ء) کی پیشگوئی مندرجہ ذیل

---

[1] نشریاتِ کتابخانۂ مہر (طہران) کی ایک فہرست میں مَیں نے رسائل شاہ نعمت اللہ کی ایک طبع کا اعلان دیکھا ہے لیکن اس طبع کے مشتملات کی کیفیت مجھے معلوم نہیں (مترجم)۔

[2] دیوان کی ایک تازہ ایرانی طبع ۱۳۱۶ھ شمسی میں "شرکت تضامنی محمد حسن علمی و شرکاء" کے سرمائے سے شائع ہوئی (مترجم)۔

نظم میں ہوئی ہے۔ جب میں شاہ نعمت اللہ کی درگاہ پر گیا تو میں نے درویشوں سے ان کے مملوکہ ایک قلمی نسخے سے جو قدیم ترین اور مستند ترین ہے اس نظم کی نقل حاصل کی اور میں نے دیکھا کہ اس نسخے کی رُو سے یہ تاریخ ۱۲۶۰ھ (غ، ر، س = ۶۰ + ۲۰۰ + ۱۰۰۰) کی بجائے ۲۷۴ھ (غ، ر، د = ۴ + ۲۰۰ + ۷۰) نکلتی ہے اور رضا قلی خان کی مجمع الفصحاء[1] میں جہاں یہی نظم[2] منقول ہے ۱۲۰۴ھ (ع، ر، د = ۴ + ۲۰۰ + ۱۰۰۰) ہو جاتی ہے۔ مجمع الفصحاء میں اس نظم پر یہ عنوان درج ہے:۔ "در اظہار بعضی از رموزات و مکاشفات بر سبیلِ کنایات"۔

قدرتِ کردگار می بینم	حالتِ روزگار می بینم
حالِ امسال صورتی دگرست	نہ چو پیرار و پار می بینم
از نجوم این سخن نمی گویم	بلکہ از کردگار می بینم[3]
عین و را دال[4] چو گذشت از سال	بو العجب کار و بار می بینم
در خراسان و مصر و شام و عراق	فتنہ و کارزار می بینم
ظُلمتِ ظُلمِ ظالمانِ دیار	بیحد و بے شمار می بینم

---

[1] طہران کی سنگی طبع۔ جلد دوم ص۴۵؛

[2] پچھلے سے پچھلے ذیلی حاشیے میں دیوان نعمت اللہ کی جس تازہ طبع کا ذکر ہے۔ اس میں یہ نظم نہیں ملتی گو اسی کی زمین کی ایک غزل شامل ہے؛ (مترجم)

[3] یعنی میری یہ پیشگوئیاں علم نجوم پر مبنی نہیں ہیں بلکہ الہامی ہیں؛

[4] ع + ر + د = ۲۷۴؛

قصّۂ بس عجیب می شنوم | غصّۂ در دیار می بینم
جنگ و آشوب و فتنہ و بیداد | از یمین و یسار می بینم
غارت و قتل و لشکر بسیار | درمیان و کنار می بینم
بندہ را خواجہ وش ہمی بینم | خواجہ را بندہ وار می بینم
سکّۂ نو زنند بر رُخِ زر | درہمش کم عیار می بینم
دوستانِ عزیزِ ہر قومی | گشتہ غمخوار و خوار می بینم
ہر یک از حاکمانِ ہفت اقلیم | دیگری را دوچار می بینم
ماہ را روسیاہ می بینم | مہر را دِل فگار می بینم
نصب و عزلِ بتکچی و عمّال | ہر یکے را دو بار می بینم
ترک و تاجیک[1] را بہمدیگر | خصمی و گیر و دار می بینم
تاجر از دستِ دُزدِ بی ہمراہ | ماندہ در رہگذار می بینم
مکر و تزویر و حیلہ بسیار | از صغار و کبار می بینم
حالِ ہند و خراب مے یابم | جورِ ترک و تتار می بینم
بقعۂ خیر سخت گشت خراب | جای جمعی شرار می بینم
بعضی اشجارِ بوستانِ جہان | بی بہار و ثمار بی بینم

---

[1] تاجیک کی اصطلاح ابتدا میں ان فوجی عربوں کے لیئے آتی تھی (تازیک، تازی) جو خراسان اور ماوراء النہر کے مفتوحہ شہروں کی محافظت پر مامور ہوتے تھے - بعد میں یہ اصطلاح بمقابلہ ترکی النسل خانہ بدوشوں کے مستقل ایرانی آبادی کے لیئے مستعمل ہونے لگی - اور اب تک ہوتی ہے ؛

اندکی امن اگر بود آن ہم — در حدِ کوہسار می بینم
ہمدمی ز قناعت و کُنجی — حالیا اختیار می بینم
گرچہ می بینم این ہمہ غمہا — شادی غمگسار می بینم
غم مخور زانکہ من درین تشویش — خرمنِ وصلِ یار می بینم
بعدِ امسال و چند سالِ دگر[1] — عالمی چون نگار می بینم
این جہان را چو مصر می نگرم — عدل او را حصار می بینم
ہفت باشد وزیر و سلطانم — ہمہ را کامیار می بینم
عاصیان از امامِ معصوم — خجل و شرمسار می بینم
برکفِ دستِ ساقیِ وحدت — بادۂ خوشگوار می بینم
غازیٔ دوستدارِ دشمن کش — ہمدم و یارِ یار می بینم
تیغ آہن دلان زنگ زدہ — کُند و بی اعتبار می بینم
زینتِ شرع و رونقِ اسلام — ہر یکے را دو بار می بینم[2]
گرگ با میش و شیر با آہو — در چرا برقرار می بینم
گنج کسری و نقد اسکندر — ہمہ بر روی کار می بینم
ترک عیّار مست می نگرم — خصمِ اُو در خمار می بینم
نعمت اللہ نشستہ در کُنجی — از ہمہ برکنار می بینم
چون زمستان پنجمین بگذشت — ششمش خوش بہار می بینم

---

[1] مجمع الفصحاء میں مختلف ہے :- بعد آنسال چند سالِ دگر ؛

[2] مجمع الفصحاء میں اس مصرعے کی جگہ یہ مصرع ہے :- محکم و استوار می بینم ؛

نایبِ مهدی آشکار شود | بلکه من آشکار می بینم
پادشاہی تمام دانائی | سروری با وقار می بینم
بندگانِ جنابِ حضرتِ او | سر بسر تاجدار می بینم
تا چہل سال ای برادرِ من | دَورِ آن شہریار می بینم
دَورِ او چون شود تمام بکام | پسرش یادگار می بینم
پادشاہی تمام دانائی | شاہِ عالی تبار می بینم
بعد ازو خود امام خواہد بُود | کہ جہان را مدار می بینم
میم حا میم دال[1] می خوانم | نامِ آن نامدار می بینم
صورت و سیرتش چو پیغمبر | علم و حلمش شعار می بینم
یدِ بیضا کہ باد پاینده | باز با ذوالفقار[2] می بینم
مہدی وقت و عیسی دوران | ہر دو را شہسوار می بینم

گلشنِ شرع را ہمی بویم
گُل دین را ببار می بینم

یہاں اس نظم کا جو متن دیا گیا ہے وُہ ہے جو ۹ راگست ۱۸۸۸ء کو ماہان میں میرے لئے نقل کیا گیا۔ اسکے مشمولہ پچاس اشعار میں سے مجمع الفصحا میں صرف ۲۴ دیئے گئے ہیں۔ اور اس تذکرے میں صرف ایک یا دو نئے اشعار کا اضافہ ہے۔ لیکن بعض جگہ اشعار کی ترتیب مختلف اختیار کی گئی ہے

---

[1] یعنی محمدؐ (صلعم)

[2] حضرت علیؑ مرتضیٰ کی مشہور تلوار؛

اور اس کے علاوہ چند ایک لفظی مختلفات بھی ہیں۔ دیوان کی طبعِ سنگی میں یہ نظم سرے سے ملتی ہی نہیں[1]۔

ہمہ اوستی نظمیں

یہ الہامی نظمیں گو ایران میں سب سے زیادہ جاذبِ توجہ رہی ہیں۔ لیکن شاہ نعمت اللہ کے کل کلام کا صرف ایک قلیل حصہ ہیں۔ شاہ نعمت اللہ کے اکثر اشعار مذہبِ وحدت الوجود کی شرح کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خاص تعداد (جس میں پھر بابیوں کو اپنے بانی کی طرف اشارہ نظر آتا ہے) اُن اشعار کی ہے جن میں "نقطہ" کی مقبول تمثیل بیان کی گئی ہے۔ دائرہ اسی کا محض ایک مظہر ہے۔ بعینہٖ جیسے خطّاطی کی دُنیا میں "الف" حروف کے امتیازی نقطے کا مظہر ہے جو ریاضیات کے "نقطے" کا ہم لقب ہے۔ مثال کیلئے چند ایک نمونے کافی ہوں گے:۔

(۲)

پادشاہ و گدا یکیست یکیست بے نوا و نوا یکیست یکیست
درد مندیم و دُرد مے نوشیم دُرد و درد و دوا یکیست یکیست
جُز یکے نیست در ہمہ عالم دو مگو چون خدا یکیست یکیست
آئنہ صد ہزار می بینم روی آن جانفزا یکیست یکیست
مبتلای بلائے بالائیم مبتلا و بلا یکیست یکیست

---

[1] جدید طبع (جو اوپر ص ۶۶۲ کے ذیلی حاشیہ [2] میں مذکور ہے) میں بھی یہ نظم شامل نہیں؛ (مترجم)۔

قطره و بحر و موج جو هر چار   بیشکی نزدِ ما یکیست یکیست
نعمت اللہ یکیست در عالم
طلبش کن بیا یکیست یکیست

(۳)

نقطه در دائرهٔ نمود و نبود   بلکه آن نقطه دائره بنمود
نقطه در دَوْر دائره باشد   نزد آن کس که دائره پیمود
اوّل و آخرش بهم پیوست   نقطه چون ختم دائره پیمود
دائره چون تمام شد پرکار   سرو پارا بهم نهاد آسود
بے وجودیم بے وجود همه   بے وجودیم ما و تو موجود
همه عالم خیالِ او گفتم   باز دیدم خیالِ او او بُود
خوشتر از گفتهای سیّدِ ما
نعمت اللہ دگر سخن نشنود

(۴)

یک مسمّی دان و اسما صد هزار   یک وجود و صد هزارش اعتبار
صورتش جامست و معنی می بُوَد   گرچه هر دو نزدِ ما یک شے بود
در دو می دان یک یکی و دو یکی[۱]   نیک دریابش که گفتم نیکگی
بی وجودِ او همه عالم عدم   بر وجود و جودِ او عالم عَلَم
عالم از بسطِ وجودِ عامِ اوست   هر چه می بینی زجودِ عامِ اوست

[۱] یعنی 2=2×1 ؛

اوئیٔ او ذاتی و مائیٔ ما عارضی باشد فنا شو زین فنا
مائیٔ عالم نقابِ عالم است بلکه عالم خود حجابِ عالم است
جاودانست این حجاب ای جانِ من ای خلیل اللہ من بُرہانِ من

حالِ عالم با تو میگویم تمام
تا بدانی حالِ عالم والسّلام

شاہ نعمت اللہ کی نظموں کی سنگی طبع میں اندازاً کوئی ۱۴۰۰۰ اشعار ہیں جن میں متعدد رُباعیاں بھی شامل ہیں۔ ذیل کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے ادبی مشاغل بہت بڑی عُمر تک جاری رہے ؎

نود و ہفت سال عُمرِ خوشی
بندہ را داد حقّ پایندہ

---

(۲) قاسم الانوار

اس دور کا اگلا شاعر جو ہماری توجہ کا حقدار ہے پچھلے کی طرح سیّد اور صُوفی تھا۔ ریو نے اس کی زندگی کے خاص خاص حالات کا خلاصہ یوں کیا ہے[1]۔

قاسم الانوار "سراب (سراو) واقع ضلع تبریز میں ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں پیدا ہؤا۔ اس کے پہلے مُرشد صفویوں کے ایک مورث شیخ صدرالدین اردبیلی تھے۔ اور ان کے بعد شیخ صدرالدین یمنی

---

[1] فہرست مخطوطات فارسی صفحہ ۶۳۵ تا صفحہ ۶۳۷؛

جو خود شیخ اوحد الدین کرمانی کے مرید تھے وُہ کچھ مدّت گیلان میں مقیم رہ کر خراسان چلا گیا اور ہرات میں سکونت پذیر ہؤا۔ تیمور اور شاہرخ کا عہد اس نے وہاں بسر کیا۔ وہاں اس کے پاس اس کثرت سے مُرید آ آ کر جمع ہونے لگے اور اسکا رسُوخ اس قدر بڑھ گیا کہ بادشاہ کو بھی اضطراب ہؤا عبدالرزاق مطلع السعدین میں بیان کرتا ہے کہ ۸۳۰ھ (۷-۱۴۲۶ء) میں جب احمد لُر نامی ایک شخص نے شاہرُخ پر قاتلانہ حملہ کیا[1] تو میرزا بایسنقر نے سیّد قاسم پر الزام لگایا کہ اس نے عازم قتل کو اپنے ہاں چھپائے رکھا تھا۔ چنانچہ اسے ہرات چھوڑ[2] کر سمرقند کا رُخ کرنا پڑا۔ وہاں اس کو میرزا الغ بیگ کی حمایت اور پناہ مل گئی۔ لیکن چند سال بعد واپس خراسان چلا آیا۔ اور ضلع جام کے ایک شہر خارجرد میں رہائش اختیار کی۔ وہیں ۸۳۷ھ (۴-۱۴۳۳ء) میں اس کی وفات ہوئی"۔

شیخ صدر الدین کیساتھ قاسم الانوار کے تعلّقات	صفوی سلاطین کے مورث شیخ صدر الدین اردبیلی کیساتھ قاسم الانوار کے گہرے تعلّقات کی وافر تصدیق خاندانِ صفوی کے انساب کی ایک غیر مطبوعہ کتاب

[1] دیکھو اوپر ص ۳-۵۰۲ جہاں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ حملہ حروفی فرقے کی تحریک سے ہؤا تھا؛

[2] اُوسلے (Ouseley) نے اپنی تالیف "تذکرہ ہائے شعرائے فارسی" (Notices of Persian Poets. لندن ۱۸۴۶ء) میں (ص ۱۰۱ تا ص ۱۰۳) اس واقعے کے متعلق ایک نہایت پُر لطف لیکن غالباً مجعول حکایت دی ہے؛

"سلسلۃ النسب الصفویہ" سے ہوتی ہے جس کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس آنجہانی سر البرٹ ہاوٹم شنڈلر[1] کے کتاب خانے سے آیا۔ اس نسخے میں (ورق ۲۷ ب تا ۲۸ ب) ہمارے شاعر کا ذکر اس حیثیت سے آیا ہے کہ وہ شیخ صدرالدین کے سب سے زیادہ پُرجوش مریدوں میں سے تھا۔ اس میں اس سخت ریاضت کا حال بھی لکھا ہے جس کے ذریعے اردبیل کی مسجد میں اس نے ایک کشف دیکھا۔ کہ اپنے ساتھی مُریدوں کو نور بانٹ رہا ہے۔ اس سے اس نے "قاسم الانوار" کا لقب پایا۔ شیخ صدرالدین کے والد شیخ صفیّ کی وفات پر اُس نے ذیل کے اشعار کہے[2]

(۱)

صدرِ ولایت کہ نقد شیخ صفیّ است	قرب نود سال بود رہبرِ این راہ
جانش بوقتِ رحیل عطسہ زد و گفت	یَا مَلَكَ الْمَوت قد وَصَلْتُ الی اللّٰہ
حالتِ او را ملک چو دید عجب ماند	گفت کہ یا شیخ الف یرحمك اللّٰہ
سوختۂ قاسمی ز فرقتِ خواجہ	صبر کن اندر فراق صبّرك اللّٰہ

مولانا جامی اس مذکور میں جو اُنہوں نے نفحات الانس میں قاسم الانوار

---

[1] Sir Albert Houtam Schindler ؛

[2] یہ اشعار کلیاتِ قاسم الانوار کے میرے نسخے میں بھی درج ہیں ؛

[3] اس عقیدے کے لئے کہ چھینک، زندگی (یہاں ظاہر ہے کہ ابدی زندگی) کی علامت ہے۔ ملاحظہ ہو فریزر (Sir F. G. Frazer) کی تالیف "توراۃ میں عامیانہ عقائد" (Folk-lore in the Old Testament) جلد اول صفحہ ۹ تا صفحہ ۹ ؛

پر وقف کیا ہے[1]۔ اُن شبہات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ۸۳۰ھ (۷-۱۴۲۶ء)

قاسم الانوار پر الحاد اور فارغ الشریعتی کا شبہ

میں شاہرخ پر قاتلانہ حملہ ہونے کے سلسلے میں اس شاعر پر کیئے گئے اور جن کے سبب وہ شہر بدر کیا گیا۔ جامی یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کی سیرت کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔ لیکن اس کے جن مُریدوں سے وہ (جامی) ذاتی طور پر واقف تھے وہ اسلام کی پابندیوں کو ترک کر چکے تھے۔ اور اُنہوں نے ایک طرح کی اشتمالی زندگی[2] اختیار کر رکھی تھی۔ پس اس اشتباہ کی بنا خاصی معقول ہے کہ قاسم الانوار اگر ان صفویوں کے جو ہنوز بے تاج و تخت تھے شیعہ حمایتیوں کے ساتھ یا اُن سے زیادہ ناقابلِ مصالحت حروفی ملحدین کیساتھ نیم سیاسی تعلّقات نہیں رکھتا تھا۔ تو بھی کم سے کم وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو شریعت کیساتھ تہاوُن برتتے ہیں۔

قاسم الانوار کی ادبی تالیف ایک غیر مطبوعہ دیوان ہے جس میں غزلیات اور کچھ مثنویاں ہیں۔ میرے پاس اسکے دو عمدہ نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک ۸۶۱ھ (۷-۱۴۵۶ء) کا یعنی مصنّف کی وفات سے صرف ۲۴ سال بعد کا لکھا ہؤا ہے۔ ان نظموں میں سے بہت سی تُرکی میں ہیں اور کچھ فارسی کی ایک مقامی بولی میں۔ اس قدیم ترین نسخے میں نظموں کے بعد دو رسالے

---

[1] نفحات۔ نساؤلیس (Nassau Lees) کی ایڈیشن ص ۶۸۹ تا ص ۶۹۳؛

[2] نفحات الانس میں "اباحت" کا لفظ استعمال ہؤا ہے؛ (مترجم)

بھی ہیں جن میں سے ایک تماماً اور دُوسرا جزواً نثر میں ہے - پہلا "انیس العارفین" ہے اور دُوسرا "انیس العاشقین" یا "رسالہ امانت - ایک نظم بھی ہے - جس کا مطلع یہ ہے ؎

الا ای شاہ بازِ قدس لاہوت
مقیّد ماندہٗ در دام ناسوت

اور جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں تیمور کی موت کی طرف اشارہ ہے گو یہ اشارہ اتنا غیر واضح ہے کہ خلقِ خدا کی ہر آفت پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے ٭

جہاں تک ایک غیر اہلِ زبان حکم لگانے کی جرأت کر سکتا ہے - قاسم الانوار کی شاعری میں درمیانہ درجے کی اور اکثر اسی صوفیانہ نوعیت کی ہے جو مغربی اور اس سے ملتے جلتے دُوسرے شاعروں کے ہاں نظر آتی ہے - ذیل کی دو غزلیں اس کی عام طرز کلام کی مناسب مثالوں کا کام دیں گی ؎

(۲)

ساقی ز کرم پُر کن آن جامِ مصفّا را
آن روحِ مقدس را و آن جانِ معلّا را
روزی کہ دہی جامی از بہرِ سرانجامی
یک جُرعہ تصدّق کن آن واعظِ رعنا را
خواہی کہ برقص آید ذرّاتِ جہان با تو

در رقص برافشانی آن زلفِ چلیپا را
ناصح برو و بنشین افسانہ مخوان چندین
از سر نتوان بردن آن علتِ سودا را
گفتی کہ ز خود گم شو تا راہ بخود[1] یابی
تفسیر نمی دانم این رمزِ معمّا را
ہر بار کہ من مُردم صد جانِ دِگر بُردم
احصا نتوان کردن اعجازِ مسیحا را
قاسم نشود عاشق ہرگز بھوای خود
لیکن چہ توان کردن آن مالکِ دلہا را

(۳)

پیش از بنای خانقہ و دیرِ سومنات
ما با تو بودہ ایم در اطوارِ کائنات
اندر میان حکایتِ پیغام[2] در گذشت
چون با منی ہمیشہ چہ حاجت بہ رسلات
از ما خلافِ دوست نیاید کہ با حبیب
ہمراہ بودہ ایم در انواعِ واردات
زنہار ذکرِ غیر[3] دگر بر زبان مران

---

[1] ایک نسخے میں "بخود" کی جگہ "بما" ہے؛

[2] پیغام سے مراد قیاساً وحی پیغمبر ہے؛ [3] یعنی غیر اللہ؛

صاحب دلان بغیر نکردند التفات
ہشیار شرط نیست کہ باشی کہ در طریق
ہر ذرّہ از ذرایر کونند ساقیات
زاہد مکن مبالغہ با ما و این بدان
بر جنسِ طیّبین حلالست طیّبات[1]
قاسم خموش باش و عنانِ سخن بکش
تا پیرِ عشق با تو بگوید ز باقیات[2]

ذیل کی غزل اِس لحاظ سے دِلچسپ ہے کہ اس میں حروفی خیالات کی جھلک نظر آتی ہے ؞

(۴)

ستّۃ ایّام گفت سبع سموات ثم علے العرش استواست نہایات[3]
حضرتِ حق را عروشِ نامتناہیست فاش بگویم عروش جملۂ ذرّات

---

[1] قرآنِ کریم۔ سورۂ نور۔ آیت ۲۶ "...... وَالطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ ......"

[2] قرآنِ کریم۔ سورۂ کہف۔ آیت ۴۴ ؛

[3] یہ ذکر کہ اللہ تعالےٰ نے آسمان چھ دن میں پیدا کیے اور پھر عرش قائم ہُوا قرآن میں بار بار آتا ہے۔ مثلاً سورۂ یُونس آیت ۳ ؛ سورۂ فرقان آیت ۶۰ وغیرہ۔ آسمانوں کی تعداد جو ان آیتوں میں مذکور نہیں سورۂ بقرہ آیت ۲۷ وغیرہ میں دی گئی ہے۔ ۷، ۱۴ اور ۲۸ کے اعداد حروفی مذہب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ؛

بر سرِ ہر ذرّہ مستولیست باسمی[1] چون بشناسی رسی بمنزلِ مُرادات
ہر چہ کہ گویم فقیہہ گوید ہے ہے ہر چہ کہ گوید فقیہہ گویم ہیہات
ہر کہ شرابِ خدا ز جامِ محمّد نوش کند وارہد زعشوہ و طامات[2]
نعرۂ مستی مزن کہ مستِ ہوائی غایت عمیا بود بجہل مباہات
قاسمی و صحبتِ فقیہہِ مقلّد،
فاتحہ خوانیم بہرِ دفعِ بلیّات

ہر چند اس غزل میں حروفی اثر کی علامات کے بارے میں مغالطے کا کوئی امکان نہیں لیکن محض اس قسم کی شہادت سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ قاسم الانوار واقعی اس فرقے کا ایک رکن تھا۔ گو فضل اللہ استرابادی کے ایک مسلّم مرید کے ساتھ اس کی وابستگی اور اس کی بنا پر جو شبہات اس پر کیے گئے[3] اس قیاس کی شدید تائید کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قاسم الانوار کے ولی اور ممدوح کئی تھے۔ اور ہمیں اسکے کلام میں الغزالی کے سے علمائے دین، شیخ احمدِ جام، بایزید بسطامی اور خواجہ عبد اللہ انصاری کے سے صوفیار اور شیخ فریدالدّین عطّار اور مولانا جلال الدین کے سے عارفانہ شعرار کی مدح سرائیاں نظر آتی ہیں۔ ان آخری دو شاعروں کے

---

[1] عقیدۂ ہمہ اوست کی تاویل حروفی لوگ مخصوصاً اس شکل میں کرتے ہیں؛ [2] ایک نسخے میں "زعشوہ و طامات" کی جگہ "زعشق طامات" ہے میرے خیال میں اس شعر میں شاعر نے اس اعتراض کو بیان کیا ہے جو شریعت کی نظر میں متصوّفین کی شرع بیزاری پر وارد ہوتا ہے۔ اس سے اگلے شعر میں شرع پرستوں سے شاعر کی نفرت کا اظہار ہے؛ [3] دیکھو اوپر صد ۵۰۴؛

کلیات کے بارے میں وُہ اپنے قارئین سے کہتا ہے کہ انہیں یکجا ایک جلد میں مجلد کر دو ؂

دوئی بگذار و دریک جلد کُن جمع
همه اقوالِ مولانا و عطّار

قرینِ قیاس ہے کہ اس کی نصف ترکی غزلوں میں سے ایک غزل میں جس کی ردیف "چلیبی بزی اُنتما" (”اے چلیبی نہ بھولیو ہم کو!“) ہے اسکا خطاب ”چلیبی آفندی“ سے ہے۔ جو ایشیائی ترکی کے شہر قونیہ کے درویشانِ مَولوی کا موروثی پیشوا تھا۔ یہ ترکی یا نصف ترکی نظمیں صرف دو یا تین ہیں اور کچھ اعلےٰ پائے کی بھی نہیں۔ فارسی کی کسی مقامی (غالبًا گیلان کی) بولی کی نظمیں تعداد میں زیادہ ہیں اور زیادہ دلچسپ ہیں۔ گو ان مقامی بولیوں کی ازمنۂ وسطیٰ کی شکلوں کے متعلق ہمارا علم بالعموم اتنا ناکافی ہے کہ ہم اس کی مدد سے ان نظموں کی پوری پوری تشریح کرنے سے قاصر ہیں۔ نمونے کے طور پر ان میں سے ایک غزل کا متن جو دو نسخوں پر مبنی ہے یہاں پیش کیا جاتا ہے ؂

(۵)

قبلۂ جانِ من توُئی گیلِ[1] فرشتہ رنگ و بوی
ماہِ سپہرِ مکرمت سروِ ریاضِ آرزو
گیل نۂ فرشتۂ وز دل و جان سرشتۂ

---

[1] حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھیں؛

گیل کہ بو کہ بوا چنین حوروش و فرشتہ خُو
می دل و دین تنی فدی خوا بیرا کہ وس خوشی
قبلہ توئی کجا روم شہر بشہر دکو بکُو
تی سرِ زلفِ مُشکبو آنچہ بمن کدن زجور
شرح دہم اگر بود با تو مجال مو بمو
آینہ را اگر رسد عکسِ جمالِ تو دمی
کے رسد آنکہ باشدش با تو ہمیشہ روبرو
دوش بغمزہ گفتیم روز نما ترا بغم
نوبتِ دیگر از کرم قصّۂ دوش بازگو
گفتمش اے مرادِ جان وعدۂ وصل کردۂ
گفت کہ آن حکایتا وا مطلب کہ آن بشو
گفتمش ای عزیزِ من خوار شدم زعشقِ تو
گفت کہ نانہ خوار بین کا ورمیرہ لاوہ لو
گفتمش عاشقِ توام چیست دوای دردِ من
گفت تو گوئی این سخن بی تو دوا بسر نشو

(حاشیہ صفحہ ۶۷۷) یہ لفظ بحرِ خزر کے ساحلی صوبہ گیلان کے باشندے کے لئے آتا ہے۔ رضاقلی خان اپنی فرہنگِ انجمن آرای ناصری میں کہتا ہے (دیکھو لفظ گیل) کہ اسکا تلفظ گَیل بھی ہے اور اس کے ثبوت میں وہ قاسم الانوار کی رُباعی پیش کرتا ہے جس میں اس لفظ کا قافیہ مَیل کے ساتھ باندھا گیا ہے ؛

قاسمی از فراق و غم گم شد و بے خبر ز خود
گم شدۂ فراق را از کرم تو وا د جو

اس کی تصدیق کہ قاسم الانوار گیلان اور اس کے علاوہ بحرِ خزر کے دُوسرے ساحلی علاقوں سے اچھی طرح واقف تھا اس کی دُوسری نظموں سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں وہ آستارا، لاہیجان، اردبیل اور ایران کے اس حصّے کے دوسرے مقامات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے کلام کا بغور معائنہ کرنے سے بیشک اس کے متعلق مزید اطلاعات اخذ کی جاسکتی ہیں لیکن جگہ کی گنجائش مجھ کو صرف اتنی اجازت دیتی ہے کہ اس کی مثنوی انیس العارفین سے دو اقتباس پیش کروں۔ اس مثنوی کے منثور دیباچے میں وُہ اپنا پُورا نام علی ابن نصیر ہارون ابن ابوالقاسم الحسینی التبریزی المعروف بہ قاسمی لکھتا ہے۔ پہلا اقتباس گنہگار کی ایک تمثیلی حکایت ہے جو اپنے گناہ سے اس لئے چمٹا رہتا ہے کہ گناہ اس کے لئے شیریں ہے ؎

(۶)

بود زنگی زادۂ بے دین و داد غولِ غفلت دادہ عمرش را بباد
داشت در خُم چند من دوشاب دُرد از قضا موشی دران افتاد و مُرد
موش را بگرفت و بیرون کرد زود موش مشئوم از حریصی مُردہ بود
نزد قاضی رفت زنگی با ملال موش را بگرفت و گفت از سوءِ حال
کرد بر دو شاب او حکمِ حرام مرد قاضی درمیانِ خاص و عام
این سخن نشنید زنگی سقط گفت قاضی را کہ کردی بس غلط

من چشیدم بود شیرینم بکام / چون بود شیرین چرا باشد حرام
گر شدی دو شابِ من تلخ آنگهی / من حرامش گفتمی بی شبہۂ
بود طبع زنگی وارون پلید / لاجرم در تلخ وشیرین عکس دید
ای چو روی زنگیان رویت سیاہ / تلخت آید طاعت وشیرین گناہ
نفس را باطل بود شیرین بکام / تلخ باشد حق ولی بر طبعِ عام
چونکہ رنجورند و صفرائی مزاج / یابد از شکر دہانشان طعم زاج
جملہ دلِ بیمارِ دنیا سربسر / زرد روی از آرزوی سیم وزر
اے بدامِ لذتِ دُنیا اسیر / ہمچو موش از حرص شیرینی ممیر
طاعتِ حق گرچہ تلخ آید ترا / داروی تلخست دردت را دوا
تلخ دارد نفع آید عاقبت / خستہ را بخشد شفا و عافیت

دوسرا اقتباس زیادہ دلچسپی کا حامل ہے۔کیونکہ اس میں صفویّوں کے مورث شیخ صفیّ الدّین (جس کے نام سے اس شاہی خاندان کا نام مستخرج ہے) اور شیخ سعدی شیرازی کی ایک ملاقات کا واقعہ بیان ہوا ہے۔اس ملاقات کی یا کم سے کم اس کے امکان کی کچھ جداگانہ تصدیق مذکورۂ سابق کتاب "سلسلۃ النّسب الصفویۃ"[1] سے ہوتی ہے۔اس میں صفیّ الدین کی تاریخِ ولادت "خلفائے عبّاسیہ کے آخری ایام میں ۶۵۰ھ" (مطابق ۳-۱۲۵۲ء) دی گئی ہے اور ساتھ ہی مصنّف لکھتا ہے کہ اس وقت شمس تبریز کو فوت ہوئے پانچ سال، شیخ محیّ الدین ابن العربی کو بارہ سال اور شیخ نجم الدین

[1] دیکھو اوپر ص ۶۷۱۔ متعلقہ عبارت اس نسخے کے ورق ۹ب پر درج ہے؛

کبریٰ کو بتّیس سال ہو چکے تھے۔ اور ممتاز معاصر اولیار اور شعرار میں سے مولانا جلال الدین رُومی کی وفات اس وقت ہوئی جب شیخ صفیؔ الدّین کی عُمر بائیس سال تھی اور شیخ سعدؔی کے انتقال کے وقت وہ چالیس سال کا ہو چکا تھا۔ امیر عبد اللہ شیرازی، شیخ نجیب الدین بُزغُوشی۔ علار الدّین سمنانی اور محمودِ شبستریؒ بھی صفی الدّین کے معاصروں میں سے تھے۔ ایک دو صفحے آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ کیونکر صفی الدّین صاحبِ مذکور شیخ نجیب الدین بُزغوشی کے ارشاد و ہدایت سے مستفیض ہونے کے لئے شیراز گیا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہُوا کہ یہ مقدس شخص فوت ہو چکا ہے۔ بلاشُبہ یہی موقع ہے جس کی طرف انیس العارفین کے اقتباس ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے ۔۔

شیخِ عالم آفتابِ اولیار ۔۔۔ پیشوائے دین صفیؔ الاصفیا
آنکہ از وی گشت مشہور اردویل ۔۔۔ وز جمالش گشت پُر نُور اردویل
دل نوازِ طالبانِ جان گداز ۔۔۔ واقفِ اسرارِ شاہِ بی نیازؒ[۲]
چون بشہر شہرۂ شیراز شد ۔۔۔ شیخ سعدی شیخ را دمساز شد
شیخ را پرسید مردِ خردہ دان ۔۔۔ کای منوّر از جمالت جسم وجان
در بیابانِ طلب مقصود چیست ۔۔۔ این ہمہ دردِ دلِ محدود چیست
از کمالِ ہمتِ خود پاک باز ۔۔۔ قصۂ با شیخ سعدی گفت باز

لہ دیکھو اوپر صفحہ ۲۱۶ تا صفحہ ۲۲۲؛ متعلقہ عبارت اسی نسخے کے ورق ۹ء پر درج ہے؛

۲ نسخے میں "شہ محبت نیاز" لکھا ہے۔ میں نے ترمیم کی جرأت کی ہے؛

چون شنید این قصّہ سرگردان بماند | وز کمالِ ہمّتش حیران بماند
شیخ را گفت ای بمعنی بہرہ مند | وز کمالِ ہمّتِ خود سربلند
آن مقامی را کہ فرمودی نشان | مُرغِ سعدی را نبودست آشیان
دردلم شد زین سخن دردی مقیم | عاجزم در سرِّ این معنی عظیم
لیکن ار گوئی من از دیوانِ خویش | گوہری چندی دہم از کانِ خویش
در جوابش گفت شیخ از عینِ درد | جانِ ما از غیر جانان است فرد
در دل از دیوانِ حق دارم بسے | نیستم پروای دیوانِ کسے
ما بدردِ او تولّا کردہ ایم | وز جہان و جان تبرّا کردہ ایم
دل بدردِ دلبری دیوانہ شد | وز خیالِ غیرِ او بیگانہ شد
شیخ سعدی زین سخن بگریست زار | شیخ را گفت ای بزرگِ کامکار
گوی دولت را بچوگانِ طلب | بُردۂ در حالِ میدانِ طلب

داری الحق ملکتِ بی منتہا
یرلحش اللّٰہُ یھدی من یشا

اس قطعے سے جو شاید ہی اس قابل ہے کہ اس کا پورا ترجمہ کیا جائے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شیخ صفیّ الدّین جس کی ناموری نے اردبیل (یا اردویل) کو مشہور کر دیا تھا قیامِ شیراز کے دوران میں شیخ بزرگ سعدیؒ کا شناسا ہو گیا۔ سعدی اس کے تقدّس اور اجتہاد سے ایسے متاثّر ہوئے کہ اُنہوں نے اپنے دیوان میں اس کی مدح کے کچھ قصائد اضافہ کرنیکا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اس پیشکش کو صفیّ الدین نے اس بنا پر قبول نہ کیا کہ اسے

"جاناں" ہی سے کب فرصت ملتی ہے۔ کہ کسی اَور چیز سے واسطہ رکھے۔ اس انکار نے ظاہر ہے کہ بچارے شیخ سعدیؒ کو بہت آزردہ کر دیا۔ اور وہ شیخ (صفی الدین) کے بلند مقاصد کو عقیدت کا خراج ادا کرتے ہوئے زار زار رونے لگے ؂

شاہ نعمت اللہ اور قاسم الانوار اگرچہ بہت غیر معمولی شاعر نہیں تھے۔ کم سے کم ایک خصوصیت اور انفرادیت کے مالک ضرور تھے۔ ان دونوں اور جامیِ بزرگ کے درمیان (جن پر آکر اس دَور کی ادبی صلاحیت اپنے معراج پر پہنچی) متعدد معمولی شاعر آتے ہیں جن میں سے انتخاب کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی چھ یا اس سے زیادہ ایک مختصر تذکرے کے ضرور مستحق ہیں۔ بالعموم ان کی زندگیوں اور ذاتی خصوصیات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں گو ان میں اکثر اس عہد کے متعدد تذکروں میں مذکور ہیں سہولت کے لئے بہترین صُورت یہی ہوگی کہ یہاں ان کی وفات کی تاریخوں کے مطابق زمانوی ترتیب سے انہیں مرتب کیا جائے ؂

(۳) کاتبی نیشاپوری

کاتبی نیشاپوری

کاتبی نیشاپوری (یا ترشیزی) جو ۸۳۸ھ (۵-۱۴۳۴ء) میں فوت ہوا زمانوی تسلسل اور غالباً فضیلت میں بھی سب سے پہلے آتا ہے۔ میر علی شیر نوائی نے اپنی مجالس النفائس میں اسے ان شعرار کی صف میں رکھا ہے جو اس کے عہد میں زندہ تھے۔ لیکن جن سے کبھی اسے شرفِ ملاقات نصیب نہ ہوا۔ اس کے متعلق لکھتا ہے:-

اس کے بارے میں میر علی شیر کی رائے

"اپنے زمانے میں بےنظیر تھا۔ اور جس کسی صنفِ سخن میں اس نے طبع آزمائی کی۔ اس میں خصوصاً قصیدوں میں اس نے حیرت انگیز معانی ادا کئے نئی نئی صنعتیں بھی ایجاد کیں جو کاملاً کامیاب رہیں۔ یہی حال اس کی مثنویوں مثلاً "حسن وعشق"۔ "ناظر ومنظور"۔ "بہرام و گلندام"۔ وغیرہ کا ہے جو صنعتِ ذوالبحرین صنعت ذوالقافیتین اور مختلف قسم کی رعایاتِ لفظی کی مثالیں پیش کرتی ہیں[1]۔ لیکن اس کا غزلوں اور قصیدوں کا دیوان زیادہ مشہور اور بہتر ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں اس نے خمسہ کے تتبع پر قلم اٹھایا۔ اور اس کے متعلق اس نے بڑھ بڑھ کر دعوے کئے۔ غالباً اسی لئے وہ اس کی تکمیل میں ناکام رہا۔ میری حقیر رائے میں اس کی شاعرانہ قابلیت ایسی تھی کہ اگر

---

[1] لیکن دولتشاہ کی روایت میں یہ الگ نظمیں تھیں جن کے عنوان "مجمع البحرین"۔ "ذوالقافیتین" اور "دہ نامۂ تجنیسات" تھے؛

اسے کسی ایسے فرمانروا کی تربیت نصیب ہوتی جو ہمارے پادشاہِ بلند اقبال کی طرح اچھے شعر کا قدردان ہوتا۔ اور اس کیساتھ ہی اس شاعر کی زندگی بھی زیادہ عرصہ قائم رہتی تو وہ اپنے رشحات سے سب کے دلوں کو تسخیر کر لیتا۔ لیکن اپنی بدنصیبی کے باعث اس نے ان دونوں بادشاہوں میں سے جن کا یہاں ذکر ہے کسی کا زمانہ بھی نہ دیکھا۔ اور اس سے پہلے ہی دُنیا سے رُخصت ہوگیا"۔

اس کے بعد میر علی شیر اس کی ایک غزل اور ایک قصیدے میں سے ایک ایک شعر اور آخر میں ذیل کے دو شعر نقل کرتا ہے جو خواند امیر نے اِس بیان کی شہادت میں[1] پیش کئے ہیں کہ کاتبی استراباد کی وبائے طاعون میں فوت ہوا[2] [3]

زآتشِ قہرِ وبا گردید ناگاہان خراب
استرابادی کہ خاکش بود خوشبوتر زمُشک
اندرواز پیرو برنا ہیچ کس باقی نماند
آتش اندر بیشہ چون اُفتد نہ تر ماند و نہ خُشک

---

[1] پروفیسر براؤن کا یہ کہنا کہ خواند امیر نے اس بیان کی شہادت میں یہ شعر پیش کئے ہیں حقیقت سے تجاوز کرنا ہے۔ حبیب السیر میں صرف اتنا لکھا ہے کہ کاتبی نے نزع کے عالم میں یہ شعر کہے (مترجم)؛

[2] حبیب السیر۔ جلد سوم۔ جزو سوم۔ ص ۱۴۹؛

[3] یہ شعر دولت شاہ نے بھی دئے ہیں (میری ایڈیشن ص ۳۸۹ تا ص ۳۹۰) جو صرف اتنا کہتا ہے کہ "در وبا و حدّت طاعون این قطعہ فرمود"؛

دولتشاہ نے اپنے تذکرۃ الشعرأ[1] میں کاتبی پر دس صفحے نقل کیے ہیں۔ بقول اس کے وہ ترشیز اور نیشاپور کے درمیان ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اسی لئے کبھی اسے ترشیزی کہتے ہیں اور کبھی نیشاپوری۔ اس نے خطّاطی کا فن ایک شاعر سیمی[2] سے سیکھا۔ جو بعد میں اس سے حسد کرنے لگا۔ چنانچہ یہ نیشاپور چھوڑ کر ہرات چلا آیا۔ یہاں کے دربار میں اس کے جوہر کی قدر نہ ہوئی تو استرآباد اور پھر شیروان چلا گیا۔ وہاں کچھ عرصہ امیر شیخ ابراہیم کی سرپرستی میں رہا۔ جس سے اس نے انعام میں بڑی بڑی رقمیں وصُول کیں لیکن قلیل مدت میں اُڑا دیں۔ چنانچہ قلاشی تک نوبت پہنچی جس کا نقشہ اشعارِ ذیل میں کھینچتا ہے ؎

مطبخی را دی طلب کردم کہ بغرائی بپزد
تا شود زآن آش کارِ ما و مہمان ساختہ
گفت لحم و دُنبہ گر یابم کہ خواہد داد آرد
گفتم آنکو آسیای چرخ گردان ساختہ

اس کے بعد کاتبی نے آذربائجان کا رُخ کیا۔ اور ترکمان حکمران اسکندر ابن قرا یوسف کی شان میں ایک قصیدہ لکھا۔ جب اس سلطان نے نہ اس کی کوشش کی قدر کی اور نہ اس کا صلہ دیا تو کاتبی نے ایک قطعے میں اس کی بڑی فحش ہجو کی اور اصفہان کا قصد کیا۔ وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] میری ایڈیشن ص۳۸۱ تا ص۳۹۱؛

[2] سیمی کی سوانحعمری دولتشاہ نے دی ہے۔ ص۴۱۲ تا ص۴۱۷؛

خواجہ صائن الدّین تُرکہ کے ارشاد و ہدایت سے اس نے ایک طرح کا تبدیلِ مشرب کیا۔ یعنی سلاطین کی خوشامد اور درباروں کی حضوری سے کنارہ کیا اور صُوفیوں کا اندازِ نظر اختیار کیا۔ دولت شاہ نے اس کی ایک نظم نقل کی ہے[1] (جو دو مزید اشعار کیساتھ میرے ایک قلمی نسخے میں بھی درج ہے) جو شاعر کے تغیّرِ قلبی کو منعکس کرتی ہے۔ لیکن یہ نظم ادبی حسن کے لحاظ سے اتنی جالبِ توجّہ نہیں جتنی شاعر کے تقدّس اور تقویٰ کے سبب سے۔ اصفہان سے وہ رشت چلا گیا۔ اور وہاں سے وہ دوبارہ استرآباد۔ جہاں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اُس نے وفات پائی ؛

مولانا جامیؔ جو دولتشاہ سے بہتر مبصّر ہیں کاتبی کی تعریف میں زیادہ محتاط ہیں۔ اپنی بہارستان کے روضۂ ہفتم میں اس کے متعلق لکھتے ہیں" وی را معانی خاص بسیار است و در ادای آن معانی نیز اسلوب خاص دارد اما شعر وی یکدست و ہموار نیست" جہاں تک مجھے معلوم ہے اسکا دیوان اب تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ میرے پاس اس کا ایک عمدہ نسخہ مؤرخہ سنہ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) ہے۔ جس میں غزلیں رُباعیات اور قطعات ملا کر کل تقریباً تین ہزار اشعار ہیں۔ حسبِ معمول شاعر کے شخصی حالات سب سے زیادہ قطعات میں ملتے ہیں۔ لہٰذا سیرت کے نقطۂ نظر سے زیادہ دلچسپ بھی یہی ہیں۔ گو بدقسمتی یہ ہے کہ جن اشخاص اور حالات کی طرف وُہ اشارہ کرتا ہے اُن کو نہ جانتے ہوئے ہمارے لئے پورا مفہوم سمجھنا ناممکن ہوجاتا

---

[1] میری ایڈیشن صہ ۳۸۴ ؛

ہے۔ ان قطعات میں سے میرے نسخے میں ۱۰۵ داخل ہیں (ورق ۱۰۴ اب تا ۱۱۵ ب)، ان میں اکثر صرف دو شعروں پر مشتمل ہیں۔ صرف دو قطعوں کی تاریخ صحیح طور پر معیّن ہو سکتی ہے۔ پہلے میں منوچہر کی ہلاکت کا ذکر ہے جو ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں واقع ہوئی۔ اور دُوسرے میں میر عادل شاہ کی موت کا مذکور ہے جو ۸۲۷ھ (۱۴۲۴ء) کا واقعہ ہے۔ قطعاتِ ذیل اس خیال سے منتخب کئے گئے ہیں کہ ان میں دلچسپی کے بعض خاص پہلو نظر آتے ہیں۔ ان میں پہلا قطعہ اپنے خوش فکرانہ قافیے اور صنعتِ تکرارِ سرحرف کے سبب قابلِ توجہ ہے ؎

ای دل ار خواہی کہ باشی در رہِ عزّت سوار
اسپِ ہمّت را بمیدانِ قناعت تاز تیز
تا شود واقف دلت از سرِّ ہر کاری کہ ہست
نقد ہستی سر بسر در پائے اہلِ راز ریز
گر شود کم جوہرِ جانت چو بیزی خاکِ فقر
مگذران زین رہگذر بر دل غبار و باز بیز
در بحق دانستۂ جای نشست و خاست را
خواہ در ارمن نشین و خواہ در ابخاز خیز

تاز تیز، راز ریز، باز بیز اور ابخاز خیز کی تکرارِ سرحرف بہت خوش فکرانہ ہے۔ گو یوں اشعار میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات نہیں۔ ذیل کے قطعے میں ہو سکتا ہے کہ اشارہ خود سلمان ساوجی کی طرف ہو۔ یا ممکن ہے

[1] ملاحظہ ہو اوپر ص ۳۸۰ تا ص ۳۹۲؛

کاتبی کے ہمعصر عارفی ہروی کی طرف ہو جیسا کہ میر علی شیر مجالس النفائس میں ہمیں بتاتا ہے۔ اس کے مدّاح "سلمانِ ثانی" کہتے تھے ؎

آن قوم کہ در دعویٰ از جانبِ سلمانند
در معرضِ شعرِ من از بہرِ چہ می آیند
شعرِ منِ روشن دل آنگہ سخنِ سلمان
من ہیچ نمی گویم مردم ہمہ بینایند

ذیل کے ہجائیہ قطعے میں جس کمال کا حوالہ ہے ممکن ہے کمال خجندی ہو۔ لیکن اغلب ہے کہ یہ کاتبی کا ہمعصر کمال الدین غیاث الفارسی الشیرازی[1] ہے۔ اور خسرو اور حسن غالباً دہلی کے دو مشہور شاعر ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے[2] ؎

گر حسن معنی ز خسرو بُرد نتوان کرد منع
زانکہ استاد ست خسرو بلکہ ز استادان زیاد
وز معانیٔ حسن را بُرد از دیوان کمال
ہیچ نتوان گفتن اورا دزد بر دزد اوفتاد

ذیل کے دو پر لطف طنزیہ قطعے بدرؔ نام ایک معاصر شاعر کو خطاب کر کے کہے گئے ہیں۔ اور ہمیں اس بات کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ کاتبی اپنے ہم فنوں میں نامحبوب کیوں تھا۔ دولت شاہ نے بدر پر ایک مختصر مقالہ وقف

---

[1] ملاحظہ ہو دولتشاہ۔ میری ایڈیشن۔ ص۴۱۴ تا ص۴۲۰؛

[2] ملاحظہ ہو اوپر ص۱۷۵ تا ص۱۸۱؛

کیا ہے[1]۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ سالہا یہ شاعر شیروان میں "سرآمدِ طائفہ شعرا" رہا۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کاتبی بھی اس شہر میں کچھ مدت مقیم رہا۔ دولت شاہ ذیل کے دو قطعوں میں سے پہلا اُن ادبی معارضات کے نمونے کے طور پر دیتا ہے جو ان دو شاعروں کے درمیان واقع ہوئے۔ اور اضافہ کرتا ہے کہ گو بعض سخن شناس بدر کی شاعری کو کاتبی کے کلام پر ترجیح دیتے ہیں لیکن اہلِ سمرقند کا اعتقاد برعکس ہے ؎

لقب کاتبی دارم ای بدر امّا محمد رسید اسم از آسمانم
محمد مرا نام گشت و تو بدری بانگشت آن[2] تو از ہم درانم

دی بدرکِ بدرگ راگفتم کہ نہ شاعر
آنکز شعرا باشد انگیختنش باید
گفتا کہ بہر شہری آویختہ ام[3] شعری
شعر آنکہ چنان گوید آویختنش باید

دُوسری طرف ذیل کے قطعے میں ابو اسحاق (بسحاق) شیرازی[4] کے

---

[1] میری ایڈیشن ص۳۷۷ تا ص۳۷۸؛

[2] دولت شاہ کے ہاں اس مصرعے کی شکل مختلف اور بہتر ہے ؏

بانگشت سبّابہ ات بر درانم

[3] غالباً اس عام عقیدے کی تلمیح ہے کہ عربی کے معلّقات کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ قصائد کعبہ یا مکّہ کے دروازے پر معلّق کئے گئے تھے۔ بدر کی مراد ہے کہ ہر شہر میں میرا ایک شعر معلّق ہے؛

[4] دیکھو اوپر ص۴۶۶ تا ص۴۷۶؛

اس کمال کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے جو اس نے دیوانِ اطعمہ کی مطبخی نظموں میں دکھایا ہے ؎

شیخ بُسحاق دامَ نعمتہٗ گرم پخت او خیالِ اطعمہ را
سفرۂ او فگند از نعمت ہست بر خوانِ او صلا ہمہ را

ذیل کا قطعہ جس میں شمسِ علا نامی ایک شاعر کی ہجو ہے عبید زاکانی[۱] کی ایک مشہور نظم کے تتبع میں لکھا گیا ہے بلکہ اس میں عبید کی اس نظم کی کچھ جزوی تعریف بھی ہے ؎

رفت آخر از جہان شمسِ علا آنکہ گہ گہ در شماری آمدی
او برفت و ماند از و دیوانِ شعر ہم نماندی گر بکاری آمدی

قطعۂ ذیل میں مذکورہ بالا شاعر سیمی[۲] پر جس نے اسے خطّاطی سکھائی سرقے کا الزام لگاتا ہے ؎

میانِ شہرِ نیشاپور سیمی چو اشعارِ ملیحِ کاتبی دید
بمشہد رفت و بر نامِ خودش بست نمک خورد و نمکدان را بدزدید

---

۱ رک بہ ص ۳۲۲ تا ص ۳۲۷ بالا؛ ۲ دولتشاہ (ص ۴۱۲ تا ص ۴۱۷) اس پہ ایک مقالہ وقف کرتا ہے۔ جس میں وہ ذکر کرتا ہے کہ سیمی نے نیشاپور سے مشہد کو ہجرت کی۔ علاوہ ایک قابلِ ذکر کاتب شاعر اور معمّا نویس ہونے کے وہ ملمع سازی، طلاکاری اور ان تمام صنعتوں میں جو فنِ کتاب سازی سے تعلّق رکھتی ہیں بڑی مہارت رکھتا تھا اور یہ فنون دُوسروں کو سکھاتا تھا۔ منقول ہے کہ اس نے ایک رات میں تین ہزار اشعار نظم کیے۔ اس کی بھوک اس بلا کی تھی کہ ایک مرتبہ بارہ من طعام و میوہ کھا گیا۔ اور بغیر ثقل پیدا کیے وہ بارہ من ہضم بھی ہو گئے؛

مندرجہ ذیل قطعے میں سرقہ کرنیوالوں کی ایک اَور مذمت ہے ؎

شاعر نباشد آنکو ہنگامِ بیت گُفتن
ز اشعار اوستادان آرد خیال درہم
ہر خانہ کہ اورا از خشتِ کہنہ سازند
مانند خانۂ نو نبود بناش محکم

یہاں اپنے ممدوح بادشاہ سے مخاطب ہو کر حُسنِ طلب سے کام لیتا ہے کہ دیکھنا! دعوتِ مَے میں مُجھ کو شراب کا پورا حصّہ ملے ؎

خسروا آنی کہ از بہرِ وقارِ مہرِ تو
پُشتِ طاقِ لامکان چون گنبدِ گردون خمست
نعمت مانیست کم از جودِ بسیارت ولے
مَی کہ می آرند ہمچون عمرِ بدخواہت کمست

ذیل میں قلم پر ایک نکتہ آفرین قطعہ ہے ؎

فریاد ز دستِ خامۂ قیر اندود کو رازِ دلم بدشمن و دوست نمود
گفتم کہ زبانش بہُبرم گُنگ شود ببریدم از آن فصیح تر گشت کہ بود

اسکے ہاں دیگر مقامات مثلاً ساری (واقع مازندران) کے حوالے ملتے ہیں۔ اور دوسرے اشخاص مثلاً خواجہ نظام، عبد الرحمٰن، امین (شاعر) اور شاپور، جمشید اور اردشیر کے حوالے ہیں۔ ان اشخاص کی مَیں تعین نہیں کر سکا۔ آخری تین شاید زرتشتی تھے۔ کیونکہ ان تینوں میں پہلے دو کا ذکر شراب کے سلسلے میں آیا ہے[1]۔ آخری یعنی اردشیر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ

[1] حاشیہ سامنے کے صفحے پر دیکھیں؛

شیروان کے خلاف ایک باغی تھا - اور جب شاہ شیروان نے اس پر غلبہ پالیا تو اس تامل میں پڑگیا کہ اسے مار ڈالوں یا اندھا کرا دوں - شاعر نے اشعارِ ذیل میں دُوسرے طریق عمل کی صلاح دی ہے ؎

شاہا مکش اردشیر سرگردانرا — ہرچند شکست پایۂ شروانرا
گفتی کُشمس یا کشمش میل بچشم — کُشتن نہ نکوست کور کن شیطانرا

(۴) عارِفی ہروی

اگلا شاعر جس پر کچھ کہنا ضروری ہے عارفی ہروی ہے - اس کی سب سے زیادہ معروف تصنیف صوفیانہ اور مجازی مثنوی ہے جس کا اصل عنوان "حال نامہ" ہے - لیکن زیادہ عام طور پر اپنے موضوع کی نسبت سے "گوی و چوگان" کے نام سے معروف ہے۔

عارفی ہروی

یہ مثنوی ۸۴۲ھ (۹-۱۴۳۸ء) میں پندرہ روز کی مدت میں لکھی گئی - اور مصنّف کو اپنے شاہی محسن سے اس کے صلے میں ایک گھوڑا اور ہزار دینار ملے - خود اسکے اپنے بیان کی رو سے اس وقت وہ پچاس سال سے اوپر کا ہوچکا تھا - پس ضرور ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) کے لگ بھگ پیدا ہوا ہوگا

(حاشیہ ص۶۹۲) پروفیسر براؤن کا یہ قیاس غالبًا اس بات پر مبنی ہے کہ اسلام کے آنیکے بعد ایران میں شرابخانوں کا بندوبست بالعموم زرتشتیوں کے ہاتھ میں رہا؛ (مترجم)

لہ ملاحظہ ہو ریو کی فہرست مخطوطات فارسی ص۶۳۹ تا ص۶۴۰ اور ضمیمۂ فہرست ص۱۸۵؛

جو خواجہ حافظ کا سنِ وفات ہے۔ خود اس کی اپنی وفات ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ۸۵۳ھ (۱۴۴۹ع) میں واقع ہوئی ؎

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے[1] وہ اپنے ثنا خوانوں میں "سلمانِ ثانی" کہلاتا تھا اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ اس کا انداز سلمان ساوجی کے انداز سے مشابہ سمجھا جاتا تھا۔ اور کچھ جیسا کہ میر علی شیر نوائی مجالس النفائس میں ہمیں بتاتا ہے یہ کہ دونوں شاعروں کی آنکھیں کمزور اور متورّم تھیں۔ عارفی کے اس مرض کا ثبوت ہمیں شعرِ ذیل سے ملتا ہے ؎

بر پلکِ سُرخِ دیدۂ من داروی سفید

باشد بعینہٖ نمکِ سودہ بر کباب

ہر چند (سوائے عہدِ جدید کے مصنف رضا قلی خان کے جس کی مجمع الفصحا میں عارفی کا مذکور نہیں ہے) تمام اربابِ تذکرہ عارفی کا ذکر کرتے ہیں لیکن جو اطلاعات وہ اس کے بارے میں دیتے ہیں بہت ناکافی ہیں۔ اسکی مثنوی "حال نامہ" جس کے متعلق جامی لکھتے ہیں کہ "این نظم سر آمدِ وی ست" صرف کوئی پانچ سَو اشعار پر شامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ابھی طبع نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے کتاب خانۂ جامعۂ کیمبرج میں اس کے ایک دیدہ زیب اور خاصے اچھے نسخے کا جائزہ لیا ہے[2] جس کی تاریخِ کتابت ۹۵۲ھ (۱۵۴۶ع) ہے۔

---

[1] صفحہ ۶۸۹ بالا ؛

[2] Add. 3150 ۔ ملاحظہ ہو میری مرتّب کردہ "فہرست مخطوطاتِ فارسی" در کتاب خانۂ جامعۂ کیمبرج ۔ ص ۶-۳۶۵ ؛

لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑیگا کہ مجھے یہ نظم پُر آورد اور رُوکھی پھیکی معلوم ہوئی۔ اس کے قطعۂ ذیل میں شاہ کے اسپ چوگان بازی کی توصیف ہے۔ اس میں بعض وہ اشعار بھی شامل ہیں جو جامی اور میر علی شیر نے مثال کے طور پر دئے ہیں۔ اس لئے اسے مناسب نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے ؎

خورشید سریر، ماہ مسند — سلطان جہانیان محمدؐ[1]
شاہی کہ چو برگرفت چوگان — مہ گوئی شد و سپہر میدان
آن لحظہ کہ پا بزین در آورد — گرد از کرۂ زمین بر آورد
چون ابرش باد پا برانگیخت — گوئی کہ بباد آتش آمیخت
چوگانیٔ شہ کہ در تگاپوی — از توسن چرخ می بُرد گوی
در جستنش ار نہ سرکشیدی — بر کوی سپہر بر دویدی
ہر بار کہ در عرق شدی غرق — باران بودی و در میان برق
بگریختہ آذر از سمِ او — آویختہ صرصر از دُمِ او

تمام نظم چوگان بازی سے ماخوذ ان بدعت آمیز اور اکثر دُور از کار تشبیہوں اور استعاروں سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں بیشتر یورپی قارئین کو کچھ مزا نہیں ملتا اور تصنّع نظر آتا ہے۔ اور شاعر کی کوششوں کا ماحصل بمشکل اس قابل ہے کہ اس پر "شاعری" کا اطلاق اُن معنوں میں ہو سکے جن میں شاعری کو لیا جاتا ہے۔

---

[1] یعنی میرزا محمد ابن بایسنغر۔ دیکھو ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی بمقام مذکور؛

جن شعراء کی وفات نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں واقع ہوئی ان میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون کون اتنی وقعت کے مالک ہیں کہ ان کو کتابِ حاضر میں مستحقِ تذکرہ سمجھا جائے۔ حتّٰی کہ ہم ان میں سے آخری اور افضل ترین شاعر مولانا جامی پر آتے ہیں جن کا یہ حق مسلّم ہے کہ انہیں ایران کے ممتاز ترین شاعروں میں شمار کیا جائے۔ یہ بات کہ ان شاعروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہر اس شخص پر صریحاً آشکار ہو جائے گی۔ جو معاصر تذکرہ نویسوں کی طرف رجُوع کرے۔ چنانچہ دولت شاہ اپنے عصر کے کوئی بیس شاعروں کے مذکورات پیش کرتا ہے۔ ادھر میر علی شیر اپنی تصنیف مجالس النفایس (بزبانِ ترکی) کی مجلسِ اوّل میں چھیالیس شاعروں کا ذکر کرتا ہے۔ درحالیکہ یہ مجلس صرف ان شعراء سے بحث کرتی ہے جو مصنّف کے عہد میں زندہ تھے لیکن جن سے اُس کی کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ ان میں سے بعض شاعروں کے ناموں سے فارسی ادب کے متعلّمین کے کان مانوس ہیں۔ اکثر نے خوش ادا اشعار کہے۔ لیکن بہت کم ان میں سے فضیلت اور خوبی کے اس درجے پر پہنچے جو ان کے ناموں کو مٹنے سے بچا لیتا۔ تھوڑی بُہت شہرت جو ان کی قائم ہے وہ یوں کہ اُنھوں نے اپنے آپکو امراء اور سلاطین سے وابستہ کر لیا جو اپنے درباروں میں آنے جانے اور اُن کی تربیت سے فیض اُٹھانے والے علماء و ادباء کی تعداد و استعداد دونوں پر ناز کرتے تھے۔ دولت شاہ اشارۃً اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اکثر کسی ادنیٰ شاعر کے مختصر مذکور کو اپنے مربّی بادشاہ کے زیادہ مفصل حالات

لکھنے کا بہانہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ اپنے تذکرے میں وہ شاہ نعمت اللہ کا ذکر لکھتا ہے جو اگر بہ حیثیتِ شاعر نہیں تو بہ حیثیتِ صوفی یقیناً حقِ امتیاز رکھتے ہیں اور اس مذکور کے خاتمے میں وہ اُن برگزیدہ مشایخ، شعرا، اور صنّاعوں کا شمار کرنے لگتا ہے[1] جو شاہرخ کے دربار کی رونق بڑھاتے تھے۔ شعرا میں وہ شیخ آذری اسفراینی (المتوفی ۸۶۶ھ = ۲-۱۴۶۱ء)، بابا سودائی ابیوردی (متوفی ۸۵۳ھ = ۵۰-۱۴۴۹ء)، مولانا علی شہاب تُرشیزی، امیر شاہی سبزواری (متوفی ۸۵۷ھ = ۱۴۵۳ء)، کاتبی تُرشیزی (متوفی ۸۳۹ھ = ۶-۱۴۳۵ء) اور نسیمی کا ذکر کرتا ہے۔ جن کے متعلق وُہ لکھتا ہے کہ "ذکرِ تصانیف و دواوین این جماعت در ربعِ مسکون شہرت دارد"۔ آخر میں لکھتا ہے "امّا چہار ہنرمند در پای تخت شاہ رُخی بودہ اند کہ در ربعِ مسکون بروزگارِ خود نظیر نداشتہ اند، خواجہ عبد القادر مراغی، در علمِ ادوار و موسیقی و یوسف اندکانی، در خوانندگی و مطربی و استاد قوام الدّین در مہندسی و طرّاحی و معماری و مولانا خلیل مصوّر، کہ ثانیٔ مانی بودہ"۔ با این ہمہ ان شعراء کے اشعار جو بیشتر آج تک غیر مطبوع ہیں اور جن کے قلمی نسخے بھی کمیاب ہیں۔ غالبًا خود انکے اپنے زمانے میں بھی خراسان سے باہر بہت کم معروف تھے۔ ہمیں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھنا چاہیئے اگر ہم ان میں سے کسی شاعر کے شخصی حالات اور خصوصیات معیّن کر سکیں۔ مثلاً یہ کہ آذری شاہ نعمت اللہ کی زیارت کو گیا۔ اور صُوفی بن کر اُس نے بادشاہوں کی خوشامد کو خیر باد کہی۔ اور اُس نے

---

[1] میری ایڈیشن۔ ص ۳۴۰؛

ہندوستان کا سفر کیا[1] یا مثلاً یہ کہ شاہی سبزوار کے سربداری فرمانرواؤں کی اولاد میں سے تھا۔ اور یہ کہ وہ شیعہ تھا۔ جس کی بنا پر قاضی نور اللہ ابن سید شریف المرعشی الشوستری کی مجالس المومنین[2] میں اس پر ایک طویل ثنائیہ تذکرہ وقف کیا گیا ہے۔ دولت شاہ اپنے عادی مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے[3] "فضلا متفق اند کہ سوزِ خسرو و لطافتِ حسن و نازکیہای کمال وصفائی سخن حافظ در کلام امیر شاہی جمع است"۔ اس بات کا اظہار کہ شاہی اپنے آپکو کچھ معمولی آدمی نہ سمجھتا تھا۔ اس نے ذیل کے اشعار میں کیا ہے۔ یہ اشعار فی البدیہہ ایک موقع پر کہے گئے جب شاہی کو کسی امیر کے دربار میں اُس جگہ سے نیچی ایک جگہ دی گئی جس کا وہ اپنے تئیں مستحق سمجھتا تھا[4]۔

شاہا مدار چرخ فلک در ہزار سال چون من یگانۂ ننماید بصد ہنر
گر زیرِ دستِ ہر کس و ناکس نشانیم اینجا لطیفہ ایست بدانم من اینقدر
بحریست مجلسِ تو و در بحر بی خلاف لؤلؤ بزیر باشد و خاشاک بر زبر

جدّت آفرینی کی ایک نادر مثال قُدسی ہِردی کا شعرِ ذیل[5] بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں وہ اپنے دہن کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے اس کا چہرہ

---

[1] دولت شاہ۔ میری ایڈیشن۔ ص ۳۹۹ تا ص ۴۰۰؛

[2] سنہ ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) کے لگ بھگ لکھی گئی۔ دیکھو ریو کی فہرست مخطوطات فارسی ص ۳۳۷-۸؛

[3] دولت شاہ طبع راقم ص ۴۲۶؛

[4] ایضاً ص ۴۲۷؛

[5] میر علی شیر نے اپنی مجالس النفائس میں یہ شعر نقل کئے ہیں؛

مفلوج ہو جانے کے باعث رال بہتی رہتی ہے ؎

باوجود چنین دہن کہ مراست
شعر گویم کہ آب[1] از آن نچکد

اس قسم کی جدّت آفرینیاں زیرِ تذکرہ عہد و مقام کا خاص مابہ الامتیاز ہیں۔ لہٰذا توجہ کی مستحق ہیں۔ لیکن شاعری سے ہم جو کچھ مُراد لیتے ہیں وہ ان میں نہیں پایا جاتا۔ دولت شاہ کے ہاں سے ذیل کی عبارت تیموری درباروں کی کیفیت کا ایک عمدہ تصور بہم پہنچاتی ہے[2]:-

"امّا ولادتِ باسعادتِ شاہزادہ بایسنغر در شہور سنہ اثنی و ثمانمائہ بودہ جمالی داشت باکمال و اقبالی و دولتی مساعد و در ہُنر پروری و ہُنرمندی شہرۂ اقالیم شد و خط و شعر در روزگارِ او رواج یافت و ہُنرمندان و فضلا بآوازۂ او از اطراف و اکناف روی بخدمتش آوردند، گویند کہ چہل کاتب خوشنویس در کتاب خانۂ او بکتابت مشغول بودندی و مولانا جعفر تبریزی سرآمد کُتّاب بُودہ و ہُنرمندان را عنایتہا کردی و شعرا را دوست داشتی و در تجمّل کوشیدی و ندیمان و جلیسان باظرائف داشتی و از سلاطینِ روزگار بعد از خسرو پرویز[3] تجمل معاش نکردہ و شعر ترکی و فارسی رانیکو گفتی و فہیدی و بشش قلم خط

---

[1] آب کے معنی پانی ہوتے ہیں لیکن اس کے علاوہ چمک، لچک (فولادکی)، تابانی (جواہرات کی)، شان و شوکت وغیرہ کو بھی آب کہتے ہیں؛

[2] میری ایڈیشن ص ۳۵۰-۱؛

[3] ساسانی بادشاہ جو آنحضرت (صلعم) کا معاصر تھا (ساتویں صدی عیسوی)؛

نوشتی و این تخلص میرزا بایسنغر راست - بیت

گدای کوئے تو شد بایسنغر
گدای کوی خوبان پادشاہست

حکایت کنند کہ خواجہ یُوسف اندکانی بروزگار سلطان بایسنغر در گویندگی و مطربی در ہفت اقلیم نظیر نداشت، لحنِ داوُدئ خواجہ یوسف دل را می خراشید و آہنگِ خسروانیؔ[1] او بر جگرہای مجروح نمک می پاشید۔ سلطان ابراہیم ابنِ شاہرخ از شیراز چند نوبت خواجہ یوسف را از بایسنغر سلطان طلب کرد، او مضایقہ کرد، آخرالامر صد ہزار دینار نقد فرستاد کہ خواجہ یوسف را میرزا بایسنغر برای او بفرستد، سلطان بایسنغر این بیت بجواب برادر فرستاد بیت

ما یوسفِ خود نمی فروشیم
تو سیم سیاہ خود نگہ دار

و در میان الغ بیگ گورگان و بایسنغر بہادر و ابراہیم سلطان لطیفہ ہا و مکاتبات بسیار واقع شدہ کہ این تذکرہ تحمّل ایراد آن لطایف نمی کند۔ امّا روزگار غدار و گردون ستمکار در آوانِ شباب قصد آن شاہ کامکار نمود و مؤکّلان قضا و قدر بر جوانئ او نبخشودند و شبی از افراطِ شراب بفرمان ربّ الارباب بخواب گردان فنا گرفتار شد و سکنۂ ہرات سبب آن وفات سکتہ پنداشتند۔ بیت

گویند کہ مرگ طرفہ خوابیست
آن خواب گران گرفت ما را

---

[1] ایرانی موسیقی کے ایک لحن کا نام ہے؛

وشاہزادۂ نیم مست بمصطبۂ خاک خرامید تا صباح محشر با خمار یافتگان حشر
سرگردان برخیزد و از ساقیان وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا[1] تقفی
بادۂ خمار شکن وَكَاْسًا دِهَاقًا[2] طلب دارد، رجا واثق است کہ حاکم رحیم
از جنایت او کہ بجز شبنم رحمت آنرا نتواند شست تجاوز فرماید، و وقوعِ این
واقعۂ ہائلہ بایسنغر سلطان در دار السّلطنت ہرات در باغ سپید بود در شہور
سنہ سبع و ثلاثین و ثمانمائہ و عمرِ او سی و پنج سال بودہ و شعرائیکہ در روزگار شاہرخ
سلطان بملازمت بایسنغر بہادر می بودہ اند بابا سودائی است و مولانا یوسف
امیری و امیر شاہی سبزواری و مولانا کاتبی ترشیزی و امیر یمین الدین نزلابادی
رحمہم اللّٰہ تعالیٰ و اموال و اقطاع بایسنغر بہادر بعہد شاہ رخ سلطان ششصد
تومان کپکی بودہ از ولایات استرآباد و جرجان و دہستان و طوس و ابیورد
و نسا و خبوشان و سمنان و از عراق کاشان و از فارس شبانکارہ، و شعرا
در مرثیۂ سلطان بایسنغر اشعار گفتہ اند امّا امیر شاہی بدین رباعی بر ہمگنان
فایق آمدہ للّٰہ درّ قایلہ - رُباعی

در ماتم تو دہر بسی شیون کرد
لالہ ہمہ خون دیدہ در دامن کرد
گل جیب قبای ارغوانی بدرید
قمری نمد سیاہ در گردن کرد"

---

[1] قرآن کریم - سورۂ انسان - آیت ۲۱؛
[2] قرآن کریم - سورۂ نبا - آیت ۳۴؛

اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت شاہ کے ہاں بہت سے معائب پائے جاتے ہیں جن میں اطلاعات کی عدم صحت اور اسلوب کی ناقابلِ برداشت آورد بد ترین عیب ہیں لیکن اس کے باوجود قتل و خونریزی، بدمستی، فن کی محبت اور ادبی ذوق کی اُس عجیب آمیزش کا نقشہ جوان تیموری سلاطین کے درباروں کا خاصہ تھی اس نے اپنے بہت سے ہمعصر مؤرخوں سے بہتر اور زیادہ کامیابی کیساتھ کھینچا ہے۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر سابقہ اقتباسات کیساتھ اس کے تذکرے میں سے الغ بیگ کی لفظی تصویر بھی پیش کر دی جائے جو آلِ تیمور کے قابل ترین اشخاص میں سے تھا۔ اس لفظی تصویر کیساتھ دولت شاہ نے عصمت بخاری کا مذکور ختم کیا ہے۔ جو بساطی اور خیالی کا استاد؛ رستم خوریانی، طاہر ابیوردی اور برندق بخاری کا معاصر تھا۔ اس ذکر کے بعد کہ عصمت ۸۲۹ھ (۶-۱۴۲۵ء) میں فوت ہُوا۔ وہ لکھتا ہے[1]:

"اما سلطان مغفور سعید الغ بیگ گورگان سقی اللہ روضہ و انار اللہ برہانہ پادشاہ عالم و عادل و قاہر و صاحب ہمت بودہ و در علمِ نجوم مرتبۂ عالی یافتہ و در معانی موی میشگافت، در جۂ عالمان بعہد او بہ ذروۂ اعلیٰ بودہ و فضلا را بدور او مراتب عظمی، در علم ہندسہ دقایق نما و در مسائل ہیئت مجسطی کشا بود و فضلا و حکما متفق اند کہ بروزگار اسلام بلکہ از عہد ذوالقرنین تا این دم پادشاہی بحکمت و علم مثل میرزا الغ بیگ گورگان بر مستقرِ سلطنت قرار نیافتہ، در علوم ریاضی وقوف تمام داشت چنانکہ رصد

---

[1] میری ایڈیشن صہ ۳۶۱؛

ستارگان بست باتفاق حکمای عہد خود چون مفخر الحکماء والعلماء قاضی زادهٔ رومی[1] و مولانا غیاث الدین جمشید و آن ہر دو بزرگوار فاضل آن کار با تمام نارسیده وفات یافتند و سلطان ہمگیٔ ہمت بر اتمام آن کار گماشتہ باقی رصد را میرزا باتمام رسانید و زیج سلطانی[2] اخراج نمود و خطبہ بنام خود نوشت والیوم نزد حکماء آن زیج متداول و معتبر است و بعضی آن را بر زیج نصیریٔ ایلخانی[3] ترجیح می کنند ؛

"و در خطۂ سمرقند مدرسۂ عالی بنا فرمود کہ در اقالیم بزینت و ترتبت و قدر آن مدرسۂ عالی نشان نمیدہند والیوم در آن مدرسۂ عالی زیاد از صد نفر طالبعلم متوطن و موظف اند و بعد پدرش شاہ رُخ بہادر چہل سال باستقلال سلطنتِ سمرقند و ماوراء النہر کرد ......

"حکایت کنند کہ فراست و قوت حافظۂ میرزا الغ بیگ تا حدی بود کہ ہر جانوری کہ انداختی و آن جانور ہر شکاری کہ کردی تاریخ آن را ضبط کردہ بر نسخہ نوشتندی کہ بچہ روز بودہ و در کدام محل واز جانوران چہ جانور

---

[1] اسکا اصل نام صلاح الدین موسیٰ تھا ؛ [2] اس اہم تصنیف کے بارے میں جو غالباً ۸۴۱ھ (۱۴۳۷-۸ء) میں مکمل ہوئی ملاحظہ ہو ریو کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی اور وہ حوالے جو وہاں دیئے گئے ہیں خصوصاً سیدیو (Sedillot) کے شائع کردہ جزوی متن و ترجمہ (پیرس ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۳ء) کا حوالہ ؛ [3] جو نصیر الدین طوسی نے تیار کیا۔ ملاحظہ ہو ریو کی فہرستِ مخطوطات فارسی ص ۴۵۴-۵۔ نصیر الدین طوسی کا کچھ حال آپ کو میری تاریخ ادبیاتِ ایران کی جلد دوم (ص ۴۸۴-۶) میں ملے گا ؛

صید شده، از قضا آن کتاب غایب شد و چندانکه کتاب را طلب کردند نیافتند و مستحفظان کتاب خانہ ترسناک شدند، پادشاہ الغ بیگ فرمود غم مخورید کہ تمام آن قضاہا را من اوّلہ الی آخرہ بیاد دارم، کُتّاب را طلب فرمود و پادشاہ تواریخ می گفت و آن تاریخ و قضایا را کاتبان کتابت میکردند تا آن دفتر باتمام رسید، قضا را بعد از مدّتی نسخۂ اوّل پیدا شد، ہر دو نسخہ را باہم مقابلہ کردند اختلاف بجز چہار پنج موضع نیافتند۔

"و ازین نوادر از طبع و ذہن آن حضرت فراوان نقل کردہ اند، امّا شیخ آذری علیہ الرحمۃ فرمود کہ من در شہور سنہ ثمانمائہ[1] در قراباغ ہمراہ خالِ خود کہ قصّہ خوان امیر کبیر صاحبقران تیمور گورگان بود بخدمت الغ بیگ میرزا افتادم در ایّام طفولیّت و مدّت چند سال بنشاط کودکی با شاہزادہ بازی کردمی و سمر و حکایات گفتمی و او را چنانکہ رسم اطفال است با من انسی و حالی بودی تا در شہور سنہ اثنی و خمسین و ثمانمائہ[2] کہ پادشاہِ مذکور خراسان را فتح کرد و در اسفراین نزول فرمود بعد ازانکہ صبحِ شیب از شام شباب مشتعل شدہ بود[3] برخاستم و بخدمت پادشاہ شتافتم، از دور کہ مرا دید در لباسِ فقرا و صلحا بعد از تقدیم سلام و پُرسش فرمود کہ ای درویش تو مصاحب و جلیس قدیم ما می نمائی، آیا تو خواہرزادۂ قصّہ خوان ما نیستی، من تعجّب نمودم

---

[1] ۸۰۰ھ (۸-۱۳۹۷ء)؛ [2] ۸۵۲ھ (۹-۱۴۴۸ء)؛

[3] سیاہ بالوں کے سفید ہو جانے کو ایرانی شاعرانہ پیرائے میں عموماً یوں بیان کرتے ہیں کہ رات میں سے صبح نمودار ہوئی؛

از ذہن دراک و حافظۂ پاک پادشاہ و گفتم بلی ہستم، حکایات قراباغ وغزو گرجستان وتعجبهای آن دیار درمیان آورد، آنچه بیاد داشتم جواب گُفتم۔

"ازین نوع دقت از خاطر آن پادشاہ بسیار نقل است زیادہ ازین این تذکرہ تحمّل نیاورد"۔

اوپر جس ملاقات کا ذکر ہے اس کے ایک سال بعد (۸۵۳ھ ۵۰-۱۴۴۹ء میں) صاحب ہُنر الغ بیگ کو اس کے ناخلف بیٹے عبداللطیف نے قتل کر دیا۔ جو سات ماہ بعد خود بھی مقتول ہوا۔

---

(۵) حسین واعظ کاشفی

تاریخ ادبیاتِ ایران کی اس جلد میں جس دَور پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے آخری حصّے کے قریب قریب تمام ادبی کمالات کا مرکز و مرجع فن و ہُنر کا زبردست اور فراخدل مربّی میر علی شیر نوائی ہے۔ اور اسی طرح ان کمالات کا پُورا عروج ہمیں

حسینِ واعظِ کاشفی

مشہور شاعر مولانا جامی کی جامعِ حیثیات شخصیت میں نظر آتا ہے جنکے تذکرے کے ساتھ ہم اس جلد کو ختم کرینگے۔ لیکن اس سے پہلے اس وعدے کے بموجب جو ہم نے پچھلے باب میں کیا تھا چند مزید الفاظ میر علی شیر نوائی نیز حسین واعظِ کاشفی کے بارے میں کہنے بھی ضروری ہیں۔ پچھلے باب میں ہم نے ان دونوں کی زیادہ ٹھوس نثریہ تصانیف پر کچھ بحث کی تھی جبکہ

کاشفی کا ایک مذکور خواند امیر کی حبیب السیر میں[1] دیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ اس کا پورا نام کمال الدین حسین تھا اور جیسا کہ اس کے لقب سے ظاہر ہے واعظ کا پیشہ کرتا تھا۔ اس نے نہایت دلکش اور لطیف آواز پائی تھی۔ دینیات اور احادیث میں اس کی علمیت اچھی تھی۔ ہر جمعہ کی صبح کو ہرات کے دار السیادتِ سلطانی میں وعظ کیا کرتا تھا۔ اور پھر میر علی شیر کی مسجد میں نماز پڑھاتا تھا۔ روزِ سہ شنبہ کو مدرسۂ سلطانی میں، روزِ چہار شنبہ کو خواجہ عبد الولید احمد کے مقبرے میں اور ایک زمانے میں روز پنجشنبہ کو حظیرۂ سلطان احمد میرزا میں وعظ کہتا تھا۔ علمِ نجوم اور فنِ انشا میں مہارت رکھتا تھا۔ اور دیگر علوم میں اپنے امثال واقران کی برابری کا دعوی کامیابی سے کرسکتا تھا۔ اس کا بیٹا فخر الدین اس کا قائم مقام ہوا۔ اور مسجد جامع ہرات میں وعظ کہنے لگا۔ فخر الدین کسی قدر شاعر بھی تھا۔ اور اس نے عشقیہ مثنوی محمود وایاز تصنیف کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والد حسینِ کاشفی نے خود شاعری نہیں کی بلکہ نفیس انشا میں اپنے جوہر دکھانے کو ترجیح دی۔ جس کا سب سے اہم اور خاص نمونہ اس کی کتاب "انوار سہیلی" ہے۔ مشہور کتاب کلیلہ و دمنہ کا یہ پُرتکلّف اور لفاظانہ ترجمہ اُس شہرت کی بدولت جو اسے ہندوستان میں نصیب ہے ناجائز حد تک انگریز طالبعلموں میں موردِ توجہ رہا ہے۔ اور کئی سال تک انڈین سول سروس کے امیدواروں کے لئے داخلِ نصاب رہا ہے۔ انوارِ سہیلی ان طویل ترین فارسی کتابوں میں سے ہے

---

[1] بمبئی کی سنگی طبع (سنہ ۱۲۷۳ھ = سنہ ۱۸۵۷ء) جلد سوم۔ جزو سوم۔ صا ۳۴۱؛

جو کبھی انگلستان کے کسی مطبعے[1] سے شائع ہوئیں۔ جس طریقے سے اس طویل نویس اور طنطنہ پسند مصنّف نے نہ صرف ابن المقفع کے اصل عربی ترجمے پر بلکہ فارسی کے پہلے ترجمے پر بھی حاشیہ آرائی کی ہے اور اُنکو پھیلایا ہے اس کا اندازہ اگر انگریزی خوانوں کو منظور ہو تو وُہ میری تاریخ ادبیاتِ ایران کی دُوسری جلد کے ص ۳-۲۵۰ کی طرف رجُوع کریں۔ سوائے ترسیل مراسلات کی کتاب مخزن الانشار کے جو میں نے نہیں دیکھی حسین واعظ کی باقی تصانیف کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے[2]۔ اس کی وفات سنہ ۹۱۰ھ (۵-۱۵۰۴ء) میں ہوئی۔ خواند امیر نے اس کی زندگی کے حالات اس سے انیس سال بعد لکھے ؎

---

(۶) میر علی شیر نوائی

میر علی شیر نوائی جیسا کہ پچھلے باب میں جتایا جا چکا ہے میر علی شیر کی اہمیت اور اثر اندازی کیا مصنّف کی حیثیت سے اور کیا سرپرست ادبار کی حیثیت سے بے پایاں تھی۔ اور بلا مبالغہ ہم اس کو اپنے عہد اور مُلک کا میسیناس[3] کہہ سکتے ہیں۔ وہ مولانا جامی کا دوست اور مُربّی

---

[1] Messrs Austin of Hersford ؛ [2] ص ۶۲۵ بعد بالا ؛

[3] C, Cilnius Maecenas ۔ سنہ ۷۳ اور سنہ ۶۳ قبل مسیح کے درمیان کسی وقت پیدا ہوا جس طرح میر علی شیر ہرات کے سلطان حسین بایقرہ کا وزیر و مشیر تھا۔ اسی طرح میسیناس مشہور رومن بادشاہ جولیس سیزر (Julius Cæsar) کے بیٹے آگسٹس (Augustus) کا معتمد صلاح کار تھا۔

(باقی حاشیہ ص ۷۰۸ پر)

تھا۔ مولانا نے اپنی تصانیف میں سے بہت سی اس کے نام معنون کی ہیں۔ مولانا کی وفات (۸۹۸ھ ۔ ۱۴۹۲ء) پر اُس نے ایک مرثیہ لکھا جس کے افتتاحی اشعار خواند امیر نے نقل کئے ہیں۔ خواند امیر کے ہاں حبیب السیر کی اس فصل میں جو اُس نے "علماء و فضلاءِ زمانِ سلطان حسین" پر وقف کی ہے[1] میر علی شیر کا ذکر بہت سے فضلاء و شعراء کے مذکورات میں آتا ہے۔ بابر جو بہت زیادہ دقیقہ رس ہے اور دولتشاہ اور خواند امیر کے سے تذکرہ نگاروں کی نسبت جا و بیجا ستائش کا بہت کم عادی ہے میر علی شیر کی تعریف نہایت اعلیٰ الفاظ میں کرتا ہے[2] اور کہتا ہے کہ ہُنر کا ایسا فیاض اور کامیاب کوئی اَور مربّی اس کی نظر میں نہیں۔ علاوہ ان متعدد مصنّفوں اور شاعروں کے جنکی اس نے حوصلہ افزائی اور تربیت کی مشہور مصوّر بہزاد اور شاہ مظفر اور بہترین ماہرینِ موسیقی قُل محمد، شیخ نائی اور حسین عُودی کی کامیابی کا سہرا اسی کے

(بقیہ حاشیہ ص۷۰۷) میر علی شیر کی طرح وہ بھی اچھی نثر و نظم لکھنے پر قادر تھا۔ اور علم و فضل کا مربّی تھا۔ اس کا گھر رُوم کے تمام اہلِ فن و ادب کا مرجع تھا۔ اور میر علی شیر کی طرح وہ ادبی صحبتوں میں بے تکلف ہوتا تھا۔ مشہور شاعر ورجل (Virgil) اور ہوریس (Horace) اسکے دوست تھے۔ اسکے ادبی آثار میں سے صرف چند نمونے محفوظ ہیں ۸ سنہ قبل مسیح میں فوت ہوا؛ (مترجم)

[1] حبیب السیر۔ بمبئی کی سنگی طبع (۱۲۷۳ھ ۔ ۱۸۵۷ء)، جلد سوم، جزو سوم، ص۳۲۴ تا ص۳۵۱؛ [2] بابر نامہ طبع المنسکی (Ilminsky) ص۲۱۳ تا ص۲۱۴ (پاوے دو کورتیئے (Pavet de Courteille) کا فرانسیسی ترجمہ۔ جلد اوّل۔ ص۳۸۲ تا ص۳۸۵)؛

سرہے۔ وہ خود ایک کامیاب ماہرِ موسیقی، نغمہ گر اور مصوّر تھا۔ اور ترُکی زبان میں شاعر کی حیثیت سے بیگانہ تھا۔ ترکی میں اس نے چار غزلیہ دیوان مرتب کیے اور چھ طویل مثنویاں تصنیف کیں جن میں سے پانچ خمسۂ نظامی کے تتبع میں ہیں اور ایک عطار کی منطق الطیر کے اتباع میں ہے جس کا عنوان "لسان الطیر" ہے۔ فارسی شاعری جس میں وہ فانی تخلص کرتا تھا بقولِ بابر وہ اتنا کامیاب نہیں۔ کیونکہ گو اس کے بعض اشعار برُے نہیں لیکن اکثر ہلکے اور گھٹیا ہیں۔ اس کا عروض بھی صحیح نہیں تھا۔ اور عروض پر اس نے جو رسالہ بہ عنوان "میزان الاوزان" تصنیف کیا۔ اس کے متعلق بابر کا دعویٰ ہے کہ اس میں مصنف نے رُباعی کے جن چوبیس اوزان پر بحث کی ہے اُن میں چار کے متعلق غلط بیانیاں کی ہیں ؂

پس میر علی شیر کی ادبی ناموری کے حقُوق ترُکی زبان پر مبنی ہیں نہ کہ فارسی پر۔ تاہم جملہ فنّ و ادب کی فیّاضانہ تربیت اسے ادبِ ایران کی ہر تاریخ میں تحسین آمیز ذکر کا حقدار بناتی ہے۔ جو قارئین اس کی زندگی اور تصنیف و تالیف کے بارے میں مزید معلومات چاہتے ہیں وہ مجلۂ آسیائی بابت ۱۸۶۱ء میں موسیو بلیں[1] کا مقالہ زیر عنوان "میر علی شیر کے وقائع عمری اور ادبی مشاغل کا تذکرہ اور اس کی تصنیف کے اقتباسات[2]" ملاحظہ فرمائیں۔ اس کی ولادت

---

[1] M. Belin ؛ [2] Notice biographique er litteraire sur Mir Ali-Chir Nevaii, suivie d'extraits tires aeuvres du meme auteur ، الگ ایک کتابچے کی شکل میں بھی چھپا۔ جس کے ۱۵۸ صفحات ہیں؛

۸۴۴ھ (۱-۱۴۴۰ء) میں ہرات میں ہوئی۔ اور وہیں ۱۲ ر جمادی الآخر ۹۰۶ھ (۳ ر جنوری ۱۵۰۱ء) کو فوت ہوکر مدفون ہؤا۔ اس پُر آشوب مُلک اور زمانے میں ایک مدبّر ہونیکے باوجود اس کی زندگی حیرت انگیز طور پر پُرامن رہی اور برابر اس کو سلطان ابوالغازی حسین کا یارانہ اور اعتماد حاصل رہا۔ سلطان حسین[1] بچپن میں اس کا ہم مکتب رہا۔ اور بڑی عُمر میں آکر اس کا آقائے مُختار بنا۔ عوامی زندگی اور سیاسی طاقت کی میر علی شیر کو کچھ پروا نہ تھی۔ اور اگر اسے موقع ملتا تو وُہ بخوشی رُوحانی غور و فکر اور ادبی مشاغل کے حق میں دُنیوی جاہ و جلال سے دست بردار ہو جاتا۔ اس نے شادی بھی نہ کی۔ مولانا جامی نے تو اسے نقشبندی درویش بھی تسلیم کیا ہے[2]۔ اس کے دل میں کارہائے خیر کے شوق کی آگ کبھی نہ بُجھتی تھی۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے ایک خراسان ہی میں کم سے کم ۳۷۰ مسجدیں، مدرسے، سرائیں اور دُوسرے مقدس ادارے بنا یا بحال کئے اور اُن کے لئے اوقاف معیّن کئے۔ بڑا پُر نویس مصنف تھا۔ موسیو بیلین نے[3] اس کی ۲۹ تصانیف شمار کرائی ہیں۔ جو سلطان حسین کے جلوس اور اپنی موت کے درمیان اس نے تیار کیں۔ ان میں وقتی لحاظ سے سب سے آخری "محاکمۃ اللغتین" ہے۔ جس میں اس نے

---

[1] سلطان حسین رمضان ۸۷۳ھ (مارچ-اپریل ۱۴۶۹ء) میں ابو سعید کے مرنے پر ہرات میں تخت نشین ہؤا؛ [2] بیلین (Belin) مقالۂ مذکور ص ۱۹؛

[3] ایضاً ص ۵۹ تا ص ۶۴؛

فارسی زبان پر ترکی کی برتری ثابت کرنیکی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب ۹۰۵ھ (۱۵۰۰ء) میں یعنی اس کی وفات سے صرف ایک سال قبل لکھی گئی ۔

---

(۷) مولانا جامیؒ[1]

ملا نور الدین عبد الرحمٰن جامی خراسان کے قصبہ جام میں ۲۳ر شعبان ۸۱۷ھ (۷ر نومبر ۱۴۱۴ء) کو متولد ہوئے۔ اور ۱۸ر محرّم ۸۹۸ھ (۹ر نومبر ۱۴۹۲ء) کو ہرات میں فوت ہوئے۔ وُہ ان نادر ترین طبّاعوں میں سے ہیں جو خاکِ ایران نے پیدا کئے کہ بیک وقت ایک عظیم شاعر، اعلیٰ فاضل اور زبردست صُوفی تھے۔ اپنی شاعری کے علاوہ جو چھوٹی چھوٹی تالیفات کو چھوڑ کر غزلیات کے تین دیوانوں اور سات عشقیہ اور موعظتی مثنویوں پر مشتمل ہے انہوں نے تفسیرِ قرآن، آنحضرت (صلعم) کی نبوت کی شہادت، حدیث، سیر الاولیاء، تصوّف، صرف ونحوِ عربی، قافیہ، عروض موسیقی، معمات اور دیگر مضامین پر قلم اُٹھایا۔ تحفۂ سامی میں ان کی چھیالیس ۴۶ تالیفات کی فہرست دی گئی ہے۔ اور میرا خیال نہیں کہ یہ فہرست مکمّل ہے۔ ان کے معاصروں کے دِلوں میں ان کا حد درجہ احترام تھا۔ اور یہ احترام

مولانا جامی

---

[1] مولانا جامی کے مفصّل مطالعے کے لئے شائقین کو پروفیسر علی اصغر حکمت کی تالیف بعنوان "جامی۔ متضمن تحقیقات در تاریخ احوال و آثار منظوم و منثور ....." (مطبوعہ طہران ۱۳۲۰ھ شمسی) کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے؛ (مترجم)

صرف اُن کے ہموطنوں تک محدود نہ تھا بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں[1] عثمانی سلطان بھی اس تعظیم میں شریک تھا۔ اور اُس نے مولانا کو اپنے دربار میں بُلانے کی ناکام کوشش کی۔ اُن کے مشہور ترین معاصرین انکو اتنا رفیع المرتبت سمجھتے تھے کہ اُن کے نزدیک وہ مدح وستائش سے بالا ہیں اور اس قدر مشہور ہیں کہ اُن کی مفصّل سیرت لکھنا غیرضروری ہے۔

جامی کا درجہ بابر کی نظر میں

چنانچہ بابر[2] یہ بیان کرنیکے بعد کہ "علوم ظاہر و باطن میں اُن کے عہد کا کوئی شخص اُن کا درجہ نہ رکھتا تھا" کہتا ہے کہ "ان کا مرتبہ احتیاجِ تعریف سے بالا ہے"۔ اور توزک میں انکا مذکور صرف "از جہت تیمن و تبرک" کیا جاتا ہے۔ سام میرزا ابنِ شاہ اسمٰعیل

سام میرزا کی نظر میں

صفوی اپنی تحفۂ سامی[3] کے پانچویں صحیفے[4] (فصل) میں انکو سب سے پہلی جگہ دیتا ہے۔ اور کہتا ہے "از غایتِ علوِ فطرت .... احتیاج بتقریر حال و تبیینِ مقال ندارد چہ پرتوِ فضائلِ او شرق تا باقصاء غرب رسیدہ و خوانِ نوالِ افضالش از کران تا کران کشیدہ"۔ اپنے تذکرے کے خاتمے میں[5] جو زندہ معاصر شعراء

دولتشاہ کی نظر میں

سے بحث کرتا ہے دولتشاہ مولانا کو سب سے ......

---

[1] صـ ۵۹۳ بالا؛ [2] بابرنامہ طبع الَمِنسکی۔ صـ ۲۲۲ تا صـ ۲۲۳؛

[3] کیمبرج کا نسخہ (Or. 648) صـ ۹۳ تا صـ ۱۰۱؛

[4] پانچویں صحیفے کی طبعِ پٹنہ (مذکورہ بر صـ ۴۵۴ بالا ذیلی حاشیہ ۲)۔ صـ ۱؛ (مترجم)

[5] میری ایڈیشن۔ صـ ۴۸۳ بعد؛

پہلی اور میر علی شیر سے قبل جگہ دیتا ہے اور ایسے ہی آہنگ میں اُنکی توصیف

میر علی شیر کی نظر میں

کرتا ہے۔ میر علی شیر نے مولانا کے اس مختصر مذکور کے علاوہ جو اس نے مجالس النفایس کے شروع میں درج کیا ہے ان کی مدح و ستائش پر ایک پوری تصنیف "خمسۃ المتحیّرین" وقف کی ہے۔ اس تصنیف کی (جس کا پورا حال بیلین[1] نے لکھّا ہے) وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ پانچ حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک دیباچہ ہے۔ تین ابواب ہیں اور ایک خاتمہ ہے۔ یہ حصّے علے التّرتیب مندرجۂ ذیل مضامین سے بحث کرتے ہیں:-

(۱) مولانا جامی کا نسب، ولادت اور مصنّف کی اُن سے شناسائی۔

(۲) واقعات اور دونوں کی آپس کی گفتگوئیں جن سے ان کی باہمی بے تکلّفی کا پتہ چلتا ہے؛

(۳) انکی باہمی خط و کتابت جو مولانا کی تصانیف میں محفوظ ہے؛

(۴) وہ تصانیف جو مولانا نے مصنّف کی تجویز اور تحریک پر تیار کیں؛

(۵) وہ کتابیں اور رسالے جو مصنّف نے مولانا کے زیرِ ہدایت پڑھے

نیز مولانا کی وفات اور جنازے کا حال جس کے مراسم غیر معمولی شان و شوکت سے ادا کیئے گئے اور جس میں علاوہ عوامی جمِ غفیر کے شاہی خاندان کے کئی افراد، متعدد اشراف، مشایخ اور فضلاء شریک ہوئے ۔

---

[1] Belin - مقالۂ مذکور صا۱۰ تا صا۱۵۸؛

جامی کی سیرت مصنفہ عبدالغفور لاری

لیکن مولانا کی سب سے زیادہ مفید سوانحعمری غالباً وُہ ہے جو اُن کے سب سے برگزیدہ مرید عبدالغفور لاری نے لکھی جو ۵ رشعبان سنہ ۹۱۲ھ (۲۱ر دسمبر سنہ ۱۵۰۶ء) کو فوت ہؤا اور اپنے مُرشد کے پہلو میں مدفُون[1] ہؤا ٭

مولانا جامی کی زندگی سے متعلق تمام ضروری اطلاعات ایک نہایت عمدہ "خاکۂ سیرت[2]" میں درج ہیں جو نساؤلیس[3] نے "نفحات الاُنس" کی اپنی مرتب کردہ ایڈیشن[4] کے (صا تا ضا) شروع میں لکھا ہے۔ اس خاکے میں صرف ایک خرابی ہے کہ اس میں تصوّف پر ایک شدید اور بے موقع حملہ کیا گیا ہے۔ مولانا کے احوال کی دستیاب تفاصیل دُوسرے شعراء مثلاً خواجہ حافظ کے معلوم حالات سے بہُت زیادہ مکمل اور بہتر مصدقہ ہیں۔ مولانا نے اپنی ولادت کی تاریخ خود محفوظ کی ہے اور جامی تخلّص کرنے کی دُہری وجہ قلمبند کی ہے۔ اور اپنی بیشتر نظموں اور دیگر کتب و رسائل کی تاریخ تصنیف بھی درج کی ہے۔ اُن کی اکثر مصنفات اُن کی عمرِ دراز کے آخری چودہ پندرہ سال میں تالیف ہوئیں۔ یہ تاریخیں اور نظموں کے متن جس سند پر مبنی ہیں وُہ غیر معمولی طور پر مضبوط ہے میری مراد مولانا کے کُلیات کے اس نسخے سے ہے جو اُن کے اپنے ہاتھ

---

[1] سنہ ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) کے لگ بھگ لکھی گئی۔ دیکھو ریو کی فہرستِ مخطوطات فارسی۔

[2] Biographical Sketch ؛ ص ۱-۵۰ ؛

[3] Nassau Less ؛

[4] کلکتہ سنہ ۱۸۵۹ء ؛

کا لکھا ہوُا ہے۔ اور "سینٹ پیٹرز برگ کی وزارتِ خارجہ کے ادارۂ السنۂ شرقیہ"[1] میں محفوظ ہے۔ اس نسخے نے سلسلۂ واقعات کی تاریخی ترتیب کے بہت سے مبہم اور مشکوک نکتے صاف اور واضح کر دیئے ہیں۔ نسخے کی کیفیت بڑی تفصیل کیساتھ بیرن وکٹر روزن[2] نے بیان کی ہے۔ مولانا کی زندگی اور خصائل واخلاق کی مزید تفصیلات کیلئے معاصر شہادت کی کوئی کمی نہیں۔ لڑکپن ہی میں اُنہوں نے غیر معمولی ذکاوت اور قابلیت کا ثبوت دیا۔ اور جُوں جُوں بڑے ہوتے گئے اور مشہور اساتذہ کے زیرِ ہدایت اُنہوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا بڑی تیزی سے اُنہوں نے وہ تمام علمیت حاصل کر لی جو اُن کے اساتذہ اُن کو دے سکتے تھے۔ جامی اکثر استدلال میں اُن کو زک دیکر اُٹھتے۔ اُن کی فضیلت کی توصیف نساؤلیس بالفاظ ذیل کرتا ہے:۔

"جامی کو شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فاضل کی حیثیت سے لیجئے تو اس میں انکار کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ غضب کی طبّاعی اور فوق العادت تبحر کے آدمی تھے۔ اور یہ افسوس کا مقام ہے کہ وہ خود پسندی، اپنے آپکو دُور کھینچنے والی نخوت اور معاصر اربابِ علم کو بحقارت دیکھنے سے مبرّا نہ تھے۔ اور یہ صفات بالعموم اُن کے مخصوص فلسفے کے پرستاروں کی نمایاں خصوصیات

---

[1] Institut des Lengues Orientales du Ministere de Afraires Etrangers.

[2] Baron Victor Rosen کی تالیف "مجموعہ ہائے کتب علمی ...... مخطوطاتِ فارسی" (Collections Scientifique) - صفحہ ۲۱۵ تا صفحہ ۲۵۹۔

ہیں۔ اُن کو اس اعتراف میں انتہائی تامل تھا کہ وہ مکاسب کمال میں اپنے کسی اُستاد کے رہینِ منت ہیں۔ خود اُنہوں نے کہا: "جتنے اساتذہ سے مَیں نے پڑھا اُن میں کسی کو اپنے سے برتر نہ پایا۔ بخلاف اس کے مَیں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ بحث میں ان سب کو ہرا سکتا تھا۔ پس مَیں ان میں کسی کے حق میں اس ممنونیت کا مُعترف نہیں ہُوں جو اُستاد کے لئے ایک شاگرد پر واجب آتی ہے۔ کیونکہ اگر مَیں کسی کا شاگرد ہُوں تو وُہ صرف خود میرے والد ہیں جنہوں نے مجھے زبان سکھائی"۔

اس کے مقابلے میں ان کا دلپسند وصف یہ ہے کہ اُنہوں نے اربابِ دول اور اصحابِ اقتدار کی خوشامد اور اُن کے سامنے اپنے آپکو گرانے سے انکار کیا۔ گو ممکن ہے کہ اُن کی اس روش کا محرّک ان کا وہی تکبّر ہو۔ تاہم یہ خوبی اُس زمانے کے شاعروں میں بہت نایاب ہے۔ اور مولانا میں اسے دیکھ کر اُنکے ترجمہ نگار حسین واعظ الکاشفی نے یہ کہا کہ نظامی کے مندرجۂ ذیل اشعار جامی سے زیادہ کسی پر صادق نہیں آتے[1]۔

جامی کی آزادطبعی

چون بعہدِ جوانی از برِ تو بدرِ کس نرفتم از درِ تو
ہمہ را بر درم فرستادی من نمی خواستم تو میدادی

دُوسری طرف اپنے مُرشدوں اور بزرگوں کا مولانا بیحد احترام کرتے جنہوں نے سلوک میں اُن کی رہنمائی کی اور اُنہیں وُہ بے دریغ خراجِ عقیدت ادا

[1] نساؤلیس کا "خاکۂ سیرتِ" جامی (Biographical Sketch)۔ صفحہ ۵؛

کرتے۔ اس حقیقت کو نساؤ لیس نے "خاکۂ سیرت"[1] میں وافر مثالوں سے ثابت کیا ہے ؟

لیکن گو انہوں نے زعما کے تملق اور خوشامد سے انکار کیا اور کیا عجب ہے کہ یہی اس کا سبب بھی ہو کہ مولانا نے اپنی زندگی ہی میں لوگوں کے دلوں میں اپنا ایسا صمیم اور عالمگیر احترام پیدا کر لیا کہ بہت کم ایرانی شاعروں کو نصیب ہوا۔ اور اتنی لمبی عمر پانے کے باوجود وہ اُن تلخ تجربات اور تقدیر کے حوصلہ شکن انقلابات سے محفوظ رہے جو دوسرے عظیم شعرا مثلاً فردوسی، ناصرِ خسرو، انوری، سعدی یا حافظ کو پیش آئے۔ واحد ناخوشگوار حادثہ جو لکھا ہے کہ مولانا کو پیش آیا اور جس سے بآسانی و سرعت انہوں نے اپنے آپ کو بچا لیا بغداد میں واقع ہوا[2]۔ ۸۷۷ھ (۱۴۷۲ء) میں جب وہ حج سے واپس آرہے تھے۔ چند بدخواہوں نے اُن کو آلِ علیؑ کی معاندت کا مرتکب ٹھہرانے کے لئے سلسلۃ الذہب کا ایک اقتباس تحریف کر کے بطور ثبوت پیش کیا۔ باوجود اس کے کہ امام حسینؑ ابن علیؑ کی شان میں ان کا ایک قصیدۂ غرّا[3] موجود تھا۔ جو انہوں نے میدانِ کربلا کی زیارت سے کچھ عرصہ پہلے تصنیف کیا تھا۔ ایک بھرے جلسے میں جس کے صدر نشین بغداد کے سرکردہ علماء تھے مولانا جامی بآسانی تہمت کو بے بنیاد ثابت کرنے اور تہمت لگانیوالوں کے

---

[1] صہ تا صلہ ؛ [2] نساؤ لیس (Nassau Lees) "خاکہ سیرت" (Biographical Sketch) صلا تا صھا ؛

[3] ایضاً صلا ؛

خلاف پانسہ اُلٹنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اُنھوں نے یہ بھی کہا۔ کہ اگر اس کتاب کے لکھنے میں انکو کوئی خدشات تھے تو یہی کہ ...... اہلِ خراسان کہیں ان کو شیعہ میلانات کا الزام نہ دیں۔ لیکن یہ بات ان کے گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ خود شیعوں کے ہاتھوں وُہ مخمصے میں پھنس جائیں گے۔ یہ واقعہ اُن کے دماغ میں کھٹکتا رہا۔ اور ایک قدرے تلخ نظم میں اُسے یاد کرتے ہیں۔ جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں[1] ؎

بکشای ساقیا بلبِ شطِ[2] سرِ سبوی
وز خاطرم کدورتِ بغدادیان بشوی
مہرم بلب نہ از قدحِ مے کہ ہیچ کس
زابنای این دیار نیرزد بگفت وگوی
از ناکسان وفا و مروّت طمع مدار
از طبعِ دیو خاصیتِ آدمی مجوی

باوصف اپنے تقدّس اور تصوّف کے مولانا چرب زبان اور بڑے حاضر جواب تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مزے لے لیکر یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

بسکہ در جانِ فگار و چشم بیدارم توئی
ہر کہ پیدا می شود از دُور پندارم توئی

ایک گستاخ نے ٹوک کر سوال کیا "حضرت فرض کیجیے وہ گدھا ہو؟"

---

[1] نساؤلیس۔ مقالۂ مذکور۔ ص۱۷۵ تا ص۱۷۹؛ [2] دجلہ اور فرات جہاں مل جاتے ہیں اس سے آگے کے دریا کو شط العرب کہتے ہیں؛

انھوں نے فوراً کہا "پندارم توئی"[1]

ایک اَور موقع پر جامی نے ایک ہمعصر شاعر ساغری پر ذیل کے شعر کہے۔ اس نے اپنے معاصر شاعروں پر الزام لگایا تھا کہ وہ سب اسکے خیالات و مضامین چُراتے ہیں ؎

ساغری می گفت دُزدانِ معانی بُردہ اند
ہر کجا در شعرِ من یک معنیٔ خوش دیدہ اند
دیدم اکثر شعرہایش را ہیچ معنی نداشت
راست می گفت آنکہ معنی ہاش را دزدیدہ اند

جب ساغری نے بگڑ کر جامی کو اس قطعے پر بُرا بھلا کہا تو اُنھوں نے کہا۔ اس میں میرا کیا قصور! میں نے "شاعری میگفت" لکھا تھا۔ کسی فتنہ پرداز نے تم کو دق کرنے کے لئے حروف کے نقطے اِدھر اُدھر کر دئے ہیں[2]۔

مولانا کی وفات کی جو تارِیخیں کہی گئیں ان میں دو سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک "وَمَن دَخَلَہٗ کَانَ آمِنًا" اور دُوسری "دود از خراسان برآمد" خراسان کے اعداد سے دُود کے اعداد منہا کریں تو ۸۹۸ باقی رہتے ہیں۔

مولانا کی نثریہ تصانیف

اب ہم مولانا کی متعدّد تالیفات کا جائزہ لیتے ہیں جو اوّلاً دو حصّوں میں تقسیم ہوتی ہیں نثر

---

[1] نسّاؤلیس مقالۂ مذکور۔ صہ ۱۹۔
[2] ایضاً۔ صہ ۱۹۔

اور نظم - ان کی چیدہ نثریہ تصانیف "نفحات الانس" (مصنفہ سنہ ۸۸۳ھ = سنہ ۱۴۷۸ء)، شرحِ لمعاتِ عراقی معروف بہ "اشعۃ اللّمعات (مصنفہ سنہ ۸۸۶ھ = سنہ ۱۴۸۱ء) اور لوایح کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے - ان کی ایک اَور اہم تصنیف "شواہد النبوۃ" ہے جو سنہ ۸۸۵ھ (۱۴۸۰ء) میں تیار ہوئی - جہاں تک مجھے معلوم ہے مولانا کی مذکورہ کتابوں میں صرف یہی اب تک غیر مطبوعہ رہ گئی ہے - میرے پاس اس کا ایک عُمدہ پُرانا قلمی نسخہ موجود ہے - جس پر ذیل کی فہرستِ مندرجات مبنی ہے[1]

شواھد النّبوّۃ کے مندرجات

مقدّمہ - در بیانِ معنیٔ نبیؐ و رسولؐ و آنچہ تعلّق بدان دارد -

رُکنِ اوّل - در شواہد و دلایلی کہ پیش از ولادتِ (آنحضرتؐ) ظاہر شدہ است؛

رُکنِ ثانی - در بیانِ آنچہ از مولد تا مبعث ظاہر شدہ است؛

رُکنِ ثالث - در بیانِ آنچہ از بعثت تا ہجرت ظاہر شدہ است؛

رُکنِ رابع - در بیانِ آنچہ از ہجرت تا وفات ظاہر شدہ است؛

رُکنِ خامس - در بیانِ آنچہ خصوصیت بیکی ازین اوقات نداشتہ باشد و در بیانِ آنچہ دلالت آن بعد از وفات ظاہر شدہ باشد؛

رُکنِ سادس - در شواہد و دلایلی کہ از صحبِ کرام و ائمۂ عظام رضی اللّٰہ

---

[1] پروفیسر براؤن نے عنوانات کا صرف انگریزی ترجمہ دیا ہے - میں نے کتاب خانۂ جامعۂ پنجاب کے ایک نہایت خوشخط نسخہ نوشتہ سنہ ۹۸۴ھ (Ppe., II 13.) سے اصل فارسی عنوان نقل کر دئے ہیں؛ (مترجم)

عنہم بظہور آمدہ است؛

رُکنِ سابع۔ در ذکر شواہد و دلایلی کہ از تابعین و تبعِ تابعین تا طبقۂ صُوفیہ[1] رحمہم اللہ ظاہر شدہ است؛

خاتمہ۔ در عقوبتِ اعدا؛

یہ کتاب بہت سادہ اسلوب میں لکھی گئی ہے اور اگر شائع ہو جائے تو اُن عقائد کے ایک نہایت عمدہ تعارف کا کام دے جو مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں رکھتے ہیں۔

مجھے اُن کی تصوّف کی تین اَور تصانیف پڑھنے کا اتفاق ہوُا ہے۔ ان میں سے ایک لوآمع ہے۔ دوسری صُوفی بزرگ محی الدّین ابن العربی کی فصوص الحکم کی شرح ہے۔ جو ۸۹۶ھ (۱۴۹۱ء) میں لکھی گئی۔ تیسری ابن العربی کے مُرید شیخ صدرالدّین القونیوی کی نُصُوص کی شرح ہے۔ اس کا عنوان "نقد النّصوص" ہے۔ اور مولانا کی سب سے ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ کیونکہ ۸۶۳ھ (۹-۱۴۵۸ء) میں لکھی گئی۔

مولانا کی چھوٹی چھوٹی تصانیف

مولانا کی چھوٹی چھوٹی تصانیف میں سے مَیں نے کوئی دو درجن مشاہدہ کی ہیں۔ یہ ۴۶ تصانیف کی اس فہرست میں شامل ہیں جو سام میرزا کی تحفۂ سامی میں درج ہے۔ لیکن مرآۃ الخیال[2] میں یہ تعداد تقریباً دُگنی بتائی گئی ہے۔ اس

---

[1] اس تقسیم (اصحاب؛ تابعین؛ تبع تابعین؛ صوفیاء) کے سلسلے میں نفحات الانس (طبع نساؤلیس۔ صہ ۳۱) سے مقابلہ کیجئے؛ [2] نساؤلیس نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ مقالۂ مذکور۔ صہ ۱۹؛

میں بیان ہؤا ہے کہ مولانا کوئی نوّے تصانیف چھوڑ مرے۔ ان چھوٹی چھوٹی تالیفات میں قرآن کے اجزا مثلاً سورۂ فاتحہ کی تفسیریں ہیں؛ اربعین یعنی چہل حدیث اور ابوذرؓ کی روایت کردہ احادیث کی شرحیں ہیں۔ کچھ دینی رسائل ہیں مثلاً وحدتِ ربّانی پر "رسالۂ تہلیلیہ" یا رسالہ" لا الٰہ الاّ اللہ۔ حج کے شعائر پر "مناسکِ حج"۔ پھر مختلف برگزیدہ صوفیاء مثلاً مولانا جلال الدین رومی، خواجہ پارسا اور عبد اللہ انصاری کے اقوال وسیر پر مقالے ہیں۔ صوفی اخلاق وعمل پر رسالے ہیں مثلاً "طریقِ صوفیان" اور "تحقیقِ مذہبِ صوفیان"۔ تصوّف کی عربی اور فارسی نظموں کی شرحیں ہیں۔ مثلاً عمر ابن الفارض کے تائیہ اور میمیہ (یا خمریہ)، کی شرح۔ مثنوی مولوی رومی کے افتتاحی اشعار کی (جو اپنے موضوع کی نسبت سے مجموعی طور پر "نے نامہ" بھی کہلاتے ہیں)، شرح، امیر خسرو دہلوی کے ایک شعر کی شرح اور خود مولانا جامی کی اپنی چند رباعیوں کی شرح۔ ان تمام تالیفات کے علاوہ مولانا نے عروض، قافیہؔ[1] اور موسیقی کے رسالے لکھے۔ "مفتاح الغیب" کی ایک شرح لکھی۔ اور ایک اَور شرح[2] ابن الحاجب کی مشہور عربی صرف معروف بہ "کافیہ" پر اپنے فرزند ضیاء الدین کے لئے لکھی۔ مولانا کے خطوط

---

[1] قافیے کا یہ رسالہ بلوخمان (Biochmann) نے اپنی تالیف "عروضِ فارسی" (Persian Prosody) کے آخر میں شائع کیا ہے۔ (کلکتہ ۱۸۷۲ء)؛

[2] اس کتاب کا جو عموماً "شرحِ ملّا جامی" کہلاتی ہے اصل عنوان مولانا کے بیٹے ضیاء الدین کے نام کی نسبت سے "الفوائد الضیائیہ" ہے۔ مشرق میں یہ شرح بہت مقبول ومشہور ہے۔ اور اس سے بکثرت استفادہ کیا جاتا ہے؛

کا ایک مجموعہ (منشآت) بھی ہے اور معمّہ پر جو اُن دنوں بہت مقبول تھا پانچ رسالے ہیں۔

جامی کی نثریہ تصنیف "بہارستان" ہے۔ اگرچہ سب سے آخر میں ہے۔ مگر کسی سے کمتر نہیں۔ یہ کتاب اپنی نوعیت اور ترتیب میں سعدیؒ کی مشہور تر تصنیف "گلستان" سے ملتی جلتی ہے۔ ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) میں لکھی گئی۔ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے (ہر ایک کا نام روضہ ہے) پہلے میں اولیاء اور صوفیاء کی حکایتیں ہیں۔ دُوسرے میں فلسفیوں اور حکماء کے اقوال ہیں۔ تیسرا عدالتہائے سلاطین پر ہے۔ چوتھا جُود وکرم پر پانچواں عشق پر۔ چھٹا مطائبات[1] و نصائح پر۔ ساتواں شعراء[2] پر اور آٹھواں جانوروں پر۔ کتاب ملی جُلی نظم و نثر میں لکھی گئی اور نظم کا حصّہ خاصا ہے۔

بہارستانِ جامی

اس کا متن شلیخٹا وسرڈٹ[3] کے جرمن ترجمے کے ساتھ ۱۸۴۶ء میں وی اینا سے شائع ہُوا[4]۔ متن کی بہت سی قسطنطنیوی اشاعتیں بھی ہیں[5]۔ پُورا انگریزی ترجمہ

---

[1] اس باب میں ۵۳ مطایبات ہیں اور ان میں مشکل ہی سے کسی کی ظرافت اتنی کافی ہو گی کہ ہمارے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر سکے؛ [2] کوئی تین درجن شاعروں کے حالات کی کچھ تفاصیل دی گئی ہیں لیکن مولینا کے معاصرین کے مذکورات بہت مختصر ہیں؛ [3] Schelecha-Wssehrd؛

[4] ایک غیر مؤرخہ نولکشوری طبع بھی موجود ہے (مترجم)؛

[5] میرے پاس وہ اشاعت ہے جو ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں اختر پریس میں چھپی۔ ملاحظہ ہو ایتھے کی "فہرستِ مخطوطاتِ فارسی در دیوانِ ہند" (India Office Persian Catalogne)؛

۱۸۸۷ء میں "کامہ شاستر سوسائٹی" اور چھٹے روضے کا انگریزی ترجمہ سی۔ای۔وِلسن[1] نے "ایران کی بذلہ گوئی اور ظرافت[2]" کے عنوان سے نشر کیا[3]۔ پس ناظرینِ شایقین اگر فارسی نہیں بھی جانتے تو بآسانی اس کتاب کے مندرجات سے زیادہ مکمل واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہاں اس کی زیادہ مفصل کیفیت بیان کرنا غیر ضروری ہے ؎

مولانا کی شاعری

مولانا کی سب سے زیادہ شُہرت بحیثیتِ شاعر ہے۔ اور اب ہمیں ان کی شاعری کی تصانیف کا ذکر کرنا چاہیئے۔ ان کی شاعری سات مثنویوں اور تین الگ الگ غزلیہ دیوانوں پر مشتمل ہے۔ ان کی یہ سات مثنویاں مجموعی طور پر سبعہ یا ہفت اورنگ کہلاتی ہیں۔ دیوانوں میں سے پہلے کا نام "فاتحۃ الشّباب" ہے۔ یہ ۸۸۴ھ (۸۰-۱۴۷۹ء) میں مرتّب ہوا۔ دوسرے کا نام "واسطۃُ العِقد" ہے۔ اس کی تاریخِ ترتیب ۸۹۴ھ (۱۴۸۹ء) ہے۔ اور تیسرا "خاتمۃ الحیٰوۃ" ہے جو ۸۹۶ھ (۱-۱۴۹۰ء) میں یعنی مولانا کی وفات سے صرف دو سال پہلے تیار ہوا۔ "ہفت اورنگ" مندرجۂ ذیل سات مثنویوں پر مشتمل ہے:-

(۱) سلسلۃ الذہب۔ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں لکھی گئی؛

---

[1] C. E. Wilson؛

[2] Persian Wit and Humour.؛

[3] آنری ماسے (Henri Masse) کا فرانسیسی ترجمہ ۱۹۲۵ء میں پیرس سے شائع ہوا؛ (مترجم)

(۲) سلامان و ابسال - فوربس فاکنر[۱] نے ۱۸۵۰ء میں شائع کی[۲] - اور اسکا انگریزی ترجمہ ۱۸۵۶ء میں ہوا - طبعِ مذکور میں ۱۱۳۱ اشعار ہیں - انگریزی نثر میں ایک اَور ملخص ترجمہ ایڈورڈ فٹز جیرلڈ[۳] نے کیا ہے جو لندن سے ۱۸۵۶ء میں نشر ہوا[۴]؛

(۳) تُحفۃ الاحرار - ۸۸۶ھ (۱۴۸۱ء) میں لکھی گئی - فوربس فاکنر نے ۱۸۴۸ء میں شائع کی - اس میں ۱۷۱۰ اشعار ہیں؛

(۴) سبحۃ الابرار - دو دفعہ (۱۸۱۱ء اور ۱۸۴۸ء میں) طبع ہو چکی ہے - ۱۸۱۸ء میں اس کی ایک سنگی طبع بھی کلکتہ سے نکلی؛

(۵) یوسف و زلیخا - ۸۸۸ھ (۱۴۸۳ء) میں تصنیف ہوئی - ساتوں مثنویوں میں سے مشہور ترین اور مقبول ترین ہے - روزن زوایگ[۵] کے جرمن ترجمے کیساتھ ۱۸۲۴ء میں وی اینا سے شائع ہوئی - اس کا ایک انگریزی ترجمہ آر - ٹی - ایچ گرِفتھ[۶] نے کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۸۱ء)، ایک اَور انگریزی ترجمہ بہت معمولی نظم میں اے - روجرز[۷] نے کیا ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۹۲ء)؛

---

۱ Forbes Falconer. ؛ ۲ اس کی ایک عمدہ طبع 'شرف الدین و اولادہ' نے ۱۳۵۵ء میں بمبئی سے نکالی - اور ایک ایرانی طبع "نشریاتِ شرکتِ کتابفروشی ادب" میں شائع ہوئی ہے - (مترجم)؛

۳ Edward Fitzgerald ؛ ۴ تعدادِ صفحات ۸۴ + یو ؛ ۵ Rosenzweig

۶ R. T. H. Griffith ؛

۷ A. Rogers ؛

(۶) لیلیٰ و مجنون - ۸۸۹ھ (۱۴۸۴ء) میں تصنیف ہوئی - شیزی[1] نے فرانسیسی میں ترجمہ کی ہے - (پیرس ۱۸۰۵ء) اور ہارٹمان[2] نے جرمن میں - (لائپزگ[3] ۱۸۰۷ء)

(۷) خرد نامۂ سکندری - اسے ساتوں میں سب سے کم توجہ حاصل ہوئی ہے - اور جہاں تک میں پتہ چلا سکا ہوں اب تک کبھی شائع یا ترجمہ نہیں ہوئی؛

(۱) سِلسلۃ الذّہب

سلسلۃ الذہب کا میرے پاس ایک عمدہ قلمی نسخہ ہے - جس کی تاریخِ کتابت ۹۹۷ھ (۹-۱۵۸۸ء) ہے - یہ مثنوی مختلف فلسفیانہ، اخلاقی اور

سِلسلۃ الذّہب

مذہبی مسائل پر تمثیلی حکایتوں کیساتھ بحث کرتی ہے - اس میں ۷۲۰۰ ابیات ہیں - کسی قدر بے ربطی اور بے جوڑ پن اور اُن کیساتھ اس کی بحر نے جو کچھ ایسی خوش آیند نہیں اس مثنوی کی مقبولیت سبعہ کی باقی مثنویوں سے گھٹا دی ہے - سلطان حسین کے نام معنون ہے " جس کے عدل نے چرخ کے ہاتھ اس طرح باندھ دِیئے کہ چرخ تعدّی نہ کر سکے " ؎

شاہ سُلطان حسین آنکو بست
چرخ را عدلش از تعدّی دست

اس کے بعد سُلطان کے نام کا ایک نہایت پیچیدہ اور تصنّع آمیز معمہ ہے جو

---

[1] Chezy ؛ [2] Hartmann ؛ [3] Leipzig ؛

نہایت دُور از کار مضامین سے بھرا ہُوا ہے ؛

مثنوی کے نمونے کے طور پر ہم ذیل کی عبارت پیش کرتے ہیں :-

(قصۂ گریستن آن شاعر کہ قصیدۂ غرّا در حضرتِ پادشاہ خواند و ہیچکس تحسینِ او نکرد جُز جاہلی کہ باسالیبِ سخن عارف نبود)

شاعری در سخنوری ساحر — در فنِ مدح گستری ماہر
بہرِ شاہی لوای مدح افراخت — پر صنایع قصیدۂ پرداخت
مدحِ شاہان بعقل و شرع رواست — زانکہ شاہ ہند و شاہ ظلِّ خداست
ہست عاید بنفسِ صاحب دل — مدحتِ ظلّ بمدح صاحب ظل
بر در روزی یکے نکو خوانرا — کہ رساند بعرضِ شاہ آنرا
نظم را حسنِ صوت مے باید — تا از آن حُسنِ آن بیفزاید
پای تا سر قصیدہ را بر خواند — حرف حرفش بسمع شاہ رساند
در سخن واجبست حسنِ بیان — حق از آن گفت رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ[1]
خواندش چون بآخر انجامید — وز ادای سخن بیا رامید
داشت شاعر باہلِ مجلس گوش — کہ بتحسین او کنند خروش
زآن ہنرمند میکنند جانی — کش ستایش کُنند ہنر دانی
ہیچ کس دم نزد زبان نکشاد — دادِ تحسینِ آن قصیدہ نداد
ناگہاں شہرۂ بجہل و غرور — بانگ زد از حریم مجلس دور
بارک اللہ فلان نکو گفتی — گوہرِ مدحِ شہ نکو سُفتی

---

[1] قرآنِ کریم - سورۂ مزمل - آیت ۴ "قرآن کو ٹھہرا ٹھہرا کر پڑھ"

مردِ شاعر چو سوی او نگریست — دست بر روی نهاد و زار گریست
گفت بشکست ازین حدیثم پشت — بلکه تحسین این خبیثم کشت
ترکِ تحسینِ پادشاه و گدا — روی بخت مرا نکرد سیاه
و آفرینی که این مغفّل کرد — روزِ عیشِ مرا مبدّل کرد
هر چه از بوستانِ بیخردیست — گرچه شاخِ قبول بیخ ردیست
شعر کافتد قبولِ خاطرِ عام — خاص داند که سُست باشد و خام
میلِ هر کس بسوی جنسِ وی است — آنچه پُختست جنس خام کی است
زاغ خواند نفیرِ ناخوش زاغ — چه شناسد صفیرِ بلبلِ باغ
چغد سازد بکنجِ ویرانه — کی پذیرد ز قصرِ شه خانه
نیست چون دیدهٔ سخن بینش — عار می آیدم ز تحسینش
همچنین رافضی[1] بآن دغلی — چون کند مدح و آفرینِ علیؑ
آید از مدحِ او علیؑ را عار — زآفرینش بود علیؑ را بار
گر تو گوئی که میلِ دِل هرگز — نیست خالی ز نسبتی جایز
رافضی بس دنی علیؑ عالیست — میل چون از مناسبت خالیست
باز گویم حکایتی در باب — کز تأمّل در آن رسی بجواب[2]

---

[1] لفظی معنی "مسترد کرنیوالا" (یعنی پہلے خلفائے راشدین کو) سُنّی بطورِ توہین شیعوں کو رافضی کہتے ہیں؛

[2] ان اشعار کے فوراً بعد ایک حکایت ہے جس کا عنوان یہ ہے:- "حکایتِ آن رافضی که یکے از فضلا را التماس کرد که علیؑ را تعریف کن و پرسیدن آن فاضل که کدام علیؑ - آن علیؑ که معتقد تُست یا آن علیؑ که معتقد منست"؛

سلسلۃ الذہب تین دفاتر میں منقسم ہے۔ پہلا دفتر ایک "اعتقاد نامہ" کیساتھ ختم ہوتا ہے۔ یہ اعتقاد نامہ مولانا کو باوصف اُن کے تصوّف کے ایک کٹر سُنّی دکھاتا ہے۔ اس کا کافی ثبوت اس کی فصلوں کے عنوانات سے ملتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔ فی وجودہ سبحانہٗ؛ فی وحدتہٖ سبحانہ تعالےٰ؛ اشارت الیٰ صفاتہ سبحانہ۔ یعنی حیات وعلم وارادہ وقدرت وسمع وبصر وکلام؛ اشارت الیٰ قضائہٖ؛ اشارت بوجودِ ملائک؛ اشارت الی الایمان بالانبیاء علیہم السّلام؛ اشارت الیٰ افضلیتہٖ نبیّنا صلی اللہ علیہ وسلّم؛ اشارت الیٰ صلّے اللہ علیہ وسلّم؛ فی شریعتہٖ صلّے اللہ علیہ وسلّم؛ اشارۃ الیٰ معراجہٖ صلّے اللہ علیہ وسلّم؛ اشارۃ بمعجزات انبیاء علیہم السلام؛ اشارت بکتابہای خدائے تعالےٰ؛ اشارت بآنکہ کتاب اللہ قدیم است[۱]؛ اشارت بفضیلتِ اُمّت وشرفِ آل واصحابِ او؛ اشارت بآنکہ تکفیرِ اہلِ قبلہ[۲] جائز نیست؛ اشارت بعذاب قبر وسوال منکر ونکیر؛ اشارت بہ نفختین؛ اشارت بنظارۂ صحایف؛ اشارت بمیزان؛ اشارت بصراط؛ اشارت بموقف عرصات؛ اشارت بخلود کفّار در نار وخروج بعض عصاۃ بشفاعت؛ اشارت بدرجاتِ بہشت:۔

سلسلۃ الذہب کے دفترِ ثانی میں بیشتر عشق، مجازی، وحقیقی کی مُختلف قسموں اور پہلوؤں پر مقالے ہیں۔ اور اولیاء اور عاشقوں کی حکایتیں ہیں۔

---

[۱] یہ اہم عقیدہ جس کی تردید معتزلہ نے نہایت شد ومد کیساتھ کی ایک آزمائشی عقیدہ تھا۔ جو بالآخر راسخ الایمان مسلمانوں کا شعار قرار پایا؛ [۲] وہ لوگ جو نماز پڑھتے ہوئے اپنا رُخ کعبے کی طرف رکھتے ہیں؛

دفترِ ثالث بیشتر بادشاہوں کی حکایتوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کے آخر میں بہت سی حکایتیں طبیبوں کی ہیں۔ یہ اطلاع دلچسپ ہے کہ ان آخری حکایتوں میں دو چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی میں سے لی گئی ہیں۔ ایک وہ[1] جو بو علی سینا نے سامانی دربار کے کسی طبیب کے بارے میں روایت کی ہے کہ اس نے ایک کنیز کو نفسانی علاج سے اچھا کر دیا۔ اور دوسری وہ[2] جس میں بیان ہوا ہے کہ کس طرح خود بو علی سینا نے آلِ بویہ کے ایک امیر کو مالیخولیائی توہمات سے شفایاب کیا۔ اس کے بعد شاعری کی دو متقابل قسموں پر ایک گفتار ہے جن میں سے ایک "آسائشِ جان" ہے اور دوسری "کاہشِ دل"۔ اس کے بعد بعض شعرائے ما تقدم پر ایک دلچسپ مقالہ ہے جنہوں نے سلاطین کی تربیت کا بدلہ یوں دیا کہ ان کے ناموں کو بقائے جاودانی بخشی۔ ورنہ وہ تاریخ کے پردے میں چھپے رہتے۔ جن شاعروں کا یہاں ذکر آیا ہے وہ رودکی۔ عنصری۔ سنائی۔ نظامی، معزی، انوری، خاقانی، ظہیر، سعدی، کمال، اور سلمان ساوجی ہیں ؛

یہاں ایک اور حکایت جو عنصری کی برجستہ بدیہہ گوئی کے بارے میں ہے چہار مقالہ سے لیکر داخل کی گئی ہے۔ کتاب یکایک ایک مختصر خاتمے پر آکر ختم ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر ہم محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کی عبارت متن میں کسی اَور جگہ آ جاتی تو تقریباً ایسی ہی برمحل ہوتی۔ مختصر یہ کہ

---

[1] دیکھو چہار مقالہ۔ سلسلۂ یادگار گب ۱۱۔ ص۷۳ بعد ؛

[2] ایضاً۔ ص۸۲ ببعد ؛

سلسلۃ الذہب بلا کسی معتدبہ خلل کے اپنی کئی ترکیبی کڑیوں کے حذف کی متحمّل ہو سکتی ہے۔ اس میں کچھ عمدہ معلوماتی مواد ہے۔ لیکن بہت لمبی ہے اور اس کے خاکے میں صنعت کارانہ پیوستگی نہیں پائی جاتی ؛

(۲) سلامان وابسال

سلامان وابسال

انگریزی خوان دلچسپ تمثیلی مثنوی "سلامان وابسال" کا تصور آسانی سے ایڈورڈ فٹز جیرلڈ[1] کے قدرے آزاد اور ملخّص ترجمے سے حاصل کر سکتا ہے۔ معرّیٰ نظم میں فٹز جیرلڈ کا ترجمہ اکثر دلپذیر اور کبھی کبھی زوردار ہوتا ہے۔ لیکن تمثیلی حکایات کے لئے (جو اس صنف کی نظموں کے تسلسل میں اکثر حائل ہوتی ہیں) اس کی اختیار کردہ بحر کا استعمال کچھ ناکامیاب سا تجربہ ہے۔ قصّہ بالکل بے جان ہے۔ اس کے کردار یہ ہیں:- یونان کا ایک بادشاہ ؛ ایک دانا جو اس کا مستقل مشیرِ معتمد اور صلاح کار ہے ؛ سلامان، بادشاہ کا ایک بہت عزیز بچّہ ؛ ابسال اس بچّے کی خوبصورت دایہ ؛ اور زہرہ (ستارہ) جو حسنِ سماوی کا مجسمّہ ہے اور سلامان کے دِل سے ابسال کی یاد بُھلا دیتا ہے۔ قصّے کے کسی قدر عجیب و غریب پہلوؤں میں ایک یہ ہے کہ سلامان بغیر کسی ماں کے پیدا ہوتا ہے (شاعر بہ سبب اپنی زن بیزاری کے ازدواج سے متنفّر ہے۔ گو وہ خود شادی شدہ تھا) اور دوسرا یہ کہ دلفریب ابسال اس بچّے سے جس کی وُہ کھلائی ہے

---

[1] Edward Fitzgerald ؛

عمر میں کوئی بیس سال بڑی ہے اور جب بچہ سنِ بلوغ کو پہنچتا ہے تو وہ اسے دامِ الفت میں پھانس لیتی ہے جو بادشاہ اور مشیر حکیم دونوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے۔ حکیم ایک قسم کی مسمریزی قوت سے سلامان کو جو جنتِ ارضی کو بھاگ گیا ہے مجبور کرتا ہے کہ جھاڑیوں کی ایک بہت بڑی چِتا تیار کرے۔ اسمیں دونوں عاشق کُود پڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابسال بچاری تو جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور سلامان صحیح و سالم نکل آتا ہے اس حال میں کہ عالِم اسفل کی تمام خواہشات و شہوات سے پاک ہو چکا ہے اور تخت و تاج پانے کے قابل ہے۔ اس کا باپ فوراً اسے بادشاہی دے دیتا ہے۔ یہ تمثیل گو بلا شرح روشن ہے لیکن خاتمے میں اس کی پوری تشریح کر دی گئی ہے[1]۔

ذیل کے انتخاب میں بیان ہوا ہے کہ کیونکر دونوں عاشقوں نے بادشاہ کی ملامتوں سے تنگ آکر راہِ فرار پکڑی۔ اور بالآخر طلسمی جزیرے میں پہنچے۔ جہاں اُنہوں نے ناز و نیاز کے پُر مسرت دِن گزارے[2]:-

از پسِ ماہی کہ زورق رانده اند   وز دمِ دریا ز رونق مانده اند

شد میانِ بحر پیدا بیشهٔ   وصفِ او بیرون ز ہر اندیشهٔ

ہیچ مُرغ اندر ہمه عالم نبود   کاندر آن عشرت گہِ خرّم نبود

یک طرف در جلوه باہم جوق جوق   چون تذرو از تاج چون قمری زطوق

---

[1] فِٹز جیرلڈ کے ترجمے کے صفحات ۵-۱۷؛ فوربس فاکنر کی ایڈیشن کے اشعار نمبر ۱۰۷۶ تا ۱۱۲۰؛

[2] ترجمہ صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۴۹؛ متن۔ اشعار ۸۰۲ تا ۸۲۴؛

یک طرف صف صف همه دستان سرای / ساز دستان کرده از منقار نای
نو درختان شاخ در شاخ اندرو / در نوا مرغانِ گستاخ اندرو
میوه در پای درختان ریخته / خشک و تر با یک دگر آمیخته
چشمهٔ آبی بزیر هر درخت / آفتاب و سایه گردش تخت تخت
شاخ بود از باد دستی رعشه دار / مشت پر دینار از بهرِ نثار
چون نبودی نیک گیرا مشتِ او / ریختی از فرجهٔ انگشتِ او
گوئیا باغِ ارم چون در نهفت / غنچهٔ پیدائیش آنجا شگفت
یا بهشتِ عدن بی روزِ حساب / برگرفت از روی خویش آنجا نقاب
چون سلامان دید لطفِ بیشه را / از سفر کوتاه کرد اندیشه را
با دلِ فارغ ز هر امید و بیم / گشت با ابسال در بیشه مقیم
هر دو شادان همچو جان و تن بهم / هر دو خرّم چون گل و سوسن بهم
صحبتی ز آویزشِ اغیار دور / راحتی ز آمیزشِ تیمار دور
نی ملامت پیشه با ایشان بجنگ / نی نفاق اندیشه با ایشان دو رنگ
گل در آغوش و خراشِ خار نی / گنج در پهلو و زخمِ مار نی
هر زمان در مرغزاری کرده خواب / هر نفس از چشمه ساری خورده آب
گاه با بلبل بگفتار آمده / گاه با طوطی شکر خوار آمده
گاه با طاؤس در جولان گری / گاه در رفتار با کبکِ دری
قصّه کوتاه دل پُر از عیش و طرب / هر دو می بردند روز خود بشب
خود چه زآن بهتر که باشد با تو یار / در میان و عیب جویان بر کنار

(۳) تحفۃ الاحرار

تحفۃ الاحرار دینی اور اخلاقی مضامین کی ایک موعظتی اور معنوی نظم ہے جس میں علاوہ تحمیدات، نعتوں اور مناجاتوں کے بیس مقالات ہیں۔ آخری مقالے[1] میں شاعر نے اپنے صغیر فرزند یوسف ضیاء الدین سے خطاب کیا ہے۔ جو اس وقت صرف چار سال کا ہوا تھا جبکہ اس کے والد کی عمر ساٹھ برس تھی۔ ہر مقالے کے بعد قاعدۃً ایک یا زیادہ تمثیلی حکایتیں دی گئی ہیں۔ ایک مختصر منثور دیباچے میں مولانا جامی نے اشارۃً بتایا ہے کہ اس مثنوی کے لکھنے کی تحریک نظامی کی "مخزن الاسرار" اور امیر خسرو کی "مطلع الانوار" سے ہوئی۔ یہ مثنوی مجموعی طور پر بے لطف اور یک آہنگ ہے اور مولانا کی تصانیف کی مفیدِ مطلب اور صحیح مثال نہیں سمجھی جا سکتی۔ نمونے کے طور پر میں مولانا کا مذکورۂ بالا خطاب بہ فرزند پیش کرتا ہوں:۔

تحفۃ الاحرار

(مقالۂ بیستم در پند دادنِ فرزندِ ارجمند کہ در بوستانِ طفولیت بہ نباتِ حسن پرورده باد و در دبستانِ بلاغت بنہایت کمال پی آورده)

ای شب امید مرا ماهِ نو ۔۔۔ دیدۂ بختم بخیالت گرو

از پس سی روز بر آید ہلال ۔۔۔ روی نمودی تو پس از شست سال

سال تو چار است بوقتِ شمار ۔۔۔ چار تو چل باد و چلت باد چار

---

[1] فوربس فالکنر کی ایڈیشن صـ۹۱ تا صـ۹۳۔ اشعار ۱۶۱۵ تا ۱۶۵۹؛

هر چل تو یک چلّہ[1] کز علم و حال — سیر کنی در درجاتِ کمال
نام تو شد یوسفِ مصرِ وفا — باد لقب دولت و دین راضیا
میکنم از خامۂ حکمت نگار — بهر تو این نامۂ حکمت نگار
گرچہ کنون نیست ترا فهم پند — چون بجد فهم رسی کاربند
تا نشود برقعِ تو موی روی — پا منہ از خانہ ببازار و کوی
سلسلہ بندِ قدمِ خویش باش — حبس نشینِ حرمِ خویش باش
هیچ گہ از صحبتِ هم خانگان — رخت مکش بر درِ بیگانگان
طلعتِ بیگانہ نہ میمون بود — خاصہ کہ سالش ز تو افزون بود
در بدبستان سر و کارت دهند — لوح الف بی بکنارت نهند
پهلوی هر سفلہ مشو جانشین — از همہ یکتا شو و تنها نشین
گرچہ بخود نیست کج اندام الف — بین کہ چسان کج شده در لام الف
لوح خود آنگہ کہ نهی بر کنار — چون الف انگشت از آن بر مدار
دال وش از شرم فگن سر بپیش — صاد صفت دوز بر آن چشم خویش
خندہ زنان گاه بآن گہ باین — رستۂ دندان منما همچو سین
دل مکن از فکر پریشان دو نیم — تنگ دهان باش ز گفتن چو میم
گوش مکن بیهده هر قیل و قال — تا نکشی درد سر گوشمال
دار ادب درس معلم نگاه — تا نشوی طبلک تعلیم گاه
سیلیٔ اد گرچہ فضیلت ده است — گر نزنی سیلی نرسانی بہ است

---

[1] چلّہ یعنی اربعین۔ چالیس روز کی ریاضت۔ دیکھو میری تالیف "ایرانیوں میں ایک سال" صفحہ ۱۴۸؛

یہ پدرانہ نصیحت (جو اسی طرح آگے چلتی ہے) خواہ عمدہ ہو لیکن اس کا مضمون ایسا نہیں جسے ہم شاعری کے لئے مناسب موضوع قرار دیں۔ یہاں یہ طرفہ زُعم کہ اخلاقی اسباق حروف ہجا کی شکلوں کے ذریعے سکھائے جائیں اس نظم کا ایک قابل برداشت ترجمہ کرنا بھی مشکل کر دیتے ہیں خواہ وہ ترجمہ نثر ہی میں کیوں نہ کیا جائے۔

(۴) سبحۃ الابرار

سبحۃ الابرار دینی، صوفیانہ، اور اخلاقی مضامین کی ایک نصائحی نظم ہے۔ اور پچھلی نظم سے ملتی جُلتی ہے۔ ویسی ہی بے ربط ہے اور طرزِ رفتار

سبحۃ الابرار

اور مضمون میں اس سے بھی کم جاذب ہے حضرت ابراہیم اور بوڑھے آتش پرست کی مندرجۂ ذیل کہانی نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ یہ بوستانِ سعدی[۱] میں بھی آئی ہے۔ اور فوربس[۲] کی "فارسی گریمر[۳]" میں کچھ بہت طویل افکار کا موضوع ہے جہاں یہ اقتباسات میں بر سبیلِ استناد نقل ہوئی ہے :-

کرد از معبدِ خود عزمِ رحیل میہمان شد بسرِ خوانِ خلیل
چون خلیل آن خللش در دین دید بر سرِ خوانِ خودش نپسندید
چونکہ دیدش ز خدا بیگانہ چہرۂ پُر دُود ز آتش خانہ

---

[۱] دیکھو طبع گراف۔ وی اینا ۱۸۵۸ء۔ ص ۳-۱۴۲۔ اشعار ۳۷ تا ۵۴؛ [۲] Forbes

[۳] Persian Grammar ص ۱۶۴ تا ص ۱۷۰؛

گفت با راہبِ روزی بگرو | یا ازین مائدہ برخیز و برو
پیر برخاست کہ اے نیک نہاد | دینِ خود را بشکم نتوان داد
یا لبی خشک و دہانی ناخورد | روی از آن مرحلہ درراہ آورد
آمد از عالمِ بالا بہ خلیل | وحی کای در ہمہ اخلاق جمیل
گرچہ آن پیر نہ بر دینِ تو بود | منعش از طعمہ نہ آئین تو بود
عمرِ او بیشتر از ہفتاد است | کہ درین معبدِ کفر آباد است
روز لیش وانگر قسمتِ روزی | کہ نداری دلِ دین اندوزی
چہ شود گر تو (ہم) از سفرۂ خویش | دہیش یک دو سہ لقمہ کم و بیش
از عقب داد خلیل آوازش | گشت بر خوانِ کرم دمسازش
پیر پرسید کہ آن لجۂ جود | از پی منع عطا بہرِ چہ بود
گفت با پیر خطابی کہ رسید | وآن جگر سوز عتابی کہ رسید
پیر گفت آنکہ کند گاہ خطاب | آشنا راپی بیگانہ عتاب
راہِ بیگانگیش چون سپرم | ز آشنائیش چرا برنخورم
روی در قبلۂ احسان آورد | دست بگرفتش و ایمان آورد

قصہ اور اس کا سبق قابلِ تعریف ہیں۔لیکن فارسی کے اکثر علماء میرے خیال میں شیخ سعدی کے نقشِ اول کو جامی کے نقشِ ثانی پر ترجیح دینگے ؛

(۵) یُوسف زلیخا

ہفت اورنگ کی پانچویں مثنوی جو یوسف اور زلیخا کی عشقیہ داستان ہے۔ باقی مثنویوں سے کہیں زیادہ مشہور اور مقبول ہے اور اصل اور ترجمہ دونوں شکلوں میں قابل رسائی بھی سب سے زیادہ ہے۔ اسکا **یوسف زلیخا** پورا متن مع ترجمۂ منظوم و حواشی از "وِنسینس ایڈلم فوَن روزن روایگ"[1] ۱۸۲۴ء میں وی اینا سے بڑی تقطیع کی ایک عمدہ جلد میں شائع ہوا ہے۔ متن کی بہت سی مشرقی اشاعتیں بھی ہیں[2]۔ میں پہلے آنجہانی اے۔ روجرز کے منظوم انگریزی ترجمے (۱۸۹۲ء) کی طرف اشارہ کرچکا ہوں جسے کامیاب ترجمہ نہیں کہا جاسکتا گرفتھ[3] کا متقدم ترجمہ (۱۸۸۱ء) مَیں نے نہیں دیکھا۔ میں نے اس کے دو عمدہ اقتباسوں کا ترجمہ دو دفعہ شائع کیا۔ پہلی دفعہ ایک مقالے میں جو تصوّف پر ہے اور "دُنیا کے نظامہائے مذہبی"[4] میں چھپا اور دُوسری دفعہ جُزوی طور طور پر اپنی "تاریخ ادبیاتِ ایران" کی جلد اوّل میں۔ (ص۴۳۹ تا ص۴۴۲)۔ پہلا

---

[1] Vincenz Edlem von Rosenzweig؛

[2] دیکھو ایتھے کی فہرست مخطوطاتِ فارسی در دیوانِ ہند (India Office Persian Catalogue) کالم۔ ص۷۔ ۷۴۶؛

[3] R. T. H. Griffith.؛

[4] Religious Systems of the World. - یہ کتاب سوان سونن شائن نے ۱۸۹۲ء میں شائع کی۔ ص۳۱۴ تا ص۳۳۲؛

اقتباس جمال اور اس کی اس فطری آرزو پر ہے کہ جلوہ گر ہو اور دُوسرا عشقِ مخلوق پر جسے عشقِ خالق کی سیڑھی سمجھا گیا ہے[1] ۔

اب خود قصّے کو لیجئے۔ یہ قرآن کی سورۂ یوسف پر مبنی ہے۔ جس میں اسے "أَحْسَنُ الْقَصَصْ" کہا گیا ہے۔ ایران اور ترکستان کی عشقیہ شاعری کے مقبول ترین موضوعات میں سے ہے۔ شاہنامہ ختم کر چکنے کے بعد فردوسیٔ بزرگ کی توجہ اس پر مبذول رہی[2] اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سے ایرانی شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کی۔ قصّے کے ترکی ترجموں کی ایک خاصی مکمّل فہرست آکو گب کی "عثمانی شاعری کی تاریخ[3]" کی دوسری جلد کے ایک ذیلی حاشیے میں ملے[4] گی۔ لیکن اس مشہور داستان کی جملہ نگارشوں میں مولانا جامی کی نگارش از روئے حق سب سے اونچا پایہ رکھتی ہے۔ اور اسی پر بڑی حد تک ان کی شہرت کا دار و مدار ہے۔ ذیل کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے[5] ۔

---

[1] دوسرا اقتباس علماء عربی کے مشہور مقولہ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کی شرح ہے؛

[2] میرے محترم بزرگ علامہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی نے قطعاً مُسکت دلائل کیساتھ ثابت کر دیا ہے کہ یوسف زلیخا کی وہ مثنوی جو فردوسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے فردوسی کی تصنیف نہیں ہے ملاحظہ ہو ان کی تالیف "فردوسی پر چار مقالے" (مطبوعہ انجمن ترقّیٔ اُردو ۔ ۱۹۴۲ء) صنہ ۱۸۰ بعد، (مترجم)

[3] History of Ottoman Poetry.

[4] جلد دوم صہ ۱۴۸ تا صنہ ۱۵۰ ۔ ذیلی حاشیہ؛

[5] فون روزن زوایک (Von Rosenzweig) کی ایڈیشن صہ ۱۸ ۔ اشعار ۱۹ تا ۴۲؛

چو یوسف این سخنها کرد ازو[1] گوش   غذای جان فشاند از چشمہ نوش
بگفتا صنعت آن صانعم من   کہ از بحرش برشحی قانعم من
فلک یک نقطہ از کلکِ کمالش   جہان یک غنچہ از باغِ جمالش
ز نورِ حکمتش خورشید تابی   ز بحرِ قدرتش گردون حبابی
جمالی بود پاک از تہمتِ عیب   نہفتہ در حجاب پردۂ غیب
ز ذرّاتِ جہان آئینہا ساخت   ز روی خود بہر یک عکس انداخت[2]
بچشمِ تیز بینت ہر چہ نیکوست   چو نیکو بنگری عکسِ رُخِ اوست
چو دیدی عکس سوی اصل بشتاب   کہ پیش اصل نبود عکس را تاب
معاذ اللہ ز اصل ار دور مانی   چو عکس آخر شود بی نور مانی
نباشد عکس را چندان بقائی   ندارد رنگِ گل چندان وفائی
بقا خواہی بروی اصل بنگر   وفا جوئی بسوی اصل بنگر
غمِ چیزی رگِ جان را خراشد   کہ گاہی باشد و گاہی نباشد

۱ه یعنی از بازغہ - بازغہ ایک عورت ہے جو زلیخا کی طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے - لیکن جب حضرت یوسف (علیہ السلام) اسے وعظ و تلقین کرتے ہیں تو وہ اس مجازی عشق سے ہٹ کر عشقِ حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے؛

۲ه قرآنِ کریم - سورۂ بقرہ آیت ۱۰۹ سے مقابلہ کیجیے؛

(۶) لیلےٰ و مجنُون

"ہفت اورنگِ جامی" کی آخری دو مثنویوں یعنی لیلیٰ اور مجنون اور خرد نامۂ سکندری کے قلمی نسخے نادر ہیں لیکن مجھے ٹرنٹی[1] کالج کیمبرج کے ایک عمدہ نسخے[2] میں ان کا جائزہ لینے کا موقع ملا ہے۔ جس کی تاریخِ کتابت ۹۳۷ھ (۱-۱۵۳۰ء) ہے۔ مَیں نے صحیح نمونوں کے طور پر ذیل کے انتخاب کئے ہیں۔ پہلے دو "لیلےٰ و مجنون" میں[3] سے ہیں ؎

لیلیٰ و مجنون

(در معنیٔ عشقِ صادقان و صدقِ عاشقان)

چون صُبحِ ازل ز عشق دم زد　　عشق آتشِ شوق در قلم زد
از لوحِ عدم قلم سر افراشت　　صد نقشِ بدیع پیکر انگاشت
ہستند افلاک زادۂ عشق　　ارکان بزمین فتادۂ عشق
بی عشق نشان ز نیک و بد نیست　　چیزی کہ ز عشق نیست خود نیست
این سقفِ بلند لاجوردی　　روزان و شبان بگِرد گردی
نیلوفرِ بوستانِ عشق است　　گوی خمِ صولجانِ عشق است
مقناطیسی کہ طبعِ سنگ است　　در آہنِ سخت کردہ چنگ است

---

[1] Trinity College ؛

[2] Class-mark R 13. 8 ؛

[3] ورق نمبر ۱۸۰ ب تا ورق نمبر ۱۹۹ ب ؛

عشقیست فتاده آہن آہنگ سر بر زده از درونۂ سنگ
بین سنگ کہ چون درین نشیمن بی سنگ شود ز شوقِ دُشمن
زان گیر قیاسِ دردمندان در جذبۂ عشقِ دلپسندان
ہر چند کہ عشق دردناکست آسایشِ سینہ ہای پاکست
از محنتِ چرخِ بازگون گرد بی دولتِ عشق کی رھد مرد

(در سببِ نظمِ کتاب و باعثِ ترتیبِ این کتاب)

زین راز چو پردہ باز کردم وین طرفہ ترانہ ساز کردم
شد طوطیِ طبع من شکرخا از قصۂ یوسف و زلیخا
جست از کلکم دران شکرریز شیرین سخنانِ شکر آمیز
در عالم از آن فتاد شوری در خاطرِ عاشقان سروری
سرچشمۂ لطف بود لیکن ز آن تشنگیم نگشت ساکن
مُرغِ دلِ من ز جاے دیگر می خواست زند نواے دیگر
چون قرعہ زدم بفالِ میمون افتاد بشرحِ حالِ مجنون
ہر چند کہ پیش ازین دو استاد از ملکِ سخن بلند بُنیاد
در نکتہ دری زبان کشادند دادِ سخن اندران بدادند
از گنجہ چو گنجِ آن گہر ریز[1] در ہند چو طوطی آن شکرریز[2]

---

[1] یعنی نظامی گنجوی؛

[2] امیر خسرو دہلوی؛

آن مقرعه زن بگوشِ دعویٰ — وین جلوه دہِ عروسِ معنی
آن کندہ زنظم نقش در سنگ — وین دادہ بجسنِ صنعتش رنگ
آن بردہ عَلَم باوجِ اعزاز — وین کردہ فسونِ ساحری ساز
من ہم کمر از قفا ببستم — بر ناقۂ باد پا نشستم
ہر جا کہ رسید رخشِ[1] ایشان — از خاطرِ فیض بخشِ ایشان
من نیز بفاقہ ناقہ راندم — خود را بغبار شان رساندم
گر ماندہ ام از شمار شان پس — بر چہرۂ من غبار شان بس

(۷) خرد نامۂ سکندری

"خرد نامۂ سکندری" کی حکایتِ ذیل اسی نسخے[2] میں سے لی گئی ہے۔ جس میں سے پچھلے دو اقتباس نقل کئے گئے ہیں ؎

(حکایتِ آن خاد کہ گوش بر افسانۂ غوک نہاد و نقد را

بامید نسیہ از دست بداد)

کنون میدہد دورِ چرخم بیاد — بضرب المثل قصۂ غوک و خاد
یکی خاد مرغ ہوائی شکار — فرو ماند از ضعفِ پیری زکار
زبال و پرش زورِ پرواز رفت — بصیدِ غرض چنگش از کار رفت
زبی توشگیش خاست از جان نفیر — وطن ساخت گرد یکی آب گیر

---

[1] رستم کا مشہور جنگی گھوڑا؛

[2] ٹرنٹی کالج کیمبرج کا نسخہ R. 13. 18. ورق ۱۷۱ الف؛

پس از مدتی کرد آنجا درنگ || در افتاد غوکیش ناگه بچنگ
بر آورد فریاد بیچاره غوک || که ای سورم از دستِ تو گشته سوگ
مکن یکزمان در هلاکم شتاب || زمانم شتاب از هلاکم بتاب
نیم من بجز طعمهٔ طبع کوب || نه در کام نیکم نه در معده خوب
تنم نیست جز پوستی ناگوار || بآن کی قناعت کند گوشت خوار
اگر لب کشائی بآزادیم || فرستی بدل مژدهٔ شادیم
بهر لحظه ز آئینِ سحر و فسون || بتو ماهیئ را شوم رهنمون
در آبِ روان پرورش یافته || زالوانِ نعمت خورش یافته
تنِ او همه گوشت سر تا بدم || از و پوست دور استخوان نیز گم
بپشت آبگون وز شکم سیم ناب || بچشمان چو عکسِ کواکب در آب
چو در شب سپهر از نثارِ کرم || همه پشت و پهلوی او پُر درم
نه در طبعِ اهلِ خرد رد چو من || یکی لقمه از وی به از صد چو من
بتلقینِ سوگندها لب کشاد || ز منقارِ او غوک بیرون فتاد
بیک جستن افتاد در آبگیر || بحرمان دگر بار شد خاد اسیر
گرسنه بخاکِ تباهی نشست || نه غوکش بپنجه نه ماهی بشست

منم همچو آن خاد حرمان زده || رهِ خرمی بر دل و جان زده
ز فکرِ سخن رفته از دل حضور || ز نقصانِ فکرم سخن پر قصور
بدستم ز محرومیٔ بختِ من || نه جمعیتِ دل نه لطفِ سخن
بیا ساقیا ساغری می بیار || فلک وار دورِ پیاپی بیار

از آن می که آسایشِ دل دہد — خلاصی ز آلایشِ گِل دہد
بیا مطربا عود بنہادہ گوش — بیک گوشمال آور اندر خروش
خروشی کہ دل را بہوش آورد — بدانا پیامِ سروش آورد

رومانی شاعروں کی حیثیت سے مولانا جامی اور نظامی کا مقابلہ

چونکہ سبعۂ جامی کی تالیف کی تحریک مسلّم طور پر خمسۂ نظامی کے ذریعے ہوئی۔ اور اس کی تشکیل بھی اسی کے نمونے پر ہوئی - لہٰذا جامی اور نظامی کے اپنے اپنے مناہج و اسالیب کا کچھ موازنہ بجا طور پر طلب کیا جاسکتا ہے چونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ادبی مذاق کے مسائل میں غیر اہلِ زبان کے لئے رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے - اسلئے میں نے اپنے ایرانی ہمکار میرزا بہروز سے درخواست کی کہ وہ اس مبحث پر ایک مختصر مضمون لکھ دیں - میرزا بہروز مشہور طبیب اور مصنّف میرزا ابو الفضل ساوجی کے فرزند ہیں اور بہت ہونہار اور قابل نوجوان ہیں - اور عربی اور فارسی دونوں کے ادب میں ان کا مطالعہ اچھّا ہے - میں انکی رائے کا خلاصہ یہاں پیش کرتا ہوں *

میرزا بہروز لکھتے ہیں کہ جامی کے اشعار شاعرانہ ساخت، شیرینی اور سادگی میں نظامی کے اشعار سے لگّا کھاتے ہیں - اور غالبًا بڑھ بھی جاتے ہیں - آورد سے مبترّا اور تصنّع آمیزی سے قطعًا پاک ہیں - لیکن متانت شاعرانہ تخیّل اور فصاحت میں نظامی کے کلام سے پیچھے رہ جاتے ہیں -

نظامی کا کلام سمجھنے اور اس سے لُطف اندوز ہونے کے لئے فارسی زبان کا ایک گہرا علم درکار ہے۔ بخلاف اس کے جامی سے سب یکساں لُطف اُٹھا سکتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ وُہ فارسی کی دنیا میں اور خصوصًا ہندوستان ٹرکی اور دوسرے ایسے ممالک میں جہاں فارسی ادب غیر ملکی حیثیت رکھتا ہے اس درجہ مشہور و مقبول ہیں۔ مزید بر آن نظامی دُور رس علمی تحصیلات کا مالک تھا۔ نہ صرف اپنے مُلک کی زبان اور تاریخ میں بلکہ اپنے زمانے کے علوم خصوصًا ریاضیات میں مہارتِ تامّہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اکثر اسکا کلام قارئین کی سمجھ میں نہیں آتا سوائے ان کے جو متعلقہ علوم میں ویسے ہی طاق ہیں جیسا کہ خود نظامی تھا۔ لیکن پھر جو لوگ ان علوم سے اس طرح بہرہ مند ہیں اُن کو نظامی کے ہاں ایسی ایسی گہرائیاں اور باریکیاں نظر آئینگی جن کی تلاش جامی کے ہاں بے سُود ہے ؀

نظامی اور فردوسی

خمسہ کی صرف ایک مثنوی یعنی سکندر نامہ میں نظامی اپنے عظیم پیشرو فردوسی کے مقابلے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ مثنوی بحر اور نفسِ مضمون دونوں میں شاہنامہ کے مطابق حصّے سے مشابہ ہے لیکن اکثر نقّادوں کی نظر میں اس سے فروتر ہے[۱]۔ بظاہر جیسا کہ نظامی خود اشعارِ ذیل میں جتاتا ہے اُسے سکندر نامہ کی تصنیف میں ایک ایسے زمانے کے تعصّب کی مزاحمت سے سابقہ پڑا ہے جو فردوسی

[۱] اس امر پر مولانا شبلی نے شعر العجم میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ جلد اوّل۔ ص ۳۲۳ تا ص ۳۵۶ ؀

کے زمانے کی نسبت کم روادار ہے ؎

جہاں ز آتش پرستی شد چنان گرم کہ بادا زین مسلمانی ترا شرم
مسلمانیم ما او گبر نام است گر آن گبری مسلمانی کدام است
نظامی بر سرِ افسانہ شو باز کہ مرغِ پند را تلخ آمد آواز

مولانا جامی گو صوفی تھے۔لیکن در اصل ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور وہ قبل الاسلامی ایران کے لئے اس جوش کا کچھ بھی ثبوت نہیں دیتے

مولانا جامی کے ہاں نظامی کا قریبی اتباع

جس نے فردوسی کو اور اس سے اُتر کر نظامی کو اُبھارا تھا۔مولانا نے اس بات کو راز نہیں رکھا کہ وہ نظامی کے ممنون ہیں اور بے شک وہ غیر معمولی پابندی سے اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔گو کہیں کہیں ایسے مباحث اور مقالات لے آتے ہیں جو کاملاً ان کے اپنے ہیں[1]۔نظامی کا اتباع وہ نہ صرف نظموں کی تبویب و تقسیم، عنوانات اور بحروں میں کرتے ہیں۔بلکہ باریک شخصی تفصیلات میں بھی۔چنانچہ دونوں شاعر اپنے آپ سے خطاب کرتے ہیں اور اپنے ایک سات سالہ فرزند کو نصیحت کرتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ نظامی نے اپنے بیٹے کو طبّ کے مطالعہ کی تلقین کی ہے اور مولانا جامی نے دینیات کی صلاح دی ہے۔یہ متوازیت خاص طور پر اُن فصلوں میں واضح ہے جو "لیلیٰ و مجنون" کے "سببِ نظمِ داستان"

---

[1] مثلاً تحفۃ الاحرار کے آغاز کے قریب بسم اللہ کے حروف کی دلچسپ تشریح؛

سے متعلق ہیں اور دونوں کی مثنویوں میں آتی ہیں۔ قلّتِ گنجائش مجھے مجبور کرتی ہے کہ اس متوازیت کی وُہ مثالیں چھوڑ دُوں جو میرزا بہروز نے اپنے مضمون میں دی ہیں۔ بڑے بڑے ایرانی شعراء کی تالیفات کے اس قسم کے موازنے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مَیں نے ان سے ابتک بہت بے توجہی برتی ہے۔ لیکن تاریخِ ادبیاتِ ایران کی جلدِ حاضر اور سابقہ جلدوں میں مَیں جس کام میں طبع آزمائی کر سکا ہوں وُہ صرف ایک ضروری تمہیدی تصنیف ہے جس کی نوعیت تاریخی، سیرتی اور کتابیاتی ہے ؞

مولانا کی غزلیّہ شاعری

مولانا کی غزلیہ شاعری جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے[1] تین جداگانہ دیوانوں پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں اس کا تبصرہ کماحقّہٗ پیش کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ پہلے ہی ضخامت کی ان حدود سے تجاوز کر چکی ہے جو میں نے اس کے لئے معیّن کی تھیں یورپ میں صرف جرمنوں نے خصوصًا فون روزن زوایک[2]، ریوکرٹ[3]، اور

---

[1] دیکھو اوپر صـ۷۲۴ـ

[2] Von Rosenzweig ـ "مولانا جامی کی سیرت کے مذکورات اور اُن کے دیوان کے ترجمہ اقتباسات از ونسینس ایڈلم فون روزن زوایک۔ Biographische Notizen uber Melwana Abdurrah man Dscami nebst Ubersetzungsproben aus seinen Diwanen vinzenz Eldem von Rosenzweg (Vienna, 1840)۔ افسوس ہے کہ اس مجلّد کے صفحات پر نمبر نہیں لگائے گئے ؞

(حاشیہ ۳ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)؛

وکرہاؤزر نے اس میدان میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ غزل کے میدان میں بھی مولانا جامی کی فضیلت اور ان کے کمالات کی افراط دیکھتے ہوئے اس موضوع کا پورا حق ادا کرنے کے لئے ایک جدا رسالہ درکار ہے۔ یہ موضوع نہ صرف اس لئے مفصّل مطالعے کا مستحق ہے کہ مولانا غزلیہ شاعری میں بڑا درجہ رکھتے ہیں بلکہ اس بات کے مدّنظر بھی کہ جیسا کہ ذکر آچکا ہے انہوں نے ایران اور اس کے علاوہ ٹرکی میں بعد کے شعراء پر گہرا اثر ڈالا۔ مجھے اُمید ہے کہ اگلی جلد میں جب مَیں غزل کے اس ارتقا پر تبصرہ کروں گا جو متأخر زمانوں میں واقع ہوا۔ تو مَیں مولانا کی غزلیّہ شاعری پر دوبارہ بحث کرسکوں گا فی الحال مجھے چند نمونوں پر اکتفا کرنی پڑے گی۔ یہ نمونے اُن کے پہلے دیوان کی اُس طبع کو سرسری طور پر مطالعہ کرنے کے بعد انتخاب کئے گئے ہیں جو

(حاشیہ ص۷۴۸) Ruckert اس کی تصنیف ۳۳ سال (۱۸۴۳ء تا ۱۸۷۶ء) میں پوری ہوئی۔ ابتدا میں اس کی قسطیں "مجلّہ برائے معلوماتِ مشرق" (Z. f. d Kunde d. Morgenlandes) میں چھپتی رہیں :۔ جلد پنجم ص۲۸۱ تا ص۳۳۶ ؛ جلد ششم، ص۱۸۹ تا ص۲۲۷ ؛ پھر مجلّۂ انجمنِ شرقیِ آلمانی (Z. D. M. G.) میں جاری رہیں :۔ جلد دوم ص۲۶ تا ص۵۱ ؛ جلد چہارم ص۴۴ تا ص۶۱ ؛ جلد پنجم ص۳۰۸ تا ص۳۲۹ ؛ جلد ششم ص۴۹۱ تا ص۵۰۴ ؛ جلد بیست و چہارم ص۵۶۳ تا ص۵۹۰ ؛ جلد بیست و پنجم، ص۹۵ تا ص۱۱۲ ؛ جلد بیست و ششم ص۴۶۱ تا ص۴۶۴ ؛ اور جلد بیست و نہم ص۱۹۱ تا ص۱۹۸ ؛

لہ Wickerhauser کی تصنیف "پھولوں کا ہار" (Blutenkraws) لائپزگ ۱۸۵۵ء اور وی اینا ۱۸۵۸ء ؛

۱۲۸۴ھ (۸-۱۸۶۷ء) میں قسطنطنیہ سے نشر ہوئی اور جیسا کہ اس کے آخر میں بیان ہوا ہے مصنّف کے خود نوشتہ نسخے[1] پر مبنی ہے۔ میرے پاس اس وقت اسی دیوان کا ایک بہت مکمل تر متن[2] موجود ہے جو لکھنؤ سے سنگی طباعت کے ساتھ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں شائع ہوا۔ اس میں بہت سی غزلیں ایسی ہیں جو قسطنطنیہ کی طبع میں غائب ہیں اور آخر الذکر کے ۱۸۲ صفحات کے مقابلے پر اس کے صفحات ۵۶۸ ہیں ؛

(۱)

یَا مَن بَدَا جَمَالُکَ فِی کُلِّ مَا بَدَا
بادا ہزار جانِ مقدّس ترا فدا

من نالم از جدائیِ تو دمبدم چو نَی
وین طرفہ تر کہ از تو نَیَم یک نفس جُدا

عشق است و بس کہ در دو جہاں جلوہ می کند
گاہ از لباسِ شاہ و گہ از کسوتِ گدا

یک صوت بر دو گونہ ہمی آیدت بگوش
گاہی ندا ہمی نہیش نام و گہ صدا

---

[1] بدقسمتی سے کچھ اتا پتا نہیں کہ یہ نسخہ اب کہاں ہے۔ یہاں غزلوں کا جو متن دیا جا رہا ہے اس کی کہیں کہیں میں نے ہندوستان کی سنگی طبع سے ترمیم کر دی ہے۔ جس میں قرأتیں اکثر زیادہ صحیح دی گئی ہیں ؛

[2] اسی دیوان کی ایک عمدہ ایرانی طبع بہ تصحیح و ترتیب حسین پژمان ۱۳۱۷ھ شمسی میں چاپخانۂ علمی سے "انتشارات شرکت تضامنی علمی" میں شائع ہوئی ؛ (مترجم)

برخیز ساقیا ز کرم جرعۂ بریز
بر عاشقانِ غمزدہ زآن جام غمزدا
زآن جام خاص کز خودیم چون دہد خلاص
در دیدۂ شہود نماند بجز خدا
جامی رہِ ہدیٰ بخدا غیرِ عشق نیست
گفتیم وَالسَّلَامُ علیٰ تابعِ الہُدیٰ

غزل ذیل صریحًا خواجہ حافظ کی مشہور غزل کے تتبع میں لکھی گئی ہے

(۲)

نَسِیمَ الصُّبحِ زُرمِنّی رُبیٰ نجدٍ وقبِّلہا
کہ بوئے دوست می آید از آن پاکیزہ منزلہا
چو گردد شوقِ وصل افزوں چہ جای طعن اگر مجنون
بہوی ہودجِ لیلیٰ فتد دنبالِ محملہا
دلِ من پُر ز مہرِ یار و او فارغ نبودست آن
کہ مے گویند راہی ہست دلہا را سوی دلہا
رسید اینک ز رہ سلمیٰ و من از ضعفِ تن زینسان
فَخُذ یا صاحِ رُوحی تُحفَۃً مِنّی وَأَقبِلہا
مریز ای ابر دیدہ آب حسرت بر سرِ راہش
کہ دور اَولیٰ سُمِ اسپش از آسیب چنین گلہا

مرا از ہجر او در دل گرہ می بود صد مُشکل
چو دیدم شکل او فے الحال حل شد جُملہ مشکلہا

ز جورِ دورِ غم فرجام جامی غصّہ ہا دارد
وَلٰکِنْ خَوْفُ أَمْلَالِ النَّدَامیٰ لَمْ یُطَوِّلْہَا

۳

طرفِ باغ ولب جوی ولب جامست اینجا
ساقیا خیز کہ پرھیز حرامست اینجا

شیخ در صومعہ گرمست شد از ذوقِ سماع
من و مے خانہ کہ این حال مدامست اینجا

لب نہادی بلبِ جام و ندانم منِ مست
کہ لبِ لعلِ تو یا بادہ کدامست این جا

بستۂ زُلفِ سیاہِ تو نہ تنہا دلِ ماست
ہر کجا مرغِ دلی بستۂ دامست اینجا

می کشی تیغ کہ سازی دلِ مارا بدونیم
تیغ بگذار کہ یک غمزہ تمامست این جا

پیشِ اربابِ خرد شرح مکن مُشکلِ عشق
نکتۂ خاص مگو مجلسِ عامست این جا

جامی از عشقِ تو شد مست و نہ مے دید و نہ جام
بزمِ عشقست چہ جای مے و جامست این جا

(۴)

خوبان هزار و از همه مقصودِ من یکیست
صد پاره گر کنند بتیغم سخن یکیست
خوش مجمعیست انجمن نیکوان ولی
ماهی کزوست رونقِ این انجمن یکیست
خواهیم بهرِ هر قدمش تحفۂ دگر
لیکن مقصّریم که جان در بدن یکیست
گشتم چنان ضعیف که بی نالہ و فغان
ظاهر نمی شود که درین پیرهن یکیست
آنجا که لعلِ دلکشِ شیرین دهد فروغ
یاقوت و سنگ در نظرِ کوهکن یکیست
ناموس و نامِ ما تو شکستی ز نیکوان
آری ز صد خلیل همین بُت شکن یکیست
جامی درین چمن دهن از گفت وگو ببند
کآنجا نوائے بلبل و صوت زغن یکیست

یہ غزل زمین اور خیالات میں ایک اَور غزل سے بہت مشابہ ہے جس کا مصنّف معلوم نہیں ہے۔ اور جس کے افتتاحی اشعار معہ ترجمہ منظوم مَیں نے اپنی کتاب "ایرانیوں میں ایک سال[1]" میں چھاپے تھے ایسا

---

[1] A year amongst the Persians

ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی اس غزل کے چوتھے شعر کا مآخذ متنبی کے مشہور عربی اشعار ہیں[1] ؎

أَبْلَى الْهَوَى أَسَفًا يَوْمَ النَّوَى بَدَنِي
وَفَرَّقَ الْهَجْرُ بَيْنَ الْجَفْنِ وَالْوَسَنِ
رُوحٌ تَرَدَّدُ فِي مِثْلِ الْخِلَالِ إِذَا
أَطَارَتِ الرِّيحُ عَنْهُ الثَّوْبَ لَمْ يَبِنِ
كَفَى بِجِسْمِي نُحُولًا أَنَّنِي رَجُلٌ
لَوْلَا مُخَاطَبَتِي إِيَّاكَ لَمْ تَرَنِي

(ترجمہ) عشق نے میرے جسم کو جدائی کے دن رنج کے مارے گھلا دیا۔ اور ہجر نے میری پلکوں اور نیند کے درمیان جُدائی ڈال دی؛

میری رُوح خلال جیسے لاغر جسم میں آمد و شد کر رہی ہے۔ اور جب ہوا اس خلال پر سے کپڑے کو اُڑا کر ہٹا دیتی ہے تو وہ (لاغری کے سبب) نظر بھی نہیں آتا؛

میرے دُبلے پن کی حد ہو گئی ہے (حالت یہ ہے کہ) میں ایک ایسا شخص ہوں کہ اگر تمہارے ساتھ بات نہ کروں تو میں تمہیں نظر بھی نہیں آؤں گا[2]۔

---

[1] دیوان متنبی۔ طبع ڈیٹریسی (Dieterici)۔ ص ۵؛

[2] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں؛

جامی کے فارسی کلام پر عربی شاعری کے اثر کی یہ مثال تنہا نہیں ہے چنانچہ ان کا ایک اَور شعر ہے ؎

بودم آنروز من از طائفہ دُرد کشان
کہ نہ از تاک نشا بود و نہ از تاک نشان

اس کا معنوی منبع جیسا کہ میرزا بہروز نے مجھے بتایا ہے قریب قریب یقیناً مشہور مصری صوفی عمر ابن الفارض[1] کا شعر ذیل ہے ؎

شَرِبْنَا عَلیٰ ذِکْرِ ٱلْحَبِیْبِ مُدَامَۃً
سَکِرْنَا بِہَا مِنْ قَبْلِ أَنْ یُخْلَقَ ٱلْکَرْمُ

(ترجمہ :- ہم نے اپنے محبوب کی یاد میں شراب پی قبل اس کے کہ انگور کی بیل پیدا کی گئی)؛

مولانا سے پہلے غزل کے جتنے بڑے فارسی شاعر ہوئے۔ ان میں سے مولانا پر شیخ سعدیؔ اور خواجہ حافظؔ کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اُنھوں نے مولوی رُومی کے اُن اشعار کا بڑی استادی سے تتبع کیا ہے۔ جو مجموعی طور پر بعض دفعہ "نے نامہ" کہلاتے ہیں[2]۔ اور اپنے طور پر مثنوی رُومی کی تمہید کا

(حاشیہ صفحہ ۷۵۴) اردو کے مندرجۂ ذیل ہم مضمون شعر ملاحظہ ہوں ؎

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں — ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے (ناسخ)

اسد جو رنجِ ہجر نے لاغر کیا مجھے — بستر پہ آکے ڈھونڈ رہی ہے قضا مجھے

معلوم نہیں یہ شعر کس کا ہے۔ (مترجم)

[1] طبع شیخ الدحدہ (پیرس ۱۸۵۸ء)۔ ص ۴۷۲؛ [2] ملاحظہ ہو اوپر ص ۷۲۲؛

تصوّر نہایت صفائی سے مرتّب کیا ہے۔ جامی کو اگرچہ میں ایران کا آخری مستند (کلاسکی) شاعر ماننے کو تیار نہیں لیکن یقیناً وہ سب سے قابل، متنوع العلوم اور پُرنویس شاعروں میں سے ہیں۔ ایسے شاعر کے اس ناکافی جایزے کا خلاصہ بطورِ خاتمہ ایک فقرے میں بیان کیا جاتا ہے۔ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جامی کے کلام میں ایران کے صُوفیانہ اور ہمہ اوستی فکر کو اپنا مکمل ترین اور واضح ترین اظہار میسّر آیا۔ اور گو ممکن ہے کہ ادب کی جن متعدد سرزمینوں کو اُنہوں نے سینچا اُن میں دُوسرے اُن کے مقابلے پر آئے ہوں یا اُن سے بڑھ بھی گئے ہوں۔ لیکن کوئی ایرانی شاعر یا مصنّف اتنے مختلف میدانوں میں اس درجہ کامیاب نہیں ہوا۔ اور مولانا کی جامع اور کثیرالاطراف طبّاعی اُن کے ممتاز ترین معاصرین کی پُرجوش تحسین کو برحق ثابت کرتی ہے ؂

کتبہ
علی محمد کاتب۔ محلّہ شیعاں۔
موچی دروازہ۔ لاہور

اشاریہ

ذیل میں آپ کو پہلے سات ابواب کے ناموں اور صفحوں کے مفصل حوالے مل جائیں گے، لیکن آٹھویں باب کے معاملے میں اُس قدر تفصیل نہ ملے گی، مجھے اس کا بے حد افسوس ہے - ہوا یہ کہ میں نے جب سات ابواب کا اشاریہ تیار کرلیا تو فوراً مجھے تعلیم کے سلسلے میں انگلستان آنا پڑا - یہاں آکر تحقیق کا جو کام میرے سپرد ہوا اس کے ساتھ ساتھ یہ تکمیل کرنا ممکن نہیں - اُمید ہے ناظرین درگزر کریں گے -

۱ جہاں کہیں صفحے کے نمبر کے ساتھ ح درج ہے اُس سے مراد ذیلی حاشیہ ہے،

۲ ترتیب تہجی میں و کے بعد ہ اور اس کے بعد ء آتی ہے-

۳ تشدید کے سلسلے میں خیال رکھا جائے کہ مثلاً بنّائی کو ترتیب تہجی میں بن نائی کی جگہ حاصل ہے،

۴ ترتیب تہجی میں مندرجہ ذیل کو معدوم سمجھا گیا ہے : -

بنو- ابو- ابن- آل (بمعنی اولاد)-

ذو (جیسے ذوالقدری میں)

لو (فرانسیسی سابقہ جیسے لو سٹرینج میں)

دو (فرانسیسی سابقہ جیسے دو سلین میں)

مراد یہ ہے: بنو قتادہ کو قاف میں دیکھئے، ابوسعید کو سین میں، ابن یمین کو یا میں، آل بویہ کو با میں، ذوالقدری کو قاف میں، لوسٹرینج کو سین میں اور دوسلین کو سین میں۔

۵ پورے نام کا اگر کوئی حصہ بطور مخفف مشہور ہے تو اسی کو ترتیب تہجی میں جگہ دی گئی ہے، نام کے باقی حصے ساتھ درج کردئے گئے ہیں مثلاً :-

میر علی شیر نوائی کو یوں لکھا ہے :- نوائی، میر علی شیر -

فخرالدین عراقی کو یوں لکھا ہے :- عراقی، فخرالدین -

۶ صفحوں کے نمبر جہاں موٹے قلم سے لکھے گئے ہیں مراد یہ ہے کہ وہاں اس جگہ، شخص، کتاب وغیرہ کا زیادہ مفصل ذکر ہے،

کیمبرج - ۸ مئی ۱۹۴۹ء   داؤد رہبر

جگہوں کے نام

کتابوں کے نام

متفرقات

شخصوں ، قبیلوں ، شاہی خاندانوں ،
فرقوں ، زبانوں ، وغیرہ کے نام

— — ● — —

ختم شد

غلطیوں کی فہرست

صفحہ	سطر کا نمبر یا حوالہ	غلط	صحیح
الف ۸	۵	سبب جو پانچ	سبب کی طرف جو پانچ
۱	——	سنہ ۶۹۳ھ	سنہ ۶۶۳ھ
۹	ذیلی حاشیہ	ہرلفورڈ	ہرٹفورڈ
۱۰	۲	بحر خضر	بحر خزر
۱۶	ذیلی حاشیہ	لیو کاہاں	لیوں کاہاں
۱۹	آخری	ایڈورڈ روم	ایڈورڈ دوم
۶۳	نیچے سے دوسری	خواند میر	خواند امیر
۹۹	۳	سلیمان ساوجی	سلمان ساوجی

۱۰۴	....	نیچے سے دوسری	القزوین	القزوینی
۱۰۷	....	۳	نظامی عروسی	نظامی عروضی
۱۳۴	....	۱۰	حدثیه	حدیقه
۱۴۲	....	۱	ابر کوهی	ابر قوهی
۱۹۳	....	۱۰	ابو سعید بن ابی الخیر	ابوسعید بن ابی الخیر
۲۲۱	....	۱۰	مری	میری
۲۲۷	....	آخری	قهستان حشیشین	قهستان حشیشین
۲۵۳	....	ذیلی حاشیه	خواند میر	خواند امیر
۲۷۸	....	نیچے سے چوتھی	سلطانه	سلطانیه
۲۸۴	....	۱	وزفول	دز فول
۳۰۳	....	نیچے سے ۵	نظامی شامی	نظام شامی
۳۱۲	....	۵	ایرانی هرجائی	ایران هرجائی
۳۳۸	....	ذیلی حاشیه	جنگشن	جنکشن

صفحہ	سطر کا نمبر یا حوالہ	غلط	صحیح
۴۱۵	آخری	عبرتناک سانچے	عبرتناک سانحے
۵۳۹	موٹے حروف میں عنوان	ابوسعید کے بیٹے احمد اور سعید	ابوسعید کے بیٹے احمد اور محمود
۵۳۹		تابدار	تاجدار
۵۵۶	۹	عمانی	عثمانی
۵۶۸	نیچے سے تیسری	ماخذ	مأخذ
۵۸۴ ...	٦	لشتا نشا	لشتا نشتا
٦۳۷ ...	ذیلی حاشیہ ۲	محلۂ انجمن	مجلّۂ انجمن
٦۵۲	۲	عبدالغنی لاری	عبدالغفور لاری
٦۹٦	نیچے سے تیسری	تربیّت	تربیت

صرف اشاریہ کے صفحات اردو ٹائیپ میں باهتمام
حکیم رشید احمد ندوی کھوسلا الیکٹرک پرنٹنگ پریس
۹۹ ریلوے روڈ لاهور میں چھپے